جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیر ادارت

محمد اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ، ڈی

جلد	جولائی سنہ ۱۹۲۶ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

(سالانہ چندہ [illegible])

جامعہ

جلد ۷ | ماہ محرم الحرام ۱۳۴۵ھ مطابق جولائی ۱۹۲۶ء | نمبر ۱

ہندوستان کی معیشت زرعی پر انگریزی قبضہ کا اثر

(بنگال میں عطار دیوانی سے قبل)

زراعت معیشت ہند کے جسم میں بمنزلہ قلب کے ہے۔ دستکاریوں کی تباہی کے بعد تو یہ اس ملک کے گذارہ کا کم و بیش تنہا ذریعہ ہے۔ ہمارے جدید تعلیمیافتہ طبقہ کو مغربی تاریخ معاشی کے سطحی مطالعہ نے ابتک اس اہم ترین معاشی عنصر سے بخبر سا رکھا۔ کچھ انگریز حکام کے اس بیان نے کہ ہندوستان صرف زراعت کے لئے موزوں ہے صنعتی ترقی کا خیال یہاں دیوانگی ہے اس گروہ کو اس شجر ممنوعہ کا اور بھی دلدادہ بنا دیا۔ اب ادہر چند سال سے ملک کی سیاسی تحریک کے ضمن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان کی صنعتی ترقی کو بھی زراعت سے قریبی رابطہ ہونا چاہئے، بلکہ شاید معاشی فلاح کی بہترین صورت یہی ہو کہ آبادی کے خالی اوقات کو کسی طرح صنعتی پیدائش دولت میں صرف کیا جائے۔

یوں گویا زراعت کی ترقی کا مسئلہ ملک کی سیاست معاشی کا اہم ترین مسئلہ بنگیا جس سیاسی

تحریک کے سلسلہ میں یہ معاشی خیال پیدا ہوا تھا وہ آج تقریباً مردہ ہو چکی ہے لیکن اس کے بہت سے مفید اثرات میں سے ایک یہ عام احساس بھی ہے کہ ملک کی ترقی کی تمام مجوزہ تدابیر غلط ہیں یا ہوں گی اگر ملک کی محنت کش آبادی کی اکثریت کے شغل یعنی زراعت کو ترقی دینے کی تدابیر نہ کی جائیں کھدر کی ترویج، مویشیوں کی پرورش اور نگہداشت کیطرف توجہ، تنظیم دیہی کی تحریک یہ سب اسی احساس کا نتیجہ ہیں۔ حکومت وقت نے بھی اس عام احساس کی صحت کو ایک زرعی کمیشن مقرر کر کے تسلیم کیا ہے۔ توقع ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا وہ حصہ جو معاشی مسائل سے کچھ بھی دلچسپی رکھتا ہے وہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرے گا۔ میں خود کوشش کروں گا کہ رسالہ جامعہ کے توسط سے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔

چونکہ ہر اس قسم کے مسئلہ کے فہم میں اسکے متعلق تاریخی معلومات سے مدد ملتی ہے اس لئے میں چند مضامین میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرونگا کہ آبادی کے جس حصہ کے ہاتھ میں آج کل ہندوستان کی زراعت ہے وہ اس شغل تک کیسے پہنچی اور اپنے شغل کیطرف انکا جو رویہ ہے یعنی انکے انہماک یا بے اعتنائی۔ ترقی کی خواہش یا حالت موجودہ پر مایوسی آمیز قناعت۔ بلند حوصلگی یا پست ہمتی کے کیا تاریخی اسباب ہیں۔ ان باتوں کے پیدا کرنے میں بے گنتی چیزیں اپنا اثر ڈالتی ہیں، لیکن ہم اس مضمون میں صرف ایک عنصر یعنی حکومت وقت کے اثر کا مطالعہ کرینگے یہ سیاسی اثر بھی کچھ انگریزوں کی حکومت کے وقت سے ہی نہیں شروع ہوا بلکہ ہندو اور مسلم عہد حکومت کے اثرات بھی آج تک ہماری معیشت زرعی میں بین طور پر موجود ہیں۔ لیکن چونکہ انگریزی عہد ہم سے قریب تر ہے اور بڑی حد تک ان اثرات کا حامل اور وارث ہے۔ جو ہم سے زیادہ بعید ہیں اس لئے ہم صرف انگریزی حکومت کے اثر پر اجمالاً نظر ڈالیں گے۔

جہاں حکومت براہ راست معاشی اعمال میں حصہ نہیں لیتی وہاں اسکا اثر ملک کی معیشت پر بالواسطہ پڑتا ہے۔ مثلاً زرعی پیداوار پر حکومت جو محصول لیتی ہے اس کے کم یا زیادہ ہونے سے زراعت پیشہ طبقہ کے عمل پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر کسان یہ جان لے کہ وہ معمول سے زائد محنت کر کے اپنی

پیداوار بڑھ جائے تو اضافہ تمام کا تمام اس سے محاصل حکومت کے طور پر لے لیا جائے گا تو وہ باوجود اپنی ضرب المثل کند ذہنی کے اس حماقت سے باز رہے گا۔ گذشتہ انقلاب عظیم کے بعد روس کے کسانوں کا رویہ اس بارہ میں نہایت سبق آموز ہے۔ اسی طرح اگر اسکی محنت کے ثمرات کسی دوسرے درمیانی طبقہ (مثلاً زمیندار) کے ہاتھ آسکیں تو وہ پھر بھی اپنی کھیتی باڑی کو ترقی نہ دے گا اگر زمیندار کو یہ معلوم ہو کہ اسکی زمینداری زیادہ دن نہیں چل سکتی اور حکومت کا ہاتھ اسے موقع پاکر کسی ایسے کے سپرد کر دے گا جو حکومت کو اس سے زیادہ رقم ادا کرے تو وہ لازمی طور پر کوشش کرے گا کہ جبتک موقع ہے اپنے ماتحت کسانوں سے جائز و ناجائز طریقوں سے جو کچھ حاصل کر سکتا ہے حاصل کرے۔ دوراندیش اور فلاح ملک کی خواہاں حکومتیں کوشش کرتی ہیں کہ محاصل کو واجبی حدود میں رکھکر اور حقوق قانونی کے تحفظ کی ضامن بنکر اس صورت حال کو کبھی نہ پیدا ہونے دیں۔ ناعاقبت اندیش اور لالچی حکومتیں اپنے خزانہ کو پُر کرنے کے لئے ایسی صورتیں پیدا کردیتی ہیں جو بے اطمینانی اور بے اعتباری کا گھن بنکر معیشت قومی کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ ہم سطور ذیل میں دیکھیں گے کہ انگریزوں کے قبضہ ہندوستان کے ابتدائی زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا رویہ اپنی مقبوضہ اضلاع کے متعلق کیا رہا اور کیوں۔

ابھی مغلوں کا آفتاب اقبال عروج ہی پر تھا کہ ہندوستان کے معاملات سیاسی وملکی میں ایک نئے عنصر کا ظہور ہوا یعنی فرنگی تجار کا۔ سترہویں صدی کے وسط میں سندھ سے لیکر بنگال تک ساحل ہند پر جہاں کہیں تجارت اور کاروبار کے مواقع تھے یہ فرنگی تاجر ضرور موجود تھے۔ اور صرف ساحل ہی پر نہیں بلکہ خود اندرون ملک میں بھی ہر طرف انکا وجود محسوس ہو رہا تھا۔ سوائے پنجاب کے ملک کا کوئی قابل ذکر حصہ ایسا نہ تھا جو انکی تجارتی الوالعزمی کا جولانگاہ نہ ہو۔ رفتہ رفتہ خود تجارت کی ضرورتوں نے ان تجارتی شرکتوں کو ملک گیری کی طرف متوجہ کیا۔ باہمی رقابتوں اور سازشوں کا جال سارے ملک پر پھیل گیا اور بالآخر ملک میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے ان شرکتوں میں

خود بالآخر ادھر اس ملک کے موجودہ حکمرانوں سے جنگ و جدال کی نوبت آئی لیکن ہم اس مضمون میں تنازع للبقا
کی یہ عبرتناک انگریزی داستان ناظرین کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہتے۔ یہاں مقصود صرف یہ ہے کہ
کارکنان قضاء و قدر نے ان تاجروں کی جس شرکت کو اس ملک کی حکومت کیلئے چنا تھا ان کی اس
سیاست کا ایک نمونہ پیش کیا جائے جو بندوبست اراضی کے متعلق انہوں نے اختیار کی۔

یعنی زیر انتظام اور مقبوضہ اراضی کے متعلق انگریزی تجار کی اس جماعت نے کچھ عجیب متضاد کارروائیاں
کیں جو شخص ان متضاد اعمال و احکام میں کوئی یگانگت ڈھونڈھنا چاہے اسکا کام واقعی بہت
دشوار ہے۔ کبھی ملک کے قدیم مالکان اراضی کو یہ کہکر مٹایا جاتا ہے کہ کسان کے حقوق کی پاسداری
ضروری ہے، کبھی پھر ایک نیا طبقہ امراء پیدا کرنے کی کوشش ہوتی ہے کہ ملک کی ترقی بلا اس
طبقہ کی مدد کے ناممکن ہے اور پھر یہ ملک کا قدیم رواج بھی ہے،، کسانوں کے حقوق بے دردی
سے پامال کردئے جاتے ہیں اور اسکے بعد انہیں ،، ظالم زمینداروں ،، کے ستم سے بچانے کی تدابیر
کی جاتی ہیں، کبھی مالگذاری کی خاطر زمین کا لگان کا ہر سال نیلام ہوتا ہے، کبھی مالگذاری
دوامی طور پر مقرر کر دی جاتی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ جب اس قسم کی کوئی نئی کارروائی کیجاتی
ہے تو ،، ملک کی تاریخ ،، ،، رسم و رواج ،، ،، حقوق انسانیت ،، ،، قانون اخلاق ،، ہر چیز اس
کارروائی کے موافق ہوتی ہے۔ اور جب کچھ دن بعد اسکے بالکل متضاد کارروائی ضروری
قرار پاتی ہے تو اسکی موافقت میں بھی یہی سب واسطے دئے جاتے ہیں!!

یہ عجیب بات بس اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ ان کارروائیوں کے بانی تاجر تھے اور انگریزی
تاجر کی نظر ہمیشہ اپنے مالی نفع پر رہی۔ وہ قوموں اور ملکوں کی قسمت کو روپیہ آنہ پائی میں تحویل
کرتا رہا۔ وہ کسی مذہبی عقائد کا اپنے عمل میں پابند نہ تھا۔ حکومت اپنے ساتھ جو ذمہ داریاں
لاتی ہے وہ ان سے بھی بیگانہ تھا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کے متعلق
یہ بات عجیب حیرت خیز اور ما فوق الفہم سی ہے کہ اس کے بانیوں نے کبھی اس کے بنا کا ارادہ
نہیں کیا اور نہ اس ملک کو کبھی محض سیاسی اغراض کیلئے چاہا۔ انہوں نے اگر ،، فتوحات ،،

کیں تو انہیں بھی غرض تجارت تھی۔ یہ مفتوحہ علاقوں میں تہذیب و تمدن کے علم بردار بنکر نہ آئے تھے۔ یہ لطیفہ تو بعد کی شہنشاہی ضروریات نے اختراع کرایا ہے۔ قبضہ و ملک گیری سے مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانی بازار میں انکی قوت خرید جو بہت کم تھی اس میں اضافہ کیا جائے ضرورت اس کی بھی تھی کہ اپنے ملک سے سونا چاندی نہ منگانا پڑے اور ہندوستانی ساہوکاروں سے بہت بہت سود دے کر قرض نہ لینا پڑے اسکی بس یہ صورت تھی کہ مقبوضہ علاقوں کی مالگذاری سے یہ کام نکالا جائے۔

یہ تھا اصل مقصد جس کے حصول کیلئے ہر ذریعہ جائز تھا۔ کبھی ایک طریقہ مناسب خیال کیا گیا کبھی دوسرا۔ انگریزی قوم کی سیرت سے جو لوگ واقف ہیں وہ ان میں سیرت قومی کی خصوصیت امتیازی کا پرتو دیکھیں گے۔ یہ قوم کبھی کسی عام اصول سے اپنے کو پابند نہیں کرتی بلکہ ہمیشہ ہر مسئلہ پر از سر نو غور کر کے اپنے مفید مطلب فیصلہ کرتی ہے۔ پھر اس مفید فیصلہ کے جواز میں تمام اخلاقی اصول پیش کرتی اور واقعی اپنے نفس کو اسکے حق ہونے کا یقین دے لیتی ہے۔ چنانچہ یکساں اطمینان قلب کے ساتھ متضاد سے متضاد کارروائیاں انجام دیتی ہے۔ یہ اطمینان قلب اس قوم کو دوسروں کے مقابلہ میں بڑی اخلاقی قوت بہم پہنچاتا ہے۔ اور سیاست کی پُرپیچ راہوں میں ضمیر کے حسب ضرورت مطمئن یا غیر مطمئن ہو جانے سے بڑی سہولتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ابتدائی قبضہ کے حالات کا مطالعہ کرنیوالا مجبوراً اس نتیجہ پہنچتا ہے کہ ان تمام اخلاقی اصولوں کے پردہ میں جنکے ماتحت مختلف کارروائیاں کیگئیں یہ تاجر کا دین تھا اور تاجر کا ایمان یعنی روپیہ اور زیادہ روپیہ۔

بندوبست آراضی کے متعلق مختلف کارروائیوں کی تفصیل کرنے سے پہلے یہ بتلانا ضروری ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسری فرنگی شرکتوں کی تجارت کے لئے ہندوستان کے اندر بے سودی روپیہ کا فراہم کرنا شرط حیات تھا۔ یوں نہیں ہندوستان کی غریب آبادی میں ان اشیاء کی بہت کم مانگ تھی جو یورپ سے تاجر لاتے تھے اور رسم و رواج اور مذاق کے اختلاف نے اس مانگ کو اور بھی کم کر دیا تھا۔ لیکن یہ شرکتیں ہندوستان سے مال خرید کر باہر بھیجنا چاہتی تھیں۔ اور ان چیزوں کے لئے قیمت ادا کرنی پڑتی تھی نقد۔ دوسرے ایشیائی ممالک میں بھی یورپ کی چیزوں کی

مانگ نہ تھی اور یہ تاجر یہاں سے بھی چیزیں خرید کر اپنے ملک کو بھیجنا چاہتے تھے ۔ ان چیزوں کی قیمت بھی یا تو ہندوستانی اجناس سے ادا کیجاتی تھی یا ایسی اجناس سے جو ہندوستانی مال کے عوض کسی اور بازار میں خریدی گئی ہوں ۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک سے جو کچھ مال خریدنا ہوتا تھا اس کے لئے یورپ کو ہندوستان میں نقد روپیہ کی ضرورت پڑتی تھی یعنی انکی تجارت کی قوت خرید بس نقد رقم کے بقدر تھی جو انکے پاس ہندوستان میں موجود ہو ۔

اس رقم کی فراہمی کی صاف اور سادہ صورت تو یہ تھی کہ یورپ اپنا سونا چاندی ہندوستان بھیجتا لیکن اس زمانہ میں جو مذہب معاشی یورپ کے سیاستیں میں مقبول تھا وہ اسکی کسی طرح اجازت نہ دیتا تھا ۔ انگریزی تاجروں کو اس بارہ میں سب سے زیادہ دشواریاں تھیں چنانچہ ۱۶۱۸ء ہی میں لندن کے ساہوکاروں نے حکومت وقت کو عرضی دی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی برآمد کی وجہ سے چاندی بازاروں میں بہت کمیاب ہو گئی ہے ۔ سنہ ۱۶۲۰ء میں ایوان حکومت میں اس قدر تیز و تند مباحثہ اس مسئلہ پر ہوا کہ ہندوستان کیلئے جو جہاز کمپنی کے روانہ ہونے والے تھے انہیں اپنا سفر ملتوی کرنا پڑا ۔

فراہمی زر کی دوسری صورت یہ تھی کہ ہندوستانی ساہوکاروں سے قرض لیا جائے ۔ یہ صورت انگریز تاجروں نے اکثر اختیار کی اور اسی سے یہاں کے بنیوں اور ساہوکاروں سے انگریزوں کا وہ تعلق شروع ہوا جس کی وجہ سے یہ زر کا کاروبار کرنے والا طبقہ انتظام ملک میں پیش پیش ہو گیا ۔ بہرحال سودی قرض دے دیکر ان ہندوستانی ساہوکاروں نے کچھ دن خوب روپیہ کمایا ۔ یہ جو روپیہ دیتے اس پر شرح سود بہت زیادہ ہوتی تھی مثلاً سنہ ۱۶۲۵ء اور سنہ ۱۶۵۰ء کے درمیان سورت میں شرح سود کا اوسط ۱۲ فیصدی تھا ۔ سنہ ۱۶۵۹ء میں ۹ فیصدی کی شرح سے انگریزوں کو بہت کم سرمایہ مل سکتا تھا ۔ سنہ ۱۶۳۰ء و سنہ ۱۶۴۰ء کے درمیان مشرقی ساحل پر شرح سود ۲۴ اور ۳۶ فیصدی کے درمیان تھی ۔ بنگال میں اس زمانہ میں شرح سود تقریباً ۳۰ فیصدی تھی ۔ ان شرحوں پر روپیہ قرض لینے کا نقصان تاجر کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا ۔

ایک تیسری صورت یہ تھی کہ ہندوستانی تجارت میں سرمایہ لگایا جائے اور اسکا منافع اجناس کی شکل میں یورپ بھیجا جائے۔ انگریزی کمپنی کو سر ٹامس رو نے یہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ صرف اس بات سے بچنے کے لئے کہ یورپ سے سیم و زر باہر نہ بھیجنا پڑے۔ ایشیائی ممالک میں تجارتی تعلقات کا ایک جال بچھا دیا گیا۔ ہندوستان میں روئی کا جو مال خریدا جاتا تھا اسے سیام اور چین بھیجکر سیامی چمڑا اور چینی خام ریشم خریدا جاتا تھا اور اسے جاپان میں بیچکر وہاں سے چاندی حاصل کیجاتی تھی اور اس چاندی سے پھر ہندوستان میں چیزیں خریدی جاتی تھیں۔ ملک کی اندرونی تجارت میں جب اس طرح ان تاجروں کو دلچسپی بڑھتی گئی تو پھر وسائل آمد و رفت پر قبضہ اور دیگر مراعات سیاسی کیطرف بھی توجہ ہوئی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان فرنگی تجار کے ذہن میں یہ خیال بہت شروع ہی میں پیدا ہو چکا تھا کہ ملک کے ذرائع پیدائش دولت پر ایسا تسلط قائم کرلیں کہ اندرونی تجارت اور مالگذاری کی رقم سے اپنی تجارت کا پورا سرمایہ فراہم ہوسکے اور وطن سے سیم و زر کے منگوانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ (۱)

قوت خرید میں اضافہ کی اسی ضرورت کیساتھ ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے عروج کی داستان وابستہ ہے۔ اور بندوبست اراضی کے متعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کی ساری کارروائیاں اسی غرض سے ظہور پذیر ہوئیں۔

سب سے پہلا اہم واقعہ جس نے اس انگریزی شرکت تجار کو بنگال میں مسئلہ اراضی سے دوچار کیا وہ کلکتہ، سوتانتی اور گوبند پور کے تین موضعوں کا پٹہ تھا جو انہوں نے مغل قانون اراضی کے ماتحت حاصل کیا۔ اس پٹہ کے ذریعہ انہیں ان تینوں قصبوں کی زمینداری کے حقوق ملے تھے اور ان سے حکومت وقت وہی مالگذاری وصول کرتی تھی جو ان سے پہلے ان موضعوں کے دوسرے

---

(۱) ولندیزی گورنر کوئن نے ۱۶۲۳ء ہی میں اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ دیکھئے ۲۴۳
Calendar of State Papers, Colonial Series, East India 1516—163
مرتبہ E. Sainsbury. مطبوعہ لندن ۱۸۶۲ء

زمینداروں سے یعنی ایکہزار ایکسو چورانوے (١١٩٤) روپیہ۔ حق زمینداری حاصل کرنے کے لئے انگریزی کمپنی کو حکم ملا تھا کہ سابقہ زمینداروں کو ایکہزار روپیہ ادا کرے اور واقعاً کمپنی نے دو امن و سکون کی خاطر تیرہ سو ادا کئے۔ (١)

اس پٹہ کی رو سے کمپنی کو اختیار تھا کہ کسانوں سے لگان وصول کرے۔ بلیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ شرح لگان حکومت کی طرف سے معین تھی۔ چنانچہ جب ١٧٣٢ء میں کمپنی کے عہداروں نے اپنی کلکتہ کی زمینداری میں اضافہ لگان کی کوشش کی اور اس کی خبر پھیلی تو صاحب صوبہ کا ایک فرمان صادر ہوا کہ ایسا کرنا قانوناً ممنوع ہے اور صوبہ نے اس پروانہ میں صاف توضیح کردی کہ کمپنی ایک ایسی کارروائی کا ارادہ کررہی ہے جس کا خود صاحب صوبہ کو اختیار نہیں۔ اور اگر وہ اپنے اس ارادہ پر قائم رہی تو قوانین سلطنت کی رو سے انکی زمینداری ضبط کرلیجائیگی۔ (٢)

مذکورہ حقوق زمینداری حاصل ہونے کے کوئی ١٥ سال بعد فرخ سیر نے تین ہزار سالانہ کے پیشکش کے عوض انگریزوں کو حق آزادی تجارت عطا کیا، مذکورہ بالا تینوں قصبوں میں انکے حق زمینداری کی تجدید کی، انکے علاوہ ٣٨ اور قصبوں میں انکے لئے اسی قسم کے اختیارات منظور کئے، اور حکم دیا کہ چالیس بیگہ زمین یہ جہاں چاہیں کارخانہ بنانے کے لئے انہیں دیجائے۔ اگرچہ حاکم صوبہ مرشد قلی خاں کی مخالفت نے ان قصبوں میں حق زمینداری حاصل نہ ہونے دیا تاہم انگریز برابر گردونواح کی اراضیات کو اپنے اثر میں اس طرح لا رہے تھے کہ ہندوستانی زمینداروں سے زمینداری حقوق کرایہ پر حاصل کرتے جاتے تھے۔

انگریزی اثر کی ترقی کا ایک اہم واقعہ کلکتہ کی مالگذاری کی معافی ہے۔ ١٧٥٧ء میں جب واٹسن اور کلایو نے سراج الدولہ سے کلکتہ چھین لیا تو یہ نہیں کیا کہ بطور فاتح اس پر قابض رہیں بلکہ

---

(١) دیکھئے Wilson: "Old Fort William in Bengal" جلد اول صفحہ ٤٠ - ٣٩

(٢) دیکھئے J. Z. Holwell "Interesting Historical Events relative to the Provinces of Bengal" طبع ثانی لندن ١٧٦٦ء حصہ اول صفحہ

اپنا آدمی نئے حاکم میر جعفر کے سامنے درخواست پیش کی کہ انہیں معافی لگان کی سند عطا کر دیجائے۔ چنانچہ یہ سند دیدی گئی اور ۱۷۵۷ء میں جن ۲۴ قصبوں کا وعدہ ہوا تھا وہ بھی کمپنی کو مل گئے۔ کمپنی کا تسلط کوئی ۸۸۲ مربع میل پر ہوگیا اور اس رقبہ کو "۲۴ پرگنہ" کہتے ہیں۔ اس پورے علاقے پر کمپنی کو زمینداری کے حقوق حاصل تھے اور اس کے عوض صوبہ کے خزانہ میں ۲۲۲۹۵۸ روپیہ سالانہ بطور مالگذاری ادا کرنے ہوتے تھے لیکن یہ رقم بھی کچھ بہت دن خزانہ میں نہیں پہنچی، مرشد آباد کے سیٹھ اپنی ریشہ دوانیوں میں کامیاب ہوئے اور ان ۲۴ پرگنوں کی مالگذاری جولائی ۱۷۵۹ء میں کلایو کو خدمت شاہی (مغل شہنشاہی کی خدمت!!) کے صلہ میں بطور جاگیر التمغہ دیدی گئی۔ ۱۷۶۵ء میں اس جاگیر کی اور دس سال کیلئے توسیع ہوئی اور طے پایا کہ اس مدت کے بعد یہ جاگیر کمپنی کو ملجائے۔

میر جعفر کو ہٹا کر قاسم علیخاں کو حاکم صوبہ بنانے میں انگریزوں نے جو مدد دی اسکے صلہ میں بہت بڑا علاقہ بلا مطالبہ مالگذاری انہیں دیا گیا اور جب پھر قاسم علی کو ہٹا کر میر جعفر کو مسند پر بٹھایا تو ظاہر ہے کہ اس سند کی تجدید ہوئی۔ اور اس طرح بردوان، مدناپور، اور چٹاگام کے اضلاع انگریزی تسلط میں آگئے۔ بالآخر ۱۷۶۵ء میں شاہ دہلی نے اس معافی کی تصدیق کردی اور کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا دیوان بھی مقرر کیا۔ ہم سطور ذیل میں صرف ان علاقوں کا ذکر کرینگے جو بنگال میں حقوق دیوانی حاصل ہونے سے پہلے انگریزی اثر میں آچکے تھے اور ان کارروائیوں پر اجمالی نظر ڈالینگے جو ان علاقوں میں انتظام اور بندوبست اراضیات کے سلسلہ میں کمپنی نے اختیار کیں۔

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ جب حکومت زراعت سے صرف یہ تعلق رکھے کہ کاشتکار کی محنت کے ثمرات کا بڑی سے بڑا حصہ اس تک کسی طرح پہنچ جائے تو اسکا لازمی نتیجہ معیشت زرعی کی تباہی ہے۔ ہم اس وقت کمپنی کی جن کارروائیوں پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں انکا مقصد یہی ہے کہ کسی طرح مالگذاری بڑھے۔ لیکن کمپنی نے مالگذاری میں جو اضافے کئے معیشت زرعی کے لئے انکے ضرر رساں اور تباہکن اثر کا اندازہ اسوقت ممکن ہے جب یہ معلوم ہو کہ انگریزوں کے تسلط سے پہلے خود دیسی

حکومت قومی پیدائش دولت کی اس اہم شاخ زراعت پر برابر بیجا مطالبات کا بار بڑھا رہی تھی جیسا کہ ذیل کی تفصیل سے ظاہر ہوگا۔

بنگال کا پہلا بندوبست شاہ اکبر کے عہد میں (۱۵۸۲ء میں) ہوا۔ اس "اصل طومار جمع بادشاہی" کی رو سے بنگال کی مالگزاری ۱۰۶۹۳۱۵۲ روپیہ تھی۔

دوسرا بندوبست ۱۶۵۸ء میں شاہ شجاع کے اہتمام سے ہوا۔ اس "ترمیم شدہ جمع طوماری" کے مطابق کل مالگزاری ۱۳۱۱۵۹۰۷ روپیہ تھی۔

تیسرا بندوبست ۱۷۲۲ء میں مرشد قلی خاں نے کرایا اور اس "جمع کامل طوماری" کی رو سے مالگزاری ۱۴۲۸۸۱۸۶ روپیہ قرار پائی۔

اس کے بعد خود مرشد قلی خاں اور اس کے جانشینوں نے ابواب، کیفیت اور توفیر کے نام سے مالگزاری میں برابر اضافہ کیا۔ ۱۷۶۳ء تک مالگزاری میں مندرجہ ذیل حیرت خیز اضافہ ہوا۔

۱۔ "ابواب" سے جو زیادہ تر مرشد قلیخاں (۱۷۲۲ء تا ۱۷۲۹ء)
شجاع الدین خاں (۱۷۲۵ء تا ۱۷۳۹ء) اور
علی وردی خاں (۱۷۴۰ء تا ۱۷۵۶ء) نے لگائے .... ۴۲۲۳۴۶۷ روپیہ

۲۔ "کیفیت" سے جو زیادہ تر قاسم علیخاں نے (۱۷۶۲ء تا ۱۷۶۳ء) لگائی ۔ ۴۵۲۳۵۶۳ روپیہ

۳۔ "توفیر" کی مد میں جو زیادہ تر قاسم علیخاں نے لگائی ۔ ۳۱۶۲۳۵۸ روپیہ

میزان "اضافہ" ۱۱۹۰۹۳۸۸ روپیہ

ذیل کے جدول سے ظاہر ہوگا کہ مختلف اوقات میں مالگزاری میں فیصدی کس قدر اضافہ ہوا اور اس اضافہ کی تیز رفتار کا اندازہ ہو سکے گا۔

۱۵۸۲ء تا ۱۶۵۸ء (یعنی ۷۶ سال میں) ۱۵½ فیصدی اضافہ

۱۶۵۸ء تا ۱۷۲۲ء (یعنی ۶۴ سال میں) ۱۳½ فیصدی اضافہ

۱۷۲۲ء تا ۱۷۶۵ء (یعنی ۴۳ سال میں) ۲۹ فیصدی اضافہ (!)

۱۷۵۸ء تا ۱۷۶۵ء (یعنی ۷ سال میں) ۴۰ فیصدی اضافہ (!!)

اس زمانہ میں نہ طریق کاشت میں کوئی غیر معمولی تغیر ہوا تھا، نہ زراعت کے علم میں کوئی ایسا انقلابی انکشاف ہوا تھا کہ زمین کی پیداوار دوچند سہ چند ہو جاتی، نہ اجناس زرعی کی قیمت میں کوئی بڑی تبدیلی ہوئی تھی۔ اس لئے اس اضافہ کے معنی صرف یہ تھے کہ ایک حریص حکومت سٹہ بٹہ کرنے والے زمینداروں کی مدد سے ملک کی کم نصیب اور کم ہمت کسان آبادی کو پیسے ڈال رہی تھی۔

اس مصیبت اور تباہی کے عالم میں صوبہ کے ایک حصہ پر انگریزوں کا تسلط ہوتا ہے۔ برکات مغرب کی یہ حال قوم صورت حال میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کے بجائے اسے اور بھی بدتر کر دیتی ہے۔ یہ نئے "شاہ مدار" مرے کو مارتے ہیں"۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں ۲۴ پرگنوں کی خالص مالگذاری کے مندرجہ ذیل اعداد جو آپ اپنی تشریح کرتے ہیں۔

۱۷۶۳-۶۴ء میں ۴۸۶۳۵۲ روپیہ

۱۷۶۴-۶۵ء میں ۹۷۹۳۴۵ روپیہ

۱۷۶۵-۶۶ء میں ۱۱۱۶۳۹۵ روپیہ

چوبیس پرگنوں پر تسلط کے بعد کوئی ۱۶ مہینے تک تو کمپنی نے مالگذاری جمع کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں رکھا لیکن ۱۷۵۹ء میں اعلان کیا گیا کہ پرگنوں کی مالگذاری بذریعہ نیلام متعین ہوگی جو لوگ مالگذاری جمع کرنے کا کام کرنا چاہیں وہ اپنے شرائط "کمپنی بہادر" کو بھیجدیں جو سب سے زیادہ مالگذاری ادا کرنے کا ذمہ لے گا اراضیات اُسی کو تفویض کی جائینگی قدیم مالگذاری جمع کرنے والے جواب کم و بیش موروثی ہوگئے تھے اپنے حقوق نہایت خوشامدانہ اور ذلت آمیز طریقہ سے کمپنی کے روبرو پیش کرتے ہیں لیکن کمپنی طے کرتی

ہے کہ ان اراضیات سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی صورت یہی ہے کہ انہیں نیلام کیا جائے (۱)۔ چنانچہ ان پرگنوں کو ۱۵ قطعوں میں تقسیم کیا گیا اور سب سے اونچی بولی بولنے والے کے نام ۳ سال کے لئے انہیں بذریعہ نیلام بیچ دیا گیا۔ سرکاری بولی ۵۰۱۳۰۰ روپیہ تھی۔ خریداروں کے مقابلہ نے بولی کو ۶۵۷۰۰۰ تک بڑھایا۔ اور رشوہ کی وبا ایسی پھیلی کہ ۱۷۶۲ء میں بعض ساہوکاروں نے اسی زمین کے سال بھر کے اجارہ کے لئے دس لاکھ روپے پیش کئے! اور راجہ نوب کشن اور رگھو شال خاندان کے ایک رکن نے سالانہ ۱۳ لاکھ دینے کی تجویز کی!! صدر کونسل نے ان تجاویز کو اس بنا پر مسترد فرمایا کہ "زمینوں کی قیمت اس سے زیادہ ہے"، لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ تجویز کو نامنظور فرماتے ہوئے "غریب کسانوں کے اغراض" کی پامالی کا اندیشہ بھی ظاہر کیا گیا ہے! (۲)۔

چٹگام، بردوان اور مدنا پور میں بھی موجودہ حقوق کی طرف سے بے پروائی اور اضافۂ مالگذاری کے لئے ہر ممکن تدبیر کی یہی کیفیت تھی۔ چٹگام کے ضلع کی مالگذاری ۱۷۱۳ء میں ۲۲۴۸٦۸ روپیہ تھی۔ ۴۷ سال میں یہ چارچند سے زیادہ ہو چکی تھی اور ۱۷٦۰ء میں رقم مالگذاری ۳۳۱۵۲۹ تک پہنچ چکی تھی لیکن چونکہ یہ رقم ضلع کی بساط سے زیادہ تھی اس لئے صرف کاغذ پر درج تھی اور کبھی دو لاکھ سے زیادہ مالگذاری واقعاً وصول نہیں ہوئی لیکن کلکتہ کی انگریزی کونسل نے ۲۴ جون ۱۷٦۱ء کے حکم میں کیا خوب استدلال کیا ہے کہ چونکہ اس ضلع کی مالگذاری میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے اس لئے اور اضافہ ہونا چاہئے، ہاں اس کے ساتھ ہی اطمینان قلب اور تسکین ضمیر کا یہ نسخہ بھی شامل

---

(۱) دیکھئے Longs Selections from the Unpublished. Reccrds of the Government of India. جلد اول صفحہ ۲۴۲-۲۴۳

(۲) دیکھئے ایضاً انتخاب ۹۱۲

ہے کہ "رعایا کی فلاح و خوشنودی کا ضرور خیال رکھا جائے"۔ اس رعایا پروری کی صورت یہ تھی کہ کمپنی نے پہلے سال طمع کی بدحواسی میں سوا سات لاکھ سے زیادہ رقم وصول کی اور اگرچہ یہ رقم بعد کو کسی ڈھنگ سے وصول نہ ہو سکی تاہم ۱۷۷۰ء تک ضلع کی مالگذاری کا اوسط سالانہ چار لاکھ سے زیادہ ہی رہا (۱)۔

مدناپور میں بھی یہی حال ہے۔ ضلع کے ملنے کے بعد ہی "کورٹ آف ڈائرکٹرس" کو لکھا جاتا ہے کہ مالگذاری کی رقم سے کمپنی کے لئے اشیاء برآمد کی خریداری کے لئے وافر رقم مل جائیگی اور بلا سود کے کارخانہ کا خرچ بھی نکل آئے گا (۲)۔ یہاں کے زمیندار چونکہ عرصہ سے مالگذاری ادا کرنے کا کام کر رہے ہیں اور رعایا سے ذاتی تعلقات پیدا کر چکے ہیں اس لئے اضافہ مالگذاری کی کارروائی میں ان سے خاطر خواہ کام نہیں نکل سکتا، لہذا قرار پاتا ہے کہ "کمپنی کے اغراض کی بہترین حفاظت اس طرح ممکن ہے کہ زمینداروں کے اختیار کو بالکل مٹا دیا جائے اور ایسے عہدہ دار مقرر کئے جائیں جو براہ راست رعیت سے لگان وصول کریں" (۳) ضلع کا انگریز حاکم جو مقامی حالات سے بہتر واقف ہے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ زمینداروں کے موروثی حق کی حمایت کرتا ہے۔ لیکن حکام بالا دست اسپر ذرا کان نہیں دھرتے۔ ضلع میں زمینداروں کو ہٹا کر وصولیابی مالگذاری کا کام "تحصیلداروں" کے سپرد کیا جاتا ہے۔ جس انگریز حاکم نے زمینداروں کی حمایت کی تھی اسی کو حکم ملتا ہے کہ انہیں بالکل فنا کر دے اور وہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اور سال ہی بھر بعد اپنے ایک ماتحت کو حکم دیتا ہے کہ زمینداروں کو انکے علاقوں سے نکال باہر کرو۔ ان کے ذاتی مال اور ملک کو اور انکے ساتھیوں کے

---

(۱) دیکھئے **Ferminger: Introduction to the Fifth Report CXXII.**

(۲) دیکھئے **CXXIV** ایضاً

(۳) ملاحظہ ہو **Vansittart.** اور اسکی کونسل کا مراسلہ مورخہ ۶ نومبر ۱۷٦۴ء

مال کو لٹا دو . . . . انکے قلعوں اور پناہ کی جگہوں کو مسمار کرڈالو" سیرت انسانی حالات گردو پیش سے کس طرح تطابق پیدا کرلیتی ہے! ان ھدایات پر عمل بھی ہوتا ہے۔ اور جب کوئی دوسرا شخص ان علاقوں کی مالگزاری کی ذمہ داری نہیں لیتا تو حکم ملتا ہے کہ انہیں تباہ و برباد کرڈالو، جلا ڈالو، تاکہ نئی رعایا کی آنکھیں ہوجائیں۔ اور یہ سب کچھ کیوں؟ اس لئے کہ ضلع کی مالگزاری کی رقم ۸ اور ۹ گنی ہوجائے ۔ ۶۳-۱۷۶۲ء میں وصول شدہ مالگزاری سوا لاکھ سے کم تھی ۔ ۶۶-۱۷۶۵ء میں دس لاکھ سے اوپر!

تیسرے ضلع یعنی بردوان میں بھی صورت حال کچھ مختلف نہیں رہی۔ مالگزاری کے بڑھانے کے لئے یہاں بھی نیلام کا مضر طریقہ رائج کیا گیا۔ ۱۷۶۱ء کی جمع بندی میں نیلام کرکے ایک ہی سال کے اندر کوئی ۲ لاکھ کا اضافہ کیا گیا۔ دوسرے سال نیلام میں بولیاں اور بھی بڑھا کر بولی گئیں اور جب یہ نئے سٹہ والے واجب الادا رقم کسی طرح نہ دے سکے تو انکی شخصی املاک منقولہ وغیر منقولہ کو فروخت کرکے یہ کمی پوری کی گئی(۱) نیلام میں بولیاں بولنے والے زیادہ تر دور دراز اضلاع کے سٹہ باز، روپیہ پیسہ کا لین دین کرنے والے، حکام صیغہ مالگزاری، محاسب، وغیرہ ہوتے تھے ۔ پرانے زمیندار جو پشتہا پشت سے اس عہدہ کے فرائض ادا کررہے تھے اور علاقہ مقبوضہ کو اپنی جائداد سمجھنے لگے تھے وہ کیسے یہ گوارا کرلیتے کہ نیلام میں ایک اجنبی شخص بڑھی ہوئی بولی بولکر انکا علاقہ ہاتھ سے چھین لے، یہ لامحالہ اور بھی چڑھی ہوئی بولی بولتے تھے ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ صرف بولی کے بڑھانے سے زمین کی زرخیزی تو بڑھ جاتی نہیں اور کسانوں کو نوچنے کھسوٹنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔ پھر اپنے دیرینہ تعلقات کی بناپر یہ زمیندار رعایا سے ایسی بیدردی کا سلوک بھی مشکل ہی سے کرسکتے تھے ۔ نتیجہ اس سب کا یہ ہوتا تھا کہ وقت پر مالگزاری ادا نہ کرسکتے تھے ۔ چنانچہ ان غریبوں کے حقوق زمینداری ضبط کرلئے جاتے

---

(۱) دیکھئے . . . Verlest's View. ضمیمہ ۱۳۱

اور تھا یا مالگذاری انکے مال کو فروخت کرکے وصول کیجاتی لیکن زمیندار اور کسان کے تعلقات کو جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جب حکومت صرف اس بات پر نظر رکھے کہ زمینداروں سے جس قدر ہوسکے وصول کرے تو جبتک زمیندار پر یہ نوبت پہنچے کہ اسکی جائداد اور مال فروخت ہو رعایا پر کیا کچھ قیامت اس زمیندار کے ہاتھ سے نہ گذر چکتی ہوگی۔

مالگذاری کے اس نیلام نے کسانوں اور پرانے زمینداروں دونوں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ معیشت زرعی کے حاملوں کا یہ پرانا طبقہ جب یوں تباہ کیا جا رہا تھا تو ساتھ ہی کمپنی کے کارکن اپنے خانگی بنیوں، محاسبوں، وکیلوں، اور سٹہ کرنیوالوں میں سے ایک اور "طبقہ امراء" کی تعمیر میں مشغول تھے! ہم اس وقت اس دردانگیز داستان کو یہیں ختم کرتے ہیں اور آئندہ کسی موقع پر ان کارروائیوں کا مختصر سا حال ہدیہ ناظرین کرینگے جو حقوق دیوانی کے ملجانے کے بعد کمپنی نے زمین کے متعلق کیں۔ اور بنگال کے بندوبست دوامی سے عام مورخین کی رائے میں لارڈ کارنوالس نے ہندوستان میں انگریزی نمونہ پر ایک "طبقہ امراء" کی جو بنیاد ڈالی اسکی حقیقت کو ظاہر کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔

بہ طرزِ اکبر

سکھ کو شیوۂ سرزوری و سرہنگی کو — لالہ جی چاہتے ہیں کہ مسلمان نہیں
ہے دعا حق سے مسلمان بھی بدل جائیں اب — ان کو توفیق عطا ہو کہ یہ انسان نہیں

جو پہیلی نہ کوئی بوجھ سکا — لارڈ ارون نے وہ اب بوجھی ہے
«بھس» کو اور «چنگی» کو دیا الزام — «بی جمالو» کو نئی سوجھی ہے

کونسل میں جا کے نقلِ محفل نہ بنا — کالج کے پروفیسر کی ہے یہ تابی
کیوں قصرِ شرف میں ہو نقب سے داخل — ہو ہاتھ میں جس کے علم و فن کی چابی
کوئی اس سے یہ بات جا کر کہہ دے — اے عاشقِ ووٹ واسطے فدلے لابی
بھائی اپنے سلیم شاہی کو نہ چھوڑ — دیتی نہیں تجھ کو زیب یہ گرگابی
کونسل کی فضا سکون کی دشمن ہے — بڑھ جائیگی تیری بیکلی بیتابی
کس طرح سے شیرمال ہوگی تجھے ہضم — جب بارِ شکم ترے لئے ہے آبی
بحثوں میں بحث کی زور باندھیں گے وہ سب — جتنے امراض تجھ کو ہیں اعصابی
تو یوں کونسل کے ہال میں تڑپے گا — جیسے صحرائے شور میں مرغابی
غافل یہ راستہ ہے ترکستان کا — ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی

عابد

اسلام اور موجودہ خیالات کیساتھ تصوف اسلامی کا تعلق

از ڈاکٹر نکلسن (کیمبرج)

محترمی ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب پروفیسر فارسی جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر نکلسن کا یہ خطبہ اردو میں ترجمہ کرنیکے لئے ایک انگریزی نوٹ کے ساتھ عنایت کیا تھا جسکا ترجمہ یہ ہے۔

"ہندوستانیوں سے ڈاکٹر نکلسن کا تعارف کرانیکی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انکا نام علم تصوف کی ایک فاضل مبصر کی حیثیت سے مشہور ہوگیا ہے۔ سر ڈاکٹر اقبال اور انہیں وہی تعلق ہے جو عمر خیام اور فٹز جیرلڈ میں ہے۔ ڈاکٹر نکلسن ہمیشہ ڈاکٹر اقبال کے مداح رہے ہیں لیکن انکا وہ ریویو جو "پیام مشرق" پر "اسلامکا" کے پہلے پرچہ میں شائع ہوا ہے ان کو ایک کامل نقاد بھی ظاہر کرتا ہے۔

یہ مضمون وہ خطبہ ہے جو ۱۹۲۳ عیسوی میں کیمبرج کی "مسلم ایسوسی ایشن" میں پڑھا گیا تھا۔ یہ تصوف کی ان جھلکوں میں سے ایک ہے جنہوں نے ڈاکٹر نکلسن کی اعلیٰ ذہنیت کو ہمیشہ روشن رکھا ہے۔ اسمیں انہوں نے اسلامی تصوف کا ایک طرف تو اسلام اور دوسری طرف موجودہ خیالات کے ساتھ تعلق ظاہر کیا ہے۔ اس مطالعہ سے واضح ہوجائیگا کہ ڈاکٹر نکلسن کا ذہن کسطرح تصوف کی بے پایاں گہرائیوں میں کام کرتا ہے۔"

ڈاکٹر نکلسن کے اصل مضمون کا ترجمہ پیش کرنے سے قبل میں ڈاکٹر نظام الدین صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس مضمون کے تصوفی الفاظ اور اصطلاحات وغیرہ کی اصلاح و درستی میں میری کافی مدد فرمائی ہے۔

سید محی الدین قادری زور
(متعلم ایم اے جامعہ عثمانیہ)

میں خوش ہوں کہ آج مجھے آپ کو ایک ایسے موضوع پر مخاطب کرنیکا موقع ملا ہے جس میں

تیس سال سے زیادہ مدت سے میں کام کر رہا ہوں آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک وسیع اور محفوظ موضوع ہے
اور مجھے اس موقع پر اپنے ملاحظات کو اس کے چند مخصوص پہلوؤں پر محدود کرنا چاہئے۔ لہذا میں چند
الفاظ اس بارے میں کہوں گا کہ اسلامی تصوف کا تعلق ایک طرف تو اسلام کے ساتھ اور دوسری
طرف موجودہ خیالات کیسا تھ کس قسم کا ہے۔ اس کے ضمن میں ایک تیسرا رشتہ بھی پیدا ہو جاتا ہے یعنی اسلام
اور موجودہ خیالات کا تعلق لیکن مجھے چاہئے کہ میں اسکو فی الحال بحث سے خارج کر دوں۔ جس طرح میرا
خیال ہے کہ اکثر دیرپا، اصلی اور ذاتی مذہبی، تجربہ ایک حد تصوفی ہوتا ہے تو بغیر اسلامی تصوف کا
گہرا مطالعہ کئے یہ ناممکن ہے کہ اسکو ایک روحانی قوت سمجھتے ہیں اسکے ساتھ کافی انصاف کیا جائے۔ یا
مسلمانوں کے گہرے خیالات اور اعلیٰ سطح نظر کو سمجھ سکیں یہ نہایت تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اہم
اور اثر کے اعتبار سے ایسے فائدہ مند عنصر کیطرف اواخر گذشتہ صدی تک یورپ کے اسلام پر لکھنے
والے مصنفوں نے توجہ نہیں کی اور اس سے زیادہ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ ایک اولوالعزم مسلمان سید
امیر علی نے بھی "اسپرٹ آف اسلام" کے پہلے ایڈیشن میں انہی کی بیجا تقلید کی۔ دوسرے ایڈیشن
میں جو گذشتہ سال شائع ہوا ہے۔ مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اسلام کی تصوفی اور دینی اسپرٹ پر ایک
چھوٹی سی فصل پائی جاتی ہے اگرچہ وہ بھی کافی طور پر ظاہر نہیں کرتی کہ ابراہیم ابن ادہم اور بایزید سے
لیکر غزالی اور جلال الدین رومی تک صوفی سالکین کا اسلام کسقدر زیادہ مرہون منت ہے۔

یہ سمجھا گیا ہے کہ تصوف کے اہم تخیلات غیر اسلامی سرچشموں مثلاً عیسائی رہبانیت، یونانی مذہب و
حکمت یا ہندوستانی معتقدات وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔ اسمیں کچھ حقیقت ہے لیکن کسی طرح حقیقت تام
نہیں میری رائے میں تصوف نے اگر اثنائے ارتقا میں متفرق تحریکات سے بھی جن سے اسکو سابقہ پڑا
بہت کچھ حاصل کیا لیکن اصلی اور بنیادی طور پر وہ اسلام ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ابتدائی صوفیوں کے
پاس سوائے قرآن کے کوئی اور کتاب نہ تھی۔ انہوں نے قرآن کا نہایت غور و خوض سے مطالعہ کیا،
اس کو زبانی یاد کیا۔ رات دن اسکا دور جاری رکھا، اور ہر سورت، ہر آیت اور تقریباً کتاب کے ہر
لفظ میں جو معنی پوشیدہ ہیں انپر غور کیا۔ اگرچہ قرآن پوری طرح سے ایک صوفیانہ کتاب نہیں کہلائی جاسکتی

تاہم کوئی بھی جو اسکو بنظر امعان مطالعہ کرنا چاہتا ہے ان مطالبات کو حاصل کرنے میں ناکام نہ رہے گا جو انسان کی ساخت و فطرت طور پر صوفیانہ توضیحات کیطرف رجوع ہوتے ہیں: "ہم نے اسکو پیدا کیا، ہم جانتے ہیں جو کچھ اسکی روح اس سے کہتی ہے، اور ہم اسکی رگ گردن سے بھی قریب ہیں" "جس طرف تو پلٹے اسطرف خدا کا چہرہ ہے" "وہ زمین پر ہر ایک فنا ہونے والا ہے لیکن تیرے خدا کا شاندار اور پر عظمت چہرہ ہمیشہ باقی رہیگا" اس قسم کے الفاظ واجب الوجود کا فوری خیال پیدا کرتے ہیں اور صوفی کو یقین دلاتے ہیں کہ برخلاف عقیدہ کے باوجود خدا جس کی وہ پرستش کرتا ہے نہ دور ہے اور نہ وقت سے حاصل ہونے والا ہے۔ پرانے صوفیوں کے اکثر عقائد و عملیات اسی طرح قرآن ہی پر مبنی ہیں۔ انہوں نے مروجہ دنیا داری کے سخت رد عمل میں زاہدانہ زندگی بسر کی، اور خدا پر کامل بھروسہ رکھا۔ انہوں نے خدا پرستی کو ایک مجوزہ فریضہ ہی نہ سمجھا بلکہ رفتہ رفتہ اسکو ذاتی ضرورت کی تسکین خیال کرنے لگے اور اسی نقطے سے زہد، تصوف میں اور خوف خدا عشق خدا اور اس کے ساتھ اتحاد کی خواہش میں منتقل ہوگیا۔ اس موقع پر ہمیں اسلام اور تصوف کی علیحدگی کی ظاہری علامتیں بھی نظر آجاتی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بصرہ کی مقدس صوفی رابعہؒ نے جب ان سے سوال کیا گیا تھا کہ وہ پیغمبر سے محبت کرتی ہیں؟ تو کہا تھا کہ "یا رسول اللہ! آپ سے کون محبت نہیں رکھتا؟ لیکن خدا کی محبت میرے دل میں اسقدر بھر گئی ہے کہ اب اسمیں کسی اور کی محبت یا نفرت کیلئے کوئی اور جگہ نہیں" محبت خدا کیلئے جیسا کہ صوفیوں کا عقیدہ ہے۔ محبت اور خودی سے سخت قطع تعلق کی ضرورت ہے۔ اور یہ اسلام کیلئے ایک نیا عقیدہ تھا۔ قرآن بہت کم خدا کو محبت کا مدار بتاتا ہے۔ اگرچہ اسمیں اکثر مذکور ہے کہ خدا ان ایمانداروں کے ساتھ محبت کرتا ہے جو صابر، عاجز اور پاک وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ در اصل صوفی ہی ہیں جنہوں نے اسلام کو محبت کا مذہب بنا دیا۔ وہ تلقین کرتے ہیں کہ محبت علم کی طرح خدا کے فضل سے حاصل ہوتی ہے۔ خدا کی محبت سبقت کرتی ہے۔ وہ لوگ جنہیں اس نے منتخب کرلیا ہے اُسے اپنے دلوں میں بھڑکتی ہوئی پاتے ہیں یہ شعلہ مراقبہ، عبادت اور شدت طلب سے اور بھڑکتا جاتا ہے۔ خدا کے سوا ہر دوسری چیز کی خواہش اور محبت کو دل سے بالکل دور کر دیتا ہے۔ تاکہ خدا کی محبت اسمیں کامل طور پر جلوہ گر ہو سکے۔ اور چونکہ خدا ہر جگہ موجود ہے اس لئے

صوفیین اپنی محبت اور ہمدردی کو نہ صرف بنی نوع انسان بلکہ تمام جانداروں تک پھیلا دیتے ہیں اس کی ایک انتہائی مثال ان بزرگ کی ہے جنہوں نے کئی سو میل تک ان چیونٹیوں کو ان کے مقام پر واپس پہنچانے کے لئے سفر کیا تھا جو غلطی سے منتقل کر دی گئی تھیں۔

یہ محبت کا عقیدہ اور معرفت خدا جب محویت کے درجہ کو پہنچ جائیں تو خطرناک ہیں، کیوں کہ وہ محدود شریعت کو اکثر چھوڑنیکا ایک آسان ترین عذر ہو سکتے ہیں۔ نیز اس لئے کہ اگرچہ عبادت و محبت سے ہدایت لازمی نہیں ہے لیکن یقیناً وہ اسکی طرف رہبری کرتے ہیں تیسری اور چوتھی ہجری صدیوں میں یہ دونوں تحریکیں آزادی سے روبہ ترقی تھیں۔ اور تصوف اور اسلام کا درمیانی فاصلہ زیادہ تر وسیع ہوتا گیا۔ صوفیوں کی طرف سے ان متضاد رجحانوں کو متحد کرنے کیلئے قشیری نیشاپوری نے ایک قابل ذکر کام کیا اس نے پانچویں صدی کے وسط میں اپنا مشہور رسالہ لکھا جسمیں یہ ثابت کیا ہے یا کم از کم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ماضی کے صوفیائے کرام نے ہمیشہ اپنے درس وتدریس کو قرآن شریف اور سنت پر مبنی رکھا ہے لیکن وہ شخص جس نے نہ صرف تصوف کو اسلام میں ایک مستقل اور دائمی رتبہ عنایت کیا بلکہ تصوف کی اسپرٹ میں جو کچھ خوبیاں تھیں ان سے اسلام کی قوت کو ابھار کر کے اسمیں اضافہ کیا غزالی تھے قبل اس کے کہ وہ ان صوفیانہ تجربات کو حاصل کرتے جو انکی زندگی کے تمام اصولوں میں انکے ساتھ رہے۔ غزالی نے اسلامی فلسفہ و دینیات کے تمام شعبوں میں کمال حاصل کر لیا تھا چنانچہ وہ بغداد کے (جامعہ) میں دینیات کے پروفیسر تھے لہذا وہ اس کام کیلئے کافی طور پر موزوں تھے جس کو انہوں نے کیا۔ انہوں نے نہ صرف صوفیوں بلکہ عام مسلمانوں کیلئے لکھا اور ایک ایسا تنقیدی اور عالمانہ پیرایہ اختیار کیا جو ہر اوسط درجہ کی ذہنیت اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انکی مصنفات صوفیانہ مسائل سے پُر ہیں۔ غزالی کو صوفیاء اپنے (حلقے) میں شامل نہیں کرتے۔ اسی لئے ان صوفیائے کرام نے جو غزالی کے بعد ہوئے ہیں بہت کم انکا ذکر کیا ہے تاہم غزالی نے وہ کام کیا جو تمام صوفی نہیں کر سکتے اور شاید انہی کے زمانہ سے اسلام عیسائیت سے زیادہ صوفیانہ مذہب ہو گیا ہے۔ وہ صوفیوں کے اصولی عقیدہ کو مانتے ہیں کہ انسانی روح خدا سے متصل ہوتی ہے اور خدا انہی کو اپنا جلوہ دکھاتا ہے جنکی روحیں پاک ہو گئی ہوں۔ انکے خیال میں مذہب

ظاہری حرکات عبادات یا چند معینہ عقائد پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ ایمان شخصی اور تجربہ پر تاہم وہ خود کو عقیدہ بدرجۂ کی نقل سے بچانے اور اسناد و روایات کا کامل طور پر لحاظ رکھنے میں ہمیشہ احتیاط کرتے ہیں۔
انہوں نے عہد طفلی میں خود سے یہ سوال کیا تھا کہ حقیقت کیا ہے؟ اور جو جواب انہیں ایک طویلانہ سکانفہ میں حاصل ہوا وہ یہ تھا، وحی پیغمبر پر نازل ہوئی،، انکا عقیدہ تھا کہ تمام مذہبی علم الہام سے نازل ہوتا ہے۔ بنی نوع انسان کے مستند اساتذہ انبیا اور اولیا ہی ہیں ذہن صلوات یا تو مفروضی ہوتے ہیں یا نقلی اور یا اس دنیا کی اشیا سے متعلق ہوتے ہیں یا دوسری دنیا کی۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ عقلی علم اور نقلی علم ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے اور عقلمند وہی آدمی ہے جو دونو کو متحد کر دیتا ہے۔ تاہم یہ سچ ہے کہ عقلی اور نقلی یعنی دنیادی اور عقبادی دو قسم کے علوم حقیقتاً متضاد ہیں۔ وہ شخص جو ایک کیلئے وقف ہو جاتا ہے بالعموم دوسرے سے محروم رہتا ہے۔ قوت عقل دونو پر مساویانہ حاوی ہو سکتی ہے۔ صرف انبیا، تمام علم پر حاوی ہو سکتے ہیں اور علم کی چابی کا نائتیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اکے قبضہ میں ہیں جو ہر شعبہ میں انسان کے رہبر اور معلم ہیں اس کے تم سمجھ لوگے کہ غزالی نے دینی ارتقائے اسلام کے لحاظ سے معلومات کو اس حد پر چھوڑا جہاں کہ انہوں نے پایا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنی قوت فہم سے کام لیا لیکن وہ معقولی نہ تھے۔ انہوں نے اشعری کی قدیم دینیات کیطرف توجہ کی اور اسمیں از سر نو جان ڈالدی۔ لیکن انکی ذات ایک غیر معمولی قوت کردار تھی جس نے انکے مذہبی جوش اور نفسیاتی تجربہ کی تاور طاقت سے متحد ہو کر ہر مشکل کو رفع کیا اور اسلام کو دوبارہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ ہر شخص کیلئے جس کا ضمیر اور قلب انکی صدا پر لبیک کہنے کیلئے تیار تھا ایک جاندار مذہب بنا دیا۔ غزالی کا تصوف زاہدانہ، عابدانہ اور اخلاقی قسم کا تھا جو خاص طور پر تزکیہ نفس اور اس کے کمال سے متعلق تھا۔ وہ ان جرات آمیز فلسفیانہ تخیلات میں کبھی مشغول نہیں ہوتے جو ابن عربی کی تصنیفات میں نظر آتے ہیں انکے مباحث کے ڈھانچے یقیناً قرون وسطی سے متعلق ہیں اور اسکا بہت کچھ حصہ اب متروک ہو چکا ہے لیکن انکا کام ایسا نہیں ہے کہ پرانا ہو جائے۔ اسکے برخلاف ابھی ابھی یورپ کے مطالعین مذہب نے اس کی خاص طور پر توجہ کی ہے یہ تمام اور اصل اس پیرایہ کی اپیل کے باعث ہی جس کو غزالی مذہبی مباحث پر گفتگو کرتے وقت استعمال کرتے ہیں

اور بالخصوص اس لئے بھی کہ ان مسائل کے ساتھ اسکا برتاؤ نفسیات پر منحصر ہوتا ہے اور انکا آغاز فطرت انسانی کے ابتدائی مراحل سے ہوتا ہے۔ یہاں قرون وسطیٰ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ زمانہ موجودہ سے۔

تصوف نے اسلام میں جسقدر اضافے کئے انکا اظہار بدقت چند الفاظ میں کیا جاسکتا ہے۔ یہیں سمجھا ہو بہرحال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صوفیوں نے اس امر کے اصرار سے بڑی خدمت کی کہ خدا کے ساتھ "بالراست ذاتی تعلق" مذہب کی اصلی روح ہے۔ اور یہ کہ اس آگاہی کے بغیر تمام مذاہب اور عقیدے بے کار ہیں۔ نیز عبادت ظاہری صرف اس حیثیت سے مفید ہے کہ وہ تمام جو کچھ باطن کو محسوس ہوتا ہے اور باطن جبکا تجربہ کرتا ہے اسکا مظہر ہے۔ صفائی قلب کیلئے انہوں نے جو کوشش کی اس نے انہیں اسلام کے اخلاقی معتقدات اور تخیلات کو گہرا کرنے اور ان میں روحانیت پیدا کرنے کے قابل بنا دیا۔ اس طرح جو قابل تعریف نتیجے انہوں نے حاصل کئے وہ اس شخص پر ظاہر ہوں گے جو "احیاء غزالی" پڑھے۔ صوفیوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک برادری ہے۔ انکے پاس سوائے ان فرائض کے جو مسلمانوں میں مشترک ہیں اصول یا عمل کا کوئی معین اور یکساں طریقہ نہیں ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ خدا تک پہنچنے کے اتنے ہی راستے ہیں جتنی روحیں ہیں۔ انکی بہترین ہستیوں نے اپنے مذہبی فرائض کو نہایت وفاداری کے ساتھ بلکہ احکام کے حدود سے زیادہ بھی انجام دیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس عقیدہ پر اپنی روحانی آزادی کو بھی برقرار رکھا ہے کہ حقیقت فرقہ جاتی تعصبات سے کہیں دور واقع ہوئی ہے۔ اور نیز یہ کہ عقائد اور طریقہ عبادت پر جھگڑنے سے خدا نہیں ملتا۔ ازمنہ متوسط میں تحمل عیسائیوں کی ایک نادر الوجود نیکی تھی اور اگر وہ مسلمانوں میں کم نادر (عام) تھی تو اسکی بڑی وجہ صوفیت کا اثر تھا۔

تصوف تمام ترقی یافتہ مذاہب کا اس قدر جاندار عنصر ہے کہ میرے خیال میں اسکو ہمیشہ اسلام میں ایک اہم حیثیت حاصل رہیگی۔ لیکن کیا وہ ہمیشہ دنیا کے کاموں سے علیحدہ ہو کر خاموشی کے ساتھ اسی طرح مختص رہے گا جیسے کہ اب ہے؟ کیا منظم صوفیانہ زندگی جس کے جامع مظاہر درویشوں کے حلقے ہیں اسلام کا ایک مستقل عنصر بنی رہے گی۔ کیا مسلمان آخر کار زمانہ خیال کے ساتھ متفق ہو جائینگے کہ تصوف ایک ایسا عنصر ہے جو تمام حقیقی مذاہب میں داخل ہے۔ جس سے ہر ایک شخص کا دنیا کیطرف ایک

رجحان قائم ہوسکتا ہے یا یہ کہ خدا ایک ایسا طریقہ زندگی ہے جو بقول سید امیر علی "اجتماع انسانی کی بنیاد ہلا کو کھوکھلی کر دیتا ہے اور قوائے انسان کو معطل کر دیتا ہے"۔ یہ دراصل صوفیوں پر بحیثیت مجموعی صادق آتا ہے جنکا افراد پر ہر زمانہ اور ہر ملک میں بعض غیر معمولی فطرتیں ہوتی ہیں جو خود کو غیر ارادی طور پر خدا کے سپرد کر دیتے اور اسی کیلئے زندہ رہنے کی طرف بڑھتی ہوئی محسوس کرتی ہیں۔ انہی میں نوع انسان کے بڑے بڑے اساتذہ یعنی انبیا اور اولیا ہوتے ہیں لیکن ایسے خدا میں غرق ہو جانیوالے بندے مقابلتاً کم ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے تصوف کو ایک پیشے کے طور پر اختیار کیا ہے یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی اسمیں شبہ ہے کہ وہ اپنے وقت کا بہترین استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ برادریاں اپنے غیر متعلقہ افراد کے ساتھ ملکر اسلام کی صرف ایک مذہبی تنظیم میں متشکل ہوتی ہیں اس لئے وہ کئی طریقوں سے فائدہ مند اثرات ڈالتی ہیں۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں موجودہ ضروریات سے قریبی تعلق پیدا کرنے کے بعض ذریعے معلوم کئے جاسکیں گے۔

میں نے آپ کو بہت دیر تک ٹھہرائے رکھا لیکن شاید آپ مجھکو اجازت دیں تاکہ میں اسلامی تصوف کے اسلام اور عیسائیت کی درمیانی کڑی ہونیکی اہمیت کے متعلق ایک، ایک دو لفظوں کا اضافہ کروں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ موجودہ خیالات سے یعنی مغربی عیسائیت کے خیالات اسلامی تصوف کیطرف بہ نسبت اسکی فقہ اور شرعی مسائل کے بہت زیادہ ہمدردی کیساتھ راغب ہیں موخر الذکر دراصل قرون وسطی کی دماغی پیداوار ہیں اور یورپ کیلئے یہ زیادہ تر تاریخی دلچسپی رکھتے ہیں برخلاف اس کے تصوف نہ صرف قرون وسطی کے طریقہ خیال سے جو اب تک موجودہ عیسائیت میں باقی ہے بلکہ مذہبی تجربوں کی ان ذاتی شکلوں سے بھی جن سے عیسائی تصوف کا ہر طالب علم روشناس ہوتا ہے ہموار شباہتیں رکھتا ہے۔ مثلاً صوفی شہید حلاج کا عقیدہ اس خیال پر مبنی ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی ہی صورت پر پیدا کیا ہے۔ یہ وہ بیان ہے جو انجیل میں پایا جاتا ہے۔ خدائی روح اور انسان کے اتحاد کا ذکر کرتے وقت حلاج لاہوت اور ناسوت کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو شامی عیسائیت میں

(حضرت) عیسیٰ کی زبان اور انسانی فطرتوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ عیسائی عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں مسلمانوں اور صوفیوں دونوں میں ہمیشہ سے رد کیا گیا ہے لیکن بعض صوفیوں نے محمدی عقیدہ تثلیث کے مقرر کرنیکی بھی کوشش کی ہے۔ ابن العربی کہتے ہیں کہ خدا کے اصلی نام تین ہیں۔ اللہ، رحمٰن رب اور دوسرے تمام انکے ماتحت ہیں۔ اور جیلی کا خیال ہے کہ خدا کی ذات تثلیث یعنی اصل الاصول خالق اور مخلوق پر منقسم ہے یہ نظریہ ایک نہایت اہم نتیجہ پیش کرتا ہے یعنی یہ کہ ذات باری ایک خالص اور متحد الاصل انفرادیت نہیں ہے۔ بلکہ خود اسمیں تفریق کا ایک اصول موجود ہے۔ عیسائیت خدا کی شخصیت میں تفریق پیش کرتی ہے اور جیلی کا خیال ہے کہ یہ تفریق خدا کی ذات میں ہے یعنی خدا کے متفرق درجے یا شکلیں ہیں۔ انکا عقیدہ اسلام اور عیسائیت کے عقائد مسلمہ کا ایک درمیانی راستہ ہے ایک دوسرا مقام جہاں تصوف اور عیسائیت پہلو بہ پہلو ہیں وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور (حضرت) عیسیٰ کی شخصیتوں کا تخیل ہے۔ آنحضرت کے متعلق صوفیوں کا نقطۂ نظر جو ایک حد تک قرون متوسط کے تمام مسلمانوں کے عام رجحان کو ظاہر کرتا ہے مسلمانوں کے (آنحضرت کے متعلق) نقطۂ نظر سے بعید مختلف تھا اور (حضرت) عیسیٰ (کے متعلق اس نقطۂ نظر سے بعید مشابہ ہے جو اکثر عیسائیوں میں اسوقت تک پایا جاتا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ہمعصروں اور ابتدائی مسلمانوں کیلئے وہی تھے جو قرآن انکو کہتا ہے کہ "تمہارے جیسا آدمی ہے"، "حقیقتاً ایک ایسا آدمی جس پر وحی نازل ہوتی ہے اور جو خلقت اور اوصاف کے لحاظ سے بالکل انسان ہے"، ان منازل ارتقا کا مطالعہ تعجب خیز اور فائدہ مند ہے جنہیں مذہبی احساسات کے بڑھنے والے اثر کے ذریعہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہ صرف ربانی صفات سے متصف کیا گیا ہے اور اسی طرح انکی تقدیس کی گئی ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ کی عیسائی کرتے ہیں۔ میں اسوقت تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن آپ کو اسکی شہادتیں میری ایک چھوٹی سی کتاب "دی آئیڈیا آف پرسنلٹی ان اسلام" The Idea of Personality in Islam میں مل سکیں گی جو قریب ہی میں یونیورسٹی (کیمبرج) کی جانب سے شائع ہونیوالی ہے۔ صوفیین پیغمبر کو ایک ایسے انسان کامل کی شکل میں پیش کرتے ہیں جس میں تمام ربانی صفات جمع ہو گئی ہوں۔ انکے خیال کے موافق پیغمبر کا قول ہے کہ

"جس نے مجھ کو دیکھا خدا کو دیکھا"، جس طرح حضرت عیسیٰ نے کہا تھا کہ "جس نے مجھے دیکھا (آسمانی) باپ کو دیکھا"، مسلمانوں کا مسئلہ انسان کامل عیسائیوں کے مسئلہ لوگس Logos کے مساوی ہے۔ یہ صرف صوفیوں ہی تک محدود نہیں ہے اس کی ایک دوسری شکل شیعوں میں پائی جاتی ہے اور اسکے بعض علامات سنیوں میں بھی نمایاں ہیں جنمیں سے اکثر کا عقیدہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روح سب سے پہلی چیز ہے جسکو خدا نے پیدا کیا۔ عیسائیوں کے موجودہ رجحانات تخیل لوگس (Logos) کے موافق نہیں ہیں۔ اور بعض عیسائی مسیح کو اسی طرح نہیں سمجھنا چاہتے جس طرح پہلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سمجھتے تھے تاہم یہ صحیح ہے کہ اکثر مسلمان انسان اور خدا کے درمیان ایک واسطہ (یعنی وہ وجود دونوں کے درمیان صرف اس لئے واسطہ بن سکتا ہے کہ اسمیں ربانی اور انسانی فطرتیں جمع رہتی ہیں بکلمن) ماننے کے لئے عیسائیوں کے ہم آہنگ ہیں اور تمام اصولی سوالات کو درگذر کرنے کے بعد ہر غیر متعصب عیسائی کو چاہئے کہ ان اخلاقی اور روحانی تخیلات کی صفائی اور عظمت کو مانے جنکو صوفیین نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں جمع کیا ہے اور جن سے اکثر یسوع مسیح کے پہاڑ والے خطبے (The Sermon on the Mount) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عیسائیت کے اخلاق کی طرح اخلاق تصوف ایک قانونی مجموعہ میں منضبط نہیں ہیں اور اس لئے انمیں نشو و نما کی قابلیت ہے۔ مذہب میں امکان ہے کہ وہ جامد اور بے لچک بن جائے۔ لیکن جس مذہب میں تصوفی عنصر زندہ رہتا ہے وہ ترقی اور آزادی سے کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ میں اس امر میں شبہ نہیں کرتا کہ اسلام ترقی اور آزادی کیطرف بڑھ رہا ہے اور سمجھتا ہوں کہ اسلامی تصوف بھی آزادی اور مصالحت کے اس پل کے بنیادی پتھروں میں سے ایک ہی جسکو مشرق اور مغرب کے درمیان بنانا چاہئے اور جو چند دنوں میں یقیناً بنایا جائے گا فقط۔

مشرق و مغرب

رابندر ناتھ ٹگور سے گفتگو

(از آلدے سودانی)

رابندر ناتھ ٹگور دوبارہ اطالیہ تشریف لائے ہیں اور اس مرتبہ خود مسولینی نے انہیں مدعو کیا ہے روم میں وزیر اعظم نے کمال عزت و حرمت سے انکا استقبال کیا۔ علاوہ روم کے فلورنس اور تورین میں بھی اُن کا خیر مقدم بڑے زور شور سے ہوا اور ہزارہا آدمی "فنون لطیفہ کے معنی" اور "مدرسہ شانتی نکیتن" پر انکی تقریریں سننے کے لئے جمع ہوئے۔ وہ یہی تقریریں لندن میں بھی کرینگے اور اپنی کمزوری قلب کی شکایات کے متعلق ماہرین فن سے مشورہ کرینگے۔

فلورنس میں مجھے اُن سے دیر تک باتیں کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ ہم دونوں کی ملاقات اُن کے ہوٹل کے نور آفتاب سے معمور کمرے میں ہوئی جہاں لنگ آرنو کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ ٹگور مجھسے دھیمی میٹھی لیکن کسی قدر خستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے وہ ایک بڑی آرام کرسی پر آرام سے لیٹے ہوئے تھے اور سیلما لیگرلوف کے نئے ناول کے انگریزی ترجمہ پر نرمی سے ہاتھ پھیر رہے تھے۔

وہ کہنے لگے "اطالیہ کی خوشنمائی روز بروز میری نظر میں کھبتی جاتی ہے اور فلورنس مجھے اطالیہ کے سب شہروں میں زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ لیکن مجھے اس سے زیادہ خوشی ہوتی اگر میں عمر اور شہرت کا بار دوش پر لیکر اطالیہ نہ آتا بلکہ کیٹس اور شیلے کیطرح نوگرفتار کی حیثیت سے زیارت کرنے نکلتا۔ شباب اُس پیام کو بہتر سمجھتا جو اطالیہ کی شاعری دے رہی ہے لیکن شہرت اور بڑھاپے دونوں میں نہ میری کوشش کو دخل ہے اور نہ میرا قصور"

شہرت کا بار ٹگور نے پھر اپنی عالمگیر شہرت کا ذکر چھیڑا۔ "میں اس لئے نہیں بنا ہوں کہ مارا مارا پھروں اور مجمع میں خصوصًا اہل مغرب کے مجمع میں مجھ پر انگلیاں اٹھیں یہ

زندگی اور اس کا پیغام داخلی ہے یہی زندگی تمام دکمال داخلی ہوتی ہے۔ لوگ جمع ہوتے ہیں کہ شاعر کو دیکھیں اور اس کی باتیں سنیں لیکن دیکھنے اور سننے کے بعد بھی وہ اسے نہیں پہچانتے کیونکہ شاعر پوشیدہ رہتا ہے۔ جتنا زیادہ شور ہوتا ہے اور جتنا کثیر مجمع ہوتا ہے اسی قدر گہرے پردے میں شاعر اپنی روح کی آڑ میں چھپ جاتا ہے اور لوگ اسے نہیں پہچان سکتے۔ اب میرے لئے شہرت کے بوجھ سے سبکدوش ہونیکی کیا تدبیر ہے؟"

میں نے سیل لیگروف کے ناول کی طرف اشارہ کرکے پوچھا "کیا آپ یورپ کے بہت سے مصنفوں کی کتابیں پڑھتے ہیں" انہوں نے جواب دیا "میں انگریز مصنفوں کی کتابیں پڑھتا ہوں اور میرے مدرسے کے بچے انگریزی کتابوں پر بڑے شوق سے گرتے ہیں۔ سب سے زیادہ اثر میرے دل پر شمالی اقوام کے ادب خصوصاً روسی ادب کا ہوتا ہے اور اسمیں سب سے بڑھکر دستہ الفیسکی، ٹالسٹائی، ترگنیف اور گورکی کی تصانیف کا۔

اندرونی بے آہنگی

ہماری گفتگو میں مشرقی اور مغربی تہذیب کے تعلقات کا ذکر آنا لابد تھا ٹیگور نے کہا "میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ دونوں کی تہذیب الگ رہ سکتی ہے اور اسے الگ رہنا چاہئے لیکن اسی کیساتھ ضروری ہے کہ دونوں میں ہم آہنگی ہو اور ایک دوسرے کی تکمیل کرے۔ ایشیا میں ہم لوگ پہلے ہی ایک دوسرے سے دور ہیں اور مختلف ملکوں، نسلوں اور مذہبوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ تم لوگ یورپ والے باوجود بیشمار اختلاف کے اور نزاعات کے مدتوں کی کوشش کے بعد اپنی تہذیب کو متحد کرنے میں کامیاب ہوگئے ہو اور یہ اتحاد ایک طرح کا معجزہ ہے خصوصاً تنظیم اور سائنس کے علم کی ترتیب کے لحاظ سے اور اسلئے یہ بہت اہم چیز ہے"۔

"مگر کیا آپکے خیال میں دنیا اس تہذیبی اتحاد میں بھی خلل انداز اور مزاحم نہیں ہو رہی ہے"

"ممکن ہے لیکن یہ بات ہمیشہ نہیں رہیگی۔ تم لوگ آجکل پہلے سے زیادہ کھرے، خودسر اور سخت گیر ہو اور لڑائی کے بعد۔ تمہاری ملک گیری کی ہوس اور نااتفاقی میں ترقی ہو رہی ہے۔ لیکن تمہارے لئے اس سے بھی بڑا خطرہ یہ ہوگا کہ تم بے آہنگی کو زندگی کا ناگزیر اور اٹل قانون سمجھنے کی

عادت ڈالو اور سب سے بڑھکر یہ کہ تم اندرونی بے آہنگی یعنی روح انسانی کی خانہ جنگی کو ضروری اور اچھا سمجھو۔ کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جنکے خیال میں سچی زندگی اسی دائمی اندرونی نقیض اسی خیالات جذبات اور خواہشات کی گھمسان لڑائی کا نام ہے۔ یہ ایک خطرناک غلطی ہے تمثیلی زندگی خود اپنے سے اور دوسروں سے دائمی نقیض کا نام نہیں ہے کیونکہ زندگی کا کام یہ ہے کہ تمہارے نفس میں ہم آہنگی پیدا کرے اور امن اور اتحاد کی روشنی سے دنیا کو منور کر دے۔"

دولت اور آزادی

یہ ضرور ہے کہ اس اندرونی اور بیرونی بےچینی کا سبب جنگ عظیم کا واقعہ ہائلہ ہے لیکن یہ چیز ہمیشہ نہیں رہیگی۔ ایک دن تم پر یہ راز کھل جائیگا کہ خارجی منافع کی خواہش اور انکا اکٹھا کرنا بیفائدہ اور خطرناک ہے اور تمہیں اپنے گھروں اور اپنے دلوں کی تہذیب سے ضروری ہونیکا احساس ہونے لگے گا۔ اُسوقت تمہیں معلوم ہوگا کہ بہت سی چیزیں جنہیں تم قابل قدر سمجھتے تھے صدیوں کا کُوڑا ہیں اور اُسوقت تم دلمیں ٹھان لوگے کہ اُس کوڑے کو جو تمہارے راستے میں حائل اور تم پر بار ہے دم بھر میں صاف کرکے پھینکدو۔ اُسوقت تم در اصل اندر اور باہر کی خدا داد زمین کے مالک ہوگے اُسپر عمارت بناؤگے اور اُسمیں آنیوالی فصل کیلئے بیج بوؤگے اُسوقت تم تہذیب کی ایک بلند سطح پر پہنچ گئے اور اپنے اور دوسروں کے ساتھ ہمسائگی کا حق ادا کرنا سیکھوگے۔"

"کیا آپ بھی اوروں سے اس خیال میں متفق ہیں کہ صفائی اور نئی تعمیر کے اس ضروری کام میں ہمیں امریکہ سے مدد ملیگی؟"

"نہیں امریکہ بہت دور ہے وہ خود اُن بدیوں کا شکار ہے جو نیکیوں میں خلل ڈالتی ہیں اور وہ حد سے زیادہ دولتمند ہے اُسکو مخاطب کرکے مسیح کے یہ الفاظ کہے جاسکتے ہیں" اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا اُس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ دولتمند آدمی آسمانی سلطنت میں داخل ہو سکے" امریکہ یوروپ کی مدد اور ہمت افزائی اُسوقت کرسکتا ہے جب وہ خود مصیبت کے گہرے سمندر کو عبور کرچکا ہو۔ علاوہ اس کے امریکہ آزاد نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم ہندوستان والے غیروں کے غلام ہیں لیکن امریکہ والوں کے مقابلہ میں ہم یعنی ہماری روحیں، کہیں زیادہ آزاد ہیں۔"

ذاتوں کی تقسیم

اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پیشتر یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ اسلامی فتوحات سے قبل ہندوستان کی تاریخ تقریباً مفقود ہے۔ کوئی ایسا قابل اعتبار ذریعہ نہیں ہے جس کی بنا پر قطعی حکم لگایا جاسکے۔ یوں تو ہر چیز کی حقیقت سے آگاہی مشکل ہے لیکن تاریخی مواد کی کمی نے ذاتوں کی اصلیت اور ابتدا کا پتہ لگانا اور بھی دشوار کردیا ہے۔

ہندوستان کی اجتماعی زندگی پر ذات پات کا جو اثر ہے وہ ہر ایک کو معلوم ہے جہاں تک ہندو آبادی کا تعلق ہے وہ تمام کی تمام "جاتیوں" کی زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہے۔ مجال نہیں کہ ان سے اپنے آپ کو آزاد کرسکے الا اس صورت میں کہ ہندوستان مغربی تہذیب کے رنگ میں سراپا رنگ جائے اور ہندوستانی اپنی نہایت ہی قدیم تہذیب کو خیرباد کہدیں۔ یہ امر بھی فروگذاشت کے قابل نہیں کہ اس تقسیم کا اثر صرف ہندو فرقے پر نہیں بلکہ مسلمان بھی اس کے زیر اثر ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر نومسلم ہیں، یہ خیال غلط ہے کہ ہندوستان میں سیدوں مغلوں یا ترکوں کی تعداد اتنی ہے جتنی عام طور پر سمجھی جاتی ہے، صرف مذہبی تبدیلی سے اور وہ بھی جب برائے نام ہو سوسائٹی کے قوانین کی پابندی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

ذات کی اصلیت کا پتہ چلانے کے لئے مختلف نظرئے پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں سب سے پرانا اور مشہور خیال جس پر پرانی چال کے ہندوؤں کا ایمان ہے یہ ہے کہ "اتما منڈی" روح اعلیٰ و برتر نے برہما و تارکی شکل اختیار کرکے برہمن، کھتری، ویش، اور شودر اپنے منہ، بازوں، رانوں، اور پیروں سے علی الترتیب پیدا کئے اور ان کے فرائض مقرر کردئے۔ برہمن کا کام تھا پڑھنا پڑھانا قربانی چڑھانا اور صدقے وصول کرنا۔ کھتری کے ذمہ لوگوں کی حفاظت تھی، ویش کے سپرد جانوروں

مضمون کا آخری حصہ پروفیسر کیلاٹ کے ان لکچروں سے مقتبس ہے جو موصوف نے جامعہ کے طلبۂ تاریخ کے سامنے دئے

کی خدمت کھیتی باڑی، تجارت اور بیوپار کا کام تھا اور غریب شودر کے ذمہ ان تینوں کی خدمت تھی
اس خیالی گورکھ دھندے سے نکل کے جب ہم علم کی روشنی میں واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو
ہم کسی اور نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

ذات کے لئے سنسکرت کا خاص لفظ "جات" یا "جاتی" ہے جس کے معنی ہیں پیدائش۔ گویا
اس سے انسان کی پیدائش، اعزاز اور رتبہ کا پتہ چلتا ہے [1]

اب اس لفظ کے ساتھ سب سے پہلے تین باتوں کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ اولاً یہ کہ ایک ذات
کے لوگ کسی ایک پیشہ کے پابند ہیں، دوسرے وہ صرف اپنے ہی دائرہ میں شادی کر سکتے ہیں اور
آخری یہ کہ وہ غیر ذات کے لوگوں کیساتھ کھا پی نہیں سکتے [2]

دنیا میں اور جگہ بھی مختلف جماعتیں قوانین اجتماعی کی پابند ہوتی ہیں لیکن ایسی سختی کہیں نہیں
پائی جاتی جیسی ہندو قوم میں

یوں تو ذاتوں کی تعداد تین ہزار تک بتائی جاتی ہے لیکن ۱۴۲۹ ذاتیں مسلمہ ہیں [2] اور لطف یہ
ہے کہ ذاتوں کی تعداد دن بدن روبہ ترقی ہے۔

صرف چار تقسیموں کا خیال بالکل غلط ہے۔ ایک ذات کے تمام لوگ آپس میں تعلقات نہیں قائم
کر سکتے تھے۔ خود منو کے عہد (دوسری صدی عیسوی) میں چار سے زائد تقسیمیں ہو چکی تھیں برہمن
مرد کو غیر برہمن عورت سے شادی کا حق حاصل تھا۔ اس طرح جو اولاد ہوتی تھی نہ وہ برہمن تھی اور
نہ دوسری تینوں ذاتوں میں سے کسی سے اسکا تعلق ہو سکتا تھا۔ وہ اور ہی نام سے منسوب کیجاتی
تھی۔ مثلاً امبستھ (ویش ماں کی اولاد) یا نشاد (شودر ماں کی اولاد) ان کے فرائض بھی جداگانہ
ہوتے تھے۔ پہلے کا کام دوادارو اور دوسرے کا مچھلی پکڑنا تھا غرض منو کے وقت میں بھی گروہ،

---

[1] Russel and Hira Lall "Tribes and Castes of the Central Provinces." P 10.

[2] Ehlich. "India." P. 208.

ویدیہ، ملا، بھوی، کھاس، دراوڑ، ساک، کرات، چنڈال، امبستھ، نشاد، مارگوار، واسا، کیوارت، اجوک، کراوڑ، دگموں اور دین مختلف ذاتوں کا پتہ لگتا ہے [۱]
ان میں شروع کی نو تقسیمیں قومی فرقوں کی بنا پر ہیں اور باقی سب پیشوں کے لحاظ سے۔
آج بھی ہندوستان میں پیشوں کے لحاظ سے تقسیمیں موجود ہیں مثلاً کاشتکار، دستکار (جیسے جلاہے موچی، بڑھئی، اور کمہار) خدام (جیسے گڈریے، حجام، دھوبی) اور دوسرے پیشوں کے لوگ جیسے ڈوم، نجومی، مچھیرے، نٹ، گوتے وغیرہ۔ دوسری نسل کے اعتبار سے بھی تقسیمیں ہیں مثلاً راج بنسی اور چنڈال بنگال میں، کولی، مہاراشٹر میں اور نایر مدراس میں [۲]
مورخین کا ایک بہت بڑا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ہندوستانی ذاتوں کی تقسیم پیشوں کی بنا پر ہے اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بڑی حد تک صحیح ہے جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا اور نئے نئے کام نکلتے آئے ویسے ہی ذاتوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ آج بھی ہمارے سامنے اس قسم کی مثالیں موجود ہیں اور نئی ذاتوں کے بننے کا سلسلہ برابر جاری ہے نہ صرف یہ بلکہ ایک ایک ذات کے بھی متعدد فرقے ہوتے چلے جا رہے ہیں جنمیں بظاہر کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔
مثال کے طور پر وہ لوگ جو چمڑے کا کام کرتے ہیں انہیں ہم "چمار" کی عام اصطلاح سے یاد کر سکتے ہیں یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جب وہ چمار جو کھال صاف کرنے اور ادھیڑنے کا غلیظ کام ترک کر کے صاف کام مثلاً جوتا بنانا یا چمڑے کا اور سامان تیار کرنا شروع کر دیتے ہیں تو عام چماروں سے برادرانہ تعلقات بھی قطع کر لیتے اور اپنی ایک مستقل ذات بنا لیتے ہیں انکا "حقہ پانی" اور شادیوں کا دائرہ اپنی نئی برادری تک محدود ہوتا ہے۔
اسی طرح ہندوستان کی تمام ذاتیں آپس میں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہیں اور وہ اسی محدود دائرے کے اندر تمام تر تعلقات رکھتی ہیں۔

۱۔ *Risley*. "People of India." P. 260

۲۔ *Wadia and Joshi*: "The Wealth of India." P 151.

ہندوستانی ذات پات کی تقسیم سے بہت پیشتر دنیا میں پیشہ کے لحاظ سے تقسیم ہوچکی تھیں۔ ایک گروہ صرف ایک پیشہ کو اختیار کرلیتا تھا اور اسکی اولاد بھی اسی کی پابند ہوتی تھی لیکن یہ ضرور ہے کہ پابندی صرف ایک صنف یعنی مردوں تک محدود تھی۔ شادیاں باہر ہوسکتی تھیں۔

منو نے جن ذاتوں کی تصریح کی ہے ان میں بھی دو قسم کی ذاتیں ملتی ہیں ایک وہ جو پیشہ کے لحاظ سے ہیں اور دوسری وہ جو نسل کے اعتبار سے۔ جو لوگ باہر سے ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے انہیں اپنے رنگ پر ناز تھا اور خاندانی فوقیت کے اعتبار سے سب سے پہلے کھتری، پھر برہمن اور تیسرے درجہ کے ویش تھے باقی اس ملک کے باشندے جو رنگ میں آریوں کی نسبت کالے تھے شودر کہلائے اس تقسیم میں نسل و رنگ وجہ امتیاز ہیں۔

یہ تقسیم تھیں تو ضرور لیکن یہ نہیں تھا کہ ایک جماعت میں سے دوسری میں جانا محال ہو۔ سات سو سال قبل مسیح تک نہایت آسانی سے پیشہ بدلا جا سکتا تھا۔ چنانچہ پرانی تاریخی کتابوں خصوصاً "جاتک" میں ہمیں اسکا کافی ثبوت ملتا ہے۔

"ایک شہزادہ اپنی بہن کے حق میں تخت سے دست بردار ہو کر تجارت کا پیشہ اختیار کرلیتا ہے"[۱]

"برہمن شکاریوں اور چڑی ماروں کا پیشہ کرتے ہیں"[۲]

جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں اس قسم کی جماعت بندیاں دنیا کے اور ملکوں میں بھی ہوچکی تھیں ہندوستان میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اور ملکوں کی طرح شروع شروع میں یہاں بھی مختلف جماعتوں کے لوگ بلا کسی دقت کے آپس میں شادیاں کرسکتے تھے۔ اس قسم کی متعدد مثالیں خود برہمنوں کے نوشتوں میں موجود ہیں کہ نہ صرف اعلیٰ ذات کے مرد نے ادنیٰ درجہ کی عورت سے شادی کی ہے بلکہ یہ بھی کہ اعلیٰ ذات کی عورت نے ادنیٰ درجہ کے مرد سے باضابطہ شادی کی[۳]

---

۱ *Davids:* "Buddhist India." P. 56.

۲ *Ibid.* P. 57.

۳ *Ibid.* P. 59.

جیسے کہ جماعت بندی میں زیادہ سختی نہیں پیدا ہوئی تھی اسوقت تک یہ تقسیم ہندو کار آمد ثابت ہوئیں لیکن جب صورت حال بدل گئی اور ایک محدود چہار دیواری سے باہر نکلنا ناممکن ہو گیا اسوقت سے یہ قومی نقصان کا باعث ہو رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب "جماعت" "ذات" میں تبدیل ہو گئی اسی وقت انفرادی و قومی زوال کا باعث ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں جماعت کو ذات کیونکر بنا لیا گیا؟

جب آریوں کا آنا بند ہو گیا اور وہ یہاں کے باشندوں میں مل جل گئے تو خالص آریہ قوم کا نشان سرزمین ہند سے بالکل اڑ گیا البتہ ایک نئی قوم جو یہاں کے باشندوں اور آریوں کا مجموعہ تھی ضرور پیدا ہو گئی اور وہ قوم اپنے آپ کو یہاں کے اصلی باشندوں سے الگ تھلگ رکھنا چاہتی تھی۔

تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح ہندوستان میں امن وامان کا دور دورہ ہو چکا تھا سکون واطمینان کے ساتھ جماعتوں کی ایک نئی ترتیب بھی پیدا ہوئی اور وہ اس طرح۔

جوں جوں لوگوں پر مذہبیت کا غلبہ ہوتا گیا اسی مناسبت سے مذہبی مظاہرے اور تیوہار بڑھتے گئے علم کی بھی کچھ اشاعت ہوئی۔ ان تمام چیزوں نے ملکر مذہبی پیشواؤں کا رتبہ بہت بلند کر دیا اسوقت یہ پیشوائی کسی خاص فرقے کیلئے مخصوص نہ تھی۔ ہر جماعت کیلئے دروازہ کھلا ہوا تھا نسل نہیں بلکہ قابلیت اسکا معیار تھا۔ مذہبی پیشوا کا کام کوئی سہل کام نہ تھا وہ اپنی تمام زندگی مذہب کے لئے وقف کر دیتا اور اسی راہ میں فنا ہو جاتا تھا۔ وہ دوسروں پر بار نہ تھا (جیسا کہ آخر میں ہو گیا) اسکی عبادت پاکیزہ تھی اسکی پوری عمر بنی نوع انسان کی خدمت میں صرف ہوتی تھی۔

اور مقامات کی مثالیں موجود ہیں کہ مذہبی پیشوا خادموں کی بجائے آقا بن بیٹھے یہی ہندوستان میں بھی ہوا۔ یہ گروہ ہندوستان کی سب سے قوی جماعت ثابت ہوا کیونکہ علم خواہ دینی ہو یا دنیوی سب ان کے گھر کی میراث تھی اور علم کے معنی ہیں قوت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی نظروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ کچھ عرصہ میں انہوں نے نہایت ہی غیر معمولی اعزاز حاصل کر لیا۔ اس عزت نے "سونے پر سہاگے" کا کام کیا پہلے وہ اگر خدمت کو فخر سمجھتے تھے تو اب عزت پر ناز کرنے لگے۔

ایک عرصہ تک انہوں نے قابل اور مستحق لوگوں کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے سے نہیں روکا لیکن جب انہوں نے اپنے اعلی خیالات سے علیحدگی اختیار کر لی تو دوسروں کیلئے بھی پیشوائی کی راہیں بند کر دیں اور خود ایک تنگ دائرہ میں محدود ہو گئے۔ حالات گردوپیش نے بھی انکا ساتھ دیا اور اب باہر والوں کیلئے اس پیشہ کے اختیار کرنیکی کوئی صورت ہی باقی نہ رہی۔

سکون اور امن و امان کیساتھ ہی مختلف جماعتیں مختلف پیشوں کو اختیار کر چکی تھیں۔ یہ جماعتیں اپنے ذاتی مصالح اور پیشوں کی ضروریات کی بنا پر دن بدن بہت تنگ نظر ہوتی گئیں۔ برہمن نے سب سے پہلے محسوس کیا کہ اس کے کام کیلئے ایک خاص ٹریننگ کی ضرورت ہے اور اسی طرح کھتری، ویش، شودر اور دوسری جماعتوں نے بھی۔

اس کے علاوہ آریہ دراوڑی اور خالص دراوڑی جماعتیں علیحدہ علیحدہ تھیں جیسا کہ ہر جگہ ہوتا ہے آج بھی ہندوستان میں جو کیفیت اینگلو انڈین حضرات کی ہے اس سے اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں اور مخلوط النسل لوگوں کے تعلقات آپس میں کیسے ہونگے رفتہ رفتہ ایک جماعت سے دوسری میں جانا مشکل ہوتا گیا۔ غرض ایک طرف تو امتیاز نسل و رنگ اور دوسری جانب ہنر کے اعلیٰ و ادنیٰ درجات نے برہمن کو اپنی ایک مستقل ذات بنانے میں کافی مدد دی۔ اپنے ذاتی اثر اور اس موقع سے برہمن نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس نے تمام لوگوں پر وہ قوانین نافذ کئے جنکی رو سے ایک گروہ سے نکل کر دوسرے میں جانا قطعی ناممکن ہو گیا۔

مذہب، برہمن کے ذاتی مقاصد کے حصول کا ایک نہایت ہی کامیاب ذریعہ تھا۔ کسی مذہب کا "زور" اس کے پیروؤں کی جہالت ہے درحالانکہ اسکی "قوت" پیروں کی روشن دماغی (یہاں "زور" Strength اور "قوت" Might کے مرادف ہے۔)

برہمن نے اپنی انتہائی قوت اس پر صرف کی کہ لوگ جاہل رہیں۔ علم کے دروازے عام مخلوق کے لئے بالکل بند تھے۔ اس حالت میں برہمن نے جہالت و تعصب کی بنیاد پر "ذات" کا مجسمہ کھڑا کیا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تمام قوم پر حاوی کیونکر رہا۔ بلاشبہ اس کی مخالفت بھی ہوئی لیکن برہمن کی کامیابی کی ایک بہت بڑی وجہ ہندوستان کے اس زمانہ کا مخلوط النسل طبقہ ہے۔ کیونکہ خود اس طبقہ کی بقا ذاتوں کی تقسیم پر منحصر تھی۔ اسکی مدد سے برہمن حسب منشا کامیاب ہوا۔

غزل

از حضرت ہادی مچھلی شہری

از برائے دست و بازو جس جانپرور بدہ — گر ہمی خواہی متاع زندگی را سر بدہ
ہیچ درد ستت نیاید از رہ بیچارگی — بر خیال بے سر و پا صورت دیگر دہ
خون فاسد مایۂ سودائے غفلت تا بکے — یک رگ جاں را متاع نوک صد نشتر بدہ
محو کن از سینہ داغ بے دلی و بے کسی — از وفا بر گلشن امید خود منظر بدہ
کن مجسم ماضی خود را بہ پیش چشم دل — مرغ پر افشاندہ یا سر مایۂ شہپر بدہ
سوختن لم بہر تو باشد متاع اعتبار — جلوہ برق طور را از زیر خاکستر بدہ
زن بدریائے عمل با ہمت مردانگی — ہر چہ بر در غم فداکاری بود از سر بدہ

ہیچ کارے تو نباشد از غم ملت جدا
ہر چہ ہادی میدہی خود را فقط زیں در بدہ

سینورا کیارا

پروفیسر گیاکاموٹڈیسکی نیپلز کا ایک مشہور ڈاکٹر ہے اس کا مکان جس میں سے خوشبوکی لپٹیں نکلتی ہیں، انکورونانا کے قریب ہے۔ اس کے ہاں ہر قماش کے لوگ پہنچتے ہیں، خاصکر خوبصورت کنواری لڑکیاں جو سانتا لوسیا میں سمندر کے مال کی تجارت کرتی ہیں، وہ کل بیماریوں کی دوا بیچتا ہے۔ خراب دانت نکالنے میں عذر نہیں کرتا۔ میلے کے دوسرے روز لڑا کا بھڑا کا لوگوں کے زخم سینے میں ماہر ہے۔ ساحل کی بولی، درسی لاطینی کے ساتھ ملا کر اس انداز سے بولتا ہے کہ مریضوں کے دل میں عقیدت پیدا ہوتی ہے۔ اسکی آپریشن کی کرسی سے زیادہ لمبی خستہ اور بوسیدہ کرسی دنیا کی کسی بندرگاہ میں نہیں پائی جاتی۔ اس کا جسم چھریرا، آنکھیں چھوٹی اور سبز، اور ناک لمبی اور اس کے پتلے ہونٹوں پر جھکی ہوئی ہے۔ اسکے گول شانے اُسکی پتلی ٹانگیں پرانے وقت کے مسخروں کی یاد دلاتی ہیں۔

گیاکامونے بڑی عمر میں نوجوان کیارا نامی ست شادی کی۔ مامی ایک پرانا سزا یافتہ تھا۔ جس کی نیپلز میں سب عزت کرتے تھے۔ اسنے بورگوڈی سانتو میں نان بائی کا کام شروع کر دیا تھا اور جب وہ مرا تو تمام شہر نے افسوس کیا۔ کیارا کا حسن اس آفتاب کے حیات بخش اثر سے نہایت آب و تاب سے شگفتہ ہوا، جو توری کے انگوروں اور سازنتو کے نگتروں کو حرارت پہنچاتا ہے۔

پروفیسر گیاکاموٹڈیسکی کا مناسب و موزوں عقیدہ تھا کہ میری بیوی جتنی حسین ہے اسی قدر پاک دامن بھی ہے۔ علاوہ بریں وہ جانتا تھا کہ ایک قزاق کے خاندان میں عصمت و عفت کا کس قدر پاس ہوتا ہے مگر وہ ڈاکٹر تھا اور فطرت نسوانی جن کمزوریوں اور بے چینیوں کا شکار ہوتی ہے، اُن سے بھی واقف تھا چنانچہ جب میلان کے اسانیو رانیری نے پیازا دی اوتیری میں عورتوں کے کپڑے سینے کی دکان کھولی اور اُس کے ہاں آمد و رفت شروع کی تو اُسے کسی قدر تشویش ہوئی اسانیو

جوان اور مقبول صورت تھا اور ہر وقت مسکراتا رہتا تھا جیری موٹن دوست امی کی بیٹی کے رگ وپے میں نیپلز کا اثر سرایت کئے ہوئے تھا، وہ ایسی نہ تھی کہ اپنے فرض سے غافل ہو کر اپنے میلان کے ہم وطن سے ناجائز تعلق پیدا کر لیتی، تاہم اسانیو کو ڈاکٹر کی غیر موجودگی میں اس کے ہاں آنے سے رغبت اور سینورا کی خلوت میں باریابی تھی۔

ایک دن ڈاکٹر معمول سے کچھ پہلے مکان پہنچا تو دیکھتا کیا ہے کہ اسانیو کیارا کے آگے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ہے، سینورا، اُسے دیکھکر، وقار و تمکنت کیساتھ اٹھ کر چلی گئی اور اسانیو بھی اٹھ کھڑا ہوا گیاکا موڈیسکی، نہایت اضطراب و تردد کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

"عزیز من، تم بیمار معلوم ہوتے ہو، اچھا کیا جو مجھے دکھانے آئے۔ میں ڈاکٹر ہوں اور انسانی دکھ درد رفع کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں تمہیں تکلیف ہے اس سے انکار نہ کرو۔ تمہارا چہرہ تمتمایا ہوا ہے یقیناً تمہیں شدید درد سر ہے۔ بہت عقلمندی کی کہ مجھے دکھانے آئے بے شک، تمہیں شدید درد ہے، ڈاکٹر میں سانڈ کی سی طاقت تھی یہ کہتا جاتا تھا اور اسانیو کو اپنے مطب کیطرف گھسیٹ رہا تھا وہاں اُسے زبردستی اپنی معروف آپریشن کی کرسی پر لٹا دیا جو متواتر چالیس سال سے درد میں مبتلا نیپلز والوں کا بار اٹھا رہی تھی۔

پھر مضبوطی سے گرفت کر کے کہا۔

"اب دیکھا تمہارے دانت میں درد ہے یہ بات ہے! واقعی تمہارا دانت بہت خراب ہو گیا ہے یہ کہکر ایک ڈبے میں سے دانت نکالنے کا عجیب آلہ نکالا اور اسانیو کا منہ زبردستی کھول کر آلے کے ایک جھٹکے سے ایک دانت نکال ڈالا۔

اسانیو خون تھوکتا ہوا بھاگا اور پروفیسر گیاکا موڈیسکی اس کے پیچھے وحشیانہ خوشی سے مغلوب ہو کر چیخا۔

"خوب دانت ہے! نہایت خوب دانت ہے!"

الفاظ کو اپنانا

آج کل دنیا میں تقریباً ۲۷۹۶ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ انہیں سے دو چار وحشی زبانوں کے علاوہ کوئی زندہ زبان ایسی نہ ہو گی جس میں پرائے الفاظ داخل نہ ہو گئے ہوں۔

یہ اجنبی الفاظ دو قسم کے ہوتے ہیں کچھ تو وہ ہیں جن کا لفظ خود اس قابل تھا کہ وہ اس نئی زبان کے الفاظ کے ساتھ اپنوں کی طرح مل گئے یا اہل زبان نے ان کا لہجہ اور سُر بدل کر ان کو اپنا لیا، اور بعض وہ ہیں جن کا بیوپار صدیوں سے ہوتا آتا ہے پھر بھی زبان میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

جو زبانیں کئی نسلوں کے الفاظ سے بنی ہوتی ہیں۔ مثلاً اُردو ان میں بدیشی الفاظ کو اپنا لینے کی صلاحیت بدرجہ اتم ہوتی ہے، لیکن جو زبانیں عربی کی طرح خالص بے میل اور یک نسلی ہیں۔ ان کا ترنم بہتیرے اجنبی الفاظ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں ابھی تھوڑے ہی دنوں سے، ریل، اسٹیشن، گلاس اور لاٹ صاحب داخل ہوئے مگر کوئی شخص ان کو محض الفاظ کی نوعیت کی بنا پر اجنبی نہیں بتا سکتا، لیکن عربی میں جص، منجنیق، اور ابریق تقریباً ایک ہزار برس سے بولے جاتے ہیں مگر صاف اور نمایاں طور پر ثقیل اور بدیشی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان الفاظ کا ترنم خالص عربی الفاظ کے ترنم اور انداز کے مطابق نہیں ہے۔

اس سے ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ اُردو جیسی زبانوں میں دوسری قسم کے الفاظ اور عربی جیسی زبانوں میں پہلی قسم کے الفاظ نایاب ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ عربی میں آکر بہت زیادہ اکثریت کے ساتھ دوسری قسم میں داخل ہو جاتے ہیں ہمارا منشا صرف یہ ہے کہ اُردو جیسی زبانوں کو غیر زبانوں کے الفاظ اپنا لینے میں بہت کم شرائط کی پابندی کرنی ہوتی ہے۔ مگر عربی جیسی زبانوں میں غیر زبانوں کے الفاظ کو عربی بنا لینے کیلئے بہت سی ایسی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے جنکو اُردو میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا ان کا خیال کم کرنا ہوتا ہے۔

ا۔ غیر زبانوں کے الفاظ قبول کر لینے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس دخیل لفظ کی۔ وضع

قطع صورت شکل اور لہجے میں صلاحیت ہونی چاہئے ورنہ انہیں اتنا تغیر ہونا چاہئے کہ لفظ کی اجنبیت کم ہو جائے ۔ یا بالکل ہی مٹ جائے ۔

عربی زبان کا فلسفہ سمجھنے والے جانتے ہیں کہ کون کون حروف باہم جمع نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو کن کن صورتوں میں؟ اور ایک لفظ زیادہ سے زیادہ کتنے حروف کا مجموعہ ہو سکتا ہے اور حرکات و سکنات کے لحاظ سے عربی الفاظ کے اوزان متعین ہیں ۔ اس لئے عربی زبان میں اجنبی الفاظ کے لہجوں کو بدل دینا نہایت آسان ہے ۔

لیکن اردو جیسی زبانوں میں الفاظ کے متعلق کوئی اصول و ضابطہ بتانا دشوار ہے کہ زبان میں کن کن نوعیتوں کے الفاظ کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے ۔ اردو کے متعلق صرف اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ اس زبان کے الفاظ میں اکثریت برج بھاشا ، فارسی اور عربی کو حاصل ہے اور یہ کہ اردو نے ان زبانوں کے ہر قسم کے الفاظ کو نہیں قبول کیا ہے اور بعض نوعیتوں کے الفاظ کو قبول کیا ہے مگر انکا استعمال زبان میں نہایت کمی کیساتھ کیا جا سکتا ہے ۔ ان نوعیتوں کے الفاظ کو اردو زبان کے لئے ناقابل برداشت سمجھنا چاہئے ۔ اس موقع پر اس سے زیادہ تشریح کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے کیونکہ اس کے لئے ترنم زبان کا مسئلہ طے کرنا ضروری ہوگا ۔

۲- اردو جیسی زبانوں میں کسی اجنبی لفظ کو اپنا لینے کیلئے اسقدر علم کافی ہے کہ ہماری زبان کا ترنم اس لفظ کے ترنم کو برداشت کر سکتا ہے یا نہیں یعنی لہجہ اور تلفظ کے لحاظ سے اس لفظ میں اردو کے کثیر الاستعمال الفاظ کے ساتھ گھل مل جانے کی صلاحیت ہے یا نہیں ؟ لیکن ہماری فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ ہم غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنے الفاظ کی صف میں اس طرح لانا پسند کرتے ہیں کہ معنوی قرائن کے لحاظ سے بھی یہ اجنبی الفاظ ہماری اپنی زبان کے الفاظ کے رشتہ دار معلوم ہوں ۔

موجودہ عہد سے پہلے ، عربی زبان میں جو الفاظ غیر زبانوں سے آئے ہیں انکو یکجا کر کے غور کیا جائے تو پتہ چلے گا ، کہ بنی عباس کے زمانہ سے زیادہ بنی امیہ اور بنی امیہ سے زیادہ عہد صحابہ اور عہد صحابہ سے زیادہ ایام جاہلیت کے عربوں میں یہ خواہش نہایت شدت کیساتھ موجود

تھی یعنی جس زمانے میں جسقدر زیادہ انہیں عربیت کے خالص جذبات تھے اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ انہوں نے اسکا بھی لحاظ رکھا کہ عجمی الفاظ کو زبان میں رائج کرنے سے پہلے اس کے لہجہ و تلفظ میں اتنا فرق کر دیا جائے کہ وہ الفاظ کسی خالص عربی مادہ سے مشتق معلوم ہوں۔

ہندی اردو میں بھی ہم کو چند مثالیں اسی قسم کی ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ ہم نے بھی نادانستہ طور پر اکثر الفاظ کی ترویج میں اس جذبہ سے کام لیا ہے مثال کے طور پر ذیل کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔

تام لوٹ اس لفظ کی اصلیت "تملت" ہے اگر بجنسہ اصلی لفظ قائم رہتا تو بھی لفظ اردو میں کھپ سکتا تھا، مگر عوام نے تام لوٹ کر دیا، اور اب اشتقاقی حیثیت سے بھی لفظ خالص اردو ہو گیا۔ ہندوستان کے دیہاتی "مس" کو جو ہماری بول چال میں تانبا ہے "تاما" کہتے ہیں اس بنا پر تام لوٹ کے معنی ہوئے تامے کا لوٹا۔

لال ٹیم "لینٹرن" بلکہ لالٹین ہوا لیکن دیہاتی گنوار لال ٹیم بولتے ہیں، جس کو دوسرے لفظوں میں "سرخ لو والی چیز" کہہ سکتے ہیں۔

مرجاپور اعظم گڈھ کے ضلع میں ایک گاؤں ہے جس کا نام پہلے میرزادپور تھا آجکل یہ شریف ہندوؤں کی بستی ہے۔ انہوں نے اس کو مرجاپور کر دیا جو بخیال انکے میرزاپور یا امیرزادپور تھا جس کے معنی ہوئے معززوں کی بستی۔

برات ہندوؤں کے قدیم تمدن میں قرب و جوار کی لڑکی اپنی بیٹی اور بہن کے برابر سمجھی جاتی تھی اسکے ساتھ نکاح کرنا معیوب تھا، اس لئے نوجوانوں کو بہت دور دراز کا سفر کر کے اپنے لئے بیویاں لانی پڑتی تھیں اس زمانہ میں تنہا سفر کرنا ناممکن تھا اسلئے سربر (شوہر) کو اپنے دوستوں اعزا و اقربا کو اپنی یاترا (سفر) یا بریات میں شریک کرنے کیلئے مدعو کرنا پڑتا تھا۔ مسلمان جب آئے تو انکے قدیم تمدن میں (بریات) کیلئے کوئی لفظ نہ تھا، مگر انہوں نے رقعہ دعوت کی مناسبت سے بریات کو برات کر دیا، برات فارسی میں اس رقعہ کو کہتے تھے جس کے ذریعہ سے وظیفے اور تنخواہیں برآمد ہوتی تھیں۔ مشہور رہے۔

برات عاشقاں بر شاخ آہو

یعنی عاشقوں کی روزی کا شقہ، قرآن شاخ آہو پر ہے۔

آدم آدم خالص عبری لفظ ہے۔ عربی کے واسطے سے دنیا کے سب سے پہلے انسان کا نام ہے اصل ترجمہ ہے گندم گون یا بے انتہا محبتی۔ یہ لفظ اکثر ہندوؤں کی زبان سے "آدِم" بکسر دال سنا گیا ہے شاید وہ اسے آدم منو (قدیم ترین انسان) کا مخفف سمجھتے ہیں۔

نہاری قدیم فارسی میں آہار روزی یا شکم سیری ظاہر کرتا تھا "نا ہار" کے معنے ہیں "ناشکم سیر" بولتے تھے ناہار بشکنید، ناشتہ کر لیجئے، رفتہ رفتہ ناہار صبح کے ناشتہ کا نام ہوگیا۔ اُردو والوں نے ناہار سے نہاری بنا کر صبح کے وقت بیچنا شروع کردیا اب نہاری گویا نہار (دن) سے منسوب بھی جاتی ہے

مٹروا اصلی لفظ متمرد ہے ہماری طرف عورتیں اکثر بولتی ہیں کہ فلاں آدمی بڑا موٹروا ہے گویا اس کا تمرد اس کی موٹائی کا نتیجہ ہے، موٹا آدمی بعض وقت دولتمند کے معنی میں بھی بولتے ہیں جس کا نتیجہ بھی بیشتر تمرد ہوتا ہے۔

اُردو میں اس قسم کے الفاظ بہت کم ملتے ہیں مگر عربی میں بکثرت ایسے الفاظ ملینگے جن کا عجمی ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ پھر بھی کتب لغت دیکھی جائیں تو ان الفاظ کی وجہ اشتقاق بیشتر عربی ملے گی۔

ابرق اصل میں "ابرک" تھا۔ عربوں نے اس کی چمک دمک کی مناسبت سے ابرق بنا دیا جس کا مادہ برق ہے۔

عراق "ایراہ" تھا ایراہ سے "ایراق" ہوگیا اور ایراق سے عراق ہوگیا، ایراہ کی وجہ تسمیہ حمزہ نے یہ بتائی ہے کہ اہل ایران ہر اس چیز کو ایراہ کہتے تھے جو سمندر سے قریب ہو، عراق دجلہ کا ساحلی علاقہ ہے ایراہ اگر ایراہ رہتا تو بھی عربی ترنم کے خلاف نہ ہوتا، ایراق بنکر خالص عربی لفظ ہوگیا اور اراقہ (بہانا) کی مناسبت سے اسکو عربی سے مناسبت بھی حاصل ہوگئی لیکن یہ وزن عربی اسماء کا نہیں ہے اسلئے عراق کر دیا گیا جو خالص عربی ہوگیا۔ ابوعمرو کہتے ہیں کہ اہل حجاز ہر اس چیز کو عراق کہتے ہیں جو ساحلی ہو۔ یہ لفظ اصل کے اعتبار سے تو فارسی ہے مگر کتب لغت میں مذکور ہے کہ کسی نے اسکو

عراق القریہ . . . . . سے ماخوذ قرار دیا ہے اور عرق کی جمع بتایا ہے ، کسی نے اسکا ماخذ عراق الارض السبخہ . . . . . کو بتایا ہے ۔ ع ، ر ، ق کا مادہ کثرت پانی پر دلالت کرتا ہے ، عرق اس رگ کو کہتے ہیں کہ جس میں خون دوڑتا ہے ۔ عَرَق پسینہ کو کہتے ہیں ۔

جزیہ گزیہ کا معرب ہے ، مگر اس کا عربی ماخذ جزا بتایا جاتا ہے گویا جزیہ جزائے حفاظت یا جزائے کفر ہے ۔

کنیسہ کلیسا کو کہتے ہیں ، یہ لفظ کلیسا کی نہیں بلکہ فارسی لفظ کنشت کی خرابی ہے عرب نے کنشت نصاری کو کنیسۃ نصاری کر دیا عربی اشتقاق کی رو سے نصاری کے جمع ہونیکی جگہ کا نام ہو گیا ۔ کناسہ قدیم عربی میں اس جگہ کو کہتے تھے جہاں لوگ گھروں کے جھاڑن بوہارن جمع کرتے تھے ۔

قلعی رانگہ کی اصل کلہ ہے ، کلہ ہندوستان کا ایک ساحلی گاؤں تھا جہاں چین کیطرف کے جہاز آ کر رکتے تھے ، وہاں رانگے کی ایک کان تھی ۔ . . . . ایک مسلمان سیاح نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ رانگے کی کان یہاں کے سوا دنیا بھر میں اور کہیں نہیں ہے ، مسلمانوں کو ابتداءً اسی کان کا پتہ تھا چنانچہ انہوں نے اس کا نام بھی اس موضع کے نام پر کلہ رکھدیا ، عربوں نے اسکو قلعہ کر لیا اب یہ عربی لفظ ہو گیا کیونکہ قلعہ کا عربی مفہوم کھودنا یا اکھیڑنا ہے چونکہ کان بھی کھودی جاتی ہے اسی قلعہ کی مناسبت سے قلعی کا لفظ نکلا جو "الرصاص القلعی" کا مخفف ہے ۔

قرآن مجید میں ، زکوۃ ، مشکوۃ ، انجیل ، فیل ، استبرق وغیرہ بعض مذہبی اور تمدنی الفاظ ایسے ہیں جنکو آج کل نہایت زبردست دلائل کی بنا پر غیر زبانوں کا لفظ بنا دیا جاتا ہے لیکن مسلمان علمائے لغت میں اختلاف ہے کہ آیا قرآن مجید میں غیر زبانوں کے الفاظ ہیں یا نہیں محققین کی اکثریت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ قرآن میں ایک لفظ بھی غیر عربی نہیں ، اور انہوں نے فیل کے علاوہ ہر لفظ کا عربی اشتقاق اور عربی وجہ تسمیہ بتائی ہے ۔ مخالفین کیطرف سے یہ دلیل پیش کیجاتی ہے کہ قرآن مجید میں فیل استبرق ، سندس ، کافور ، زنجبیل وغیرہ ایسی چیزوں کے نام بھی ہیں جو عرب

یں پیدا ہوتی ہی نہیں۔ اس لئے یقیناً ان چیزوں کے ساتھ انکے اسامی غیر زبانوں سے آئے ہوں گے۔

یہ [illegible] ہے مگر غلط فہمی پر مبنی ہے جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ نہیں انکے معنی یہ نہیں ہیں کہ غیر عربی چیزوں کے نام قرآن مجید میں نہیں آتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جتقدر الفاظ ہیں وہ سب عربی کے مخصوص اوزان کے مطابق ہیں اور انکو عربی کے مادوں کے ساتھ اشتقاقی قرابت بھی ہے۔

جو لوگ استبرق کا مادہ "برق" کو بتاتے ہیں انکا مطلب یہ ہے کہ مدلول استبرق میں ایک وصف ایسا بھی ہے جس پر ب رق کے مشتقات دلالت کرتے ہیں۔

عام محاربین ائمہ فن کے اس قسم کے اقوال کو انکی لاعلمی پر محمول کرینگی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم عرب علمائے لغت کے ایسے متعدد اقوال پیش کرسکتے ہیں جن سے پتہ چلیگا کہ یہ لوگ لفظ کو عجمی مانتے ہوئے بھی اسکا عربی اشتقاق بتانیکی کوشش کرتے تھے، یاقوت کی معجم البلدان دیکھو اور مندرجہ ذیل جگہوں کے ناموں پر غور کرو۔ یاقوت نے سب کو عجمی تسلیم کرتے ہوئے انکی عربی وجہ اشتقاق بھی بتائی ہے۔

آمد دیار بکر میں ایک مشہور شہر تھا۔ یہاں کے بہت سے علما مشہور تھے، یاقوت نے صرف لفظوں میں تسلیم کیا ہے کہ

وما اظنہ الا لفظہ رومیۃ — میں اس کو رومی کے سوا کچھ نہیں جانتا

وہ کہتے ہیں کہ یہ عربی مادہ (ء م د) کا اسم فاعل ہے۔ آمد کا مفہوم عربی میں ہے غصہ کرنیوالا اس کے بعد فرماتے ہیں۔

والجامع بینہما ان حصا تہا مع

تغضب من ارادہا

نسف ماوراء النہر میں نسف نام کا ایک شہر تھا یاقوت اس نام کو عجمی تسلیم کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ عربی میں یہ گویا نسف (بہت موٹا آدمی جو کام نہ کرسکے) کی جمع ہے۔

قرطبہ یہ عجمی ہے عربی میں قرطب بمعنی دبا و اکر نیکے ہیں گو قرطبہ کا مفہوم مفتوحہ زمین ہے ۔

ہذار یہ بھی عجمی ہے اس عربی مرح ذرہ یذرہ کا مادہ ہے جسکا ماضی مستعمل نہیں اس صورت میں اسکا ترجمہ متروکہ علاقہ ہوگا یا پسندیدہ نفسہ سے ماخوذ ہے اور اس صورت میں یہ جگہ ناپاک دل والوں کی بستی ہوگی ۔

طیلسان ۔ اس کے متعلق صاف اقرار کیا ہے کہ "فارسی ہے عربی بنالیا گیا اصل اسکی تالشان ہے پھر بھی فرماتے ہیں کہ اسکا ماخذ اطلس (وہ بھیڑیا جس کے بال جھڑ گئے ہوں) کا مصدر طلس یا طلسم ہے۔

غرض ان چند مثالوں سے یہ معلوم ہوا کہ علمائے لغت معرب الفاظ کو عجمی تسلیم کر لینے کے باوجود اس لفظ کا عربی ماخذ بھی تلاش کرتے رہے کیونکہ ان کو علم تھا کہ اہل عرب عجمی الفاظ کو جبتک عربی نہ بنالیتے تھے اسوقت تک وہ آزادی کیساتھ ان الفاظ کا استعمال کرنا پسند نہ کرتے تھے ، اور تعریب کی شرائط میں سے ایک انکے خیال میں یہ بھی تھی کہ لفظ کو حتی الوسع ہر حیثیت سے عربی ہونا چاہئے ۔

آجکل جو عربی اخبارات اور رسائل نکلتے ہیں انکو دیکھکر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عربوں کا وہ جذبہ تعریب فنا ہوگیا ہے تاہم اب بھی مصر و شام میں کچھ ماہران تعریب اسکا خیال رکھتے ہیں مصر کے ایک ماہر تعریب شیخ ابراہیم یازجی نے سائن بورڈ کیلئے ارمہ کیا اچھا لفظ وضع کیا ہے اسکی اصل ایک فرانسیسی لفظ آرمایری

(Armaire) ہے جو (Armore) آرمیر (فوجی - لڑنیوالا سپاہی) سے ماخوذ ہے یہ لفظ عربی میں (آرما) کی صورت میں آیا ، اصلی زبان میں شاہی علم یا جھنڈے کو کہتے تھے ۔ کثرت استعمال نے اسے ہر جماعت کے شعار اور سائن بورڈوں کیلئے عام کر دیا ۔ شیخ ابراہیم یازجی نے بدل کر اسے ارمہ کر دیا اب یہ خالص عربی لفظ ہوگیا ہے کیونکہ ارمہ (نشان جماعت نشان دکان) کو ارزوم (نشانات راہ) سے خاص مناسبت ہے اور لفظ عربی وزن پر ہوگیا ہے ۔ اس کے علاوہ مصر و شام میں مختلف اشخاص اور مختلف جماعتیں جو جدید الفاظ کے وضع کرنے یا اجنبی الفاظ کے معرب بنانے میں نہایت سرگرم اور کوشاں ہیں انکے متعلق ہم انشاء اللہ آئندہ صحبت میں تفصیل سے بحث کرینگے ۔

بادشاہ دہلی اور کمپنی بہادر کی خط وکتابت

جب سے دہلی کی سلطنت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آئی اُسوقت سے سلاطین دہلی کی حیثیت کمپنی کے ہاتھ میں ایک موم کے گڈے کی سی ہوگئی اخیر زمانہ میں معلوم نہیں گذشتہ شاہانہ وقار کا پاس کرکے یا شاید اس خیال سے کہ عوام میں بے چینی و اضطراب نہ پیدا ہو، کارکنان کمپنی ان بادشاہوں کا ان کے روزانہ کے اخراجات کیلئے کوئی جاگیر یا سالانہ وظیفہ مقرر کردیا کرتے تھے اس پر بھی جوں جوں کمپنی کا اثر و اقتدار بڑھتا گیا انکی جاگیروں اور وظیفوں میں روز بہ روز کمی آتی گئی آج کوئی علاقہ ہاتھ سے نکل گیا کل کسی رقم میں کمی کردی گئی کبھی کوئی عہدہ چھین لیا گیا غرض اس طرح رفتہ رفتہ انکی تمام املاک و جائداد انکے ہاتھ سے نکل گئی اور آج بہت سے ایسے شاہی خاندان کے ممبران ہیں جنکا ماہانہ وظیفہ دو تین روپے سے زیادہ نہیں ہے اور اسے بعض قناعت پسند طبیعتیں مراحم خسروانہ سے تعبیر کرتی ہیں۔ بہرحال سلاطین مغلیہ کے وظائف و جاگیروں کی تخفیف کو خواہ حکام برطانیہ کی ناانصافی اور غصب حقوق سے تعبیر کیا جائے یا رہا سہا جو کچھ بھی وظیفہ ملتا ہوا اسے مراحم خسروانہ اور الطاف کریمانہ کا ایک جزو سمجھا جائے یہ اپنی جگہ پر درست ہے کہ اسی قسم کے واقعات پیش آئے، چنانچہ ایسا ہی ایک واقعہ انیسویں صدی کے اوائل نصف کا بھی ہے جبکہ سلطان معین الدین اکبر شاہ ثانی دہلی کے برائے نام تاجدار تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کیطرف سے لارڈ ہیرسٹ ہندوستان کے اصلی والی اور حکمراں بنے ہوئے تھے۔ قابل پور (یا کبیر پور) ایک موضع دریائے جمنا کے کنارے واقع تھا اس کے مغرب اور شمال کے درمیان جو گاؤں پڑتے تھے وہ بادشاہ موصوف کیلئے بطور جاگیر کے وقف کردئے گئے تھے۔ اس علاقہ کا تمام انتظام و انصرام ریزیڈنٹ کے سپرد تھا لیکن خزانہ عامرہ سے ایک مقررہ رقم وظیفہ کی صورت میں ہر سال بادشاہ کو ملاکرتی تھی خواہ اس علاقہ سے وہ رقم پوری وصول ہوتی یا نہوتی یہ جاگیر یا وظیفہ بادشاہ کو اس عہدنامہ کی بنا پر ملا تھا جو انکے والد بزرگوار شاہ عالم ثانی اور لارڈ ولزلی کے درمیان طے پایا تھا۔ اس عہدنامہ کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ ایک مقررہ رقم بادشاہ کو ہر سال دیجایا کرے خواہ وہ رقم پوری کی پوری

علاقہ مذکورہ سے وصول کر لیجائے یا اسکا کچھ حصہ کمپنی کو اپنے خزانہ سے دینا پڑے لیکن کچھ عرصہ کے بعد کمپنی کیطرف سے اس وظیفہ میں کمی ہونے لگی جو بادشاہ کو سخت ناگوار گزری اور یہ تخفیف نہ صرف ناگوار خاطر ہی ہوئی بلکہ اسکی وجہ شاہی اخراجات پورے ہونے مشکل ہو گئے۔ مزید براں یہ کہ ابتک افسران کمپنی جب کبھی شاہان مغلیہ کو کسی تحریر یا تقریر میں مخاطب کرتے تھے تو القاب یا آداب میں انکے شاہی مراتب کو برابر ملحوظ رکھتے تھے لیکن عزت واحترام کے دو لفظ بھی انکو گراں معلوم ہونے لگے اور وہ اب سے انہیں اپنی تحریروں اور تقریروں میں مساویانہ القاب سے یاد کرنے لگے بادشاہ سلامت کو افسران کمپنی کے اس رویہ سے بھی ایک بڑی حد تک شکایت تھی۔

لیکن دراصل جس چیز کی سب سے زیادہ شکایت تھی، وہ وظیفہ کی تخفیف تھی جس سے فی الحقیقت شاہانہ اثر واقتدار میں بہت کمی آجانے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ بادشاہ سلامت نے یہ ارادہ کیا کہ کمپنی کی اس ناانصافی اور اپنی حق تلفی کی اپیل ملک معظم انگلستان کے پاس کریں، ممکن ہے کہ وہ ہم رتبگی کا خیال کرکے اسکی کچھ شنوائی کریں اور معاملہ روبراہ ہو جائے۔ اسی زمانہ میں رام موہن رائے اپنی ملازمت سے دست بردار ہو کر کلکتہ میں آکر مقیم ہوئے تھے جہاں اب آپکا شغلہ تعلیمی، معاشرتی اور مذہبی اصلاح کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انہی دنوں آپکا خیال انگلستان جانیکا ہو رہا تھا کہ شدہ شدہ یہ خبر آپکے کانوں تک پہنچ گئی کہ بادشاہ موصوف اپنے معاملہ کی چارہ جوئی ملک معظم انگلستان کے پاس کرنی چاہتے ہیں چنانچہ آپنے دیکھا کہ موقع اچھا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ فوراً انہوں نے بادشاہ سلامت کے پاس ایک عرضی گزرانی جسمیں خاندان شاہی سے اپنے قدیم تعلقات ظاہر کرنیکے بعد اس خدمت کیلئے اپنے کو پیش کیا۔ دبیر الدولہ سے آپکی دوستی تھی انہوں نے بادشاہ سے انکے لئے سفارش کی کہ آدمی اچھا ہے چنانچہ بادشاہ سلامت کیطرف سے اس کا جو جواب ملا ہے وہ یہ ہے۔

"آپ کو معلوم ہو کہ عرضی مورخہ ۲ مارچ ۱۸۲۹ء ہمارے حضور میں دبیر الدولہ نے گزرانی اور اس کے مضمون سے ہمیں اطلاع ہوئی۔

ایک عرصہ سے ہماری یہ خواہش رہی ہے کہ اس معاملہ کو پہلے کلکتہ میں پیش کیا جائے اور پھر

اس کے بعد انگلستان لیا جائے تاکہ ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ دراصل اس قوم میں انصاف کس حد تک موجود ہے لیکن مختلف وجوہ سے یہ معاملہ ابتک نہیں چھیڑا گیا چنانچہ اب ہم آپ کو اس غرض کیلئے لکھتے ہیں کہ آپ ایک اپیل کا خاکہ فارسی میں لکھکر اور اسی کے ساتھ اسکا انگریزی ترجمہ ہمارے سامنے پیش کیجیے۔

اگرچہ ان اعلیٰ خدمات کی بنا پر جو آپکے دادا نے ملک معظم آنجہانی کے وقت میں صوبجات مشرقی کے زمانہ قیام میں انجام دی ہیں، ہمیں آپ پر پورا اعتماد تھا۔ لیکن اب وزیر الدولہ کی گفتگو سے آپکے جوش عقیدت کا حال معلوم کرکے ہمیں اور بھی زیادہ اطمینان ہو گیا ہے کہ آپ اس معاملہ کو جو ہمارے دل سے لگا ہوا ہے پورے طور سے انجام دینگے اور ہمیں قوی امید ہے کہ آپ اپنی قابلیت کے مطابق اس معاملہ میں پوری کوشش اور جانفشانی سے کام لیں گے اور ہمارے احکام کے مطابق عمل کرتے رہیں گے۔

نیز ہم یہ بھی اطلاع کرنی چاہتے ہیں کہ دبیر الدولہ نے بعض انگریزی کاغذات کی نقلیں مہیا کی ہیں اور دو یا تین تو ابھی حال میں پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ ان دستاویزات سے شاہی مقصد کی کامیابی میں بہت زیادہ مدد ملیگی۔ لہذا ہم ان کاغذات کو آپکے پاس بھیجتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ اگر آپ انہیں کارآمد سمجھتے ہوں تو اپنے پاس محفوظ رکھئے۔ ۱؎

لیکن انکے علاوہ بھی رام موہن رائے کو کچھ اور کاغذات کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ انہوں نے دربار شاہی میں لکھ بھیجا اور بادشاہ نے اپنے وکیل خاص مرزا افضل بیگ کو ایک خط دیکر مسٹر اے سٹرلنگ کے پاس بھیجا ہوا اسوقت فارسی زبان کے تمام کاغذات و دستاویزات کے معتمد (سکرٹری) تھے

۱؎ ان تمام خطوط کی اصل یا تو فارسی میں ہے یا انگریزی میں ہے جن کا طرز بیان بالکل قدیم اور اب متروک ہے۔ چنانچہ محاورہ اور زبان کے خیال سے ہم نے انکے ترجمہ میں کسی قدر ترمیم سے کام لیا ہے لیکن ویسے جہانتک کہ مضمون میں فرق نہ آئے۔

لیکن یہ کاغذات انہوں نے نہ دئے اور لکھا کہ ۔

"جن کاغذات کی نقول آپ کو درکار ہیں انکے متعلق میرا خیال ہے کہ اگر آپ ریزیڈنٹ مقیم شاہجہاں آباد (دہلی) کے دفتر سے طلب کریں تو زیادہ بہتر ہے جہاں تمام کاغذات محفوظ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ حضور کے افسران جہاں ریزیڈنٹ بہادر دہلی سے درخواست کرینگے وہ فوراً وہ کاغذات انہیں دیدینگے، زیادہ حد ادب "

چنانچہ ۲۳ ر اکتوبر ۱۸۲۸ء کو بادشاہ نے ریزیڈنٹ دہلی، سر ایڈورڈ کولبروک کو ایک رقعہ بھیجا جسمیں انہوں نے انگریزی کاغذات کی ایک فہرست دی تھی جنکی نقل انہیں چاہئے تھی۔ مگر ریزیڈنٹ نے بھی اس حکم کی تعمیل سے انکار کردیا۔ اب بادشاہ نے مجبور ہو کر فروری ۱۸۲۹ء میں ایک خط گورنر جنرل کے پاس لکھا جسمیں انہوں نے بتفصیل اپنے اس ارادہ کا اظہار کرنیکے بعد کہ وہ جاگیری علاقہ کے پوری مالگذاری نہ ملنے کی اپیل ملک معظم انگلستان کے پاس کرنی چاہتے ہیں اور اس غرض سے انہیں چند کاغذات کی ضرورت ہے جنکی نقل انہیں دلادی جائے۔ یہاں سے بھی وہ کاغذات انہیں نہ ملے۔ اب بادشاہ نے مجبور ہو کر رام موہن رائے سے ایک درخواست براہ راست ملک معظم انگلستان کے پاس لکھوائی اور اسی کے ساتھ اس درخواست کی ایک نقل مع ایک خط کے چیف سکرٹری کے توسط سے حکومت ہند کے پاس بھی بھیجی جسمیں رام موہن رائے نے لکھا کہ

"چونکہ درخواست ہذا کا مضمون حکومت ہند کے طریق عمل سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا مجھے ملک معظم ابو النصر معین الدین محمد اکبر بادشاہ کیطرف سے یہ حکم ملا ہے کہ اسکا مضمون میں گورنر جنرل باجلاس کونسل کی اطلاع کیلئے آپکے پاس بھیجدوں تاکہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو ان شکایات کو خود رفع کردیں ملک معظم انگلستان کے نام جو خط لکھا گیا ہے وہ بھیجا جاچکا ہے اور اسکی ایک دوسری نقل میں خود اپنے ہمراہ لیکر انگلستان جانیکی تیاری کر رہا ہوں"۔

یہ سنکر گورنر جنرل کے حواس باختہ ہوگئے اور انہوں نے فوراً ریزیڈنٹ کے توسط سے ایک خط لکھا جسمیں انہوں نے اپنے انتہائی حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور یہ دریافت کیا کہ آیا بادشاہ سلامت

نے رام موہن رائے کو اپنا سفیر مقرر کیا ہے یا یہ یونہی بن بیٹھے۔ وہ خط یہ ہے۔

"نائب صدر باجلاس کونسل کی اسوقت یہ خواہش ہے کہ آپ بادشاہ سلامت سے صرف اس حیرت کا اظہار کر دیں جس سے حکومت نے انکے مذکورہ بالا خط کو دیکھا ہے اور بالخصوص ان بے بنیاد اور بے حد و پایاں الزامات پر انہیں سخت تعجب ہے جو کمپنی بہادر کے شاہی عہد نامہ کی خلاف ورزی کرنیکے متعلق لگایا گیا ہے۔ اسوقت یہ امر غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ اس قرارداد سے سر مو بھی تجاوز کیا جائے جو ان مطلوبہ کاغذات کے متعلق پہلے منظور کیجا چکی ہے۔

نیز مجھے ہدایت کیگئی ہے کہ میں بابو رام موہن رائے کے متعلق بادشاہ سے یہ اطمینان کرلوں کہ آیا وہ انہیں اپنا سفیر تسلیم کرتے ہیں"

گورنر جنرل کے اس خط کے بعد ریزیڈنٹ نے خود بادشاہ سے ملاقات کرنی چاہی جو اسوقت رمضان کی وجہ سے نہو سکی لیکن چند دنوں میں روزے گزر جانیکے بعد بادشاہ نے انہیں شرف باریابی بخشا۔ اس ملاقات میں جو نج کی گفتگو ہوئی، اسکی اطلاع ریزیڈنٹ نے گورنمنٹ کو جن لفظوں میں دی اسکا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"بادشاہ سلامت تسلیم کرتے ہیں کہ بیشک انکا یہ ارادہ ہے کہ وہ بابو رام موہن رائے کو اپنا سفیر بنا کر انگلستان بھیجیں تاکہ وہ وہاں جاکر ملک معظم کی خدمت میں ایک خط پیش کریں۔ آپنے یہ بھی ظاہر فرمایا کہ انکو اس خدمت پر مامور کئے جانے کی تجویز سب سے پہلے فریدالدین خاں دبیر الدولہ نے کی ہے۔ بادشاہ سلامت نے اسی کے ساتھ اپنے منشی سے مجھے اس خط کا مسودہ بھی سنوایا جو وہ انگلستان بھیجنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اسکی ایک مہر شدہ صاف نقل رام موہن رائے کے پاس موجود ہے۔ میں نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ اس خط کی ایک نقل مجھے بھی ملنی چاہئے تاکہ میں اسکا مضمون بیان کرنے میں اپنے حافظہ پر بھروسہ کرنیکی بجائے خود اس نقل کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کر دوں لیکن

مجھ سے کہا گیا کہ غالباً رام موہن رائے نے خود اسکی ایک نقل گورنمنٹ میں بھیجدی ہوگی
بادشاہ سلامت کو بہت افسوس ہوگا اگر اس خط کا کوئی فقرہ یا جملہ گورنر جنرل
بہادر کی نظر میں قابل اعتراض معلوم ہوا اور انہوں نے فرمایا کہ یہ انتہائی احتیاج تھی
جس نے انہیں اس طریقۂ عمل کے اختیار کرنے پر مجبور کیا کہ وہ اپنا ایک سفیر انگلستان
بھیجیں اس سے پہلے تھوڑے بہت اضافہ وظیفہ کی جو درخواستیں وہ بھیجتے تھے تو انکا اثر
یہ ہوتا تھا کہ کچھ نہ کچھ وظیفہ بڑھا دیا جاتا تھا لیکن انکے خاندان کی جو حالت اسوقت ہے
اور انکے قریبی اور دوری رشتہ دار جیسے حاجتمند نظر آتے ہیں اسکی بنا پر یہ ضروریات
روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔ انہوں نے ارل آمہرسٹ سے جو گذارشات کی تھیں
انمیں انہوں نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ تھوڑی بہت ممکن اعانت پر بھی قناعت
کرلیں گے بلا لحاظ اس کے کہ وہ کتنے کے مستحق ہیں لیکن انکی اس درخواست کو نامنظور
کر دیا گیا اور اب اس کے بعد جو مایوسی ہوئی ہے وہی انکے اس اپیل کا اصلی سبب ہے۔
اپنی ان مصیبتوں کو ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ آج سے ۲۵ سال پیشتر
انکے تمام بھائیوں اور بہنوں کیلئے فی کس ۲۵ روپیہ ماہانہ مقرر کیا گیا تھا لیکن اب اتنی
ہی رقم انکے بیٹوں اور پوتوں پر بھی تقسیم کرنی پڑتی ہے اور باوجود کمال ہمدردی و
اعانت کے جو انکے بس میں ہے انمیں سے اکثر کو ۵ روپیہ ماہانہ سے بھی زیادہ نہیں
پڑتے ہیں اور بعضوں کو تو وہ بھی نہیں ملتے،،

ریزیڈنٹ نے یہ شکایتیں اور واقعات جو گورنر جنرل کے سامنے پیش کئے ان سے انکی آنکھیں
کھل گئیں اور انہوں نے مجبور ہوکر رام موہن رائے کے خط کی نقل اور بادشاہ کی درخواست دونوں
کو مع اپنے ایک خط کے کورٹ آف ڈائرکٹران کے سامنے پیش کر دیا۔ اسکا جو کچھ اثر ہوا اسکا ذکر
تو بعد میں آئیگا لیکن اسوقت چونکہ رام موہن رائے کی روانگی کا زمانہ قریب آرہا تھا اس لئے
انہوں نے پھر ایکبار گورنمنٹ کے پاس ان کاغذات کیلئے لکھا لیکن انہیں پھر اسی ناکامی کا منہ

دینا پڑا۔ اس کے بعد رام موہن رائے نے یہ کوشش کی کہ بادشاہ دہلی کیطرف سے جو راجہ کا خطاب ملا ہے اسے وہ باقاعدہ طور پر حکومت ہند سے تسلیم کرالیں چنانچہ اس غرض کیلئے انہوں نے ایک خط حکومت کے پاس بھیجا لیکن حکومت نے اسے تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا اسی عرصہ میں رام موہن رائے کی بعض دوسرے حلقوں سے بھی مخالفتیں ہونے لگیں یہ حال دیکھکر انہیں اندیشہ ہوا کہیں اس تو تو میں میں انکا انگلستان کا جانا بھی نہ رہجائے۔ اس لئے انہوں نے یہ سب بحث و تکرار چھوڑ کر نجی حیثیت سے جانیکی ٹھانی اور فوراً ہی پاسپورٹ کیلئے ایک درخواست بھیجدی جو بلا کسی مزید وقت کے منظور ہوگئی اور انہیں پاسپورٹ ملگیا۔ غرض رام موہن رائے ۱۵ نومبر ۱۸۳۰ء کو البیون جہاز سے انگلستان روانہ ہوگئے۔

۸ جولائی ۱۸۳۱ء کو رام موہن رائے صحیح وسلامت انگلستان پہنچے یہاں آپکا نہایت شاندار خیر مقدم ہوا۔ مختلف دعوتیں ہوئیں۔ متعدد ایڈریس پیش کئے گئے۔ شہنشاہ انگلستان اور شہنشاہ فرانس نے ہندوستان کے اس شاہی سفیر کو شرف باریابی بخشا اور اپنے ساتھ ایک سے زاید بار کھانے پر مدعو کیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن اصل مقصد ابھی باقی تھا جس کے طفیل میں انکو یہ اعزاز و اکرام حاصل ہوا۔ اس کے لئے رام موہن رائے نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ اس اپیل کے مضمون کی ایک تحریر جو تاجدار دہلی کی طرف سے انہوں نے ملک معظم انگلستان کے پاس بھیجی تھی چھپوا کر انگلستان کے تمام ذی اثر اور با اختیار لوگوں کے پاس بھیجی اور اسکی ایک نقل کورٹ آف ڈائرکٹران میں بھی پیش کر دی۔

اسی عرصہ میں (۳۰-۱۸۲۸ء) کورٹ آف ڈائرکٹران کے پاس حکومت بنگال کیطرف سے متعدد مراسلے اور تحریریں پہنچ چکی تھیں جسکا اثر یہ ہوا کہ کورٹ نے بادشاہ کے وظیفہ میں ۳ لاکھ سالانہ کا اضافہ منظور کرلیا اور اسے انہوں نے ایک خط میں نہایت تفصیل کے ساتھ ظاہر کیا ہے جو گورنر جنرل با اجلاس کونسل کے نام ۱۲ فروری ۱۸۳۳ء کو لندن سے بھیجا گیا تھا۔ لکھتے ہیں کہ

"۲۔ ہم اس بات کو منظور کرنے کیلئے خوشی تیار ہیں کہ وہ وظیفہ جو ملک معظم اور انکے شاہی

خاندان کی امداد و اعانت کیلئے مقرر کیا گیا تھا، ۱۵ لاکھ روپیہ سالانہ تک بڑھا دیا جائے اور اس بات کو ہم آپکے اختیار میں چھوڑتے ہیں کہ یہ تین لاکھ کی اضافہ شدہ رقم آپ جس طرح مناسب اور صحیح سمجھیں اہل خاندان کے حقوق کا لحاظ رکھتے ہوئے انپر جس طرح چاہیں تقسیم کر دیں۔

۴۔ یہ امر نہایت واضح طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ اس اضافہ وظیفہ کو جو ہم اسوقت منظور کر رہے ہیں بادشاہ دہلی کو اپنے ہر قسم کے مطالبات کے جواب میں قبول کرنا ہوگا۔

۵۔ ہم اس اطلاع کا ذکر کر دینا بھی مناسب سمجھتے ہیں جو قلعہ کی ناگفتہ بہ حالت اور اسکی مرمت کے مصارف کے متعلق ہمارے پاس پہنچی ہے اگر اس اضافہ شدہ رقم کی مستحقین کو دیئے جانے پر قلعہ کی مرمت آپکے خیال میں دشوار معلوم ہو تو اسکے لئے آپ خود ایک رقم منظور کر سکتے ہیں اسکے بعد قلعہ کی مرمت و درستگی کا تمام خرچ رئیس خاندان کے سر رہا کرے گا۔"

غرض کورٹ آف ڈائرکٹران کا یہ فیصلہ حکومت ہند کے توسط سے بادشاہ دہلی کے پاس پہنچا جسے بادشاہ نے منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا اسلئے کہ وہ تین لاکھ کے اس حقیر اضافہ کو مع ان شرائط کے اسوقت تک منظور کرنا نہیں چاہتے تھے جبتک کہ خود انکے سفیر رام موہن رائے کیطرف سے اس امر کے متعلق کوئی اطلاع نہ آجائے۔ چنانچہ انہوں نے اسکے جواب حکومت ہند کے پاس جو خط لکھا وہ حسب ذیل ہے۔

"آپکی عرضی مورخہ ۱۲ جولائی ۱۸۳۳ء موصول ہوئی جسمیں آپ نے یہ اطلاع دی ہے کہ کورٹ آف ڈائرکٹران نے از راہ عنایت میرے مقررہ "پیشکش" میں تین لاکھ روپیہ سالانہ کا اضافہ منظور کیا ہے اور یہ اضافہ میرے تمام ان مطالبات کے جواب میں ہے جو میں نے راجہ رام رائے کے ذریعہ سے پیش کئے ہیں اس کے ساتھ آپنے مجھے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ یہ حکومت ہند کے اختیار میں ہے کہ وہ اس رقم کو جس طرح چاہیں

ارکان خاندان میں تقسیم کریں اور یہ کہ اس رقم کا ایک حصہ قلعہ اور اس کے متعلقہ عمارت کی مرمت و درستگی کے لئے علیحدہ کر دیا جائے۔

کورٹ آف ڈائرکٹران نے میرے سالانہ "پیشکش" میں جو کچھ بھی اضافہ کیا ہے اسکا میں دل سے شکر گزار ہوں لیکن جہاں تک میرے ان مطالبات کا تعلق ہے جو افسران کمپنی کے ساتھ معاہدہ و معاملہ پر مبنی ہیں وہ اس سے کہیں بلند پایہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مطالبات کو تسلیم کرانے کیلئے میں نے جو شاہی سفیر بھیجا ہے وہ ابتک انگلستان میں مقیم ہے تا وقتیکہ اُسکی طرف سے مجھے کوئی اطلاع نہ ملجائے، میں ان شرائط کو ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ یہ باتیں میں نے اُسوقت بھی کہی تھیں جب آپ مجھسے ملے تھے۔"

بادشاہ کا یہ جواب مسٹر فریزر سکریٹری گورنر جنرل نے انگریزی میں ترجمہ کر کے گورنمنٹ کے پاس پیش کیا اور اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ

"پرسوں مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ رام موہن رائے کے خطوط بادشاہ کے پاس آگئے ہیں جنمیں انہوں نے یہ ہدایت کی ہے کہ وہ کسی ایسی درخواست کو ہرگز منظور نہ کریں جس سے انکے ان مطالبات کا فائدہ ہاتھ سے جاتا ہو جو انگلستان میں پیش کئے گئے ہیں اور جنکے متعلق امید ہے کہ رام موہن رائے کی کوششوں سے منظور کر لئے جائینگے"

بادشاہ کا جواب اور اسپر مسٹر فریزر کا یہ خط پانیکے بعد گورنر جنرل نے کورٹ آف ڈائرکٹران کو لکھا کہ بادشاہ نے اضافہ وظیفہ مع ان شرائط کے جو اسکے ساتھ وابستہ ہیں منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے جس کے جواب میں کورٹ آف ڈائرکٹران نے گورنر جنرل کو ایک خط لکھا جو حسب ذیل ہے۔

"۲۰۔ بادشاہ دہلی نے ہمارے اضافہ کردہ وظیفہ کو مع ان شرائط کے منظور کرنے سے اسوقت تک کیلئے انکار کر دیا ہے جبتک کہ انہیں انکے سفیر مقیم انگلستان کیطرف سے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملجائے آپنے خوب کیا جو انہیں یہ اطلاع کر دی کہ آپ

کو اس موضوع پر مزید بحث مباحثہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے اور یہ آپکے (بادشاہ کے) نامنظوری کی اطلاع ہمارے پاس (کورٹ آف ڈائرکٹران) کر دیجائے گی۔ اگر انکی نئی درخواست آپکے پاس آئے تو آپ ہمیں فوراً اطلاع کیجیے۔ لیکن اس کے بعد اگر وہ اس اضافہ کو مع ان شرائط کے منظور کرنے پر مائل ہوں تو آپ کو پورا اختیار ہے کہ ان انتظامات کو پورے طور پر عمل میں لائیں جو ہمارے مراسلہ مورخہ ۱۳ر فروری ۱۸۳۲ء میں درج ہیں۔"

بدقسمتی یا خوش قسمتی (کمپنی کے نقطہ خیال سے) سے اسی عرصہ میں رام موہن رائے کا ۲۷ر ستمبر ۱۸۳۳ء کو انتقال ہوگیا جس سے وہ مقصد پورا نہ ہوسکا جس کیلئے وہ انگلستان بھیجے گئے تھے اور وہی اضافہ وظیفہ جسے چند دن پہلے بادشاہ نے نہایت حقارت کیساتھ ٹھکرا دیا تھا اسے اب مع ان تمام شرائط اور پابندیوں کے منظور کرنا پڑا۔ چنانچہ ۱۲ر ستمبر ۱۸۴۴ء کو بادشاہ نے مسٹر فریزر کے نام جو خط لکھا اسمیں انہوں نے نہایت گول مول الفاظ میں اس اضافہ کو مع ان شرائط کے منظور کیا ہے۔ اپنے اس خط میں وہ لکھتے ہیں کہ :-

"ہم نے جو خط بھیجا تھا اور جسمیں ہم نے یہ لکھا تھا کہ آیا گورنمنٹ کا ارادہ اضافہ کردہ رقم یعنی تین لاکھ روپیہ میں کچھ اور بڑھانے کا ہے یا نہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو تمام رقوم اضافہ کئے جانیکی تاریخ سے آج تک ہمارے پاس بھیجدیجائیں، اسکے جواب میں آپکی عرضی موصول ہوئی جس میں آپنے یہ لکھا ہے کہ آپکی عرضی کے جواب میں ابتک کوئی ہدایات نہیں ملی ہیں۔ نیز آپنے یہ بھی فرمایا ہے کہ مجھے اس اضافہ کے مع ان شرائط کے منظور کرنیکی صورت میں ایک خط لکھنا چاہیئے تاکہ وہ خط مع ایک رپورٹ کے گورنمنٹ کے پاس بھیجدیا جائے اور یہ بھی کہ حسب ہدایات میں عمل کروں۔ آپنے پہلی عرضی جو بھیجی تھی اسمیں آپنے لکھا تھا کہ منجملہ اور شرائط کے ایک شرط یہ ہے کہ اس رقم کا کچھ حصہ گورنمنٹ کی خواہشات کے مطابق خاندان شاہی کے ارکان میں تقسیم کیا جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ان معاملات کو جو رام موہن بابو کے سپرد کئے گئے ہیں، آگے نہ بڑھایا جائے۔ تیسری یہ ہے کہ اس اضافہ

شدہ رقم میں سے کچھ حصہ قلعہ اور اس کے متعلقہ عمارات کی مرمت و درستگی کے لئے علیحدہ کر دیا جائے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اس اضافہ شدہ رقم میں سے کچھ حصہ اہل خاندان کو دیا جائے گا اور اسکی اطلاع حکومت کو کر دی جائیگی۔ رہا مطالبات پر مصر رہنے کا سوال کہ جسکے لئے راجہ رام موہن رائے انگلستان بھیجے گئے تھے اور جو خود گورنمنٹ کے وعدوں اور معاہدوں کی رو سے عاید ہوتے ہیں اگر گورنمنٹ آف ڈائرکٹران کا انصاف صرف اسقدر اضافہ کا مقتضی ہے جو میرے ساتھ کیا گیا ہے تو کیا مجھے اس سے زیادہ حاصل کرنے یا گورنمنٹ کے معاہدوں کے تسلیم کرانے کا کوئی اور اختیار ہے؟ روزانہ کے کثیر اخراجات کی وجہ سے قرضخواہوں کا جو شدید تقاضہ ہو رہا ہے اور اس کثیر رقم کی وجہ سے جو مجھے اپنے سفیر کے انگلستان بھیجنے میں صرف کرنی پڑی ہے ان ہر دو وجوہ سے مجبور ہو کر میں نے یہ اضافہ اسوقت منظور کر لیا ہے۔ لیکن چونکہ گورنمنٹ کے معاہدوں کی رو سے ہمارے مطالبات اس سے کہیں زیادہ ہیں لہذا آپ دریافت کیجئے اور لکھئے کہ صرف تین ہی لاکھ روپیہ سالانہ کی کیوں منظوری دی گئی اور صرف اسی قدر اضافہ کرنیکے کیا وجوہ و اسباب ہیں؟"

رہا القاب و آداب کا سوال کہ جن کے متعلق بھی شکایت ہے۔ اسکے بارہ میں میں یہ گزارش کروں گا کہ جو عزت میری لارڈ امہرسٹ کے ساتھ قائم رکھی گئی تھی کم سے کم وہی آیندہ بھی باقی رہنی چاہئے (یعنی یہ کہ آیندہ گورنران سے ملاقات کا بھی وہی دستور ہوگا جو لارڈ امہرسٹ کے ساتھ تھا) اور اب سے لارڈ ولیم بنٹنگ مجھے ان الفاظ کیساتھ خطاب کریں جنکا پہلے رواج تھا یعنی الفاظ میں لارڈ امہرسٹ کیا کرتے تھے اس بارہ میں میں گورنر جنرل سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اسے تسلیم کرینگے۔

قلعہ اور اس کے متعلقہ عمارات کی درستگی و مرمت میں خود اپنے آرام و آسائش کے خیال سے بھی ضروری سمجھتا ہوں اور اس کے لئے ایک ماہانہ رقم علیحدہ کر دیجایا کریگی

شاید آپ واقف نہیں کہ مجھ پر قرضخواہوں کا کسقدر شدید تقاضا ہے اور روزانہ کے اخراجات تک کا بھی کوئی سہارا نہیں ہے۔ مہربانی کر کے آپ فوراً گورنر جنرل کو لکھئے اور اضافہ شدہ وظیفہ جس تاریخ سے منظور ہوا ہے اُسوقت سے لیکر آجتک کا وصول کر کے بھیج دیجئے۔"

لیکن اس دردانگیز خط کے بعد بھی مسٹر فریزر نے بادشاہ کو یہ لکھا۔ کہ اگر آپ اس اضافہ وظیفہ کو مع ان شرائط کے منظور کرنا چاہتے ہیں تو اور واضح طور پر اپنی منظوری اور قبولیت کا اظہار کیجئے، تاکہ اس سے آئندہ غلط فہمیاں پیدا نہوں" بادشاہ نے یہ بھی کیا اور کیسے نہ کرتے، مثل مشہور ہے مرتا کیا نہ کرتا۔

نوٹ:۔ یہ تمام خط وکتابت مسٹر براجیندر ناتھ بنرجی نے امپیریل ریکارڈ آفس سے لیکر سب سے پہلی بار شائع کی ہے جو ماڈرن ریویو کے گذشتہ اپریل اور مئی کے دو نمبروں میں نکلی ہے اسی کے ساتھ انہوں نے وہ پرزور اپیل بھی شائع کی ہے جو راجہ رام موہن رائے نے لکھی تھی اور جسے لیکر خود وہ انگلستان گئے تھے۔ اس اشاعت سے موصوف کو یہ کہنا مقصود ہے کہ اتنے اہم کام کیلئے بادشاہ دہلی نے راجہ رام موہن رائے کا انتخاب کیا اور انہوں نے بھی اس مقصد کو نہایت کامیابی کیساتھ انجام دیا لیکن آئندہ نمبر میں ہم انشاءاللہ انہی تحریروں سے یہ دکھائیں گے کہ راجہ رام موہن رائے نے انگلستان جانے کے لالچ میں خود اس کام کو حاصل کیا اور وہ اسمیں کامیاب بھی نہیں ہوئے۔
سعید

گوری امّاں

۱ - ایسٹر آرہا تھا۔ ایسپر کونسٹینٹنووچ سیکسولوف پریشان اور مضمحل تھا۔ اس کی یہ کیفیت بظاہر سوقت سے ہوئی جب گورودٹش کیف کے ہاں اس سے پوچھا گیا "ایسٹر کہاں کا کروگے ؟"

سیکسولوف نے جواب دینے میں تامل کیا۔

میزبانہ نے جس کا ڈیل بھاری، نظر کمزور، اور پاؤں میں چکر تھا، کہا "ہمارے ہاں آجانا"

سیکسولوف آزردہ تھا، کیا اُس لڑکی سے جس نے اپنی ماں کے الفاظ سُنکر، جلدی سے اسکی طرف دیکھا اور فوراً نظر ہٹا کر بدستور ایک نوجوان مددگار پروفیسر سے گفتگو میں مشغول ہوگئی؟

شادی کے لائق لڑکیوں کی ماؤں کے نزدیک سیکسولوف قابل قبول تھا۔ اس سے وہ اور بھی جلتا تھا وہ خود کو ایک مسن ناکتخدا سمجھتا تھا۔ اگرچہ اسکی عمر صرف سینتیس سال تھی۔ اُس نے ترش روئی سے جواب دیا: "آپ کا شکریہ۔ میں یہ رات ہمیشہ گھر پر گذارتا ہوں"

لڑکی نے اُس پر نظر ڈالی، مسکرائی، اور پوچھا "کس کے ساتھ؟"

سیکسولوف نے تھوڑی سی حیرت سے جواب دیا "تنہا"

بیگم گورودٹش کیف مُنہ بنا کر مسکرائی "آدمیوں سے بھاگتے ہو!"

سیکسولوف اپنی آزادی کا دلدادہ تھا کبھی کبھی اسے تعجب ہوتا تھا کہ کیسے شادی کرنے پر نیم رضا مند ہوگیا تھا اب وہ اپنے مختصر سادہ طرز سے سجے ہوئے کمرے، اپنے معمر، مستقل مزاج خدمتگار فیڈو اور اُسکی اسی قدر معمر بیوی کرسٹین کا جو کھانا پکاتی تھی، عادی ہوگیا تھا۔ اور اسے پورا یقین تھا کہ وہ اپنی پہلی محبت کے ساتھ وفاداری کے خیال سے شادی نہیں کرتا۔ اصل میں تنہا، بے مقصد زندگی بسر کرتے کرتے اُسکا دل بے اعتنائی سے سرد پڑ گیا تھا اسکی آمدنی معقول تھی، ماں باپ عرصہ ہوا مر چکے تھے، اور قریبی رشتہ دار کوئی تھا نہیں، فارغ البال تھا، اطمینان سے رہتا تھا، کسی محکمے سے تعلق رکھتا تھا، اپنے زمانے کے ادب اور آرٹ سے بخوبی آشنا تھا، اور لطائف زندگی سے ابیقوری سی ذوق رکھتا

تھا، بااین ہمہ، زندگی بذات خود اُسے خالی خالی، بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ اُسکا دل بالکل مرجھا جاتا مگر کبھی کبھی وہ ایک مستور اور پاک خواب نہ دیکھا کرتا۔

(۲)

اُسکی پہلی اور آخری محبت جو بن کھلے مرجھا گئی تھی گاہے گاہے اُسے حسرت بھرے شیریں خواب دکھاتی تھی۔ پانچ سال ہوئے اُس کی ملاقات ایک نوجوان لڑکی سے ہوئی تھی جس نے اُس پر ایک پائدار نقش چھوڑا تھا۔ اپنی زرد رنگت، نازک اندام، پتلی کمر، نیلگوں آنکھوں، اور بھورے بالوں سے وہ اُسے ایک سماوی مخلوق، ہوا اور ابر سے مرکب معلوم ہوتی تھی جسے قسمت نے اتفاقاً شہر کے شور شغب میں تھوڑے عرصہ کیلئے لا ڈالا تھا، وہ نرم رو تھی، اُسکی صاف، نازک آواز اُس ندی کی طرح جو خوش خرامی سے سنگ ریزوں پر سے ہلکی ہلکی لہریں لیتی ہوئی بہ رہی ہو، نرم تھی۔

سیکسولوف کو۔ اتفاقاً یا التزاماً؟ ۔ وہ ہمیشہ سفید پوشاک میں ملبوس نظر آتی تھی سفیدی کا خیال اُس کے ذہن میں اُس کے تصور کیساتھ گتھ گیا تھا۔ اُسکا نام تمارا بھی اُسے پہاڑ کی چوٹیوں کی برف کی طرح سفید معلوم ہوتا تھا۔ تمارا کے ہاں آنے جانے لگا۔ ایک سے زائد بار تمارا سے وہ الفاظ کہنے کا عزم کیا جو ایک انسان کی قسمت دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ بچ کر نکل جاتی تھی، خوف اور اضطراب اُسکی آنکھوں میں جھلکنے لگتا تھا۔ اُسے کس بات کا خوف تھا؟ سیکسولوف کو اُسکے چہرہ پر ہالی محبت کی علامتیں نظر آنے لگیں اُس کے داخل ہوتے ہی تمارا کی آنکھوں میں نور آجاتا اور رخساروں پر سرخی دوڑ جاتی۔

ایک شام کو جسے وہ بھلائے نہیں بھولتا تھا تمارا نے اُس کی باتیں سنیں۔ بہار کا ابتدائی زمانہ تھا دریا حال ہی میں پگھل کے کھلا تھا اور درخت نرم سبز جامہ پہنے ہوئے تھے۔ تمارا اور سیکسولوف شہر میں ایک کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی آگے دریائے نیوا کے رُخ بیٹھے تھے بغیر یہ سوچے کہ کیا کہوں، کیونکر کہوں وہ میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا اور تمارا سہمی جاتی تھی اُسکا رنگ فق ہو گیا کھوئے ہوئے انداز سے مسکرائی، اور کھڑی ہو گئی، اُس کے نازک ہاتھ کرسی کی کام کی ہوئی پشت پر کانپنے لگے۔

دھیمی آواز سے "کل" کہا اور چلی گئی۔

سیکسولوف شدید انتظار میں دیر تک اُس دروازے کیطرف گھورتا رہا جس نے تمارا کو چھپا لیا تھا۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ سفید پھول کی ایک ٹہنی نظر آئی جو اُس نے اٹھالی، رات بھر اُسے نیند نہ آئی کھڑکی کے قریب تاریک گلی پر جو صبح کے قریب روشن ہو چلی تھی، نظر جمائے مسکراتا ہوا سفید پھول کی ٹہنی سے کھیلتا رہا۔ صبح ہوئی تو یہ دیکھکر کہ کمرے کے فرش پر سفید پھول کی پتیاں بکھری ہوئی ہیں اسے بہت حیرت ہوئی غسل کرکے جس سے اُسکی طبیعت بحال ہوگئی، تمارا کے یہاں پہنچا۔

معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے، کہیں ہوا لگ گئی۔ سیکسولوف نے پھر اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ دو ہفتے بعد اُسکا انتقال ہوگیا وہ اُس کے جنازے میں شریک نہوا نہ اسکی موت کا اُسے کوئی خاص صدمہ ہوا اور اب وہ یہ بھی نہ بتا سکتا کہ اس سے واقعی محبت تھی یا محض ایک وقتی کشش تھی۔

تاہم کبھی کبھی شام کو اُسکا تصور بندھ جاتا۔ بعدازاں اس کی یاد زائل ہونی شروع ہوئی سیکسولوف کے پاس اُسکی کوئی تصویر نہ تھی۔ کئی سال بعد گذشتہ بہار میں، تمارا کی یاد سفید پھول کی ایک ٹہنی پر تازہ ہوئی جو ایک ریستوران کی کھڑکی میں رکھی تھی اور مرغن کھانوں میں بہت بے جوڑ معلوم ہوتی تھی اُس دن سے اُسے شام کو تمارا کا خیال آنے لگا۔ کبھی کبھی یونہی آنکھ لگ جاتی تو خواب میں دیکھتا کہ وہ آگئی ہے اور سامنے بیٹھی ہے اور محبت بھری نظریں گاڑے ہوئے ہے، جیسے کچھ چاہتی ہے تمارا کی منتظر نگاہ سے اُسے کبھی کبھی اُلجھن اور اذیت ہوتی تھی۔

اب گورودش کیف کے ہاں سے جاتے ہوئے اُس نے خوف زدہ ہوکر سوچا۔

"ایسٹر کی مبارکباد دینے ضرور آئیگی۔"

خوف اور تنہائی کا اس قدر غلبہ ہوا کہ اُس نے سوچا، شادی کیوں نہ کرلوں؟ پھر مقدس، پُر اسرار راتوں کو اکیلا نہیں رہوں گا۔"

دلیریا ماتیکیلوونا گورودش کیف خاندان کی لڑکی۔ اُس کے ذہن میں آئی، وہ حسین تو نہ تھی مگر خوش پیرہن ضرور تھی، سیکسولوف کو خیال ہوا کہ اُسے مجھ سے رغبت ہے اگر میں نے پیغام دیا تو رد

نہ کرے گی۔

بازار کے ہجوم اور شور نے اُسکا دھیان بٹایا، گو روڈش کیف خاندان کی لڑکی کا خیال اُس کے مخصوص کسی طرح خیال میں رنگا گیا۔ علاوہ بریں وہ تمارا کے ساتھ بے وفائی کیسے کر سکتا تھا؟ تمام دنیا اُسے ایسی حقیر اور عامیانہ معلوم ہونے لگی کہ اُسے آرزو ہوئی کہ تمارا۔ صرف تمارا۔ آئے اور مجھے ایسٹر کی مبارک باد دے۔

اُس نے سوچا، مگر پھر اپنی منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھے گی۔ پاکباز ونازنین تمارا آخر چاہتی کیا ہے؟ کیا اُس کے نرم ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملیں گے؟"

(۴۳)

تمارا کا پُراذیت خیال دل میں لئے ہوئے راہ گیروں کو گھورتا ہوا سیکسولوف سڑکوں پر پھرتا رہا۔ مردوں اور عورتوں کی شکلیں اُسے بھدی معلوم ہوتی تھیں اُس نے سوچا کہ کوئی ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ شوق یا محبت سے تبادلہ تہنیت کر سکوں تہوار کے پہلے دن بہت سے بوسے لئے اور دیئے جائینگے۔ بھدے ہونٹ، اُلجھی ہوئی ڈاڑھیاں، شراب کی بو۔

اگر پیار ہی کرنا ہے تو کسی بچے کو کیا جائے۔ بچے اُس کے دل کو لبھانے لگے۔

دیر تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا، جب تھک گیا تو بازار کے شور سے نکل کے قبرستان میں پہنچا۔ وہاں ایک زرد رو بچہ ایک نشست پر بیٹھا تھا۔ اُس نے پرخوف نظروں سے سیکسولوف کو دیکھا اور چپ چاپ سامنے نظر جمائے دیکھتا رہا۔ اُسکی آنکھوں میں تمارا کی طرح حسرت اور پریم تھا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ ٹانگیں زمین تک پہنچتی تھیں نشست کے آگے لٹک رہی تھیں۔ سیکسولوف اُس کے قریب بیٹھ گیا اور اُسے پرشفقت تجسس سے دیکھنے لگا۔ اس تن تنہا چھوٹے سے بچے میں کوئی بات تھی جس نے میٹھی یادیں تازہ کر دیں دیکھنے میں وہ ایک معمولی بچہ تھا بدن پر پھٹے پرانے کپڑے، چھوٹے سے بھورے سر پر سفید ریشم کی ٹوپی، پاؤں میں غلیظ، پھٹے ہوئے جوتے۔

بچہ دیر تک یونہی بیٹھا رہا پھر اُٹھا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ پھر دروازے سے نکل کے بازار

طرف بھاگ اٹھا، دوسری طرف دوڑا، پھر ٹھہر گیا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ راستے سے ناواقف ہو
کے چپکے رو رہا تھا، موٹے موٹے آنسو گالوں پر بہ رہے تھے۔ ایک انبوہ جمع ہو گیا۔ ایک سپاہی پہنچا
کے سے پوچھا کہاں رہتے ہو۔
اس نے چھوٹے بچوں کی طرح تتلا کے کہا "گلوئی خوف منزل میں"
سپاہی نے پوچھا "کس محلے میں"
لڑکے کو محلے کا نام یاد نہ تھا۔ اس نے پھر کہا "گلوئی خوف منزل"
نوجوان خوش مزاج سپاہی نے کچھ دیر سوچا، پھر کہا کہ قرب و جوار میں اس نام کا کوئی
کان نہیں ہے۔
ایک ہول شکل والے مزدور نے پوچھا "کس کے ساتھ رہتے ہو؟ باپ زندہ ہے؟"
لڑکے نے مجمع کو اشک آلود نظروں سے دیکھ کر کہا "میرے ابا نہیں ہیں۔"
مزدور نے متانت سے سر ہلا کر کہا "اوہو، بے باپ کے ہو! اماں ہیں؟"
"ہاں اماں تو ہیں"
"انکا نام کیا ہے"
لڑکے نے کہا "اماں" پھر کچھ سوچ کے بولا "کالی اماں"
ہول مزدور نے کہا "کالی؟ انکا نام ہی یہ ہے؟"
لڑکے نے تصریح کی "پہلے گوری اماں تھیں، اب کالی اماں ہیں"
سپاہی نے فیصلہ کن انداز سے کہا "میاں، تمہاری باتوں کا سر پیر ملنا مشکل ہے تھانے
لے چلتا ہوں۔ وہاں ٹیلیفون سے پتہ لگا لیا جائیگا کہ تم کہاں رہتے ہو۔"
سپاہی نے ایک پھاٹک میں جھک کر گھنٹی بجائی، اُسے دیکھ کر ایک دربان ہاتھ میں جھاڑو لئے ہوئے
برآمد ہوا۔ سپاہی نے کہا اس بچے کو تھانے لے جاؤ۔ بچہ کچھ سوچ کے چیخنے لگا "مجھے جلنے دو خود
راستہ ڈھونڈ نکالوں گا۔"

کیا وہ دربان کی جھاڑ سے ڈر گیا یا واقعی اُسے کچھ یاد آگیا تھا؟ کچھ بھی ہو، وہ اتنی تیزی سے بھاگا کہ بہت جلد سیکولوف کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی رفتار دھیمی پڑ گئی کبھی بازار کے اِس طرف کبھی اُس طرف مکان کو ڈھونڈتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ سیکولوف خاموشی سے اُس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ بچوں سے باتیں کرنی اُسے نہیں آتی تھیں۔

آخر لڑکا تھک گیا اور ایک لیمپ کے کھمبے سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور رونے لگا۔

سیکولوف نے کہنا شروع کیا "کیوں، میاں مکان نہیں ملا؟"

لڑکے نے اپنی حسرت بھری، ملائم نظریں اُس پر ڈالیں۔ دفعتاً سیکولوف سمجھ گیا کہ میں کیوں اتنی دیر سے اس کے پیچھے پیچھے کھنچا چلا آرہا تھا۔

اس چھوٹے سے گم کردہ راہ لڑکے کی نگاہ اور درجہ تارا سے بہت ملتی جلتی تھی۔

سیکولوف نے نرمی سے پوچھا "میاں تمہارا نام کیا ہے؟"

"لیشا"

"لیشا اپنی اماں کے ساتھ رہتے ہو؟"

"ہاں اماں کے ساتھ مگر یہ کالی اماں ہیں پہلے گوری اماں تھیں"

سیکولوف نے خیال کیا کہ کالی اماں سے اس کی مراد شاید راہبہ سے ہو

"راستہ کیسے بھولے؟"

"اماں کے ساتھ جا رہا تھا اور ہم چلے جاتے تھے، چلے جاتے تھے، انہوں نے کہا بیٹھ جاؤ اور میرا انتظار کرو۔ یہ کہہ کے وہ چلی گئیں اور مجھے ڈر لگنے لگا۔"

"تمہاری اماں کون ہیں"

"میری اماں؟ کالی اور بدمزاج ہیں"

"وہ کیا کرتی ہیں"

"قہوہ پیتی ہیں"

"اور کیا کرتی ہیں؟"

لیشا نے تھوڑی دیر ٹھہر کر جواب دیا "اور کرایہ داروں سے لڑتی ہیں"

"تمہاری گوری اماں کیا ہوئیں؟"

"انہیں اٹھا کے لے گئے۔ کفن پہنایا اور لے گئے۔ اور ابا کو بھی لے گئے؟"

لڑکے نے کہیں دور فاصلے کیطرف اشارہ کیا اور پھر رونے لگا۔

سیکسولوف نے سوچا "اسکا کیا کروں؟"

لڑکے نے یکایک بھاگنا شروع کیا۔ چند گلیوں تک دوڑنے کے بعد آہستہ ہو گیا۔ سیکسولوف نے اُسے پکڑ لیا۔ لڑکے کے چہرے پر خوف اور خوشی سے ملی جلی ایک عجیب جھلک تھی۔

ایک بڑے پانچ منزلہ، بدنما مکان کیطرف اشارہ کر کے سیکسولوف سے کہا، "گلونی خوف منزل آ گئی۔"

اتنے میں مکان کے دروازے میں ایک کالے بالوں، کالی آنکھوں والی عورت، کالے کپڑے پہنے، سر پر سفید چتیوں کا لال رومال باندھے، نمودار ہوئی۔ لڑکا اُسے دیکھ کر خوف کے مارے سہم گیا اور آہستہ آہستہ بولا "اماں!"

اُسکی سوتیلی ماں نے اُسے حیرت سے گھورا اور چیخ کر کہنے لگی۔

"بدذات، یہاں کیسے پہنچا؟ میں نے تو وہاں بیٹھے رہنے کو کہا تھا کیوں؟"

مارنے کو ہاتھ اٹھایا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ ایک معقول معزز وضع کا آدمی دیکھ رہا ہے، آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی۔

"آدھ گھنٹہ تک نہیں ٹکا گیا، بھاگ کھڑا ہوا۔ بدذات تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے عاجز آ گئی!"

لڑکے کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے بڑے ہاتھ میں زور سے پکڑا اور اُسے دروازے کے اندر گھسیٹ کے لے گئی۔

سیکسولوف نے محلے کا نام دیکھا اور گھر چلا گیا۔

(۴)

سیکولوف کو فیڈو کی عاقلانہ رائیں سننے کا شوق تھا ۔ گھر پہنچکر اُس سے لیشا کا ذکر کیا فیڈو بولا "وانستہ چھوڑ گئی کیسی بدذات عورت ہے کہ لڑکے کو گھر سے اتنی دور لیجاکر چھوڑ دیا"
سیکولوف نے پوچھا "آخر یہ کیا کیوں ؟"
"کہا نہیں جا سکتا کمبخت نے خیال کیا ہوگا کہ لڑکا گلیوں میں مارا مارا پھرے گا کوئی نہ کوئی اپنے ساتھ لے جائیگا ۔ سوتیلی ماں سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے ؟ لڑکا اس کے کس کام کا ؟"
اس انداز جیسے اُسے یقین نہیں آیا ۔ سیکولوف نے کہا "مگر پولیس اسکا پتہ لگا لیتی ۔"
"شاید ۔ مگر ممکن ہے وہ شہر ہی سے جا رہی ہو پھر کیسے پتہ چلتا ؟"
سیکولوف مسکرایا اُس نے دل ہی دل میں کہا "واقعی فیڈو کو حاکم حرج ہونا چاہئے تھا ۔"
لیمپ کے قریب کتاب لئے بیٹھے بیٹھے اُسے غنودگی آ گئی ۔ خواب میں تمارا نظر آئی ۔ لطیف اور سفید ۔ آئی اور اُس کے قریب بیٹھ گئی ۔ اُسکا نقشہ ہو بہو لیشا کا سا تھا ۔ متواتر اصرار کیساتھ اُسے دیکھے گئی جیسی کسی چیز کی منتظر ہے ۔ اس کی منور ، ملتجی نگاہوں کو دیکھنا اور سمجھنا کہ کیا چاہتی ہے ۔ سیکولوف کو بے چین کر رہا تھا جلدی سے اُٹھ کر جہاں تمارا بیٹھی نظر آتی تھی وہاں پہنچا اور اُس کے سامنے ایک انداز التجا سے باواز بلند کہا ۔
"کیا چاہتی ہو ؟ بتاؤ ۔"
مگر وہ غائب ہو چکی تھی
سیکولوف نے حسرت سے کہا "محض خواب تھا"

(۵)

اگلے دن اکادمی کی نمائش سے نکلتے ہوئے سیکولوف کی ملاقات گورنوڈش کیف خاندان سے ہوئی ۔
لڑکی سے لیشا کا ذکر کیا ۔

ولیریا نکیلو ونا نے نرمی سے کہا "بچارا غریب بچہ! اسکی سوتیلی ماں اُس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔"

سیکولوف نے اس بات سے بگڑ کر کہ فیڈوا اور یہ لڑکی دونوں ایک معمولی واقعے کو ایسا المیہ رنگ دے رہے ہیں، کہا "یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"بالکل ظاہر ہے۔ لڑکا بن باپ کا ہے اور اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اُسے ایک بلا ہی ہے اگر معقول طریقے سے اُس سے چھٹکارا نہ پا سکی تو نکال باہر کریگی۔"

سیکولوف نے مسکرا کر کہا "تمہاری نظر خواہ مخواہ تاریک رخ پر پڑتی ہے۔"

ولیریا نکیلو ونا نے مشورہ دیا "آپ اسے متبنّٰی کیوں نہیں کر لیتے؟"

سیکولوف نے متعجب ہو کر پوچھا "میں؟"

وہ کہے گئی "تم اکیلے رہتے ہو، تمہارا کوئی نہیں ہے۔ ایسٹر پر ایک نیک کام کرو۔ اس سے ایک تو یہ ہوگا کہ مبارکباد دے اور لے سکو گے۔"

"مگر، ولیریا نکیلو ونا یہ تو بتاؤ بچے کا میں کیا کروں گا؟"

"اس کیلئے نرس رکھ لینا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قسمت نے تمہیں یہ بچہ بھیجا ہے۔"

سیکولوف نے لڑکی کے تمتمائے ہوئے، پرحرارت چہرے کیطرف حیرت سے اور غیر اختیاری ملاطفت سے دیکھا۔

اُس دن شام کو تمارا اُسے خواب میں دکھائی دی تو اُسے یہ محسوس ہوا کہ مجھے معلوم ہے یہ کیا چاہتی ہے اور اُس کے کمرے کے سکوت میں یہ لفظ آہستہ آہستہ گونج رہے تھے۔ "اس کا کہا مانو"

سیکولوف خوش خوش اٹھا اور اپنی نیند بھری آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔ میز پر سفید پھول کی ٹہنی نظر پڑی۔ یہ کہاں سے آئی؟ کیا تمارا اسے اپنی فرمائش کی نشانی کے طور پر چھوڑ گئی؟

یک لخت اسے خیال ہوا کہ اگر میں نے گورڈش کیف خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی اور لیشا کو متبنّٰی کر لیا تو تمارا کی فرمائش پوری ہو جائیگی۔ وہ پھول کی بھینی بھینی خوشبو ذوق وشوق سے

اُسے یاد آیا کہ یہ پھول خود اُس نے اُسی دن خریدا تھا، پھر وفعتاً آپ ہی آپ سوچا، "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں نے خریدا۔ اس بات میں بھی ایک شگون ہے کہ میں خریدنا چاہتا تھا اور خریدنے کے بھول گیا۔"

(۶)

صبح کو وہ لیشا کی تلاش میں نکلا وہ اپنے پھاٹک میں ملا اور مکان دکھانے لے گیا اُسکی ماں قہوہ پی رہی تھی اور اپنے سرخ ناک والے کرایہ دار سے لڑ جھگڑ رہی تھی۔ لیشا کی بابتہ سیکسولوف کو یہ باتیں معلوم ہوئیں۔

وہ تین برس کا تھا کہ اُسکی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اُس کے باپ نے اس کالی عورت سے شادی کرلی اور وہ بھی اُسی سال مرگیا۔ اس کالی عورت۔ آرینا ایوانوونا کے ایک سال کا بچہ تھا۔ وہ پھر شادی کرنیوالی تھی۔ شادی چند دن بعد قرار پائی تھی اور اُس کے فوراً بعد اُنکا "صوبوں" میں جانکا قصد تھا۔ لیشا اُس کے لئے غیر اور اُس کے راستے میں حائل تھا۔

سیکسولوف نے کہا "اسے مجھے دے دو"

آرینا ایوانوونا نے ایک انداز بدخواہی سے مسکراکے کہا "شوق سے" پھر ٹھہر کر بولی "مگر اس کے کپڑوں کی قیمت ادا کردو"

چنانچہ لیشا، سیکسولوف کے مکان میں متمکن ہوگیا۔ گوروڈش کیف خاندان کی لڑکی نے نرس تلاش کرنے اور لیشا کی رہائش کے متعلق ضروری امور طے کرنے میں مدد دی۔ اس غرض سے اُسے سیکسولوف کے ہاں آنا جانا پڑا۔ جب وہ اس کام میں لگی ہوتی۔ تو ایک دوسری ہستی معلوم ہوتی اُس کے قلب کا دریچہ سیکسولوف کی نظروں کے سامنے کھل گیا۔ اُسکی آنکھیں منور اور متجلی ہوگئیں وہ سرتاسر اُس لطافت میں ڈوب گئی جو تمارا میں سے نکلتی تھی۔

لیشا کی زبانی اسکی گوری اماں کی باتیں سن سن کر فیڈو اور اُسکی بیوی متاثر ہوئے حضرت عیسٰی

کے روز انتقال سے پہلے ہفتے کے دن اُسے پلنگ پر لٹاتے وقت انہوں نے اُس کے سرہانے شکر کا ایک سفید انڈا لٹکا دیا۔

کرسٹن نے کہا "یہ تمہاری گوری اماں نے بھیجا ہے۔ مگر، دیکھو، جبتک حضرت عیسیٰ نزول نہ فرمائیں اور گرجا کی گھنٹیاں بجنے نہ لگیں، اسے ہاتھ نہ لگانا۔

لیشا چپ چاپ لیٹ گیا دیر تک اُس خوش نما انڈے کو دیکھتا رہا، پھر سوگیا۔

اور سیکولوف اُس دن شام کو اکیلا گھر پر بیٹھا رہا۔ آدھی رات کے قریب نیند کا ایسا جھونکا آیا کہ اُسکی آنکھ لگ گئی اُسے خوشی ہوئی کہ اب تمارا سے ملاقات ہوگی۔ وہ آئی سفید پوشاک میں ملبوس اور متجلی، اور اپنے جلو میں گرجا کی گھنٹیوں کی پرمسرت دبیمی آواز لائی۔ ایک انداز لطیف سے مسکرا کے اُس پر جھک گئی، اور ناقابل بیان کیف! سیکولوف نے اپنے ہونٹوں پر ایک ملائم اتصال محسوس کیا۔ ایک نرم آواز نے آہستہ سے کہا، "حضرت عیسیٰ نے نزول اجلال فرمایا!"

بغیر آنکھیں کھولے سیکولوف نے اپنے بازو پھیلا دئے۔ ایک نرم و نازک جسم اُس کے گلے سے لگ گیا۔ یہ لیشا تھا جو اُسے ویسٹر کی مبارکباد دینے اُس کی گود میں آبیٹھا تھا۔

گرجا کی گھنٹیوں سے اسکی آنکھ کھل گئی تھی سفید انڈے کو لیکر بھاگا بھاگا سیکولوف کے پاس پہنچا تھا سیکولوف جاگ اٹھا لیشا نے ہنسکر سفید انڈا دکھایا اور تتلا کے کہا، "گوری اماں نے بھیجا ہے۔ میں آپکو دیتا ہوں۔ آپ بھیجی دلبریا کو دیدیں"

"اچھا میاں جو تم کہتے ہو وہی کروں گا"

لیشا کو بستر پر لٹا کر اور سفید انڈا لے کر جو گوری اماں نے بھیجا تھا سیکولوف، ویرنا اینکیلوڈنا سے ملنے روانہ ہوا۔ مگر اُسے اسوقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ تحفہ تمارا نے بھیجا ہے۔

(تھیوڈور سولوگب)

غزل

از مولانا شوکت علیخاں صاحب فانیؔ

دلِ مایوس کو اے عہد کرم شاد نکر — نازپروردۂ غم ہے اسے برباد نکر
اے تقاضائے خرد مجھ پہ یہ بیداد نکر — میں ہوں دنیائے محبت مجھے برباد نکر
روح اربابِ محبت کی لرز جاتی ہے — تو پشیماں نہو اپنی جفا یاد نکر
غم ہستی ہی سہی تیرے سوا کوئی تو ہو — دل کہ بستی ہے تری غیر سے آباد نکر
خامشی میں فغاں ہونے نہ پائے اے دل — اور جو فریاد ہی کرنا ہے تو فریاد نکر
صبر شایانِ محبت تو نہیں ہے لیکن — شکر اگر بن نہ پڑے شکوہ بیداد نکر

دل کی حد سے اثر زیست نہ گزرے فانیؔ
ہوش لازم ہے مگر ہوش کو آزاد نکر

رفتارِ تعلیم

لارڈ جان رسل نے اب سے ستر برس پہلے جنگ کریمیا کے زمانہ میں کہا تھا کہ جنگ دراصل "جہالت کی سلطنت" کے خلاف ہے۔ صحیفہ ٹائمس اپنے تعلیمی ضمیمہ میں اس قول کا مقابلہ ان الفاظ سے کرتا ہے جو مسٹر بالڈون نے حال میں جونیر امپیریل لیگ کے جلسہ میں کہے ہیں۔ مسٹر بالڈون فرماتے ہیں کہ یہ زمانہ سائنس کی اختراعات اور مشینوں کا زمانہ ہے جن کے استعمال سے سوائے چند ماہرین فن کے کوئی واقف نہیں اور ان ہی مشینوں کا اثر انسانوں کے باہمی تعلقات پر ہے۔ عام لوگ اپنے آس پاس کی چیزوں کو بالکل نہیں سمجھتے اس لئے اضافی حیثیت سے اگلے زمانے کے لوگوں سے زیادہ جاہل ہیں۔ اس جہالت کو دور کرنے کی کوئی فوری تدبیر نہیں بلکہ صرف تدریجی سعی اور اصلاح سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

مسٹر بالڈون تو خیر سیاسی آدمی ہیں اور پھر انگریز۔ وہ فطرتاً اس بات پر مجبور ہیں کہ اصولی باتوں کو وقتی ضروریات کے نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ کل وہ جرمنی کی مفروضہ جہالت اور وحشت کے مقابلہ میں انگلستان کی سچی تعلیم اور تہذیب پر فخر کر رہے تھے اور آج جب خود انگلستان کے مزدوروں نے کوئلہ بند کر کے ڈبل روٹی پکانا اور چائے بنانا دشوار کر دیا ہے وہ اپنے ملک کی جہالت سے نالاں ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ بجائے خود قابل غور ہے کہ آیا حقیقی معنی میں یوروپ جو تہذیب و تمدن کا مرکز ہے آج اگلے زمانے مثلاً قرون وسطیٰ کے مقابلہ میں زیادہ جاہل ہے یا نہیں۔

ایک طرف تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر علم و فن میں یوروپ والے روز افزوں ترقی کر رہے ہیں۔ نظام قدرت کا مطالعہ جس باریک بینی سے آج ہو رہا ہے کبھی نہیں ہوا تھا۔ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تہ تک بھی محقق کی نظر خوب پہنچ رہی ہے۔ لیکن ان شعبوں کے باہمی تعلق اور

زندگی اور کائنات کے صحیح رابطہ سے نوع انسانی نہ واقف ہے اور نہ واقف ہونیکے لئے کماحقہ کوشش کر رہی ہے۔ اہل نظر کے نزدیک یہی علم حقیقی علم ہے اور اس سے ناواقفیت سب سے زیادہ شرمناک جہالت ہے۔ قرون وسطےٰ میں انسانی علم بہت تنگ دائرہ میں محدود تھا لیکن اس محدود دائرہ میں مکمل تھا اور مرتب۔ آج کل سب کچھ ہے مگر تکمیل اور ترتیب نہیں۔

یہ مقابلہ آج کل کے یورپ اور قرون وسطےٰ کے یورپ کا ہے اس کے معنی یہ نہ سمجھے جائیں کہ ہم بھی اور بہت و سرم محبان ملک وملت کی طرح یورپ کی تنقیص اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے ایشیا کی عظمت ثابت ہو۔ مغرب کی مادیت کے مقابلے میں مشرقی روحانیت خود پسند ایشیائیوں میں ضرب المثل ہے لیکن اگر غور سے دیکھئے تو اسکی اصلیت صرف اتنی ہے کہ ایشیائیوں میں روحانی زندگی کی صلاحیت زیادہ ہے یا بالفاظ دیگر اُن میں روحانیت بالقوۃ یورپ والوں سے زیادہ ہے لیکن بالفعل جو حال ہے وہ کلکتہ اور راولپنڈی والوں سے پوچھئے اس طرح کے مذہبی نزاعات روحانیت کی کمی نہیں بلکہ اس کے فقدان کی دلیل ہیں۔

بین الاقوامی انجمن علم اللسان کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے عزیز عزت پاشا نے جامعہ ازہر کے حالات اختصار کیساتھ بیان کئے۔ آپنے فرمایا کہ جامعہ ازہر ۹۷۳ء میں یعنی پیرس یونیورسٹی سے دو سو سال پہلے قائم ہوئی تھی۔ مصر کے متعدد بادشاہوں نے اس کی عمارت کی توسیع کی اور بہ حالت موجودہ اس میں ایک بڑا عظیم الشان ہال اور دو اس سے چھوٹے ہیں جو متعدد رواقوں میں تقسیم ہیں اور ہر رواق ایک خاص ملک کے طالبعلموں کیلئے مخصوص ہے۔ برطانوی قبضہ سے پہلے یہاں طالبعلموں کی تعداد ۷۰۰۰ اور اساتذہ کی ۲۰۰ تھی۔ اس قبضہ کے زمانہ میں تعداد بہت گھٹ گئی تھی لیکن اب پھر روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔

مقرر نے کہاکہ جامعہ کی میعاد تعلیم ۱۲ سال ہے لیکن بعض طالب علم ۱۲ سے لیکر ۱۵ سال تک

رہتے ہیں۔ طلبہ کوئی فیس نہیں دیتے بلکہ ہر رواق کے لئے جامعہ کے اوقاف میں سے ایک رقم مخصوص ہے۔ اساتذہ کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی بلکہ وہ اتالیقی کرکے، کتابوں کی نقل کرکے یا کوئی مذہبی خدمت انجام دے کر گذر بسر کرتے ہیں۔ کبھی کبھی خوشحال طلبہ انہیں نذرانہ دیتے ہیں۔ استاد جب سبق دیتے ہیں تو پالتی مار کر ایک چٹائی پر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک کتاب سے جو انکے سامنے ڈیسک پر رکھی ہوتی ہے پڑھاتے ہیں۔ کبھی استاد کسی منتہی طالب علم کو بآواز بلند پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔ اور بیچ بیچ میں مطالب کی تشریح اور توضیح کرتا جاتا ہے اکثر طالب العلم خصوصاً وہ جن کی مادری زبان عربی نہ ہو ابتدا میں صرف نحو پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد دینیات کی باری آتی ہے پھر فقہ کی۔ اس کے علاوہ منطق، خطابت اور شعر کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔

انگلستان کی مایۂ ناز یونیورسٹیاں آکسفورڈ اور کیمبرج بہت سی باتوں میں زمانہ کی رفتار سے پیچھے ہیں چنانچہ وہاں ابھی تک فلسفۂ تعلیم کی اہمیت تسلیم نہیں کی گئی اور اس کے درس کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ دونوں جگہ طریقۂ تعلیم کا ڈپلوما ملتا ہے لیکن اسکا معیار پست ہے اور اسمیں علمی شان نہیں ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے طلبہ نے اس کمی کو محسوس کیا ہے اور ایک غیر سرکاری حلقۂ تحقیقات قائم کیا ہے جس میں وہ اہم تعلیمی مسائل پر غور کرتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے نتائج عام معلومات کے لئے شائع کرتے ہیں۔

آج کل آکسفورڈ اور کیمبرج میں اس مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے کہ ہندوستان کی نئی یونیورسٹیوں بنارس دہلی رنگون علیگڈھ ناگپور اور جامعہ عثمانیہ کی اسناد تسلیم کیجائیں یا نہیں۔ اب تو یہ صورت ہے کہ آکسفورڈ اور کیمبرج دونوں جگہ ان یونیورسٹیوں کے طلبہ کی درخواستوں پر انفرادی حیثیت سے غور کیا جاتا ہے اور انکی ذاتی قابلیت کے لحاظ سے انکی سند تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ لیکن اس طرز عمل کے خلاف ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہو رہی

ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس معاملہ میں انگلستان کی یہ قدامت پسند تعلیمگاہیں جدید طرز کی یونیورسٹیوں کے ساتھ تعصب کر رہی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے۔ مذکورہ بالا ہندوستانی یونیورسٹیاں (خصوصاً جامعہ عثمانیہ) اس کی مستحق تو ضرور ہیں کہ اُنکے طالبعلم آکسفورڈ اور کیمبرج میں جاکر مزید تعلیم حاصل کرسکیں۔ اب رہا لائق اور نالائق طالبعلموں میں امتیاز ہر یونیورسٹی داخلہ کے وقت کرتی ہے۔ اس کے لئے دوسری یونیورسٹیوں کی سند تسلیم کرنے میں تامل کرنا کسی طرح جائز نہیں۔

صحیفہ مانچسٹر گارجین کے تعلیمی نامہ نگار نے ایک دلچسپ بحث چھیڑی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مشاہدہ کی قوت لڑکیوں میں زیادہ ہوتی ہے یا لڑکوں میں۔ نامہ نگار ایک واقعہ سے لڑکوں میں مشاہدہ کی کمی پر استدلال کرتا ہے۔ لیکن ایک مدرسہ میں ایک لڑکے نے اپنے اُستاد سے پوچھا کہ فلاں ملک کا نقشہ کہاں ہے حالانکہ یہ نقشہ ایک ہفتہ سے اس ڈیسک کے سامنے دیوار پر لٹکا رہتا تھا جس پر وہ لڑکا بیٹھتا تھا۔ نامہ نگار کے خیال میں کوئی لڑکی اس طرح کی بے توجہی کی مرتکب نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ اس کے ثبوت میں کہتا ہے کہ جن خاندانوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں موجود ہیں اُن میں اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں لڑکے اپنا جوتہ ٹوپی موزہ کہیں رکھکر بھول جاتے ہیں لیکن اُنکی بہنیں اپنی گڑیاں یا سوئی تاگے کا لچھا شاذ و نادر ہی گم کرتی ہیں۔ یہ لڑکیاں اور لڑکے جب بڑے ہوکر مرد و عورت بن جاتے ہیں تب بھی یہ فرق باقی رہتا ہے۔ گھر میں ماں کو سب چیزوں کا ٹھکانا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن باپ بیچارہ ہمیشہ اپنا عصائے پیری ڈھونڈتا نظر آتا ہے۔

مگر خوشی کی بات ہے کہ نامہ نگار نے ان باتوں کا وہ غلط نتیجہ نہیں نکالا جو لوگ عام طور پر نکالتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ لڑکیاں ہر قسم کی اشیا کا مشاہدہ لڑکوں سے زیادہ غور سے

کرتی ہیں بلکہ صرف بعض مخصوص چیزوں میں لڑکیوں کی اس فضیلت کا قائل ہے۔ نفسیات سے ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ مشاہدہ غور اور توجہ سے دیکھنے کا نام ہے۔ اور غور اور توجہ کا انحصار دلچسپی پر ہے۔ ایک مشہور قصہ اس نکتہ کو واضح کرتا ہے۔ ایک کبوتر اور ایک گدھ فضائے آسمانی کی بلندیوں پر اڑ رہے تھے۔ گدھ نے ایک کھیت میں ایک جانور پڑا ہوا دیکھا اور کہا دیکھو ایک مردہ بیل پڑا ہے۔ کبوتر نے کہا ہاں ایک جانور پڑا تو ضرور ہے اور اس کے کان میں ایک گیہوں کا دانہ بھی ہے لیکن یہ کیسے معلوم ہوا کہ بیل ہے اور مردہ ہے۔ دلچسپی ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جو ادراک وحواس کو تیز کر دیتی ہے اور انہیں یکسوئی پیدا کر کے مشاہدہ میں مدد دیتی ہے۔ نامہ نگار نے جتنے واقعات لڑکیوں کے مشاہدے کے بتائے اُن سب میں ایسی چیزوں کا ذکر ہے جو امور خانہ داری سے یا روزمرہ زندگی کی ضروریات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان چیزوں سے ظاہر ہے کہ لڑکیوں کو زیادہ شوق ہوتا ہے۔ بہ خلاف اس کے ان چیزوں میں جن سے لڑکوں کو زیادہ دلچسپی ہو ان کا مشاہدہ لڑکیوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتا ہے۔ ہاکی یا کرکٹ کا کھیل لڑکیاں برسوں دیکھیں لیکن انہیں سے اکثر کی سمجھ میں اتنا بھی نہیں آتا کہ اس میں ہار جیت کیسے ہوتی ہے۔ یہی حال تاش، شطرنج، گنجفہ وغیرہ میں ہے۔ اسی طرح مجمع کا صحیح اندازہ عورتیں بہت کم کر سکتی ہیں۔ ہر شخص روزمرہ زندگی میں اس قسم کے فرق کا خود مشاہدہ کر سکتا ہے اور خود اس قوت مشاہدہ کے مشاہدہ میں عورتیں مردوں کا مقابلہ کبھی نہیں کر سکتیں

ڈاکٹر برنارڈو کا نام محب انسان افراد کے سلسلہ میں ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اس محسن قوم نے غریبوں کے آوارہ گرد لڑکوں اور لڑکیوں کے قیام کے لئے دار الاقامہ بنائے تھے جو ہزاروں بچوں کو مجرمانہ زندگی سے بچا کر ملک کا مفید رکن اور قوم کا مفید فرد بنا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک مکانات کا ایک سلسلہ جو ایک مستقل گاؤں ہے۔ صوبہ ایسکس میں واقع ہے اور بارکنگ سائڈ کہلاتا ہے

حال میں ڈیوک آف یارک وہاں تشریف لے گئے تھے کہ بانی کے یوم وفات کے جلسہ میں شریک ہوئے۔

مسٹر ولیم میک کال صدر مجلس انتظامی نے ڈیوک کا استقبال کیا اور موصوف کو ان بیشمار گھروں میں سے چند دکھائے جنہیں لڑکیاں منہ بولی ماؤں کے ظل عاطفت میں رہتی ہیں۔ ڈیوک نے اس گاؤں کی گھریلو زندگی سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا اور لڑکوں اور لڑکیوں کی دستکاری کا کام دیکھکر جسمیں نجاری۔ طباعت۔ خیاطی۔ ٹوکریاں بنانا اور پکانا ریندھنا شامل ہے۔ بہت خوشی کا اظہار کیا۔ جب ڈیوک گاؤں کے سبزہ زار میں شامیانہ کے نیچے تشریف لائے کہ دارالاقامہ کے تمام شعبوں کے کام کی نمائش ملاحظہ کریں تو اس انسٹی ٹیوشن کے حامیوں نے جو ہزارہا کی تعداد میں جمع تھے خیر مقدم کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھالیا چار لاکھ ہاف کراؤن (ڈھائی روپیہ کا سکہ) چندہ کی اپیل کی گئی جس کا معقول حصہ فوراً جمع ہوگیا

انگلستان کے قصبہ سوانسی کی میونسپلٹی نے ایک تعلیمی باغ بنوایا ہے جسمیں برطانیہ کے خودرو پودوں کے ۱۵۰۰ نمونے ہیں ان میں سے ۴۰۰ کے قریب ایسے پودے ہیں جنکی کاشت سے اقتصادی فائدے حاصل ہوسکتے ہیں۔ منطقۂ حارہ کے پودے مثلاً چائے۔ کافی۔ گنا وغیرہ الگ حرارت خانوں میں ہیں۔ یہ باغ دو سال کے عرصہ میں بنا ہے اور اسمیں روزانہ ہر شخص کو جانے کی اجازت ہے۔

شذرات

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۶ ر اگست سے کھلیگی جو طلبہ دار الاقامہ میں داخلہ کے لئے آئیں انہیں چاہئے کہ ایک ہفتہ پہلے سے اپنے آنے کی اطلاع دیدیں۔

افسوس ہے کہ اس پرچہ میں "جامعہ ملیہ اور مسلمانوں کی تعلیم" کی تیسری قسط نہ شائع ہوسکی مضمون نگار کی عدیم الفرصتی کے سبب سے مضمون مکمل نہیں ہوا۔ انشاء اللہ اگست ستمبر اور اکتوبر کے پرچوں میں بقیہ حصے شائع ہوجائیں گے۔

ہمارا وفد حیدرآباد اپنے مقاصد میں قابل اطمینان کامیابی حاصل کر رہا ہے۔ لوگوں کو جو غلط فہمیاں جامعہ کے بارے میں تھیں وہ بالکل رفع ہوگئی ہیں اور اس کے حقیقی نصب العین سے ارباب فکر کو آگاہی ہوگئی ہے۔ وفد کی ساری کامیابی کی وجہ نواب اکبر یار جنگ بہادر کی سعی جمیلہ ہیں۔ جو رپورٹیں آتی ہیں وہ نواب صاحب موصوف کی مہمان نوازی اور ہمدردی کی تعریف سے پُر ہوتی ہیں۔ نواب حیدر نواز جنگ بہادر اور نواب مسعود یار جنگ بہادر بھی توجہ اور دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں، اور مولوی عبدالحق صاحب قبلہ تو گویا بارات والوں کیطرف سے ہیں۔ علاوہ اخلاقی اعانت اور ہمدردی کے اکابر حیدرآباد نے معقول رقوم چندے کے طور پر بھی عطا فرمانے کے وعدے کئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان وعدوں کے ایفا میں زیادہ دن نہ لگیں گے۔ اور ہمارے وفد کے قیام حیدرآباد کے زمانہ ہی میں پورا چندہ وصول ہوجائیگا۔ ہم مسلمانان حیدرآباد کا عموماً اور نواب اکبر یار جنگ بہادر اور نواب مسعود یار جنگ بہادر کا خصوصاً تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مولوی صاحب مدظلہ العالی کا شکریہ وفد والوں کے ساتھ ادا کیا جائیگا۔

صوبہ متوسط اور برار میں بھی ہمارے وفد کا خیر مقدم بہت اچھا ہوا۔ ارکان وفد نے متعدد شبینہ مدارس قائم کرائے اور بہت سی تعلیمگاہوں کا معائنہ کیا۔ جامعہ کیلئے ابتدائی اور انتہائی درجوں کے طلبہ فراہم کئے۔ مکتبہ جامعہ کی کتابیں کثیر تعداد میں فروخت کیں اور ایک خاصی رقم چندے کی بھی جمع کی۔ وفد کی رپورٹوں میں سب شہروں کے سربرآوردہ مسلمانوں کی توجہ اور دلسوزی کا ذکر ہے۔ لیکن جناب اکبر خانصاحب رئیس سرگاؤں اور سید عبدالرؤف شاہ صاحب کی مہمان نوازی اور قومی ہمدردی کو خاص طور پر سراہا گیا ہے ہم اپنے سب بھائیوں اور خصوصاً اصحاب موصوف کے نہایت شکرگذار ہیں۔

ہمعصر نگار نے اپنے جولائی کے نمبر میں جامعہ ملیہ کا ذکر بہت دلسوزی اور محبت کیساتھ کیا ہے اور کارکنان جامعہ کو بہت اہم مشورہ دیا ہے۔ ہمارے ہمعصر کی رائے میں ذمہ دار اساتذہ جامعہ کو چاہیئے کہ تقسیم عمل کے اصول پر جامعہ کا کام خود چلائیں اور "رہنمایان قوم" سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ ہم کو اس رائے سے اس حد تک ضرور اتفاق ہے کہ جامعہ کا تعلیمی نظام بالکل اساتذہ جامعہ کے ہاتھ میں رہنا لازمی ہے اور اسمیں کسی اس شخص کو دخل دینے کا حق نہ ہونا چاہیئے جو علمی اور تعلیمی زندگی سے ذمہ دارانہ تعلق نہ رکھتا ہو۔ لیکن دنیا میں زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور جامعہ بھی زندگی کے ایک پارے کا نام ہے جامعہ کا قومی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے عملی اور نظری حیثیت سے قطع تعلق کر لینا گویا حیات کے رشتوں کو توڑ کر ایک مردہ جسم بن جانا ہے۔ اور چونکہ قومی زندگی کی باگ ہمیشہ چند افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لئے قوم کی سربرآوردہ ہستیوں سے قطع تعلق بھی اسی حد تک مہلک ہے۔ البتہ اشخاص کا تعین اور تعلق کی نوعیت کا تعین دوسرا مسئلہ ہے جس پر گفتگو بہت تفصیل چاہتی ہے۔

یہ تو ایک اصولی بات ہے اب رہی صورت حال وہ یہ ہے کہ سچائی اور انصاف کو نظر

رکھتے ہوئے ہمیں منتظمین جامعہ کی موجودہ طرزِ عمل سے بے اطمینانی کی کوئی وجہ نہیں اور اطمینان کے ثانی وجوہ ہیں لیکن ہم اپنے معاصر کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ کبھی واقعات کا رُخ اور جامعہ کے ارباب حل وعقد کا رویہ اس طرح بدلا کہ اس سے ہمارے عظیم الشان مقصد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو سکے تو وہ ان لوگوں میں جنہیں اس نے مخاطب کیا ہے "ہذا فراق" کہنے کی ہمت پائیگا۔

سلطان فواد اگست یا ستمبر میں یوروپ تشریف لے جائینگے۔ آپ کا قصد ہے کہ پہلے کارلسباد میں رہ کر علاج کرائیں اور لندن جا کر شہنشاہ جارج سے ملاقات کریں۔ کون ایسا سنگدل ہوگا جو یہ کہے کہ برسوں کی محنت شاقہ برداشت کرنے اور فکر و تشویش کا مقابلہ کرنے کے بعد تاجدار مصر اپنے تھکے ہوئے دماغ کو آرام نہ دیں اور کون ایسا بدگمان ہوگا جو شہنشاہ جارج سے آپ کے ملنے یا لندن کے غیر سیاسی حلقوں سے تعلق پیدا کرنے میں کسی طرح کا خطرہ سمجھے لیکن وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں ہمارے دل میں طرح طرح کے وہم آتے ہیں۔

جزیرہ قبرص کے باشندے جو یونانی نسل سے ہیں اور مصر میں رہتے ہیں برطانیہ کی رعایا بننے کی کوشش کر رہے ہیں اس کے معنی یا تو یہ ہیں کہ یونانیوں کو مسلمانوں سے اس قدر نفرت ہے کہ وہ انکی رعایا بننے پر کسی طرح راضی نہیں یا یہ کہ برطانیہ کی رعایا ہونے میں کوئی خاص دلکشی ہے۔ اگر ممکن ہوتا تو ہم دوسرے معنی سمجھتے۔

آج کل عراق کی پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ نوری پاشا جو حکومت عراق کیطرف سے انگورہ میں سفیر تھے موصل کا معاملہ طے کر کے اور جمہوریہ ترکی سے عہد نامہ کر کے واپس آئے ہیں انکی حکمت عملی کی کامیابی پر ہر طرف تحسین و آفریں ہو رہی ہے اور پارلیمنٹ نہایت عجلت کیساتھ عہد نامہ کی تصدیق کرتی ہے۔

کٹھ پتلی کا تماشا بھی دلچسپ چیز ہے۔

معزز ہمعصر سرونٹ آف انڈیا لارڈ اروِن کی تقریر کا جو انہوں نے حال میں چیمسفورڈ کلب میں کی تھی ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ویسرائے بالکل بجا فرماتے ہیں کہ حکومت ہند کسی طرح ہندو مسلمانوں کی نزاعات کی ذمہ دار نہیں ہے۔ وائسرائے کی اس تجویز کو کہ ہندو مسلمانوں کی ایک کانفرنس حکومت کے زیر سایہ ہونا چاہیے جس میں باہمی مناقشات کو رفع کرنے کی تدابیر سوچی جائیں ہمارا ہمعصر پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے اُسے اس سے بھی اتفاق ہے کہ انتخاب جداگانہ کے مسئلہ میں کوئی دست اندازی اُس وقت تک نہ ہونا چاہیے جب تک ۱۹۲۹ء کا شاہی کمیشن ہندوستان کی حالت کا صحیح اندازہ کرکے اپنی رپورٹ نہ پیش کر دے۔ البتہ اس بارے میں وہ وائسرائے سے اختلاف رکھتا ہے کہ یہ نزاعات خالص مذہبی ہیں اُس کے خیال میں مسلمانوں کی اقتصادی پستی اور ہندوؤں کے بعض طبقوں کا مہاجن پن زیادہ تر عداوت اور نفرت کے جذبات پیدا کرنے کا باعث ہے۔ وہ امید کرتا ہے کہ ہندوستان کے کل سیاسی فرقوں کے لیڈر وائسرائے کے ساتھ شرکت عمل کرکے صلح اور امن کا جھنڈا گاڑنے میں مدد دیں گے۔

ہمارے ہمعصر کی معقول پسندی اور متانت اور حکومت کے مقابلے میں اُس کی مسکینی نیازمندی اور بھولے پن کا اعتماد اس پرشور زمانے میں بہت غنیمت ہے ہم اُس کی خاطر سے حضرت ناصح کیلئے "دیدہ و دل فرش راہ" کرنے کو موجود ہیں۔ لیکن "وہ سمجھائیں گے کیا" اس کا جواب یا تو وہ ہمارے ہمعصر کے پاس ہوگا یا لارڈ اروِن کے پاس۔

فاضل اجل پروفیسر براؤن کی وفات علوم مشرقی کی دنیا کیلئے ناقابل تلافی صدمہ ہے یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ اس سانحہ کو کئی مہینہ گذر گئے اب تک صحائف اور رسائل میں آنجہانی کے سوانح زندگی اور اُنکے علمی کارناموں پر مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ہم ذیل میں ایک مضمون سے جو ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ میں نکلا ہے۔ اقتباس کرکے مرحوم کی زندگی کے بعض

ہم واقعات نذر ناظرین کرتے ہیں۔

۱۸۷۷ء سے ترکی اور روس میں عظیم الشان جنگ ہو رہی ہے انگلستان کے ایک مدرسہ میں ایک سولہ برس کا لڑکا لڑائی کی خبریں بڑے شوق سے پڑھتا ہے اور اسکے دل میں کمزور فریق کی محبت اور ہمدردی کے جذبات موجزن ہوتے ہیں - وہ ترکی زبان پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔

۱۸۷۹ء میں یہی لڑکا کیمبرج میں طب پڑھتا ہے لیکن ترکوں کی محبت جو اب زیادہ وسیع ہو کر عالم اسلام کی محبت بن گئی ہے ابتک اُس کے دل میں باقی ہے وہ اپنی تعلیم سے وقت نکال کر السنۂ مشرقیہ کی تحصیل کرتا ہے۔

۱۸۸۷ء میں یہ لڑکا اپنی تعلیم ختم کر چکا ہے۔ علوم مشرقی سے اُس کا شغف بہت ترقی کر گیا ہے۔ اور اُسکا دل مشرق کی سیاحت کے لئے بیچین ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اُسکی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہو گی اور اُسے اپنی عمر لندن کی گلیوں میں مریضوں کی نبض دیکھنے میں صرف کرنا پڑیگی لیکن قضا و قدر سچے علمی ذوق اور سچی محبت کی پاس داری کرتے ہیں۔ نوجوان براؤن کو پمبروک کالج سے علوم مشرقی کی تحصیل کیلئے اور ایران کے سفر کے لئے وظیفہ ملتا ہے۔ یہ پورا سال براؤن طہران۔ اصفہان۔ شیراز۔ یزد اور کرمان کے سفر میں اور ہر طبقہ کے ایرانیوں سے ملنے جلنے میں بسر کرتے ہیں اور ایرانیوں کی زندگی اور انکی معاشرت سے اتنی گہری واقفیت حاصل کرتے ہیں جتنی کسی یورپ والے نے آج تک نہیں حاصل کی۔

سفر سے واپس آکر براؤن کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرر مقرر ہوتے ہیں اور چودہ برس کے بعد چارلس ریو کی جگہ پر سرٹامس آدم کی قائم کی ہوئی عربی پروفیسر کی مسند پر

زینت افروز ہوتے ہیں۔ اُسوقت سے اور وفات کے زمانہ تک جس طرح انہوں نے علوم شرقی کی خدمت اور مشرقی خصوصاً ہندی طالبعلموں کی مدد اور سرپرستی کی ہے اُس سے دنیا واقف ہے۔ ان احسانات کا شکریہ تمام مشرقی اقوام کو خصوصاً ایرانیوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ادا کرنا چاہیئے۔

جامعہ برلن کے پروفیسر ڈاکٹر بانبگر نے زمانہ حال کے سب سے بڑے مستشرق اور ماہر اسلامیات پروفیسر گولڈسیہر کے متعدد لکچروں کا مجموعہ شائع کرکے خراج تحسین وصول کیا ہے یہ لکچر پہلی بار ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئے تھے لیکن پروفیسر بانبگر نے نہایت اہتمام کیا تھا حواشی وغیرہ کا اضافہ کرکے پروفیسر ڈاکٹر بیکر وزیر تعلیم پروشیہ کے مقدمہ کیساتھ شائع کئے ہیں۔ پروفیسر بیکر خود بڑے پایہ کے مستشرق ہیں اور ان کے مقدمہ سے یقیناً کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان لکچروں کا ترجمہ اب تک انگریزی میں شائع نہیں ہوا ہے اسلئے افسوس ہے کہ وہ ہندوستانی ارباب ذوق کی پہنچ سے باہر ہیں لیکن انہیں یہ سُنکر خوشی ہوگی کہ ہمارے ایک محترم دوست ان لکچروں کا اُردو میں ترجمہ کر رہے ہیں اور رسالہ جامعہ کو اشاعت کے لئے عطا کرنے والے ہیں۔

مطبوعات مکتبہ جامعہ ملیہ

تاریخ الامۃ ابتدائے اسلام کی مکمل مسلسل اور مربوط تاریخ جو نہایت تحقیق کے ساتھ سلیس اُردو میں لکھی گئی ہے۔

حصہ اوّل۔ سیرۃ الرسول۔ قیمت . . عہ/

حصہ دوم۔ خلافت راشدہ " . . . ۶/

حصہ سوم۔ خلافت بنی امیہ " . . عہ

حصہ چہارم۔ خلافت عباسیہ " . . . ۶/

حصہ پنجم۔ عباسیہ بغداد " . . . ۶/

مبادی معاشیات اکنامکس پر سلیس و فہمیدہ ترجمہ از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پرنسپل جامعہ کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ تقریباً ۵۰۰ صفحہ . . عہ/

انتخاب جوہر طلبائے جامعہ کے قلمی رسالہ جوہر کا دلکش انتخاب نظم و نثر مع تازہ فوٹو مولنا محمد علی صاحب۔ قیمت . . . عہ/

انتخاب میر میر تقی میر کے کلام کا بہترین انتخاب مع مقدمہ مشتمل بر حالات میر و کلام میر از نورالرحمن صاحب بی۔ اے خوبصورت جلد قیمت . . عہ/

اورنگزیب عالمگیر سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۱۲۵ صفحات کاغذ سفید کتابت و طباعت عمدہ ٹائٹل آرٹ پیپر پر رنگین و دیدہ زیب قیمت ۱۲۰/

دیوان غالب سائز ۲۰×۳۰/۸ طبع نفیس و خوبصورت و مضبوط مجلد قیمت . . .

مسدس حالی سائز ۲۰×۳۰/۸ طبع نفیس و خوبصورت و مضبوط جلد قیمت . . . ۸/

ہمارے نبی سلف اسلام کے سبق آموز حالات بچوں کی کیلئے از پروفیسر سید نواب علی قیمت ۸/

ترکوں کی کہانیاں بچوں میں محبت و غیرت پیدا کرنیوالی چند ترکی بچوں کی سچی کہانیاں۔ قیمت . . . .

شعر و شاعری سائز ۲۰×۳۰/۸ کاغذ و طباعت کتابت دیدہ زیب۔ قیمت ۶/

اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ڈاکٹر مسز بی سی رائے کا خطبہ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ قیمت ۴ر داصل انگریزی مقدمہ عبدالمجید خواجہ۔ قیمت ۱۰

ازہار العرب عربی کی ادبی و اخلاقی سہل نظموں کا مجموعہ جامعہ کے نصاب درس میں داخل ہے۔ قیمت . . . ۱۰

ملنے کا پتہ منیجر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

جلد ۷ | ماہ صفر المظفر ۱۳۴۵ھ مطابق اگست ۱۹۲۶ء | نمبر ۲

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ

(۳)

جن اصول پر ہمارے خیال میں جامعہ ملیہ کو اپنی تعلیم اور اپنے امتحان کی بنا رکھنا چاہئے اُنکا ہم اختصار کیساتھ ذکر کر چکے ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم جامعہ یا دار العلوم کے دوسرے عظیم الشان مقصد یعنی تحقیقات علمی کی توضیح کرنا اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اس کام کو کس طرح انجام دے سکتی ہے۔

فطرت نے ذہن انسانی میں چند صلاحیتیں ودیعت کی ہیں جو نشو و نما پا کر اور ہم آہنگ ہو کر انسان کو ایک نعمت عظمیٰ بخشتی ہیں جسکا نام تہذیب نفس یا Culture ہے۔ ان صلاحیتوں میں علم ایک ممتاز رتبہ رکھتا ہے۔ طلب علم کوئی ناگوار فرض نہیں ہے جو کسی خارجی طاقت کی طرف سے عاید کیا گیا ہو بلکہ خود انسانیت کے ایک پہلو کی تکمیل ہے۔ اب علم کی ماہیت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایسی

تعلق کا نام ہے جو ذہن انسانی کا عقلی پہلو اپنے ماحول سے رکھتا ہے اور چونکہ ذہن انسانی اور اُس کا ماحول دونوں متحرک اور تغیر پذیر عناصر ہیں۔ اس لئے علم بھی ساکن یا بیگانۂ تغیر نہیں ہو سکتا۔ علم میں تغیرات دو قسم کے ہوتے ہیں توسیع اور اصلاح۔ ایک طرف تو بنی نوع انسان کا علم روز بروز عالم فطرت اور عالم ذہنی کے نئے اقالیم فتح کرتا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنی پرانی مقبوضات کا معائنہ کرتا ہے اور ان میں جو تغیرات ہوئے ہیں اُنکے لحاظ سے اپنے نظام حکومت کو بدلکر اس کی بنیاد کو استوار کرتا ہے۔ اس معائنہ میں پرانے دور کے علمی ذخائر جو کتابوں میں مقید ہو کر مردہ یا قریب بہ مرگ ہیں۔ نئے دور کے انسانوں کے سینہ سے مس ہوتے ہیں اور اُسکی گرمی ان میں جان ڈالدیتی ہے اور "روایات" کو "حق" بنا دیتی ہے۔ یہی طلب حق یہی علم کا احیا، یہی ذہن انسانی کا اپنے ماحول سے صحیح عقلی تعلقات قائم کرنا علمی تحقیقات کہلاتا ہے۔

علمی تحقیقات کا سب سے اہم مقصد وہی ہے جسکا ہم نے اوپر ذکر کیا یعنی نشو ونما کے لئے بیتاب ذہن انسانی کے اُس شعبہ کی تربیت اور تکمیل میں مدد دینا جو طلب علم اور جستجوئے حق کا حامل ہے لیکن ضمناً اس کے دوسرے مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً علمی تحقیقات میں مصروف رہنا بہت بڑی اخلاقی تربیت ہے۔ ضبط نفس، جفاکشی، سچائی کی محبت اور نظم و تربیت کا شوق یہ ساری باتیں جس حد تک علمی تحقیقات سے پیدا ہوتی ہیں دوسرے مشاغل سے کم ہوتی ہونگی پھر علوم فطرت کی تحقیقات کے ذریعہ سے انسان فطرت کو تسخیر کرتا ہے اور اس سے اُسکی حاکمانہ جبلت تسکین پاتی ہے۔ اسی طرح بیشمار معاشی فوائد علمی تحقیقات کی بدولت بنی نوع انسان کو حاصل ہوئے جنکی شاہد موجودہ زمانہ کی حیرت انگیز ایجادات ریل، تار، بجلی وغیرہ ہیں۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ سارے منافع اور برکات ضمنی اور ثانوی ہیں اور ان پر زور دینے سے نہ صرف اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ خود یہ فوائد بھی حاصل نہیں ہوتے۔ جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں علمی تحقیقات میں کامیابی اُنہی بے نفس، بے غرض لوگوں

کو ہوتی ہے جو محض اپنی سیرت کے تقاضے سے دن رات عالم ذہنی اور عالم فطرت کی گتھیوں کو سلجھانے میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں، اور جنہیں اُن منافع کی خبر بھی نہیں ہوتی جو اُنکے کام سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

علمی تحقیقات کو خالص اور مستند بنانیکے لئے ان ضمنی نتائج سے بے تعلق رکھنے کے علاوہ دوسرے مصالح سے ایک حد تک قطع نظر کرنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً یہ خیال کہ علمی تحقیقات کا نتیجہ مذہب کو نقصان نہ پہنچائے احقاق حق کیلئے زہر قاتل ہے اور تحقیق کو تاویل بنا دیتا ہے۔ جو مذہب سچائی سے ڈرتا ہے وہ اس قابل نہیں کہ کوئی دیانت دار آدمی اُسے اختیار کرے۔ اسی طرح سیاسی اور معاشرتی مضرات کے ڈر سے علمی تحقیق کو روکنا یا اسمیں تحریف کرنا بھی نہایت بزدلی کی بات ہے۔ محقق کو اپنا کام نہایت دلیری سے کرنا چاہیئے کیونکہ اُسکا مقصد پاک اور برگزیدہ ہے اور ظاہری مصالح سے بالاتر ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ علمی تحقیقات کو ہر قسم کے بیرونی اثر سے آزاد اور بیرونی مصالح سے بے تعلق کرنے سے ہمارا منشا یہ نہیں ہے کہ علم اور تہذیب و تمدن کے دوسرے شعبوں کے درمیان ربط کے رشتہ کو توڑ دیا جائے یا محقق کے ذہن کو سوائے علم اور تحقیق کے ساری چیزوں سے خالی کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں تو علمی تحقیق زندگی اور تہذیب و تمدن کے کُل سے الگ ہو کر ایک بے معنی چیز رہجائیگی اور محقق کا ذہن نظام کائنات کا چھوٹا سا نمونہ ہونیکی جگہ محض ایک چٹیل میدان بن جائیگا۔ ہم تحقیقات علمی کو دوسرے تمدنی شعبوں سے طول میں نہیں بلکہ صرف عرض میں جدا کرنا چاہتے ہیں یعنی ہمارا یہ مدعا ہے کہ علمی تحقیقات اپنے اصول و قوانین کے لحاظ سے آزاد اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے ممتاز ہو لیکن اُس کے ساتھ ہی اُسکا موضوع تہذیب و تمدن من حیث الکل ہو۔ محقق جس بات پر غور و فکر کرے خواہ وہ کوئی تاریخی مسئلہ ہو یا ریاضی یا طبیعی اُسے کوئی جداگانہ اور بے تعلق چیز نہ سمجھے بلکہ تمدنی زندگی کا ایک جزو اور اس پر اسی حیثیت سے نظر

ڈالے کہ تہذیب و تمدن کے اور دوسرے اجزا سے اور خود کل سے اسکا کیا تعلق ہے بیشک محقق کو تمدن کے بڑے سے بڑے مقصد کیلئے بھی اپنے ناموس اعظم یعنی حق پژوہی راست گوئی سچائی کو نہ چھوڑنا چاہیئے اور اس حیثیت سے ساری بیرونی مصلحتوں سے آزاد رہنا چاہیئے لیکن اس حد تک پابندی اُس پر ضرور عائد ہوگی کہ اپنی تحقیق کا موضوع ضروریات زمانہ اور تمدنی مصالح کے لحاظ سے منتخب کرے۔ جو لوگ اپنا موضوع تحقیق بذات خود جزوی اور غیر اہم یا زمانہ کے لحاظ سے بیکار چیزوں کو بناتے ہیں وہ بقول شیخ سعدی کے چند کتابوں کے حامل ضرور ہوتے ہیں لیکن محقق یا دانشمند نہیں کہے جا سکتے۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ اس قسم کے تنگ نظر محقق اکثر دیکھنے میں آتے ہیں بلکہ علمی کام کرنیوالے زیادہ اسی طرح کے ہوتے ہیں اس کے مقابلہ میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو جزویات کو حد سے زیادہ حقیر جانتے ہیں اور صرف کلیات سے واسطہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک اہم بالشان نتائج تک پہنچنے کیلئے واقعات کی چھان بین کی ضرورت نہیں بلکہ صرف تخیل کی بلند پروازی کافی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ علمی تحقیق کے دو عناصر ہیں اور دونوں بجائے خود نہایت اہم ہیں (۱) تجزیہ یا تحلیل جس میں محقق عالم فطرت یا عالم ذہنی کے صرف ایک مظہر کو ایک وقت میں دیکھتا ہے اسکو حتی الامکان چھوٹے چھوٹے اجزا میں تقسیم کرتا ہے ہر جزو کو کمال احتیاط سے جانچتا پرتا لتا ہے اور مختلف اجزا میں ترتیب پیدا کرتا ہے (۲) ترکیب یا تنظیم جس میں وہ ان جانچے پرتالے ہوئے اجزا کو ملا کر نئے سرے سے مستقل مظاہر کی شکل میں لاتا ہے ان مظاہر کا تعلق دوسرے مظاہر سے معلوم کر کے نظریات قائم کرتا ہے ان نظریات کو عالم ذہنی اور عالم فطرت کے عام قوانین کی تحت میں لاتا ہے اور اس طرح پورا نظام مرتب کرتا ہے۔ بہترین صورت تو یہ ہے کہ یہ دونوں عمل یعنی تحلیل اور ترکیب ایک ہی شخص کرے لیکن ہوتا یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ذہن میں بہت کم جمع ہوتی ہیں بعض لوگ پہلے کام کے لئے مناسب ہوتے ہیں بعض دوسرے

کام کے لئے بلکہ قوموں کی ذہنی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق مختلف زمانوں میں بھی
پایا جاتا ہے۔ کوئی عہد جزئیات کی چھان بین پر زیادہ زور دیتا ہے اور کوئی اس سے فائدہ اٹھا کر
ہیئت کے قائم کرنے اور نظام بنانے پر اپنی ساری قوت صرف کرتا ہے۔ یہ فرق اگر حد سے زیادہ
بڑھ جائے تو اشخاص اور ادوار کی ذہنی زندگی یک طرفہ اور ناقص ہو جاتی ہے اسی لئے ذی ہوش
قومیں کوشش کرتی ہیں کہ انکے محقق تحلیل اور ترکیب کے جامع ہوں۔ اس کی سب سے زیادہ
کامیاب صورت یہ ثابت ہوئی ہے کہ تحقیق کا کام کرنے والے معلم بھی ہوں علمی تحقیق اور تعلیم کا ایک
ہی مرکز بنایا جائے، جسے جامعہ کہتے ہیں تاکہ محققین نوجوان طالبعلموں کے توسط سے زندگی سے
تعلق قائم رکھ سکیں انکا کام محض بے نظام تجزیہ یا بے بنیاد نظام نہ بننے پائے بلکہ ہر پہلو سے مکمل
اور حقیقی معنوں میں تحقیق ہو اس قول کے لئے کہ تحقیقات علمی کا صحیح مرکز جامعہ ہے کسی مزید ثبوت
کی ضرورت نہیں۔ تحقیقات علمی اور تعلیم کا تعلق اس قدر گہرا ہے کہ جہاں ان میں سے ایک چیز کا
گھر ہو وہاں دوسری چیز کا رہنا بھی لازمی ہے۔ تعلیم کو اگر دریا قرار دیا جائے تو تحقیقات علمی اسکے
منبع کی حیثیت رکھتی ہے اور جس طرح منبع کے بند ہو جانے سے دریا کا پانی یا تو خشک ہو جاتا ہے
یا کم سے کم کثیف ہو کر رہ جاتا ہے اسی طرح تحقیقات علمی کا دروازہ بند ہو جانے سے تعلیم یا تو سرے
سے غائب ہو جاتی ہے یا اسکا انحصار اسلاف کے فرسودہ خیالات کی کورانہ تقلید اور چند
کرم خوردہ کتابوں کے حفظ کرنے پر ہو جاتا ہے بالفاظ دیگر تحقیقات علمی اور تعلیم ایک ہی عمل کے
دو حصے ہیں اور چونکہ وہ عمل اعمال نامیہ میں سے ہے اس لئے یہ دونوں حصے ایک دوسرے
سے الگ ہونے کے بعد صحیح حالت میں باقی نہیں رہ سکتے۔

اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد یہ مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ تحقیق علمی کا کام کن لوگوں کو کرنا
چاہیے بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ تحقیقات اہل علم کے ایک خاص طبقہ کے متعلق ہونا چاہئے

جو فکر معاش سے آزاد ہو اور جسے کوئی دوسری پابندی نہ ہو اس اصول کے فوائد ظاہر ہیں جو لوگ تصنیف و تالیف کے لئے مناسب ہیں وہ جب صرف یہی کام کرینگے تو انکی کارگذاری طبیعت کی یکسوئی اور وقت کی زیادتی کے سبب سے کیف و کم دونوں کے اعتبار سے بڑھ جائیگی۔ لیکن جب مسئلہ کے دوسرے پہلو پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمیشہ ایک کام کرنے سے طبیعت میں جمود اور نظر میں تنگی پیدا ہوتی ہے اور ابتدا میں کتنی ہی ترقی کیوں نہ ہو آگے چلکر تنزل کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں علاوہ اس کے بہت بڑی خرابی وہ پیدا ہوتی ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں یعنی علمی تحقیقات تعلیم سے الگ ہونے کے سبب سے تہذیب و تمدن کے مجموعی نظام سے الگ ہو جاتی ہے اور اس میں زندگی کی تر و تازگی باقی نہیں رہتی اس لئے بہتر یہی ہے کہ علمی تحقیق انہیں لوگوں کے سپرد ہو جو اعلیٰ تعلیم دیتے ہیں یعنی دار العلوم یا جامعہ کے اساتذہ سے یہ کام بھی لیا جائے۔ اس طریقہ میں جو خرابیاں ہیں یعنی فرصت کی کمی سے مجموعی کارگذاری کا کم ہونا یا اساتذۂ دار العلوم کی فطرتی قدامت پسندی کے سبب سے خیالات کے ارتقا کا رک جانا ان کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنا چاہیے۔ دار العلوم یا جامعہ میں اساتذہ کی تعداد اتنی ہو کہ ہر فرد واحد کے حصے میں تعلیم کا کام زیادہ نہ ہو اور وہ کافی وقت علمی خدمات میں صرف کر سکے۔ بیرونی اہل علم تنقید و تبصرہ کے ذریعہ سے اساتذہ جامعہ کے کام کا احتساب کریں اور انہیں نئے خیالات سمجھائیں علاوہ اس کے ان اساتذہ کے کام میں نوجوان طالب علم بھی شریک کئے جائیں جنکی طبیعت زمانہ کے تغیر اور خیالات کی تبدیلی کا مقیاس ہوتی ہے اور اپنی زندہ دلی جدت پسندی اور جوش سے معمر اساتذہ کی خشکی قدامت پسندی اور افسردہ مزاجی میں اصلاح کرتی ہے۔

ذی علم اور خوش مذاق نوجوانوں کا علمی تحقیق کے کام میں اساتذہ کا ہاتھ بٹانا چند اور وجوہ سے بھی مناسب ہے۔ علمی تحقیقات بھی اور پیشوں کی طرح ایک پیشہ ہے اور جیسے دوسرے پیشوں کے

ے خاص تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے اس کے لئے بھی ہے اگر نوجوان طالب علم اپنی درسی تعلیم ختم کرنے کے بعد ماہر فن اساتذہ کی نگرانی میں علمی کام کرینگے تو وہ بہت کم وقت میں تصنیف و تالیف کے اس معیار پر پہنچ جائینگے جس پر اُنکے اساتذہ خاص تربیت سے محروم رہنے کے سبب عرصہ دراز میں پہنچے تھے۔ علاوہ اس کے نوجوان محققوں سے یہ امید بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اُن فنون کو بھی اپنے دائرہ تحقیق میں شامل کرینگے جس سے بالعموم معمر اہل علم کو کم دلچسپی ہوتی ہے۔ مثلاً ادب لطیف، فنون جمیلہ، سیاست وغیرہ۔

ان مقدمات کے بیان کرنے کے بعد ہم مختصر الفاظ میں یہ بتا ئینگے کہ ہمارے خیال میں جامعہ ملیہ کو اپنے یہاں علمی تحقیق کا انتظام کس طرح کرنا چاہئے۔

اس تجویز کو ہم محتاج دلیل نہیں سمجھتے کہ جامعہ ملیہ کی تصانیف و تالیفات کی زبان اردو ہونا چاہئے۔ اسی طرح یہ بھی مسلمہ ہے کہ تحقیق علمی کیلئے ایک مستقل ادارہ کی ضرورت ہے جو اپنے اندرونی انتظامات میں خود مختار ہو اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ہم اپنے اصول کے خلاف دارالتحقیق کو دارالتعلیم سے جدا کر رہے ہیں تو صحیح نہ ہوگا کیونکہ جو علیحدگی ہم تجویز کر رہے ہیں وہ محض انتظامی ضرورتوں سے ہے اور انتظامی امور تک محدود ہے یہ ضرور نہیں کہ کسی دارالعلوم کے سب اساتذہ علمی تحقیق کا ذوق رکھتے ہوں یا اس کے اہل ہوں اس لئے یہ اصول بالکل غلط ہے کہ دارالتحقیق کا تعلق دارالعلوم سے بہیئت مجموعی یعنی بلا تفریق کل اساتذہ سے ہونا چاہئے۔ ہماری تجویز ہے کہ وہ اساتذہ جو تصنیف و تالیف کی صلاحیت اور اُس سے ذوق رکھتے ہوں چند ہونہار فارغ التحصیل طلبا اور چند بیرونی فضلا کے ساتھ ملکر ایک ادارہ قائم کریں جسکا نام اُردو اکادمی ہو۔ طلبہ اکادمی کے رفقا کہلائیں وہ ایک معینہ میعاد تک اور اگر ہوسکے تو ایک معینہ مقدار میں کام کرنے کے پابند ہوں اور انہیں معقول وظیفہ دیا جائے تاکہ وہ ضروریات زندگی کیطرف سے مطمئن رہیں۔ دوسرے

حضرات کے لئے نہ کوئی معاوضہ مقرر ہو نہ کام کی مقدار اُن سے یہ توقع کیجائے کہ وہ نوجوان رفقا کی نگرانی اور مدد کرینگے اور خود بھی ہر طرح سے کوشش کرینگے کہ اُردو زبان کو اپنے اسلاف اور دوسری اقوام کے حکما اور فضلا کے بیش بہا خیالات سے مالا مال کردیں۔

اکادمی کو اپنا لائحہ عمل بنانے میں پابندی اور آزادی معینہ نظام اور خودرو طبیعت دونوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اُسے ایک عظیم الشان کام انجام دینا ہے یعنی اسلامی تہذیب کی نشو و نما کی تاریخ اور اُسکے بہترین ذہنی نتایج کو اُردو زبان میں پیش کرنا انہیں چراغ راہ بنا کر دوسری قوموں کے علمی کارناموں کا مشاہدہ کرنا اور دونوں کے امتزاج سے ایک علمی فضا پیدا کرنا جسمیں ہندی مسلمانوں کی ذہنی تربیت ہو سکے اور وہ دوسری اقوام کے دوش بدوش علم انسانی کی ترقی اور حقیقت کی جستجو کے لئے سعی کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اس کے لئے ظاہر ہے کہ غور و خوض کرکے مکمل نظام بنانیکی ضرورت ہے ورنہ یہ انجام ہوگا کہ علوم و فنون کے شعبوں کی تحقیق اور کتابوں کی تالیف و تصنیف میں اہم اور غیر اہم مقدم اور موخر کا فرق نہ رہے گا اور سارے کام میں بے اصولی اور بے ترتیبی پیدا ہو جائیگی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ تصنیف و تالیف کوئی جر ثقیل کا عمل نہیں کہ مقررہ قواعد کے مطابق معینہ وقت کے اندر معینہ مقدار میں ہوسکے ان قیود کے لگانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تصنیف و تالیف میں فطرتی جوش آمد اور تر و تازگی نہ باقی رہے گی۔

انسان کامل

کچھ عرصہ ہوا پروفیسر نکلسن نے بعض تحقیقات کو جو انہوں نے تصوف اسلامی میں کی ہیں ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا تھا منجملہ اور دلچسپ مباحث کے اس کے ایک حصہ میں انہوں نے مشہور صوفی مصنف شیخ عبدالکریم ابن ابراہیم الجیلی کی کتاب "الانسان الکامل فی معرفۃ الاواخر والاوائل" پر بھی نہایت تفصیل سے بحث کی ہے۔ چونکہ الجیلی نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جسے دنیائے تصوف کے باہر بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس لئے ہم نہایت اختصار کیساتھ ناظرین جامعہ کیلئے اس کتاب کا ملخص پیش کرتے ہیں۔ دنیائے تصوف میں اس مسئلہ کو سب سے پہلے منصور نے چھیڑا تھا جس کی صدائے اناالحق میں معارف وحقائق کی ایک دنیا پوشیدہ تھی، بعدازاں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے ان مسائل پر غیر معمولی وسعت اور دقت نظر سے اظہار خیال کیا۔ الجیلی بھی کم و بیش اگرچہ اسی مسلک کے پابند ہیں جسے منصور اور ابن عربی قائم کر گئے ہیں لیکن خیالات کی برجستگی اور طرز ادا کی خوبی کی بدولت انہیں اسمیں ایک مجتہدانہ درجہ حاصل ہے۔

عبدالکریم ابن ابراہیم الجیلی (گیلانی) کا سن پیدائش سنہ ۱۳۶۵ء ہے، وطن گیلان ہی اور سلسلہ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ مسلمان تذکرہ نویسوں نے اگرچہ انکا بہت کم ذکر کیا ہے لیکن انہوں نے خود اپنے حالات لکھے ہیں۔ عرصہ تک وہ اپنے مرشد شیخ شرف الدین اسمٰعیل ابن الجبرتی کیساتھ یمن میں رہے، ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا، خود لکھتے ہیں کہ سنہ ۷۹۰ھ میں وہ کوشی (غالباً بنارس مراد ہے) میں تھے۔ سن وفات معلوم نہیں، غالباً سنہ ۱۴۰۶-۱۴۱۷ء کے درمیان کسی وقت فوت ہوئے۔

شیخ کی تصانیف میں سے جنکے متعلق اندازہ کیا گیا ہے کہ تعداد میں قریباً چالیس تھیں صرف بیس

باقی ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہمیت "الانسان الکامل" کو حاصل ہے، یہ کتاب اگرچہ ایک مبہم انداز میں لکھی گئی ہے۔ پھر بھی شیخ نے قرآن و حدیث کا دامن نہیں چھوڑا انکو یقین ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اسمیں اور شریعت میں سرِ مو تفاوت نہیں، ان کے نزدیک انسان کامل کے تحت میں جو تخیل کام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان بجائے خود ایک ایسا جہانِ اصغر ہے جو خدا اور فطرت دونوں کی قوتوں کا مظہر ہے۔ یہ اساس ہے جس پر شیخ نے اپنے فلسفہ تصوف کی عمارت تیار کی ہے،

جیلی وحدۃ الوجود کے قائل ہیں وہ دنیا اور اس کے تمام اختلافات کو ایک ہی ذات کا پرتو سمجھتے ہیں، اب ذات جسے ہم اسما و صفات سے متصف کرتے ہیں اسکی دو صورتیں ممکن ہیں یا تو یہ کہ اسکا وجود محض خیالی ہو جیسے شاعری میں ہما و عنقا کا یا یہ کہ وہ واقعتہً موجود ہو، ذات واقعی کی دو قسمیں ہیں، ذات مطلق یعنی خدا اور وجود جو عدم سے ملحق ہے یعنی دنیائے مخلوقات، ذات الٰہی بحیثیت ذات الٰہی ادراک سے بالاتر ہے۔ ہمیں اسکا علم صرف اس کے اسما و صفات کے ذریعے سے ہوتا ہے وہ ایک ایسا جوہر ہے جس کے دو عرض ہیں ازلیت اور ابدیت دو صفتیں ہیں خالقیت اور مخلوقیت، دو تعین ہیں حدوث و قدم دو نام ہیں عبد و معبود (خدا و انسان) دو پہلو ہیں خارجی اور مرئی یعنی موجودہ دنیا اور داخلی اور غیر مرئی یعنی آنیوالی دنیا، اتفاق و لزوم دونوں اس کے اندر موجود ہیں، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ یا تو وہ اپنے لئے موجود نہیں لیکن دوسروں کے لئے موجود ہے یا یہ کہ دوسروں کے لئے موجود نہیں مگر اپنے لئے موجود ہے،

ذات مطلق اسماء و صفات دونوں سے مبرا ہے اسمیں اسما و صفات کو اسی وقت دخل ہوتا ہے جب وہ اپنی مطلقیت کو چھوڑ کر مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ دراصل کائنات عبارت ہے ذات مطلق کی انہیں مختلف شئون سے وہ ایک مظاہری "چیز" ہے اس لئے کہ اس میں حقیقت نے خارجیت اختیار کی ہے اس اعتبار سے اگرچہ ہم ذات و صفات میں

امتیاز قائم کرنے پر مجبور ہیں لیکن انجام کار دونوں ایک ہیں جیسے برف اور پانی، نام نہاد دنیائے مظاہر یعنی دنیائے صفات) کوئی سراب نہیں بلکہ یہ بجائے خود ایک حقیقت ہے بحیثیت ذات مطلق کے پر تو ہونے کے دوسرے وجود کے، چونکہ الجیلی کے نزدیک ذات اور صفات میں حقیقتاً کوئی فرق نہیں اس لئے اس نے خیال اور وجود میں بھی کوئی فرق نہیں کیا، گویا دنیا اظہار ہے۔ خدا کی اپنی ذات کے خیال کا جیسا کہ ابن عربی لکھتے ہیں۔

"ہمیں وہ صفات ہیں جن سے ہم ذات الٰہی کا احصا کرتے ہیں، ہماری ہستی دراصل خدا کی ہستی کی خارجی شکل ہے جس طرح ہماری ہستی کیلئے خدا کا وجود ضروری ہے اسی طرح ہمارا وجود ضروری ہے تاکہ خدا اپنی ذات کا مشاہدہ کر سکے"

اگر اسما و صفات سے قطع نظر کرلیجائے تو ذات مطلق محض "اعمیٰ" ہے، یہ وہ لفظ ہے جسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس سوال کے جواب میں استعمال فرمایا تھا کہ جب دنیا نہ تھی تو خدا کہاں تھا اور جس کا مطلب بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ ذات مطلق اسوقت غیر شعوری حالت میں تھی! جیلی کے نزدیک ذات مطلق کو اپنے اندر شعور پیدا کرنیکے لئے تین منزلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے جس سے بتدریج اسکی سادگی کم ہوجاتی ہے، یہ گویا نزول ہے ذات مطلق کا جو علی الترتیب ان تین منزلوں میں سے گزرتی ہے (۱) احدیۃ (۲) ہوئیہ اور (۳) انائیۃ احدیۃ سے مراد وحدت کا وہ مجرد خیال ہے جس میں اگرچہ کسی چیز کا ظہور نہیں ہوتا لیکن وہ پہلا قدم ہے شہود کیطرف ہوئیت سے مراد ذات الٰہی کی احدیت فی الباطن ہے جس میں صفات کو مطلق دخل نہیں، انائیۃ ہوئیۃ کا خارجی پہلو ہے یعنی وحدت دنیا جس کی مظہر یہ عمل ہے مطلق کے نزول کا جسمیں ذات محض خود ہی اپنے خیالات کا فاعل و مفعول بنگئی ہے اور اسکا ظہور خدا کی صورت میں ہوا ہے ان نمایاں صفات کیساتھ جو تمام کائنات پر محیط ہیں۔ بالفاظ دیگر کائنات خارجی پہلو ہے اس کا جسکا داخلی پہلو خدا ہے، گویا ذات

۲- ڈاکٹر اقبال، تاریخ مابعد الطبیعیات ایران

مطلق میں ایک ایسی کثرت مضمر ہے جو اس کے نزول کیساتھ وسیع ہوتی جاتی ہے۔ نزول سے قبل اسمیں صفت کو دخل ہوتا ہے یعنی تعلق کو لیکن یہ بتدریج اسما وصفات اختیار کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کا آخری ظہور کائنات کی صورت میں ہوتا ہے باایں ہمہ اس سے اسکی وحدت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا، کثرت ایک بے ثبات چیز ہے جسمیں مطلق کا موجود رہنا ناممکن ہے لہذا یہ کثرت بالآخر ناپید ا ہو جاتی ہے اور مطلق پھر مطلق میں گم ہو جاتا ہے، صاف ظاہر ہے کہ مطلق میں کا صعود (رجوع الی الذات) اس کے نزول کا الٹ ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا ذریعۂ صعود کیا ہے ؟

جیلی کہتے ہیں کہ انسان بوجہ اپنی ذات کے وہ خیال تکوینی ہے جو گوشت اور پوست کی صورت میں وجود مطلق اور فطرت کے درمیان رابطہ کا کام دیتا ہے۔

جبکہ ہر نمود حقیقت کی کسی صفت کی مظہر ہے انسان وہ کائنات اصغر ہے جسمیں تمام صفات متحد ہیں اور یہ صرف ذات انسانی ہے جسمیں ذات مطلق کو اپنے تمام مختلف مظاہر کا شعور حاصل ہوتا ہے بالفاظ دیگر ذات مطلق فطرت انسانی میں جلوہ نما ہو کر اسی کے ذریعے سے پھر اپنے آپ میں واپس لوٹ جاتی ہے، گویا انسان کامل میں خدا اور انسان ایک ہو جاتے ہیں، اگر وہ ایک طرف مذہبًا خدا اور انسان کے درمیان واسطہ ہے تو دوسری طرف مابعد الطبیعی حیثیت سے وہ اصول اتحاد ہے جسمیں حقیقت و نمود کا تضاد معدوم ہو جاتا ہے۔ لہذا ذات مطلق کا صعود روح انسانی کی واردات اتحاد کے اندر اور اسی کے ذریعے سے رونما ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جیلی کے فلسفہ کی تان بالآخر تصوف پر ٹوٹتی ہے۔

اب سلسلۂ گفتگو انسان کیطرف جو تجلیات ربانی کا مظہر ہے رجوع کرتا ہے، جیلی کے نزدیک صوفیانہ تجلی کے تین مراحل ہیں ٹھیک اس طرح جیسے مطلق کے نزول کی تین منزلیں تھیں یہ پہلی منزل

تجلی اسمائی ہے، یہ وہ منزل ہے جسمیں انسان کامل پر ذات مطلق کے ہر اسم کا راز ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ اس نام سے اس طرح متحد ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس نام سے اللہ کی مدد طلب کرے تو وہ اسے پورا کر سکتا ہے،

دوسری منزل تجلی صفات کی ہے جسمیں انسان خدا کی مختلف صفات میں سے کسی ایک سے جسمیں اسکی تجلی ظاہر ہو متحد ہو جاتا ہے، مثلاً اگر کوئی اسکی صفت حیات سے متحد ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اسی کی زندگی تمام خیالی اور حواسی اشیاء میں جاری و ساری ہے، اگر اسے صفت علم حاصل ہوگئی ہے تو اس پر ماضی و مستقبل کے تمام عقدے وا ہو جاتے ہیں اور وہ علم کے تمام راز ہائے سربستہ سے واقف ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جیلی نے صفات الہیہ کے چار عنوان قائم کئے ہیں (۱) صفات ذات (۲) صفات جمال (۳) صفات جلال اور (۴) صفات کمال، کائنات اور اسمیں جو کچھ ہے جمال الٰہی کا آئینہ ہے اس میں حسن و قبح دونوں کا وجود اپنی اپنی جگہ پر ضروری ہے گویا شر محض ایک اعتباری چیز ہے، اور انسان جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تمام صفات الہیہ کا مظہر ہے حتیٰ کہ اس کی صفات توحید و سرمدیت کا بھی جو اور کسی شے میں موجود نہیں خواہ وہ اس عالم میں ہو یا آنیوالی دنیا میں،

آخری منزل تجلی ذات کی ہے جو کمال کا آخری درجہ ہے، یہاں صفات کی بحث ہی نہیں اس لئے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں مطلق مطلق میں گم ہو جاتا ہے۔

انسان کامل کیا ہے؟ کائنات کا قطب جس پر تمام دنیا کا انحصار ہے، وہ تخلیق کی علت غائی ہے وہی ہے جس کے ذریعہ خدا خود اپنا مشاہدہ کرتا ہے اس لئے کہ خدا کے اسماء و صفات بحیثیت مجموعی اسی میں دیکھے جا سکتے ہیں، وہ شبیہ ہے ذات الٰہی کی اور اسمیں وہ کچھ موجود ہے جو ذات مطلق

کے ان دو پہلوؤں کے مقابل میں ہے جنہیں ہم ہویتہ اور انائیتہ سے تعبیر کرتے ہیں یعنی داخلیت وخارجیت یا بالفاظ دیگر الوہیت اور انسانیت، اس کی فطرت سہ گانہ ہے جسمیں ذات مطلق ہو اپنے دونوں پہلوؤں خالقیت اور مخلوقیت کے موجود ہے۔

"انسان کامل جسد و روح دونوں اعتبار سے کائنات کی بلند ترین ہستی ہے۔ وہ خیالات میں ملائکہ سے افضل لیکن وساوس اور توہمات میں شیاطین و جنات سے بھی فروتر ہے۔ بہ لحاظ حیوانیت اسے تمام حیوانوں پر فوقیت حاصل ہے، وہ ہر مثال کی مثال عکسی ہے ......

انسان کامل ذات الہی کا نسخہ ہے، حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے آدم کو رحمن کی صورت پر پیدا کیا، ایک دوسری حدیث ہے کہ خدا نے اسے اپنی صورت پر پیدا کیا، یہ اسلئے کہ خدا حی وقیوم ہے، سمیع وعلیم ہے، خبیر وبصیر ہے اور انسان بھی وہ ہویتہ الہی کا اپنی ہویتہ انائیتہ الہی کا اپنی انائیتہ اور ذات الہی کا اپنی ذات سے تقابل کرتا ہے گویا وہ کل کے مقابل پر کل ہے اور جز کے مقابل پر جز، خدا کے تمام ضروری اسما اور صفات اسمیں موجود ہیں اس لئے کہ اسکی حقیقت اور اس کی روحانیت بھی اس طرح ظاہر ہو سکتی تھی۔ خدا کو انسان کامل سے وہی نسبت ہے جو انسان کو آئینے سے ہے۔ انسان آئینہ ہی میں اپنے آپ کو دیکھ سکتا ہے لیکن اسمیں سوائے اپنے آپ کے اور کچھ نہیں دیکھتا ایسے ہی انسان کامل اپنے آپ کو اسمائے الہی کے آئینے میں دیکھتا ہے اور خدا بھی اگر اپنا مشاہدہ کرتا ہے تو اسی میں اسلئے کہ وہی ایک ذریعہ ہے صفات الہیہ کے ظہور کا، یہی فریضہ اظہار صفات الہیہ ہے جسے قرآن نے امانتہ کے نام سے تعبیر کیا ہے اور جسے زمین وآسمان اور پہاڑوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا لیکن انسان نے اسے

قبول کیا، بیشک وہ ظلوم وجہول ہے* ظلوم اس لئے کہ وہ اپنی روح کو پست کر دیتا ہے اور جہول اس لئے کہ وہ اس راز سے بے خبر ہے ... جب انسان اسماء وصفات کی سرحد سے آگے نکل جاتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک "لذت الہیہ" محسوس کرتا ہے ... یہاں وہ خود بھی صفات واسماء سے مبرا ہوتا ہے۔ اور اسے سوائے اپنی ذات کے اور کسی وجود کا علم نہیں ہوتا (ہویۃ) وہ محسوس کرتا ہے کہ جو کچھ بھی ہے اسکا صدور اسی سے ہوا ہے مختصراً یہ کہ وہ تمام کثرت کو اپنی ذات کے اندر دیکھتا ہے ..."

اسمیں کوئی شک نہیں کہ خلقت کے اعتبار سے تمام انسان مساوی ہیں لیکن کم ہیں جو عملاً اس نقطہ کمال پہ پہنچتے ہیں پھر باعتبار کمال انکے مدارج میں بھی فرق ہے، انتہائی کمال صرف ایک ہی انسان کو ہوسکتا ہے اور وہ نبی اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات ہے۔

"انسان کامل وہ محور ہے جس کے گرد دنیا گردش کرتی ہے، وہ ایک ہی اور ہمیشہ ایک ہی رہیگا۔ اس کی مختلف لباس ہیں اور مختلف کنائس جنکے مطابق اسے مختلف نام دئے جاتے ہیں لیکن اس کا اصلی نام محمد کنیت ابوالقاسم عرف عبداللہ اور لقب شمس الدین ہے۔"

جیلی کا خیال ہے کہ انسان کامل یا بالفاظ دیگر حقیقۃ محمدیہ کا جو جس صورت میں چاہتے متشکل ہوسکتی جسکو نبی کوئی پرتو ہر زمانے میں موجود رہتا ہے، خود جیلی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے پیر ومرشد شیخ شرف الدین اسماعیل الجبراتی کی صورت میں ملاقات کی تھی۔

"میں ایک مرتبہ ان سے اپنے مرشد شیخ شرف الدین اسمٰعیل الجبراتی کی صورت میں ملا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ شیخ ہی نبی ہیں حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ نبی ہی شیخ ہیں۔ یہ وہ رویت تھی جو مجھے ۷۹۶ھ میں زبید (یمن) میں نصیب ہوئی جب کبھی کوئی صاحب کمال

---

* انا عرضنا الامانۃ الخ

(ادیب) حضورؐ کو اس شکل میں دیکھتا ہے جیسی وہ زندہ ہے تو وہ ان سے ان کے اصلی نام سے خطاب کرتا ہے لیکن جب وہ اسے کسی دوسری شکل میں نظر آتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اسمیں خود حضورؐ ہی موجود ہیں تو وہ حضورؐ کو اسی صورت کا نام دیتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ محمد سے مطلب صرف حقیقۃ محمدیہ ہے اس نام کو کسی اور معنی میں استعمال نہ کیا جائے ، چنانچہ ایک بار جب انکا ظہور شبلی[۲] کی صورت میں ہوا تو انہوں نے اپنے مرید سے کہا ، دشاہد رہنا کہ میں نبی ہوں اور مرید جو اس راز سے واقف تھا کہنے لگا ، میں شہادت دیتا ہوں کہ تم اللہ کے نبی ہو ، بہت ممکن ہے اس پر لوگوں کو اعتراض ہو لیکن یہ انکی غلطی ہوگی اسکی مثال تو وہی ہے جیسے کوئی شخص خواب میں کسی کو کسی دوسری شکل میں دیکھے لیکن خواب اور صوفیانہ کشف میں فرق ہے اگر کوئی شخص آنحضرت کو خواب میں کسی دوسری صورت میں دیکھے تو وہ بیداری میں حقیقۃ محمدیہ کو اس صورت کے نام سے موسوم نہیں کر سکتا لیکن صوفیانہ کشف میں معاملہ اس کے برعکس ہے اگر اس حالت میں تم حقیقۃ محمدیہ کو کسی صورت میں دیکھو تو تمہیں حقیقۃ محمدیہ کو اس صورت کا نام دینا چاہیئے اور اسکی ایسی ہی تکریم و تعظیم کرنا چاہیئے جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ میں تناسخ کا قائل ہوں ، معاذ اللہ مطلب صرف یہ ہے کہ آنحضرت جس صورت کو چاہیں اختیار کر سکتے ہیں ۔ اور بروئے سنت ثابت ہے کہ وہ ہر زمانے میں انسان کامل کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں ۔ ظاہری اعتبار سے انسان کامل آنحضرت کے خلفا ہیں اور باطناً آنحضرت ان کی حقیقت روحانی ،،

گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی اولین مخلوق ہیں اور تمام مخلوق کی مثال اعلیٰ وہ ایک

---

۲ ابو بکر شبلی رح

نسخہ نہیں ذات الہی کا، حدیث ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا لیکن جہاں وہ ایک طرف نہ خدا کے برابر ہیں نہ اسکی شان سرمدیت میں شریک دوسری طرف وہ تمام کائنات سے افضل ہیں! اوپر بیان ہو چکا ہے کہ انسان کامل جس زمانے میں بھی ہو حقیقۃ محمدیہ کا پرتو ہے اس لئے بعض صوفیا کا یہ کہنا کہ اولیا انبیا سے افضل ہوتے ہیں سراسر غلط ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہو جانیکا احتمال ہے جس کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض بے بصر ناقدین فن جنکا مقصد تحقیق حق کی بجائے زیادہ تر عیب چینی و عیب جوئی ہوتا ہے۔ تصوف اور ائمہ تصوف کے متعلق ہر قسم کی بے سروپا باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔ اس مضمون سے ہمارا مقصد چونکہ صرف ایک تحقیق علمی کو پیش کرنا ہے۔ اسی لئے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جیلی جیسا کہ احتمال ہو سکتا ہے نہ حلول کے قائل ہیں نہ تناسخ کے۔ صوفیائے اسلام نے ذات الہی کو ہمیشہ دنیا سے ماورا تصور کیا ہے خود منصور کو جس کی صدائے انا الحق کو تعصب کی گرم بازاری میں صدائے کفر سے بھی بدتر قرار دیا گیا ہے اعتراف ہے کہ ذات انسانی اور ذات الہی اتحاد و اتصال کے باوجود بھی ایک نہیں ہو جاتیں، ذات انسانی کی علیحدگی ہمیشہ قائم رہتی ہے پانی کو شراب میں ملا دیجئے، یہ اسمیں حل ہو جائیگا لیکن جب بھی پانی ہی رہے گا۔ شراب نہیں بن سکتا،

ممکن ہے قارئین کرام کو جیلی کے بعض خیالات میں منطقیانہ تضاد نظر آئے لیکن جیلی نہ خالص فلسفی ہیں نہ مجذوب الحال صوفی، ذات الہی اور ذات انسانی کے اتحاد و اتصال کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں۔

"ذات مطلق کے ادراک کی یہ صورت ہے کہ انسان کے ذہن سے من وتو کا امتیاز جاتا رہے، لیکن یہ نہ حلول ہے نہ یگانگت ذات اس لئے کہ عبد ہمیشہ عبد ہی رہیگا، یہ نہیں ہو سکتا کہ معبود عبد ہو جائے اور عبد معبود۔ بے شک انسان کامل ایک

حقیقت ہے لیکن یہ وہ حقیقت مطلق نہیں جو اسکے شعور میں عبد و معبود کی شکل میں رونما ہوتی ہے "

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیلی کے خیالات پر نوافلاطونیت کا اثر نہایت گہرا پڑا ہے لیکن وہ اسکے ماتحت جس نتیجہ پر پہنچا ہے اس کا "اسلامی" ہونا یقینی ہے

نیازی

ریف کا سردار

از جناب حافظ سید فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی

گھنگھرج برق کی وہ ابر وہ تار باراں ۔۔۔ بجلیوں کا وہ چمکنا وہ گھٹا ٹوپ سماں
باڑہ پر باڑہ وہ میداں میں وہ توپوں کا دھواں ۔۔۔ اسمیں اک ریف کا سردار مجاہد جاں باز
کھولدیتا ہے خموشی کا الفاظ میں راز

ٹڈی دل فوج کی جاں بازکو پروا ہی نہیں ۔۔۔ سختیٔ موت سے ڈرنا ہمیں آتا ہی نہیں
بے مزہ زیست کی واللہ تمنا ہی نہیں ۔۔۔ باڑہ توپوں کی جو مینہ بنکے برس جاتی ہے
وہ مری کشت شہادت میں بہار آتی ہے

حضور سرورِ کائنات (صلعم)

زندگی انسانی اصولاً دو قسموں پر تقسیم ہے۔ ایک حیات نفسی اور دوسری حیات شعری یا خارجی۔ حیات نفسی محض زندہ رہنے کا نام ہے اور حیات شعری یا خارجی سے مفہوم وہ مجموعہ تعلقات ہے جو انسان کے دنیا سے اور دنیا والوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ حیات خارجی اگرچہ تابع ہے حیات نفسی کی۔ اس لئے کہ جبتک کوئی ذات سلسلہ انفاس سے یا ان فطرتی قوتوں سے آراستہ نہو جو قدرت سے تخلیق کے وقت بالعموم انسان کو عطا ہوتے ہیں، تعلقات خارجیہ کا اس سے ظہور نہیں ہوسکتا۔ مگر زمانہ حال نے حیات نفسی اور اس کی ضمنی قوتوں کو قانون فطرت کا اٹل اصول قرار دے کر حیات خارجی کو بنفسہ جداگانہ مضمون قرار دے لیا ہے۔ اور اس کی ہر شاخ کے متعلق تحقیق و تفتیش کو ایک جداگانہ فلسفہ قرار دیا ہے۔ مثلاً اخلاقیات معاشرت کا جزو لازم ہے مگر دونوں جداگانہ مضامین ہیں۔ جذبات کو بھی اسی طرح فلسفہ حیات سے علیحدگی ہے۔ حیات خارجی پھر دو قسموں پر منقسم ہے۔ ایک وہ سلسلہ ہے جس کا تعلق مذہبیات اور روحانیت سے ہو۔ اور دوسرا وہ جس کا علاقہ محض دنیائے مادی سے ہے اور جسمیں مذہب کے اختلاط سے کوئی فرق واقع ہونے نہیں پاتا۔

حضور سرورِ کائنات صلعم کی حیات کے متعلق بھی ان دو مختلف پہلوؤں سے بحث ممکن ہے۔ ایک وہ حیات جس کا تعلق مذہب، اعتقاد اور روحانیت سے ہو۔ اور دوسرا وہ جس کا اثر دنیائے مادی پر تھا یا جس کا اثر دنیائے مادی سے متعلق تھا۔

مذہب، اعتقاد اور روحانیت کے زاویہ نظر سے حضور کے حالات آپ کے سامنے پیش ہوچکے ہیں اور آئندہ بھی پیش ہوتے رہینگے آج میں رحمۃ العالمین کی پاک زندگی کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ ذات جس کی عظمت مذہبی اور روحانی نقطۂ نظر سے "قصہ مختصر" یہ ہو کہ "بعد از خدا بزرگ توئی"

وہی وجود با جود دنیائے مادی کے لئے بھی آفتاب ہدایت ہی یا نہیں۔ اور جو زندگی اس ذات پاک نے دنیائے مادی کی گذاری وہ اپنے اصولوں کے لحاظ سے بنی نوع انسان کی فلاح وبہبود اور ترقی و عروج کی ضامن ہے یا نہیں۔

معاف فرمائیے میرا یہ مقصد نہیں کہ مذہبی زاویہ نظر سے اور روحانی نقطہ خیال سے جو کچھ محاسن حضور کے آپ سن چکے ہیں یا جنکو آپ آئندہ سنیں گے ان سے انکار رہے۔ نعوذ باللہ من ذالک ہرگز نہیں میں ہر ایک پر ایمان رکھتا ہوں۔ اس تجزیہ اور تبصرہ سے میری غرض صرف اسقدر ہے کہ میں دنیائے عمل پر بھی اس پاک زندگی کا اطلاق کرکے یہ دیکھوں اور یہ یقین کرلوں کہ یہ دنیا بھی اس دامن فیض کے برکات سے محروم نہیں رہی اور یہ کہ دنیاوی نقطہ نظر سے حضور ممدوح کی ذات ہماری رہبری کیلئے ایک ہمیشہ زندہ رہنے والی مثال ہے یا نہیں۔ دنیائے مادی میں بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے؟۔ اس کا جواب تشنہ ہے بڑی طویل بحث کا۔ رائج الوقت جملہ علوم جو تعلق ہیں معیشت سے۔ تمدن سے۔ جذبات سے، سیاسیات سے، طبعیات سے، تاریخ سے جغرافیہ سے وغیرہ وغیرہ، ان میں سے ہر ایک سے ہر ایک ضرورت کے متعلق بحث کرنے کے بعد یہ حد قایم کیجائیگی کہ فلاں امر موصل الی المقصود ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ بحث موجودہ مضمون کے بساط کی نہیں (اتنا وقت نہ آپ کو ہے اور نہ مجھے اسلئے) ان بحثوں سے قطع نظر کرکے میں صرف اُن کسوٹیوں کو لیتا ہوں جو دنیا میں بلا اختلاف کسی مسلمہ طور پر جوہر خالص کی پرکھ کرسکتی ہیں۔ ساڑھے تیرہ سو سال قبل دنیا کو ملاحظہ فرمالیجئے اور یہ علوم کرلیجئے کہ دنیا اسوقت اپنے مادی منازل میں حضور کی بعثت کے وقت کہاں قدم زن تھی۔ اس کے بعد آپکی ذات سے جو انقلاب دنیا میں واقع ہوا اس کا موازنہ بآسانی ہوکر اس انقلاب کی قدر و قیمت کا پتہ چل سکیگا۔

ملک عرب، عرب بائدہ کو میٹ چکا تھا۔ عرب عاربہ کا اکا دکا فسرد کہیں گمنامی میں ہوگا تو ہو

کچھ خبر نہیں۔ عرب مستعربہ کا دور آخر تھا۔ وہ شمعیں جو حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ کی وساطت سے دنیا کی فلاح کے لئے آچکی تھیں، کفر و ضلالت کی گھٹاؤں اور گمراہی کے دھندوں میں چھپی ہوئی پڑی تھیں۔ یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت یہی نام نہاد مذہب تھے جس کے افراد یہیں آباد تھے، مگر مذہبی تلقین کا اثر ان سے قطعاً مٹ چکا تھا۔ خود عیسائی مورخوں کا بیان ہے کہ ابتدائی زمانہ کی پاک اور فراخ ایمان کی جگہ توہم پرستی نے لیلی تھی۔ عیسائیت کی حالت گری ہوئی تھی کہ باہم جنگ و جدال نے تنگ کر رکھا تھا۔ عیسائی مورخین نے اسکندریہ کے بہت بڑے کتبخانہ کے جلائے جانے کا الزام غلط حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات پر لگایا تھا۔ اس کتبخانہ کی بربادی کا ذکر گبن جیسا مشہور مورخ یوں لکھتا ہے کہ ان کتابوں کا اس سے بہتر اور کیا مصرف ہو سکتا تھا کہ اسکندریہ کے حمام ان سے ۶ ماہ تک گرم کئے جاتے۔ بنی تغلب کے متعلق حضرت علی کا قول ہے کہ انہوں نے عیسائیت سے سوائے شراب خوری کے اور کچھ نہیں سیکھا۔ توحید کے اعلان کا صدر بتوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ بتیانیوں کے گھٹے کہیں لات کی قدرت کے ثبوت تھے تو کہیں عزیٰ کے اقتدار اور قوت کے ثبوت۔ اعتقادات سے تو مجھے چنداں بحث نہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اپنے بنائے ہوئے خداؤں نے دنیا میں کیا محاسن اخلاقی کیا صفات معاشرتی، کیا تمدنی بھلائیاں، فلاح و بہبود کے کون سے مضمر اور پوشیدہ خزانے اور ترقی و عروج کے کون سے گرانمایہ جوہر اپنے اپنے حلقۂ اثر میں پیدا کر رکھے تھے۔ ام الخبائث کے زیر قدم ہر شخص اپنی راحت کی حیثیت تسلیم کئے ہوئے تھا۔ شراب ناب کے دور دورے تھے۔ انسانی زندگی کی وقعت کسی بھیڑ بکری سے زیادہ نہ تھی۔ ذرا ذرا سے جھگڑوں میں صدہا خون صدیوں تک بہتے رہنا اس زمانہ کے فخر و مباہات کا بڑا ذریعہ تھا۔ جان کی سلامتی کا جب یہ حال ہو تو مال کا کیا ذکر۔ کسی کی پگڑی اسکے سر پر سلامت نہ تھی بلکہ مسلمہ طریقہ پر ملکیت تھی اس شخص کی جو اپنی لاٹھی کے زور سے بھینس کو ہانک سکے بہت کم لوگ تھے جو کہیں چھپے ہوئے بیٹھے تھے ورنہ عموماً زمانہ کے جور و تعدی سے تنگ تھے

کھاکر اپنے لشکروں کو باردوشش بناتے ہوئے ہر کجا کرشب آمد سرائے او دست پر عمل پیرا تھے صنف نازک
محض خواہش پرستی کا آلہ تھی اور ان سے متعلق فسادات اور خوں ریزیاں اگر ہوتی تھیں تو اس وجہ سے
کہ ان سے کسی اور کو لطف اندوزی سے محروم کردیا جاتا تھا اس لئے جذبات نفسانی کی اس توہین کی پاداش
میں دوسروں کو اپنی جانوں کا اپنے عزیزوں کی عصمتوں کا اور اپنے املاک کا جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا ورنہ
وجہ عناد خود عصمت ریزی کبھی نہ ہوتی تھی۔ ایک عورت کئی کئی مردوں کی بیوی ہوا کرتی تھی۔ دوسرے قبیلوں
کی عورتیں جو قبضے میں آجاتی تھیں انکو ذریعہ معاش بنایا جاتا تھا اور یہ کوئی عیب نہ تھا۔ کسی شخص کے انتقال
پر اسکی بیوی اور بیٹی خود اسی مردہ کے لڑکے کا ترکہ بنکر نکاح میں آجایا کرتی تھیں عشق ومحبت زن وشو
کے تعلقات کھلم کھلا بیان کئے جاتے تھے۔ شاعری میں ان تذکروں کو ایسے ننگے کلمات میں ادا کیا جاتا
تھا کہ جس کا سننا یا اعادہ کرنا بھی آج ممکن نہیں۔ لڑکیاں زندہ دفن کردی جاتی تھیں۔ بیویوں سے
نکاح کے وقت اکثر یہ شرطیں ہوتی تھیں کہ جو لڑکی پیدا ہوگی وہ قتل کردی جائیگی۔ اس طرح جنس لطیف
کی اہمیت اُسوقت ایک مملوکہ چیز سے زیادہ نہ تھی جس کے نہ تو حقوق تھے اور نہ جس کی کوئی ہستی خاص
اہمیت اخلاقی یا معاشرتی رکھنے والی تھی۔

خاص عرب کی تو یہ حالت تھی۔ دنیا کے دوسرے گوشوں کی حالت کا بھی اندازہ لگا لیجیے مصر اور
ایران کے تمدن اور تہذیب کو مٹے ہوئے بہت زمانہ گذر چکا تھا۔ یونان ان سے پہلے اپنا ڈنکا بجاکر گوشہ
گمنامی میں خفتہ تھا۔ البتہ روم کی تہذیب کے کچھ کچھ آثار ٹمٹماتے شعاؤں کی صورت میں یورپ کی تاریکی میں
نظر آتے تھے مگر روما کی تہذیب و تمدن کو بالفاظ دیگر عیسویت کی تہذیب اور تمدن کہا جا سکتا ہے
اور تہذیب و تمدن کی اہمیت اور خوبی کا اندازہ ان لوگوں کے حالات زندگی سے لگایا جا سکتا ہے
جو اس تہذیب و تمدن پر کاربند ہیں عیسویت کا اثر عربوں اور مصریوں کے اخلاق پر جو کچھ تھا وہ اوپر
کے واقعات میں ضمناً بیان ہو چکا۔ خود مسئلہ تثلیث نے جو اختلاف عیسائی دنیا میں پیدا کر دیا تھا

دہ کچھ کم ہنگامہ خیز نہ تھا۔ ایک اعتقاد رکھنے والا دوسرے کی نگاہوں میں کافر اور گردن زدنی تھا
تمدن کی زبردست قوت گرفت قانون جب یوں منفعل ہو تو ضدیں یا خود غرضیاں کیا کچھ خرابیاں اور
فساد نہ پیدا کر سکتی ہوں گی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کا وہ حلقۂ اثر جو اسوقت کے
نام نہاد مذہب عیسویت کا حلقہ بگوش تھا، اخلاق اور تمدن کی کس منزل پر ہوگا۔

امریکہ اسوقت تک مسلسل طریقہ پر اس ناواقفیت کی گراں اور زبردست پردہ کی آڑ میں چھپا ہوا
تھا جس نے سابقہ تہذیبوں کی روشنی کو وہاں تک پہنچنے نہ دیا تھا۔ خاص امریکہ کی بعض پرانی اقوام
کے افراد جو آجتک کسی کسی طبقہ میں موجود ملجاتے ہیں اور جنمیں مردم خواری جاری ہے ان سے اس
امر کا پتہ چل سکتا ہے کہ انکا ماضی کیا تھا۔

ایشیا وہ ملک ہے جو مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ اور عربستان اور اس کے قرب و نواح
کی آبادیاں ہی وہ حصۂ ملک تھیں (ہیں) جنہوں نے دنیا کو اکثر مذاہب دئے ہیں۔ جب گھر کے قریب
حصہ کا یہ حال ہو جو عرب اور شام کا تھا تو ان حصوں کا اندازہ لگانا کوئی دشوار کام نہیں۔ جہاں تک
تہذیبہائے سابقہ کی رسائی ہونے بھی نہیں پائی تھی۔ غرض دنیا کے ہر گوشہ میں وہی ابتری رونما تھی
جسکی تفصیل عرب کے سلسلہ میں بیان ہو چکی ہے۔ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ بچہ جس حلقۂ اثر میں پرورش
پاتا ہے سن شعور میں انہیں اثرات کا عملی جامہ پہنا کرتا ہے اس لئے دنیاوی علوم کے دلائل اور
قیاس خواہاں ہیں اس امر کے کہ حضور رسول اکرم اپنی ذات میں انہیں بدترین اثرات کا نتیجہ ثابت
ہوتے مگر سیرتیں ملاحظہ فرمائیے تو پتہ چلتا ہے کہ آپکی ذات تیرہ و تار، ابر آلود، آسمان کی وہ درخشاں ہستی
تھی جس نے اپنے لمعات پر نور سے بندہی ہوئی ہوا کو متموج کر کرکے کثیف بادلوں کو منتشر کر دیا اور
مطلع کو پھر از سر نو نورانی بنا دیا۔

دیانت و امانت ابتدائے عمر ہی سے آپکے مزاج میں سلامت روی، صداقت حسن معاملت

ایفائے وعدہ اور دیانت کے جوہر موجود تھے۔ دنیائے عرب میں آپکی ذات امین مشہور و مسلم ہو چکی تھی شام و بحرین، حباشہ جرش اور خود اہل مکہ تجارت کے سلسلہ میں اور نیز دن رات کے تجربہ سے آپ کے گرویدۂ دیانت تھے۔ کہیں آپ تاجر امین تو کہیں صرف امین مشہور تھے۔ بہرصورت دیانت اور امانت جو دنیاوی زندگی کیلئے بیاضروری ہیں انکے وجود کا اعتراف ہر طرف سے تھا۔

ایفائے وعدہ ایفائے وعدہ کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک صاحب نے ایک خاص مقام پر جناب سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اتفاقاً وہ بھول گئے اور تین دن کے بعد اس مقام پر پہنچے تو حضور کو اسی جگہ موجود پایا اور اس پر مستزاد یہ کہ نہ کبیدگی تھی نہ برافروختگی۔ ایفائے وعدہ کی نسبت عزبھر تاکید اکیدرہی حذیفہ ابن یمان اور ان کے والد ہجرت نبوی کے بعد مدینہ میں آکر شریک ہوئے۔ قریش نے انکی آمد پر یہ اعتراض کیا کہ تم وہاں جاکر ہمارے مخالفین میں شریک ہوجاؤ گے اور پھر ہم سے لڑنے کو آؤ گے انہوں نے قریش سے کہا کہ ہماری غرض صرف تبدیل مقام ہے۔ مدینہ میں جب جنگ بدر کی تیاریاں ہونے لگیں تو حذیفہ نے بھی شرکت کرنا چاہی وہ وقت یاد رہے کہ عظیم الشان قریشی فوج کے مقابلہ میں صرف تین سو تیرہ مسلمان لڑنے کیلئے جا رہے تھے ایک ایک متنفس کی کمی بیشی اہم تھی۔ تاہم ایفائے وعدہ کے لحاظ سے حذیفہ کو شرکت جنگ کی اجازت نہیں ملی۔ یہی اکیلے نہ تھے جو جنگ بدر سے ایفائے وعدہ کی خاطر محروم رکھے گئے ابوحسل کو بھی اس جنگ میں اسی ایفائے وعدہ کی خاطر شرکت کی اجازت نہیں ملی

حسن معاملت کی مثالیں حضور کی زندگی میں بیشمار ہیں اور میں اختصار کی خاطر ایک ہی دو پر اکتفا کرتا ہوں۔ ایک یہودی کا آپ پر قرض تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مکہ فتح ہو چکا تھا۔ اسلام کا عروج انتہائی پر تھا حضور کی ذات مقتدر و محترم ترین قرار دی جاتی تھی۔ یہودی آتا ہے اور اپنے قرض کو نہایت سختی اور درشتی سے طلب کرتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضہ یہ برداشت نہیں کر سکتے اور یہودی پر برہم ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے نہیں اس طرح سے پیش نہ آؤ اور اس استدلال پر کہ وہ قرضخواہ ہے اس کو

خی کا بھی اتفاق ہے ۔ باوجود اسکے کہ اس وقت تعدد ازدواج معیوب نہ تھا لیکن حسن خلق اور حسن معاملت
س کا نام ہے کہ ۲۵ سی عمر میں پندرہ برس بڑی بیوی کے ساتھ زندگی کا وہ خاص حصہ صرف کیا جاتا ہے
جب دنیا کی دلچسپیوں میں انسان کو اپنا گرویدہ بنالینے کی مقناطیسی کشش موجود ہوتی ہے ۔

حسن معاملت سے لگ بھگ ہی حسن تدبیر بھی ہے ۔ حسن تدبیر کی متعدد مثالیں چھوٹے اور بڑے واقعات
میں ملتی ہیں تاہم ایک خاص واقعہ یہ ہے کہ مکہ معظمہ کے جس قدر سربرآوردہ فرقے تھے ان سبھوں نے مل کر
خانہ کعبہ کی مرمت کر لی لیکن جب حجر اسود کے نصب کئے جانے کا وقت آیا تو ہر شخص اپنے آپ کو اس
فخر کے حصول کا اہل سمجھتا تھا حجتیں ہوئیں تکراریں رہیں اور نوبت اس کے قریب آگئی کہ ایک خونخوار جنگ
چھڑ جائے اس وقت یہ تجویز قرار پائی کہ دوسری صبح جو شخص سب سے پہلے حرم میں داخل ہو وہ اس
معاملہ میں حکم مقرر کیا جائے ۔ قسمت نے ایسے نازک اور اہم مسئلہ کے تصفیہ کے لئے آپ سے رجوع
کیا اور اتفاق نے آپ ہی کو وقت مقررہ پر سب سے پہلے حرم میں پہنچایا ۔ اس لئے معاملہ آپ کے سپرد
ہوا ۔ آپ نے نہایت دور اندیشی سے جملہ مدعیان منصب کو ایک جگہ جمع کیا ۔ حجر اسود کو ایک کپڑے میں رکھوایا
اور انہیں لوگوں سے اٹھوا کر اس جگہ تک پہنچوایا جہاں نصب کیا جانا منظور تھا ۔ اور وہاں دست مبارک
سے حجر اسود کو اٹھا کر نصب فرمایا ۔ اس حسن تدبیر کی بدولت صدہا سر تنوں پر قائم رہ گئے ۔ ہزارہا عورتیں
غلامی کی مصیبت اور عصمت ریزی کی شامت سے بچ رہیں اور سینکڑوں نفوس ابتری مال اور تباہی
احوال سے بچ رہے ۔

صلح جوئی آپ نے ہمیشہ صلح کل رہنا پسند فرمایا ۔ حرب فجار میں حق اور خاندان کی خاطر شرکت تو کرنا
پڑی مگر آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا ۔ یہ بات نہ تھی کہ جنگ آزمائی کی قابلیت نہ تھی بدر میں شک کی تو گنجائش
ہی نہیں ۔ بدر سے پہلے جو مہمیں گذریں غزوۂ بد بعض غزوۂ احد وغیرہ وغیرہ اس امر کی شاہد ہیں کہ ایک
جری اور بہادر جنرل جنگ کو کس خوبی کیساتھ شروع کرتا ہے نشیب و فراز پر جنگ آزماؤں کی روک

تھام کس کس طرح کرتا ہے اور مصروف بہ کار لوگوں کے دل بڑھا بڑھا کر کس طرح انہیں مشغول رکھتا ہے اور ہزارہا دشواریوں کے مقابلہ میں بھی ہمت، جرآت، استقلال اور خوبی انتظام سے مظفر و منصور ہی ہوتا ہے، ایک نہیں صدہا واقعات ہیں جن سے آپکی صلح کل فطرت کا نتیجہ مستنبط ہوتا ہے۔ غزوہ احد میں حمزہؓ جیسا قابل عظمت چچا انکا جیسا جری و جان نثار مونس میدان جنگ میں شہید پڑا ہو یکمشت مسلمان جو خدا کے نام پر بدرجہا زائد بھاری فوج کے مقابلہ میں سینہ سپر بنے ہوئے ہتھیلیوں پر سر لئے جاں نثاری کو معراج سمجھے ہوئے سرکٹا رہے ہوں۔ ایسے نازک وقت میں بھی ہمہ تن خیر فطرت مشرکین کے حال پر متاسف ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ اور اس وقت بھی کہ جب عبد اللہ ابن حمیہ کی تلوار سے چہرہ مبارک میں مغفر کی دو کڑیاں چبھ کر رہ جاتی ہیں، دعا کے لئے ہاتھ اٹھتے ہیں تو یہی دعا مانگی جاتی ہے کہ رَبِّ اغْفِرْ قومی فانہم لایعلمون ط اے خدا میری قوم کو بخش دے کہ وہ جانتی نہیں۔ حلف الفضول بھی فطرتی خواہش کا ثبوت ہے آئے دن کی جنگوں نے صدہا گھروں کو تباہ و برباد کر دیا تھا مظلوم کا دنیا میں کوئی ساتھی نہ تھا اس وقت چند خاندانوں کی غیرت جوش میں آئی اور انہوں نے مظلوموں کی امداد کا معاہدہ کیا۔ حضور اقدس بھی اس حلف میں شریک تھے اور بعد کی زندگی میں بھی حلف الفضول کی شرکت پر مسرور ہوتے رہے۔

مدینہ طیبہ میں تشریف لیجانیکے بعد یہودیوں سے عہد و پیمان دوسرے فرقوں سے معاہدے۔ حدیبیہ کا معاہدہ، قریش پر فوج کشی کرنے سے پہلے مصالحت کی کوشش، یہ تمام امور اسی بات کے شاہد ہیں کہ جنگ سے بدرجہا زیادہ صلح مرغوب خاطر مبارک تھی۔

مساوات دوسروں کے ساتھ میل جول میں مساوات کا برتاؤ رہا کرتا تھا یہ امر پسند نہ تھا کہ آپکی ذات کا کوئی احترام اس سے زیادہ کیا جائے جتنا معمولی شخص کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ آپکی تعظیم کے لئے لوگ اگر اٹھتے تو آپ انہیں منع فرمادیا کرتے تھے۔ مجلس میں بیٹھتے وقت اپنے لئے کوئی خاص مقام آپ تجویز نہیں فرماتے تھے بلکہ جمع شدہ لوگوں میں اس طرح مل جل کر بیٹھ جاتے تھے کہ اجنبی کو آپکی شناخت بلا اعانت غیرے

ممکن نہیں رہتی تھی۔ اصول مساوات کا اندازہ اس سے ہوسکیگا کہ آپ ایک مرتبہ قیس ابن سعد کے ہاں تشریف لیگئے واپسی کے وقت سعد نے اپنا گدھا پیش کیا اور قیس کو ہمراہ رکاب جانیکے لئے کہا آپ نے قیس کی معیت کو اس شرط پر منظور فرمایا کہ قیس خود بھی گدھے پر سوار ہو اور قیس چونکہ گدھے کا مالک تھا اسلئے آپکے سامنے بیٹھے۔ مسجد نبوی جب تعمیر ہو رہی تھی تو مسلمانوں کی کمی نہ تھی مگر جذبات مساوات نے آپ کو علیحدہ رہنے نہ دیا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ آپ بھی مٹی کی ٹوکریاں اٹھاکر لاتے تھے اگر کہیں تشریف لیجاتے تو سلام میں ہمیشہ خود تقدیم فرماتے۔

پاس وضع مراسم کا ایک نہج پر شروع ہوجانا آسان ہے مگر اسی صورت سے مدت العمر ان تعلقات کا قیام نہایت دشوار ہے۔ بشریت کے اقتضا سے ایسی غلط فہمیاں اکثر واقع ہوتی رہی ہیں اور ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں جو معیوب نہ بھی ہوں تاہم اختلاف طبائع کے باعث کبھی کبھی گرانی اور کشیدگی پیدا کر دیا کرتی ہیں۔ اس گرانی اور ناگواری کے دفعیہ کیلئے ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ انسان اس موقع پر صبر و تحمل سے کام لے اور آئندہ زمانہ میں موقع کی مناسبت سے اس فعل کے فاعل کو اسکے ثواب یا غلط ہونے کا یقین دلائے عملی دنیا میں یہ صبر و تحمل نہایت دشوار ہے۔ ہزار ہا نفوس آپ کو ایسے ملینگے جو ایسے جذبات کے ضبط پر قادر نہوں گے۔ اس شخص کا اندازہ لگائیے جسے متذکرہ بالا مساوات کے ساتھ شبانہ روز ہزاروں سے سابقہ رہتا ہو اس کے لئے ایک مرتبہ کے قائم شدہ مراسم کا اسی نہج پر مدت العمر قائم رکھنا کیسا دشوار اہم کام ہوگا لیکن حضور کی سیرتوں کا ملاحظہ فرمائیے۔ تاریخوں کی ورق گردانی کیجئے ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ ایکمرتبہ کے قائم شدہ مراسم میں کبھی ناگواری یا کشیدگی کو راہ ملی ہو۔

بادشمنان تلطف دوستوں کیساتھ مدارات گو مشکل اگرچہ ہے لیکن اسکا وقوع پذیر ہونا صفات اخلاقی کی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن با دشمنان تلطف البتہ ایسی چیز ہے جو کمیاب بھی ہے اور انمول بھی غزوۂ احد میں دشمنوں کیلئے جو دعائے رحمت مانگی گئی اس سے پتہ چل سکتا ہے کہ طبعیت اور فطرت کے لب سے

یہ نفس بھی بعید نہ تھا لیکن یہ واقعہ زندگی مبارک کا اکیلا ہی واقعہ نہ تھا جس پر یا دشمنان تلطف کا قلع قمع کیا جاسکے۔ عبداللہ ابن اُبی جس نے اپنی زندگی آپکی دشمنی کیلئے وقف کردی تھی اپنی کوششوں سے صدہا بار لوگوں کو آپکے خلاف ابھارا اور اکسایا جب اس کا انتقال ہوا تو آپنے اسکی مغفرت کی دعا مانگی اور یہی نہیں اس کی تجہیز وتکفین کیلئے اپنا کرتہ بھی عطا کیا۔ قریش کہ جنہوں نے ایذا رسانی کی کوئی ممکن تدبیر اٹھا نہ رکھی جان ومال، عافیت وطن جن کی بدولت برسوں خطرے میں رہے، ہزاروں مسلمانوں کا خون جنکی بدولت ہوا، ہزاروں جنکی بدولت یتیم ہوئے اور ہزاروں جنکی بدولت بیوائیں ہوئیں جب مکہ فتح ہوا تو بشریت انتقام لیے بغیر رہ نہیں سکتی تھی مگر آپ کا داخلہ کہ اعلان امن تھا نہ صرف مسلمانوں کیلئے بلکہ انکے لئے بھی جو غیر مسلم تھے۔ انتقام تو کس کا وہاں ماضی کے متعلق کوئی ملامت بھی نہیں فرمائی گئی۔

فیاضی فیاضی طبیعت کا خاصہ خاص تھا کوئی گداگر سے محروم نہیں جاتا تھا اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں اپنی ضرورت سے زیادہ چیز نہ ہوتی تو بھی اپنے اوپر تنگی فاقہ اور تکلیف برداشت کرلی جاتی اور دوسرے کی حاجت روائی کردی جاتی۔

حمایت وہمدردی دردمندوں کی ہمدردی، مظلوموں کی حمایت، غریبوں کی مدد، بیماروں کی پرسش، اعانت۔ بیکسوں کی دستگیری اپنے ہی نہیں غیروں کے بچوں کے ساتھ بھی پیار ومحبت یتیموں پر خاص توجہات یہ ایسی صفات ہیں جنکی بیشمار مثالیں سیرتوں میں اور تاریخوں میں بھری ہوئی پڑی ہیں۔

تہذیب واخلاق فضول گفتگو کرنا پسند خاطر نہ تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ خدانخواستہ کج اخلاق تھے یا آپ کی طبیعت شگفتہ نہ تھی۔ اصحاب کرام سے آپ خوش طبعی بھی فرماتے تھے ہاں یاوہ گوئی کے عیب سے دامن پاک تھا۔ جب کسی سے کلام فرماتے تو نہایت متانت اور تہذیب سے۔ گفتگو میں سختی یا درشتی نہ ہوتی تھی۔ خودستائی پسند خاطر نہ تھی پاس بیٹھنے والے دوسروں کی برائیاں اگر کرنا چاہتے تو آپ منع فرمادیتے تھے۔ عمر بھر میں کسی کو گالی نہیں دی۔ ایک مرتبہ یہودیوں کے السام علیکم کہنے پر حضرت عائشہؓ نے از فرط

ہوئیں اور بیوہ ہویوں کو بددعائیں دینے لگیں تو آپ نے منع فرمایا ارشاد ہوا کہ عائشہ خدا کو سخت کلامی پسند نہیں۔ ظاہر ہے جو فطرت دشمنوں کے لئے بدعا سننا بھی پسند نہ کرتی ہو وہ خود اپنے لئے سخت کلامی کا استعمال کیسے جائز رکھ سکتی ہے۔

سادگی لباس میں خوراک میں اور دیگر ضروریات زندگی میں صفائی اور سادگی کا بدرجہ اتم لحاظ تھا۔ تکلفات کو کسی بات میں راہ نہ تھی۔ خود اپنا سودا خرید لاتے تھے۔ گھر میں جھاڑو دے لیتے تھے۔ جوتوں کی خود مرمت کر لیتے تھے۔ انتظام خانہ داری میں اہل بیت کی امداد فرمایا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ اپنے ضروریات کے کاموں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے کر لینے میں عار ہوتا۔ کھانے میں تکلف کی اجازت نہ تھی۔ بیشتر محض ایک ہی چیز پر اکتفا ہوا کرتا تھا۔ روکھی سوکھی جو کچھ مل رہتی اس پر قناعت تھی البتہ ایسی چیزیں مرغوب خاطر نہ تھیں جنہیں بو ہو مثلاً پیاز و سرکہ۔

شان عفو شان عفو کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ آپ کی صداقت اور آپکے محاسن نے جو عقیدت صحابہ کرام میں آپکی ذات کے متعلق پیدا کر دی تھی اسکے لحاظ سے ان سے ایسے افعال کا سرزد ہونا جو خطا ہوں ممکن نہ تھا۔ پھر بھی نئی نئی بات تھی جہالت کی پیدا کردہ طبیعت ثانیہ کبھی امکان ضبط سے زیادہ قوی نکلجاتی اور بعض سے خطا سرزد ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر آپ حتی الامکان چشم پوشی فرماتے اور اصلاح کے لئے بلاواسطہ کوئی صورت اختیار کرنا بھی طبع نفیس کو گوارا نہ ہوتا تلقین اصلاح ہوتی تھی لیکن اکثر حدیث دیگراں میں کوئی اصحاب میں سے کسی دوسرے کی خطا بیان کرنے کے خواہاں ہوتے تو آپ عیب پوشی کی تلقین فرمایا کرتے تھے

حیا عرب میں آپکی حیا کو کنواری لڑکیوں کی حیا سے تشبیہ دیجاتی تھی اور تو اور کسی کے عیب بھی کھلم کھلا اس طرح ظاہر کرنے میں آپکی حیا غالب آجاتی تھی۔ دنیا میں حیا کو شعبہ ایمان قرار دینے والی ذات سب سے پہلے حضور ہی کی ہستی تھی۔ (باقی آئندہ)

سلطان جلال الدین خلجی

ہمارے مورخین بالعموم تاریخ ہند کے اسلامی عہد کو نہایت تاریک کرکے دکھاتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ دَور ظلمت و تباہی قتل و غارتگری ، ستمگاری و خونریزی ، بیدینی و بداخلاقی کا دَور رہا ہے ، اور تہذیب و تمدن اخلاق و مذہب ، سیاست و جہانبانی کا اسمیں کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ان مورخین نے صرف انہی سلاطین اور حکمرانوں کو بہت نمایاں طور پر پیش کیا ہے جنمیں یہ باتیں کسی نہ کسی حد تک موجود تھیں یا ان کے صرف انہی عادات و اطوار ، اعمال و افعال کو زیادہ اجاگر کرکے دکھایا ہے جن سے انکا یہ مقصد حاصل ہوتا تھا۔ محمود کے حملے ، علاء الدین کی ملک گیری ، محمد تغلق کا دیوانہ پن ، نادر و تیمور کے مظالم جہانگیر کی عیاشیاں ، اورنگزیب کا تعصب یہ سب باتیں بہ بانگ دہل بیان کیجاتی ہیں لیکن اکبر و محمود کی بےمثل علم پروری ، فیروز تغلق اور شیر شاہ کی حیرت انگیز اصلاحات ، شاہجہان کے ذوق تعمیر کا کہیں ذکر نہیں ۔ تاریخ کی انہی مظلوم ہستیوں میں سے ایک سلطان جلال الدین خلجی کی بھی ہے جسکے محاسن اخلاق خدا ترسی اور دین پروری کا ہماری عام تاریخوں میں کہیں نام نہیں ۔ تاریخ میں وہ ایک غیر معروف بلکہ ناقابل ذکر شخصیت سمجھی جاتی ہے ، اسلئے کہ اس نے اپنی تخت نشینی کے وقت کوئی قتل و خونریزی نہیں کی ، باغیوں اور سرکشوں کو کبھی تہ تیغ نہیں کیا ، دین و مذہب کو پس پشت نہیں ڈالا ۔ حالانکہ یہ ایک بہت بڑا ظلم ہے ۔ اسکے محاسن اخلاق اور پاکیزہ عادات و اطوار کو دیکھکر آج حیرت ہوتی ہے کہ یہ قابل رشک ہستی کیا اس قابل تھی کہ تاریخ میں اسے اسقدر گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا جاتا !

عجز و انکسار "خاندان غلامان" کے آخری بادشاہوں میں جب کوئی لائق اور حکومت کے قابل ہستی نہ رہی تو امراء اہل دربار نے سلطان جلال الدین کو منتخب کیا ۔ ایک طرف امراؤ اہل دربار کا زمام سلطنت ہاتھ میں لینے کیلئے اصرار پہ اصرار تھا دوسری طرف سلطان جلال الدین کا اس اہم ذمہ داری کے قبول کرنے سے انکار پہ

انکار تھا لیکن جب لوگوں نے بہت مجبور کیا تو خواہی نخواہی انہیں قبول کرنا ہی پڑا تخت نشینی ہوتی ہے۔ بادشاہ جلوس سلطانی کے ساتھ محل کے اندر تشریف لیجاتے ہیں تو عجز و بے نفسی کا یہ حال ہے کہ سب سے پہلے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے ہیں لیکن پھر بھی قدم تخت شاہی پر نہیں پڑتا۔ امرا اور اہل دربار سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں:-

چگونہ شکرانہ خدا توانم گفت کہ در پیش تختے[1]
کہ چندیں گاہ سر بر زمین نہادہ ام،
پائے برآں نہادم و بہ باشاہی نشستم
و یاران من و خواجہ تاشان و ہمسران من
کہ با ایشاں طریق دوستاں و برادراں
زیستہ ام، دست بر کمر بستہ و پیش من ایستادہ
شدند۔

کیونکر میں اس کیلئے خدا کا شکرادا کر سکتا ہوں کہ ایک
ایسے تخت پر جس کے سامنے میں مدتوں سر بہ زمیں
رہا ہوں، آج اسپر میں اپنا قدم رکھوں اور
بادشاہی کرنیکے لئے اسپر بیٹھوں اور میرے وہ دوست
واحباب اور رفقا و معاصرین کے ساتھ میں نے
دوستوں اور بھائیوں کیطرح ایک عمر بسر کی ہو آج میرے
سامنے دست بستہ کھڑے ہوں!

غرض کہ ابھی حال تخت نشینی کی رسم ادا ہوچکی ہے، زمام سلطنت کو ہاتھ میں لئے ایک سال گذرجاتا ہے کہ کڑہ (الہ آباد) کے علاقہ میں قدیم امرا میں سے ایک امیر ملک چھجو علم بغاوت بلند کرتا ہے، گرد و نواح کے تمام امرا و جاگیردار اسکا ساتھ دیتے ہیں۔ عوام جوق در جوق اس کی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں اور وہ ایک لشکر کثیر کو ساتھ لیکر دہلی کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ بادشاہ کو اس بغاوت کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ لشکر شاہی مقابلے کے لئے روانہ ہوتا ہے اور دونو فوجیں بداؤں (بدایوں) کے قریب صف آرا ہوتی ہیں ایک چھوٹے سے باغی امیر کا شاہی لشکر سے مقابلہ ہی کیا، ملک چھجو کی فوج کو شکست ہوتی

[1] "تاریخ فیروز شاہی" مصنفہ ضیاء الدین برنی صفحہ ۱۷۸

ہے وہ معہ اپنے دیگر رفقا اور ہمراہیوں کے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے تمام فوج تتر بتر ہوجاتی ہے لیکن لشکر شاہی انکا تعاقب کرتا ہے اور تمام امراء کو گرفتار کرکے بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ان گرفتار شدہ امرا کی حالت یہ ہوتی ہے کہ گردنوں میں دوشاخے پڑے ہوتے ہیں مشکیں پیچھے چڑھی ہوتی ہیں۔ کپڑے خاک و خون میں آلودہ ہوتے ہیں۔ بادشاہ یہ حالت زار دیکھتا ہے اور فوراً اپنی دستار اتار کر منہ پر رکھ لیتا ہے، اور چلا کر بلند آواز سے کہتا ہے "ہے ہے، ایں چہ می شود" (ارے یہ کیا ہوا) بعدہ فوراً حکم دیا کہ۔

"تا امراو معارف را از ستوراں فرود آورند و شاخہا از گردن ایشاں کشیدند و دست کلہا بکشا وند و ایشاں را در خرگہے خالی بردند و طشت داراں و جانداران سلطان برایشاں رفتند و سرہائے ایشاں بشستند و عطرہا مالیدند و جامہائے کسوت سلطانی پوشانیدند و سلطان در بارگاہ خاص رفت و آں را در مجلس شراب پیش خود طلبید و حریف خمر آں کرد[۵۲]"

ان امرا کو اونٹوں سے نیچے اتاریں دوشاخے انکی گردنوں سے نکالدیں اور ہاتھوں کی رسیاں کھولدیں اور ایک بڑا خیمہ خالی کرکے اسمیں لیجائیں۔ بادشاہ کے ملازمین خاص انکی خدمت کو حاضر ہوئے انکے سر اور ہاتھوں کو دھلایا، خوشبوئیں ملیں اور انہیں خلعت سلطانی پہنایا۔ بادشاہ نے فوراً ایک مجلس خاص منعقد کی اور اسمیں ان کو بلایا اور اپنے ساتھ شریک جام کیا۔

بادشاہ کے اس عفو و کرم نے وہ کام کیا، جو دوسروں کے تیغ و تفنگ سے نہو سکتا تھا ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ۔

---

۵۲ صفحہ ۱۸۳۰

"ایشاں دور می خوردند و از خجالت سر فرو انداختہ جانب زمین میدیدند و سخن نمیکردند"

جس وقت کہ وہ شراب پی رہے تھے، شرم سے سر نیچے زمین کی طرف جھکا ہوا تھا اور منہ سے بات نہیں کرتے تھے۔

خارجی لیکن امراء اہل دربار کو باغیوں اور دشمنوں کے ساتھ بادشاہ کا یہ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کچھ پسند خاطر نہ ہوں وہ دل ہی دل میں کڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ اسے بادشاہی کرنیکا کچھ بھی سلیقہ نہیں، کوئی دوسرا بادشاہ ہوتا تو آج ان دشمنان سلطنت کو تہ تیغ کر دیتا۔ یا خود اگر ہم ان کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے ہوتے تو ہمارا حشر کیا ہوتا؟ صاف طور سے کہنے کیلئے اور تو کسی کی زبان کھلی نہیں۔ ملک احمد حبیب نے جو نہایت صاحب تدبیر اور اہل الرائے مانے جاتے تھے یہ سب باتیں بادشاہ کے سامنے صاف صاف بیان کر دیں بادشاہ نے انکی تمام باتیں غور سے سننے کے بعد نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا کہ

"[لہ] اے احمد انچہ تو گفتی من ہم میدانم و سیاست بادشاہاں در بغاۃ بیش از تو دیدم و لیکن چکنم من میان مسلمانی پیر شدہ ام و خونہائے مسلمانان ریختن عادت ندارم و عمر من از ہفتاد گزشتہ است، و دریں مدت ہیچ موحدے را نکشتہ ام و در پیران سال از برائے بقائے ملک چند گاہ کہ نہ پس دیگراں ماند و نہ پس ما خواہد ماند حکم مسلمانی و احکام شریعت را پشت دہم و کفر بایم کہ مسلماناں

میاں احمد! جو کچھ تم نے کہا میں بھی جانتا ہوں اور بغاوتوں کے معاملہ میں بادشاہوں کی زجر و توبیخ کو تم سے زیادہ دیکھا ہے لیکن کیا کروں کہ میں نے اپنی تمام عمر مسلمانی میں گزاری ہے اور مسلمانوں کا خون بہانے کی کبھی عادت نہیں رہی ہے میری عمر اسوقت ستر سے تجاوز کر چکی ہے لیکن اس عرصہ میں میں نے کسی ایک اللہ کے ماننے والے کو کبھی قتل نہیں کیا اور اس ضعیفی میں صرف ملک کی خاطر جو کہ نہ دوسروں کے بعد باقی رہا اور نہ

لہ ایضاً صفحہ ۱۸۵

را بیدریغ گردن بزنند و امروز بطریق
کہ بہست بگذرد، فردائے قیامت جواب
من نزدیک خدا تعالیٰ چہ باشد، واگر
ما در دست ایشاں می افتادیم و ایشاں
مارا بکشتندے و مسلمانی را پشت دادندے
جواب قیامت از ایشاں طلب شدے
و از کشتن مسلمانان ایشاں در دوزخ
میرفتند"

میرے بعد باقی رہیگا کیسے تذکرہ ہوگا کہ احکام الٰہی
اور شریعت محمدی کو پس پشت ڈالدوں اور یہ حکم
دیدوں کہ ہاں مسلمانوں کو خوب قتل کرو، اور آج
تو جیسے تیسے گذر جائے لیکن کل قیامت کے دن
اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دونگا؟ فرض
کرو کہ اگر ہم انکے ہاتھ اسی طرح گرفتار ہوتے اور
وہ ہم کو مار ڈالتے اور احکام اسلامی کو پس پشت
ڈالدیتے تو قیامت کے دن کیا ان سے باز پرس
نہوتی؟ اور مسلمانوں کے قتل کی سزا میں وہ ضرور
دوزخ میں جھونکے جاتے۔

جوانمردی | لیکن بادشاہ کے اس جواب باصواب سے وہ کسی طرح مطمئن نہوئے۔ وہاں تو انکے دلوں میں شعلہ انتقام بھڑک رہا تھا۔ تمام امرا و اہل دربار سخت بے زار اور نالاں تھے اور ہر وقت یہی شکوہ و شکایت رہتی کہ اس بادشاہ کو بادشاہی کرنیکا سلیقہ نہیں۔ جس مجلس میں بیٹھتے اور جو تذکرہ بھی چھڑتا اس میں بس بادشاہ کی غیبت اور برائی ہوتی تھی۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ تمام امرا ایک بڑے امیر ملک تاج الدین کوچی کے مکان میں جمع تھے۔ شراب کا دور شروع ہوا اور یہی تذکرہ چھڑا۔ ہر شخص نشہ میں چور تھا، جو جس کے دل میں آتا زبان سے نکالتا جاتا تھا۔ کوئی کہتا کہ بادشاہی کے لائق تو ملک تاج الدین سے بڑھ کر کوئی نہیں، کوئی یہ خیال ظاہر کرتا کہ خلجی حکومت کرنی کیا جانیں اور اگر انمیں کوئی ہے تو ملک احمد چپ ہے۔ بعض سر پھرے ایسے بھی تھے جو یہ کہتے کہ میں تو ایک وار میں سلطان جلال الدین کا کام تمام کر سکتا ہوں۔ کوئی تلوار میان سے باہر نکالکر یہ کہتا کہ آج یہ میری تلوار ہے اور بادشاہ کا سر

اتفاق ایسا ہوا کہ اس سازش کی خبر بادشاہ کو ہوگئی اور جو کچھ باتیں ان کے متعلق یہاں ہوئی تھیں وہ سب کسی نے ان سے جا کر کہدیں دوسرے دن بادشاہ نے تمام امرا و اہل دربار کو طلب کیا اور ان پر سخت عتاب کیا لیکن اس غصہ اور عتاب کی حالت میں بھی جوانمردی و اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا کہنے لگے۔

اے[۳] زنگیان مست شدہ درمیان خود
لافہا میزنید ومیگوئید کہ چنیں تیر خواہم زد و
چنیں تیغ خواہم راند۔ میان شما کدام
مرد است کہ ایں تیغ بردست گیرد و آشکارا
برمن درآید۔ اینک نشستہ ام کہ می آید۔

اے زنگیو! آپس میں مست ہو کر بڑھ بڑھ کے باتیں
کرتے ہو اور کہتے ہو کہ وہ تیر ماروں گا اور ایسی تلوار
چلاؤں گا۔ تم میں سے کون ایسا مرد ہے جو یہ تلوار
ہاتھ میں لے اور کھلے میدان میرے سامنے آئے۔
لو بیٹھا ہوں دیکھوں تو بھلا تم میں سے کون آتا ہے

دوسرا کوئی بادشاہ ہوتا تو اس گفت وشنید کی نوبت ہی نہ آتی اور ان تمام امرا کے سر خاک اور خون میں تڑپتے ہوئے نظر آتے۔ لیکن جلال الدین کے عتاب سلطانی میں اخلاق و انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا، اور عفو و کرم کا یہ سلوک کسی ذاتی کمزوری کی بنا پر نہ تھا، بلکہ مردوں کی طرح ان کو کھلا چیلنج دیتے ہیں۔ لیکن وہاں کس کی مجال تھی اور کہاں یہ یارا کہ کوئی اسے قبول بھی کرتا۔

اعترافِ جرم ان عام اوصاف و اخلاق کے علاوہ سلطان میں ایک سب سے بڑی خوبی اعتراف حق اور قبول جرم کی تھی جو عام انسانوں میں مفقود ہونیکے علاوہ بادشاہوں میں تو عنقا ہوتی ہے۔ آخر انسان ہی تھے، ایک دن دل میں یہ آیا کہ ساری عمر مغلوں کے ساتھ جہاد کرنے میں گزری کیا وجہ ہے کہ جمعہ کے خطبہ میں میرا نام اَلمُجاہِدُ فی سَبِیلِ اللّٰہ کے ساتھ نہ لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بیوی ملکہ جہاں سے کہا کہ جب قضاۃ وصدور دربار میں آئیں تو تم ان سے یہ تحریک کرو کہ وہ میرا نام خطبوں میں اَلمُجاہِد فی سَبِیلِ اللّٰہ کے ساتھ لیا کریں۔ اتفاق سے انہی دنوں شہزادہ کی شادی تھی جس میں مبارکباد

---

[۳] ایضاً صفحہ ۱۹۰

پیش کرنیکے لئے صدور و قضاۃ دربار میں حاضر خدمت ہوئے۔ ملکۂ جہاں نے انکے پاس کہلا بھیجا کہ آپ لوگ بادشاہ سے گذارش کریں کہ وہ اپنے نام کے ساتھ جمعہ کے خطبوں میں المجاہد فی سبیل اللہ کا لقب اضافہ کرنے دیں، اسلئے کہ گذشتہ کارناموں اور جاں نثاریوں کی بنا پر وہ اسکا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں چنانچہ غرّہ کے دن حسب دستور تمام اہالی و موالی، قضاۃ و صدور بادشاہ سے ملنے کیلئے آئے اور شرف دست بوسی جاہا تو عین اُس موقع پر قاضی فخرالدین ناقلہ نے تمام حاضرین کے سامنے ایک قصیدہ پیش کیا جسمیں انہوں نے اس خواہش کا تمام حضار کی طرف سے اظہار کیا۔ بادشاہ کا روشن ضمیر اور حق پسند دل اپنی اس انسانی کمزوری کو کسی طرح چھپا نہ سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور صاف صاف تمام اصلی واقعات کا اظہار کردیا۔ حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"من؎ با مادر محمود یعنی ملکہ جہاں گفتہ بودم کہ
دریں باب برایشاں پیغام فرستد تا شما
دریں معنی از من التماس کنید و بعد آں
بمدت آں سہ چہار روز اندیشہ کردم، مرا یاد
نیامد کہ من وقتے در عمر خویش بے شائبہ طمع
طلب میت للہ و فی اللہ تیغ زدہ ام و تیر
طرف دشمنان خدا فرستادہ و جہادے از
برائے خدا کردہ۔ و ازیں آرزو کردہ بودم
و بمدراں ایام متاسف شدم و پشیماں گشتم

میں نے خود محمود کی ماں یعنی ملکہ جہاں سے یہ کہا تھا
کہ وہ آپ لوگوں سے اس کے متعلق کہیں تاکہ آپ
لوگ مجھ سے یہ گذارش کریں لیکن اسکے تین ہی چار
روز بعد میں نے غور کیا تو مجھے خیال آیا کہ کبھی ایسا نہیں ہوا
کہ اپنی عمر میں میں نے بلا کسی لالچ یا ناموری کی خواہش
کے خالصۃً للہ تلوار اٹھائی ہو یا دشمنوں پر تیر
چلایا ہو یا کبھی راہ خدا میں جہاد کیا ہو۔ یہ آرزو
جو میرے دل میں پیدا ہوئی اس پر میں فوراً پچھتایا
اور مجھے شرم آئی کہ میں نے جب کبھی مغلوں سے

؎ ایضاً صفحہ ۱۹۷

کہ من ہر معاملہ کہ باعث کردہ ام از برائے	کوئی جنگ کی ہے تو وہ محض اپنے نام و نمود کے
صیت و خود نمائی کردہ ام و مطلوب	لئے کی ہے اور اسمیں میرا سب سے بڑا مقصد اپنی
من دراں ناموری بودہ خاچنانچہ بجہت	شہرت اور ناموری کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن ایسا
اعلائے کلمہ حق جہاد کنند تمنائے شہادت	جہاد جو اعلائے کلمۂ حق کیلئے کیا گیا ہو اور جسمیں شہادت
متضمن ان بود ، ہچناں جہاد نہ کردہ ام ۔	حاصل کرنا مقصود ہو میں نے کبھی نہیں کیا ۔

حسن ظن | عربی میں ایک مثل ہے المرء یقیس علی نفسہ، انسان عموماً اپنے اوپر دوسروں کو بھی قیاس کیا کرتا ہے سلطان جلال الدین جیسے نیکدل اور پاک طینت خود تھے، ویسا ہی وہ دوسروں کو بھی سمجھتے تھے یہ جو واقعہ ہے کہ سلطان جلال الدین نے گوالیار پر لشکر کشی کی اور اسی اثنا میں خبر ملی کہ علاء الدین نے دیوگیر کے ملک کو فتح کر لیا ہے اور بہت کچھ زر و جواہر اور اسپ و فیل اپنے ہمراہ لا رہا ہے۔ سلطان کو اس خبر سے بیحد خوشی ہوئی اور سمجھا کہ آخر وہ میرا ہی بھتیجا اور داماد ہے جو کچھ لائیگا وہ میرے ہی پاس لائیگا چنانچہ امرائے دربار سے مشورہ کیا کہ اس معاملہ میں کیا کرنا چاہیئے، آیا یہیں پر انتظار کرنا چاہیئے یا آگے بڑھکر اسکا خیر مقدم کرنا چاہیئے یا ان دونوں سے ایک بھی نہوا اور سیدھے دہلی لوٹ جایا جائے۔ ملک احمد حبیب نے جو ایک نہایت صاحب الرائے اور اہل تدبیر امیر سمجھا جاتا تھا، عرض کیا کہ مال اور فتنہ دونوں لازم ملزوم چیزیں ہیں۔ علاء الدین سے یہ توقع ہرگز نہیں کہ وہ آپ کے ساتھ وفا کرے گا اور پھر ایسی صورت میں جبکہ وہ اپنی خوشدامن ملکۂ جہاں اور بیوی دونوں سے ناخوش ہے، بھلا دہلی کیوں آنے لگا۔ وہ سیدھا کڑہ (الہ آباد) پہونچیگا جہاں لوگ فتنہ و فساد کیلئے تلے بیٹھے ہیں لہذا مناسب اور بہتر ہے کہ آگے بڑھ کر چندیری کے قریب اسکا استقبال کیا جائے۔ اثنائے راہ میں جب وہ لشکر سلطانی کی آمد کا حال سنے گا ڈر کے مارے تمام زر و جواہر اور اسپ و فیل آپ کے حوالہ کر دیگا لیکن سلطان نیکدل نے اس مشورہ کو کسی طرح پسند نہ کیا۔ کہنے لگا۔

"بچه ام را در نظر من شیرے میکند وی نمی‌داند
من در حق علاءالدین چه بد کرده ام که
از من خواہد گشت و مال و پیل پیش من
نخواہد آورد . . تو پیوسته با علاءالدین
بدگمان بوده اورا من کنار کرده پرورده ام
و چندین حق ہا در گردن او دارم ہیچگونه
از من خواہد گشت ۔ اگر پسران من بگردند
او ہم از من بگردد۔

میرے بچہ کو خود میرے سامنے شیر بناکر دکھاتے
ہو۔ میں نے علاءالدین کے ساتھ کیا برائی کی ہے
جو وہ مجھ سے برگشتہ ہوجائیگا اور وہ اپنا تمام زر و جواہر
اور مال و منال میرے سامنے نہ لائیگا۔ تم ہمیشہ
علاءالدین سے بدظن رہے ہو۔ میں نے اسکو اپنی
گودوں میں پالا ہے اور اسکی گردن پر میرے
اتنے حقوق ہیں، وہ بھلا مجھ سے کیونکر پھر سکتا ہے،
اگر میرے بیٹے مجھسے روگردانی کرسکتے ہیں تو
ظاہر ہے کہ وہ بھی کرسکتا ہے۔

اس کے بعد سلطان نے دوسرے امرا سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ تم لوگوں کی کیا رائے ہے۔ ملک فخرالدین کوچی جو کہ بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانے کے بہت عادی تھے، کہا کہ آب ندیدہ موزہ کشید، علاءالدین سے ابھی قبل از وقت اسقدر خوف و ہراس کی کیا وجہ ہے۔ معلوم نہیں ابھی یہ خبر بھی صحیح ہے یا نہیں کہ وہ اپنے ساتھ بہت سا زر و جواہر اور مال و اسباب لا رہا ہے اور اگر وہ لاتا بھی ہو تو یہ یقینی ہے کہ ہمارے آگے بڑھ کر ملنے سے وہ بدگمان ہوجائیگا اور ہماری آمد کی خبر جہاں پائیگا، وہیں سے پیچھے کسی صحرا یا جنگل میں بھاگ جائیگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سارا مال و اسباب اور زر و جواہر راستہ ہی میں لٹ جائیگا، جو نہ اس کے کام آئیگا اور نہ ہمارے۔ یہ کہنا کہ وہ کڑہ (الہ آباد) میں بیٹھکر بغاوت شروع کردے گا، بے کار ہے۔ اسکی یا کسی اور کی کیا مجال کہ جو ہمارے سامنے دم

ے ایضاً صفحہ ۲۲۶ و ۲۲۷

ارے۔ بہتر ہے کہ اس وقت دہلی لوٹ چلیں۔ رمضان کا مہینہ بھی قریب ہے، خربوزے خوب پک
گئے ہیں۔ مناسب ہے کہ اطمینان و لطف کیساتھ روزے وہیں گذارے جائیں اور علاءالدین جب
آئیگا تو سب سے پہلے یہیں آئیگا۔ اور جو کچھ ہمراہ لائیگا وہ ہمیں کو دے گا۔

ارادہ | سلطان کو ملک فخرالدین کی یہ صلاح پسند آئی، سیدھے دہلی مع تمام لشکر و فوج کے لوٹے۔
چند دن میں خبر ملی کہ علاءالدین مع تمام ساز و سامان کے کڑہ واپس آگیا ہے۔ اس نے سلطان
کے جب اس ارادہ اور نیت کا حال سنا تو لکھ بھیجا کہ میں خود دربار میں حاضر ہوتا لیکن ڈرتا ہوں کہ
معلوم نہیں اس عرصہ میں درباریوں نے میری طرف سے آپ کو کس قدر بدظن کر دیا ہو اور وہاں
میرے خلاف کیا کیا سازشیں کیگئی ہوں لہذا مناسب یہ ہے کہ آپ خود تکلیف فرمائیں بعض اور لوگوں
نے بھی بادشاہ کو یہی رائے دی کہ وہ خود وہاں تشریف لیجائیں چنانچہ بادشاہ نے علاءالدین کے
پاس یہ کہلا بھیجا کہ میں عنقریب خود آرہا ہوں اور فوراً دریا کے راستے دو سو مسلح آدمیوں کو ہمراہ لیکر
روانہ ہوگئے اور ملک احمد چپ کو مع لشکر کے خشکی سے بھیجا کہ کڑہ پہنچیں۔ علاءالدین نے سلطان کی
آمد کی خبر جب سنی تو اپنی تمام فوج اور لشکر کو دریا کی جانب آراستہ اور صف آرا کر دیا شاہی کشتیاں
جب کڑہ کے قریب پہنچی ہیں تو الماس بیگ نے جو بادشاہ کے ہمراہ تھا کہا کہ زیادہ آدمیوں کے چلنے
کی کوئی ضرورت نہیں ہے صرف دو چار آدمی کافی ہیں اور وہ بھی اسلحہ وغیرہ اتار کر جائیں تو
مناسب ہے۔ لیکن ملک خورم وکیلدار نے کہا کہ ہم لوگ اتنی دور سے آئیں اور علاءالدین سے اتنا
نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنا خیمہ چھوڑ کر دو چار قدم آگے ہم سے آکر ملے۔ الماس بیگ نے جواب دیا
کہ وہ خیمہ میں آپ لوگوں کی افطاری وغیرہ کا انتظام کر رہے ہیں آپ لوگ وہیں چلکر فروکش ہوں
اور ماحضر تناول فرمائیں لیکن اس فریب آمیز جواب سے کوئی تسکین نہ ہوئی وہ صاف اپنی آنکھوں
کے سامنے موت کا تماشا دیکھ رہے تھے لیکن بادشاہ کے حسن ظن اور فرط محبت سے مجبور تھے

جو کشتی میں نہایت اطمینان کے ساتھ رحل پر قرآن رکھکر تلاوت کرتے ہوئے جا رہے تھے وہ بھی جب موت کے گھاٹ اترنے کے قریب ہوئے تو ایک دوسرے پر سورۂ یٰسین پڑھنے لگے غرض سلطان مع اپنے چند رفقائے خاص کے کشتی سے اترے، علاءالدین اپنے خیمہ سے نکلکر چند قدم آگے بڑھا اور سب سے پہلے آداب شاہی بجالایا اور پھر قدمبوسی کیلئے زمین پر گر پڑا، سلطان نے یہ دیکھکر جھٹ اُسے زمین سے اٹھایا اور اٹھا کر رخسار اور آنکھوں پر بوسے دئے پیار کیا اور کہنے لگے۔

"اے علی، کمیزی در اوان طفلی در کنار من
کرده بودی، بوئے آں ہنوز از جامہ من
نمی رود کہ تو چرا از من می ترسی و در خاطر
تو چیست کہ من با تو بد خواہم کرد۔ من
ترا از شیرخوارگی تا امروز کہ مرد بزرگ
مینمائی بجہت آں پرورده ام و درجہ درجہ
تا اینجا رسانیده ام کہ ترا بکشم و تو نزدیک
من ہمچو یکے از پسران من عزیز و عزیزتر بودی
و ہستی، چندیں ترس چیست کہ مرا روزه دار
تا اینجا آورده اگر جہاں بگردد، مہر و پیوند
من از تو کم نشود۔ اے علاءالدین، چند
از من خواہی ترسید، خون من آب کردی

اے علاءالدین بچپن میں جو پیشاب کہ تم نے میری
گود میں کیا تھا اسکی بو ابتک میرے کپڑوں سے آتی
ہے۔ پھر تم مجھ سے کیوں ڈرتے ہو اور تمہارے
دل میں کیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ برائی کرونگا
میں نے تمکو بچپن سے لیکر آج تک جبکہ تم اتنے بڑے
ہوگئے ہو کیا اسی لئے پالا ہے اور منزل بمنزل
تمکو یہاں تک اسی غرض سے پہنچایا ہے کہ آج تمکو
جان سے مار ڈالوں۔ تم ہمیشہ میرے نزدیک بیٹوں
کے برابر بلکہ ان سے بھی زیادہ عزیز رہے ہو اور
آج بھی ہو۔ اسقدر خوف کی کیا وجہ ہے کہ خود مجھ
روزہ دار کو اتنی دور بلایا ہے۔ اگر دنیا بدل جائے
لیکن مجھے تمہارے ساتھ جو محبت اور تعلق ہے اس
میں ایک ذرہ کمی نہ آئیگی۔ علاءالدین بھلا کبتک
تم مجھسے ڈروگے۔ میرے خون کو پانی کر ڈالاہے۔

یہ کہا اور علاء الدین کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کشتی کی طرف کھینچنے لگا۔ اتنے میں علاء الدین نے اپنے آدمیوں کو آنکھوں سے اشارہ کیا اور محمد سالم نامی ایک سنگدل نے آگے بڑھ کر سلطان پر تلوار چلائی جو خود اس کے ہاتھ پر لگی۔ اس نے پھر دوبارہ وار کیا جو بدقسمتی سے خالی نہ گیا اور بادشاہ زخم کھا کر کشتی کی طرف لپکا اور اسی حالت اضطراری میں یہ الفاظ زبان سے نکالے :-

"اے علاء بدبخت چہ کردی" ارے کمبخت علاء الدین، یہ تو نے کیا کیا ؟

کہ اتنے میں اختیار الدین نامی ایک شخص آگے بڑھا اور بادشاہ کا سر قلم کر لیا۔ کہتے ہیں کہ سر تن سے جدا ہوتے وقت بادشاہ کی زبان پر کلمۂ شہادت جاری تھا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہندوستان کی معیشت زرعی پر انگریزی قبضہ کا اثر

(۲)

(عطائے دیوانی کے بعد)

پچھلے مضمون میں ہم ان کارروائیوں کا ایک اجمالی تذکرہ کر چکے ہیں جو انگریزی شرکت تجار (انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی) نے بندوبست آراضی کے متعلق ان قطعات ملک میں اختیار کی تھیں جو عطا حقوق دیوانی سے قبل انکے تصرف میں آچکے تھے۔ لیکن معیشت زرعی پر ان کارروائیوں کا تباہ کن اثر پھر بھی مقابلۃً ایک چھوٹے رقبہ تک محدود تھا۔ کہ اگست ۱۷۶۵ء میں جہاں بردوان، مدنا پور اور چٹگام کے عطیہ کی تصدیق شاہ دہلی کی طرف سے ہوئی تو ساتھ ہی کمپنی بہادر کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا دیوان مقرر کئے جانے کا فرمان "قضا جریان" بھی صادر ہوا۔ اس فرمان کی رو سے کمپنی کو ان تینوں صوبوں میں مالگذاری وصول کرنیکا حق حاصل ہو گیا اور یہ طے پایا کہ کمپنی خزانہ شاہی میں سالانہ ۲۶ لاکھ روپیہ ادا کر دیا کرے۔ اور نظامت صوبہ کے اخراجات کی بھی کفیل ہو۔ ان حقوق دیوانی کا حصول دراصل ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے قیام کا سب سے اہم قدم تھا۔ اور ہر چند کہ عطائے دیوانی سے کمپنی کو شاہی حقوق حاصل نہ ہوئے تھے اور ضابطہ سے انکا کام صرف مالگذاری جمع کرنے تک محدود تھا، تاہم تین صوبوں پر کامل مالی اقتدار نے کمپنی کے ہاتھ میں ایسی موثر قوت دیدی تھی جس کا استعمال تمام انتظامی اور سیاسی امور میں ہو سکتا تھا اور عملی طور پر ان صوبوں کی حکومت کمپنی ہی کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ خیال ہو سکتا ہے کہ جبتک کمپنی کے تصرف میں ملک کی آراضی کا بڑا حصہ نہ آیا تھا اُس وقت تک احساس ذمہ داری نہ ہونے کے باعث بندوبست میں سختیاں ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ ایک گاؤں کا زمیندار یا ایک بڑے تعلقہ دار، اور ایک ملک کی حکومت ان میں سے ہر ایک کی ذمہ داریوں کی نوعیت جدا جدا ہے

اور اکی اچھائی کی برکت اور برائی کے عذاب کی وسعت اور شدت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بہت ممکن
تھا کہ کمپنی، اسوقت تک جبتک کہ اس کے قبضہ میں صرف چند اضلاع تھے معیشت زرعی کو مستقل نقصان
پہنچانے سے دریغ نہ کرتی تھی۔ اب وہی کمپنی تین صوبوں کا نظم ہاتھ میں آنے کے بعد کچھ سوچتی سمجھتی اور
ملک کے لئے اپنے اس مہلک طرز عمل سے باز آتی۔ حکومت کے ساتھ جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں
ممکن ہے انکا احساس پیدا ہوتا اور یہ احساس اس شرکت تجار کی مداخلت کو جو پہلے چند اضلاع کے
لے عذاب الٰہی ثابت ہو چکی تھی ان صوبوں کیلئے رحمت بنا دیتا بعد کے شاہی فرامین اور اسناد میں
انکو مخاطب کرنیکا جو طریقہ ہے اسے اگر کوئی شخص دیکھے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاجروں کی جماعت نہیں
رہی بلکہ ایک زبردست سیاسی قوت ہوگئی ہے۔ پہلے جو "تجارت کیلئے مایہ ناز" تھے بعد کی اسناد
میں اکی "قوت و جبروت"، "شرافت"، "سپہ گری"، "وفا شعاری" اور "بہی خواہی" ملک
کا ذکر ملتا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ آیا واقعی اس شرکت تجار میں کوئی قلب ماہیت ہوئی تھی؟

افسوس ہے کہ تاریخ اس سوال کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ اسقدر وسیع رقبہ زمین
کے زیر اقتدار آنیکے بعد جب لاکھوں کروروں انسانوں کی زندگیاں بھی اس شرکت کے ہاتھ میں
آگئیں تو اس وقت بھی یہ تاجر تاجر ہی رہے۔ تجارتی اغراض انکا دین تھا اور زیادہ سے زیادہ
منافع حاصل کرنا انکا ایمان۔ حقوق دیوانی کے حاصل کرنے میں انکے پیش نظر تو بس یہی تھا کہ مالی نفع
ہو اور کمپنی کو ہندوستان میں جو مال باہر بھیجنے کے لئے خریدنا پڑتا ہے اس کے لئے کہیں سے رقم
ملے۔ اسے کوئی ہمارا سوء ظن نہ سمجھے۔ عطاء دیوانی کے بعد بنگال سے جو پہلی چٹھی منتظمین کمپنی کے
نام ولایت جاتی ہے اسمیں لارڈ کلایو انہیں یقین دلاتے ہیں کہ "حصول دیوانی سے کمپنی کے مقبوضات
ہر قسم محفوظ ہوگئے ہیں اور اس کا اقتدار بلا شرکت غیرے ہوگیا ہے۔ اب جو سخت سے سخت صورت
پیش آئیگی وہ عارضی تاخت و تاراج سے ہو سکتی ہے اور یہ بھی اسقدر بڑے پیمانہ پر نہ ہوگی جب

سے کمپنی کی مالگذاری اس قدر گھٹ جائے کہ یہاں کے دیوانی و فوجداری کے مصارف پورے کرکے خریداری مال کے لئے کافی روپیہ نہ بچے"[1]

کمپنی کی ضرورت زر اور اسکے حصول کیلئے اپنے حقوق دیوانی کا استعمال اسوقت آسانی کیساتھ سمجھ میں آجائے گا جب ہم یہ معلوم کرلیں کہ اس زمانہ میں کمپنی کی مالی حالت کیسی تھی۔ ایک طرف مدہم لین دین اور تجارت کی کساد بازاری، دوسری طرف رئیسوں سے جنگ، تجارتی جہازوں پر جنگی انتظامات کے خرچ، بڑے بڑے قلعوں کے مصارف، رقیب کمپنیوں کی مسابقت اور خود اپنے ملازموں کی خیانت نے شرکت کی مالی حالت کو نہایت نازک کر رکھا تھا۔ اکثر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس یہ ناؤ اب ڈوبی لیکن ادہر ادہر سے روپے قرض لیکر کام کسی نہ کسی طرح چلتا رہا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کا قرض برابر بڑھتا گیا۔ ۱۷۰۸ء میں شرکت نے صرف ۵ فیصدی نفع تقسیم کیا تھا۔ ۱۷۱۲ء میں نفع ۱۰ فیصدی ہوگیا لیکن ۱۷۲۲ء سے ۱۷۳۲ء تک ۸ فیصدی رہا اور اس کے بعد ۱۷۴۳ء تک برابر ۷ فیصدی ہوگیا اس کے بعد ۱۲ سال تک (یعنی ۱۷۵۵ء تک) منافع ۸ فیصدی کے حساب سے تقسیم ہوا۔ کمپنی نے ۱۷۰۸ء میں حکومت انگلستان کو ایک قرضہ دیا تھا جس کی شرح سود ۵ فیصدی قرار پائی تھی۔ اب ہسپانیہ اور فرانس سے جنگ کیلئے جو قرضہ لیا اسکی شرح سود صرف ۳ فیصدی قرار پائی اور اس سے سابق قرضہ کی شرح سود میں تخفیف ہوگئی جس سے شرکت کو بہت نقصان اٹھانا پڑا اور منافع ۱۷۵۵ء سے ۱۷۶۶ء تک صرف ۶ فیصدی رہ گیا۔

جہانتک فرانسیسیوں اور ملکی طاقتوں سے جنگ آزمائی کا تعلق ہے، اسمیں بھی عطاء دیوانی سے قبل کا زمانہ کافی تشویشناک گذرا۔ ۱۷۴۶ء میں کرناٹک کی جنگ ہوئی جس میں انگریزوں اور

---

[1] Firminger Introduction to the fifth Report, CLIII – CLIV.

فرانسیسیوں نے مسند نوابی کے لئے اپنے اپنے امیدوار کی مدد کی ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۶ء تک گرچہ یوروپ میں امن تھا لیکن انگریزی اور فرانسیسی شرکتیں ہندوستان میں برسرپیکار رہیں، یوروپ میں ہفت سالہ جنگ کے شروع ہوتے ہی یہاں بھی شرکتیں سرگرم پیکار ہونے لگیں۔ پھر بنگال میں سراج الدولہ سے معرکہ رہا۔ ان معرکہ آرائیوں کا نتیجہ خواہ کچھ ہی ہوا ہو، لیکن شرکت کی مالی حالت پر انکا اثر نہایت مضر پڑا۔ اس پریشان کن مالی حالت میں حقوق دیوانی کے حصول نے عجیب طرح سے مشکل کشائی کی۔ ایک بے تعداد مالگزاری کی توقع نے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کردیا اور توازن ذہنی پر بین اثر ڈالا۔ برطانوی تاج نے خواہش کی کہ یہ سب مالگزاری اسے ملے۔ حصہ داران شرکت کی ایک جماعت نے تجویز کی کہ ۵۰ سال تک ۱۴ فیصدی منافع دیا جائے اور خزانہ عامرہ میں نو لاکھ پونڈ ادا کئے جائیں۔ بعضوں نے تو ۵ فیصدی منافع کو بھی توقعات سے کم بتلایا۔ اور واقعۃً کمپنی نے شرح منافع ۱۰ فیصدی کردی اور برطانوی مجلس شوریٰ نے یہ قانون منظور کیا کہ "کمپنی خزانہ شاہی میں صرف شاہی کے لئے ۴ لاکھ پونڈ سالانہ کی رقم ادا کرے" ادہر کمپنی کا قرض ۱۷۶۵-۶۶ء میں ۹۰ لاکھ پونڈ سے کچھ ہی کم تھا۔ پھر کیا تعجب ہے کہ تاجروں کی اس کم ہمت دیوالیہ جماعت نے اپنی "حقوق شاہی" کی آمدنی کو اپنے بگڑتے کام کے سنبھالنے میں صرف کرتے وقت بہت کچھ بدحواسی سے کام لیا (۱)

کمپنی کو حقوق دیوانی کیا ملے، سونے کی ایک کان ہاتھ آگئی اور ان تاجروں نے اس سے

---

(۱) کمپنی کی مالی حالت کی تفصیل کے لئے دیکھئے۔

India Or Facts submitted to illustrate the Character and Condition of the native Inhabitants etc.

مطبوعہ لندن ۱۸۲۳ء۔ یہ کتاب کمیاب ہے۔ راقم نے اسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں دیکھا ہے۔

پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہندوستان سے جو مال خرید کر باہر بھیجا جاتا تھا اس کی قیمت کوئی ساڑھے تین لاکھ پونڈ ہوتی تھی حکم ہوا کہ ۸ لاکھ پونڈ کا مال خریدا جائے (۱) شرکت نے طے کیا کہ سارا مال دیوانی کی آمدنی سے خریدا جائے بنگال کی (جمعیۃ منتخبہ) دسمبر ۱۷۶۶ء کے ایک خط میں لکھتی ہے کہ "جہاں دوسری قومیں اپنا اسباب تجارت فراہم کرنیکے لئے بڑی بڑی شرح سود پر قرض لے رہی ہیں وہاں ہم اپنے وطن کو ایک عظیم الشان مالگذاری کی بچت اجناس کی شکل میں بھیجتے ہیں، جو قوم کے لئے اور کمپنی کے لئے خالص منافع کہا جا سکتا ہے(۲)"، لکھنے والے اگر منصف مزاج ہوتے تو آتا اور لکھتے کہ "اور ایک بدنصیب قوم کے لئے خالص نقصان"

یہی نہیں کہ بنگال کی مالگذاری سے اجناس کی قیمت نکالی جاتی جو ہندوستان سے خرید کر باہر بھیجی جاتی تھیں۔ بلکہ دوسرے بازاروں میں خریداری کے لئے بھی اسی خزانہ سے رقمیں دیجاتی تھیں۔ شرکت کی حالت انگلستان میں چونکہ اس قابل نہ تھی کہ وہ حسب معمول چین کو زر نقد بھیج سکتی لہذا وہاں بھی تین لاکھ پونڈ سالانہ بنگال ہی سے بھیجے جاتے تھے۔ عطاء دیوانی کے بعد پانچ سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ اس عرصہ میں بنگال کی آمدنی سے کوئی ۱۲ لاکھ پونڈ خریداری اجناس کے لئے دوسرے ممالک کو بھیجے جا چکے تھے (۳)

کمپنی کا ایک نہایت معزز عہدہ دار ویرلسٹ جو ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء تک کونسل کا صدر اور بنگال کا گورنر رہا، اس نے اس زمانے کی کیفیت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے اسکی رائے کی اہمیت اسوجہ سے اور بھی زیادہ ہے کہ یہ کمپنی کا خیرخواہ اور نمکخوار رہے اور اس

---

(۱) دیکھئے Verelst State of Bengal etc. صفحہ ۸۵ - ۸۱

(۲) دیکھئے کتاب متذکرہ صدر India جلد ۲ صفحہ ۵۱۴

(۳) دیکھئے Verelst کی کتاب اور صفحات متذکرہ صدر

کے انتظام کو مخالف نہیں بلکہ اس "مبارک حکومت کے برکات" کا بیحد معترف ہے جس میں "قوت تجارت ایک ہی ہاتھ میں مجتمع ہیں" وہ کہتا ہے کہ "پارلیمنٹ اور کمپنی کے حصہ داروں میں یہ شدید ہوس کہ کمپنی کے نئے مقبوضات سے خوب فائدہ اٹھایا جائے بہت سی ایسی خرابیوں کا باعث ہوئی جو اگر وطن والے زیادہ دانشمندی اور اعتدال سے کام لیتے تو ہرگز پیدا نہ ہوتیں۔ اسی وجہ سے وصول مالگذاری کے انتظام میں کوئی مفید تغیر نہ ہو سکا اور زمانہ قدیم کی وہ تمام برائیاں جو متعدد حکمرانوں کے ماتحت بہت پھیل گئی تھیں برابر قایم اور برقرار رہیں۔ یہی برائیاں اہل ملک کی معاشی زندگی کے لئے کیا کم تباہ کن تھیں کہ بنگال کو ایک اتھاہ سونے کی کان سمجھکر مزید مالگذاری کے شدید مطالبہ نے اس تیز التعداد اسباب زوال میں اور بھی اضافہ کر دیا جو یہاں کی خفاکش آبادی کو پیسے ڈالتے تھے۔ کوئی سال نہ گذرتا تھا کہ جس میں یورپ سے یہ احکام نہ آتے ہوں کہ ہندوستان میں مال کی خریداری بڑھاؤ (۱)۔"

ان سب باتوں کا ذکر کرنا جو ابھی ہم نے اوپر بیان کی ہیں اس لئے ضروری تھا کہ ان سے وہ کارروائیاں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں جو بندوبست اراضی کے متعلق کمپنی نے دیوانی علاقوں میں اختیار کیں۔ کمپنی کے تجارتی اغراض کے لئے تو روپیہ کی ضرورت تھی ہی اور اس کے لئے مالگذاری کا مطالبہ بڑھانا لازمی ہی تھا مزید براں کمپنی کے عہدہ داروں کے ذاتی اغراض بھی اس اضافہ کی حمایت میں تھے کیونکہ وصولیابی کے مصارف نکال دینے کے بعد جو خالص مالگذاری بچتی تھی اس میں سے ۲½ فیصدی کے حساب سے ملازمین کمپنی کو بٹہ ملتا تھا (۲) جس کے متعلق یہانتک پتہ چلتا ہے

---

(۱) دیکھئے مذکورہ بالا کتاب India. جلد ۲ صفحہ ۵۱۱

(۲) ملاحظہ ہوں "کورٹ آف ڈائرکٹرس" کی ہدایات مورخہ ۲۰ نومبر ۱۷۶۷ء

کہ اس میں سے ۱۰ فیصدی گورنر کو دئے جاتے تھے، نائب صدر کونسل کو ۱½ فیصدی بقیہ ارکان مجلس منتخبہ کو ۳½ فیصدی بقیہ ارکان کونسل کو ۱½ فیصدی، ریزیڈنٹ مقیم دربار کو ۱½ فیصدی وغیرہ - آقا اور ملازمین کے اغراض جب اس طرح مشترک تھے تو پھر بھلا حصول مقصد میں کیوں نہ کامیابی ہوتی - ظاہر ہے کہ اس صورت میں دیوانی علاقہ کی مالگذاری میں نہایت سرعت کیساتھ اضافہ ہوا جسکا صحیح اندازہ حسب ذیل اعداد سے ہو سکے گا -

۱۷۶۵-۶۶ء میں تینوں صوبوں کی مالگذاری ۱۰۸۸۷۱۸ پونڈ تھی

۱۷۶۶-۶۷ء میں یعنی سال بھر بعد ہی ۱۸۱۷۶۴۹ ہو گئی

اس نتیجہ کے حصول کے لئے یہاں بھی وہی مجرب نسخہ استعمال کیا گیا جو پہلے دوسرے علاقوں میں خاطر خواہ اثر دکھا چکا تھا یعنی مختلف حصوں کا نیلام کیا گیا اور سب سے زیادہ دام جس نے لگائے اسے مالگذاری جمع کرنیکا حق دیدیا گیا - اس طرز عمل سے ان بدنصیب صوبوں کی زرعی آبادی پر جو کچھ گذری اسکا کچھ اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو جائیگا جو ہم رچارڈ بیشر کے ایک خط سے کرتے ہیں جو اس نے ۱۷۶۹ء میں گورنر کے نام بحیثیت ریزیڈنٹ دربار کے لکھا ہے - واضح رہے انکا لکھنے والا کمپنی کا معزز عہدہ دار ہے اور سیاسی اشتعال پیدا کرنیکے لئے یہ باتیں نہیں لکھ رہا بلکہ یہ فقرے جو ہم آج شائع کر سکتے ہیں اسوقت "راز کی باتیں" تھیں - وہ کہتا ہے "اس خیال سے ہر انگریز کے دل کو دکھ پہنچنا چاہئے کہ انہیں حقوق دیوانی کے ملنے کے بعد سے اس ملک کے باشندوں کی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر ہو گئی - اور میں سمجھتا ہوں کہ اس خیال کی واقعیت میں کوئی شبہ نہیں" . انگریزوں کو جب یہ حقوق ملے تو معلوم ہوتا ہے کہ انکا پہلا خیال یہ ہوا کہ اپنے وطن کے شدید مطالبات اور یہاں کے کثیر مصارف کو پورا کرنے کے لئے جتنی بڑی رقم بھی یہاں سے وصول ہو سکے وصول کیجائے - زمیندار چونکہ ان کثیر رقوم کی ادائگی سے معذور تھے یا اسکے لئے آمادہ

ہوئے بنداً اکثر اضلاع میں "عامل" بھیجے گئے۔ تقرر کے وقت "عامل" کو اپنے ضلع سے ایک مقررہ رقم ادا کرنے کا وعدہ کرنا ہوتا تھا، جو سب سے زیادہ رقم کا وعدہ کرتا اس کو ترجیح دیجاتی تھی ۔۔۔ جب سے انگریز دیوانی پر قابض ہوئے ہیں مالگذاری اسی تباہ کن طریقہ سے جمع کی گئی ہے اور برابر یہی مطالبہ رہا ہے کہ مالگذاری میں اضافہ ہونا چاہئے۔"

یہ خیالات دراصل نتیجہ ہیں زرعی آبادی کی اس تباہی کا جواب چھپائے نہ چھپتی تھی جدھر نظر اٹھتی اسکے آثار موجود تھے اس تباہی سے اب چونکہ انکار ممکن نہ تھا اس لئے کسی توجیہ کی ضرورت تھی ۔ کمپنی میں کسانوں کے ساتھ ہمدردی کی بظاہر اس قدر قوی لہر دوڑنے لگی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب اس بدنصیب آبادی کے دن پھرے ۔ انکی تباہی و ہلاکت کے اسباب پر بحث مباحثے ہونے لگے سب کچھ اسباب تجویز ہوئے لیکن کسی خدا کے بندہ نے یہ نہ کہا کہ یہ جو مالگذاری کا مطالبہ روز بروز بڑھایا جاتا ہے اس کو ختم کردو تو کہیں جاکر اس مرض کی ترقی رک سکے ۔ مطالبہ مالگذاری کے متعلق سب خاموش ہیں البتہ نزلہ مالگذاری وصول کرنے والے ہندوستانی عملہ پر گرتا ہے جو غالباً اس غاصب نظام کا سب سے ضعیف عضو تھے ۔ تجویز ہوتی ہے کہ اس عملہ سے ہندوستانیوں کو نکالکر یورپین لوگ رکھے جائیں ۔ چنانچہ ۱۷۶۹ء میں انگریز "نگراں"، مختلف اضلاع میں بھیجے جاتے ہیں تاکہ تمام حقوق کی جانچ کرکے جمعبندی کریں ۔ اپنے ضمیر کی تسکین کے لئے اس کارروائی میں طرح طرح کے ۔۔ تی محاسن نکالے جاتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ نگرانوں کا یہ تقرر دراصل "حقوق انسانیت کے تحفظ کے ایک موقع سے فائدہ اٹھانا ہے"۔ اسکا مجوز لکھتا ہے کہ "اس حقیقت پر کون شبہ کرسکتا ہے کہ غریب اور محنتی کسان پر علاوہ زمین کے مقررہ لگان کے زمیندار ہر اس فضول خرچی و اصراف کے لئے ٹکس لگاتا ہے جو اپنے غرور و تکبر، حرص اور لالچ کی وجہ سے اسے کرنا پڑے"۔ اور آگے چلکر نگرانوں کو یوں مخاطب کرتا ہے "اس علاقہ میں تمہارے قیام سے خاص طور پر جن نتائج

کی توقع ہے اسمیں یہ بھی ہے کہ تم رعیت کو اسکا یقین دلادو کہ تم اسے ظالم کے دستبرد سے بچاؤ گے، اسے پناہ دوگے اور اسکے ساتھ جو ناانصافیاں ہوں انکی تلافی کروگے۔ تمہیں رعیت کو یہ بھی باور کرانا چاہئے کہ اس پر اتنک جو مصیبتیں گذریں اسکا باعث ایک درمیانی سبب تھا جس کا نہ ہمیں علم تھا اور نہ ہم نے اس کی اجازت دی تھی"

جو لوگ محض الفاظ سے مطمئن ہو جاتے ہیں انکے قلب کی تسکین کے لئے ان مواعظ میں بہتیک کافی مواد ہے۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو قول کے بعد فعل پر نظر رکھتے ہیں اور انکو اکثر اس اطمینان سے محروم کر لیتے ہیں جو الفاظ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے اس معاملہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں۔ کسانوں سے ہمدردی اور حقوق انسانیت کی حفاظت کا اخلاقی جوش جو انگریز نگراں مقرر کرنے والوں کی تحریر کے ہر ہر لفظ سے طراوش کرتا ہے اسکے اظہار کو ابھی مشکل سے ایک سال گذرا تھا کہ ۱۷۷۰ء میں بنگال میں سخت قحط پڑا۔ صدر کونسل کلکتہ سے اطلاع دیتا ہے "چھ مہینے تک اکثر اضلاع میں پانی کی ایک بوند نہ پڑی۔ اس سے جو قحط رونما ہوا اور اسمیں اتلاف جان اور فلاکت کی جو نوبت پہنچی وہ بیان سے باہر ہے۔ پورنیہ کے زرخیز علاقہ میں تقریباً ایک تہائی آبادی موت کے گھاٹ اتری اور صوبہ کے دوسرے حصوں میں بھی تباہی کا یہی حال ہے"[1]
۱۷۷۲ء نے وارن ہیسٹنگز نے اس قحط کے متعلق لکھتے ہوئے اتلاف جان کا اندازہ "کم از کم صوبہ کی ایک تہائی آبادی" کیا ہے۔ سر جان شور نے ایک نظم میں جسمیں بقول ہنٹر بالکل شاعرانہ

---

(۱) دیکھئے صدر کونسل کلکتہ کی چٹھی بنام ڈائرکٹران کمپنی مورخہ ۹ مئی ۱۷۷۰ء۔ بحوالہ
Ramsay Muir. مصنفہ **Making of British India, 1756-1858.**
مطبوعہ منچسٹر ۱۹۱۵ء صفحہ ۹۷

سالہ نہیں اس سبب آفت سماوی کا ایسا دردانگیز نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں
عالم سوز بلا کے اسباب میں یوں تو کمپنی کے ملازموں کی آتش حرص کو بھی بڑا دخل تھا کہ انہوں
نے اور بنگالی گماشتوں نے (اپنے طور پر) تمام چاول کا اجارہ لے لیا تھا اور اس صوبہ کی قحط زدہ
آبادی کی فلاکت سے فائدہ اٹھانے کیلئے کسی سفاکی سے دریغ نہ کرتے تھے۔ محمد رضا خاں نائب ناظم
اور رچارڈ بیشر دونوں نے ملازمین کمپنی کے اس کارروائی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن
باوجود ڈائرکٹران کمپنی کی اس ہدایت کے کہ اس الزام کی تحقیقات کیجائے مقامی عہدہ داروں
نے معاملہ کو دبا دیا۔ (۱)

ہر حال ہمیں یہاں اس الزام کی حقیقت پر بحث کرنا نہیں ہے۔ ہم تو صرف یہ تبلانا چاہتے ہیں
کہ اس شدید قحط کے مسلمہ واقعہ کے بعد کمپنی کے مطالبہ اور وصولی مالگذاری کی حالت کیا رہی۔ ساری
دنیا کا قاعدہ ہے کہ ایسی حالت میں مالگذاری یا تو معاف کر دی جاتی ہے۔ یا کم سے کم ملتوی۔ لیکن ہمارے
کسانوں کے ہمدرد اور رعیت کے خیر خواہ تاجروں کا رویہ کچھ نرالا ہی ہے۔ وارن ہیسٹنگز ۱۷۷۲ء
میں لکھتا ہے کہ "باوجودیکہ صوبہ کی آبادی کا کم سے کم ایک تہائی حصہ اس قحط میں مرگیا تھا اور
اس وجہ سے ظاہر ہے کہ رقبہ زیر کاشت میں بہت تخفیف ہوگئی تھی تاہم ۱۷۷۱ء کی خالص وصول شدہ
مالگذاری ۱۷۶۸ء سے بھی زیادہ تھی"۔ ۱۲ر فروری ۱۷۷۲ء کی ایک اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ
"ہر چند قحط نہایت شدید تھا اور آبادی میں اسکی وجہ سے بہت کمی بھی ہوئی لیکن پھر بھی اس سال
بنگال اور بہار دونوں صوبوں کے بندوبست مالگذاری میں کچھ اضافہ ہی کیا گیا ہے" (۲) اس ظلم و

---

(۱) دیکھئے Ramsay Muir. کی کتاب مذکورہ صدر صفحہ ۹۸

(۲) دیکھئے Hunter. کی Annals of Rural Bengal مطبوعہ ۱۸۶۹ء صفحہ ۴۰۴ - ۳۹۹

ستم اور تشدد وسفاکی کی کیمیا کا حال جس کے ذریعہ سے بے جتی زمینوں اور مزہ اور دم توڑتے ہوئے کسانوں سے سیم وزر کے انبار وصول ہو رہے تھے۔ ہمیں ایک خط میں ملتا ہے جو صدر کونسل نے ۳ر نومبر ۱۷۷۲ء کو کلکتہ سے لکھا تھا (۱) ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ کیمیا گر وہی لوگ ہیں جو ۱۷۶۵ء میں انگریز نگرانوں کے تقرر کے وقت حقوق انسانیت کی حفاظت کے لئے کھڑے ہوئے تھے!

الغرض سخت سے سخت مصیبت کے زمانہ میں بھی کمپنی اپنے مطالبات کو برابر بڑھاتی رہی۔ زیادہ سے زیادہ مطالبہ کچھ عرصہ تک تو جیسے تیسے پورا کیا ہی جاتا ہے لیکن بعد میں دشواریاں لازمی ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا ایک طرف مالگذاری کا مطالبہ بڑھتا تھا دوسری طرف بقایا میں اضافہ ہو رہا تھا کمپنی کو جب اس سے تردد پیدا ہونا شروع ہوا تو معاملہ پر غور و خوض کیا گیا۔ لیکن اب بھی یہ طے نہ ہوا کہ مطالبہ بہت زیادہ ہے بلکہ الزام اس مرتبہ بھی ملکی عہدہ داران مالگذاری کے سر آیا اور کمپنی نے ۱۷۷۲ء میں فیصلہ کیا کہ پورے نظام مالی کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ایک کمیٹی مقرر ہوئی کہ مختلف علاقوں کا بندوبست کرے اس نے موجودہ زمینداروں وغیرہ کے حقوق کو بالائے طاق رکھکر تمام علاقوں کو ۵ سال کے لئے نیلام کر ڈالا۔ زمینداری طریقہ کی بجائے یہ عارضی اجارہ داری کا طریقہ ہر جگہ رائج کیا گیا باہر کے سٹہ کرنے والوں نے دیکھتے دیکھتے پرانے زمینداروں کو بے دخل کرا لیا۔ وہ انگریز نگراں جو مختلف حصص ملک میں رعیت کی حمایت کے لئے بھیجے گئے تھے انہوں نے بنیوں کے ذریعہ ملک کی تمام اندرونی تجارت پر اپنے نجی کے طور پر قبضہ کر لیا۔ پھر ان لوگوں سے اور بنیوں سے اس طرح جو قریبی تعلق پیدا ہوا اس سے موخرالذکر نے بھی خوب خوب فائدے اٹھائے۔ ان نگرانوں کی مدد سے بڑی

---

(۱) اس خط کو فیلڈ نے اپنی کتاب Landholding and Relations of Landlord and tenant مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۳ء کے صفحہ ۱۰۴ پر نقل کیا ہے۔

بڑی جائدادوں کے اجارے اسکے ہاتھ میں آگئے۔ اور ا کا اثر ملک میں بے حد بڑھ گیا۔ ان بنیوں اور گماشتوں نے بے حس آقاؤں کی آڑ میں جو جو مظالم ملک کی عام آبادی پر کئے انکا ذکر ملاریں کیبدی کے خطوط میں ملتا ہے "صاحب لوگوں" پر ان بنیوں نے جو اثر قائم کرلیا تھا اسکا ذکر ایک انگریز یوں کرتا ہے "بنیہ ترجمان ہوتا ہے اور محاسب، منشی اور چٹھی نویس ہوتا ہے اور دلال، ضرورت کے وقت روپیہ فراہم کرتا ہے اور (صاحبوں کا) روپیہ اپنی تحویل میں رکھتا ہے اور صرف روپیہ ہی نہیں بلکہ اسکے راز بھی۔ مختصر یہ ہے کہ یہ اکیلا اپنے آقا پر وہ بلکہ اس سے بھی زیادہ اثر رکھتا ہے جو ہمارے ملک میں خانساماں، قرض خواہ، اور معشوقہ سب ملکر رکھیں۔ اسکے علاوہ اکثر ہوتا ہے کہ اسکا آقا جن کارروائیوں کو علی الاعلان اپنے ساتھ منسوب نہیں کرنا چاہتا وہ اس کے سر منڈھ دی جاتی ہیں" (۱) ان بنیوں کا اثر یہی نہیں کہ معمولی ملازمین کمپنی پر ہو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار انکے اثر سے محفوظ نہ تھے۔ خود گورنر کے بنیہ کے پاس ۱۳½ لاکھ کی مالگزاری کا اجارہ تھا اور اس کے علاوہ نمک کے لئے ۱۲ لاکھ کا مال خریدنے کا ٹھیکہ اسے دیا گیا تھا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ کم سے کم کل اراضی کا تہائی حصہ انگریز عہدہ داروں کے بنیوں کے پاس تھا۔ (۲)

مختصر یہ کہ روپیہ کی ہوس نے بنگال کی معیشت زرعی کے تمام نظام کو درہم برہم کرڈالا اکثر شریف خاندان جنکا تعلق زمین سے پشتہا پشت سے چلا آتا تھا اور رہا ہے وہ پہلے محض مالگزاری جمع کرنے کے لئے ہی کیوں نہ مقرر کئے گئے ہوں اب کم و بیش مالکانہ حیثیت رکھتے تھے بالکل مٹ گئے۔

---

(۱) William Bolts: Considerations on Indian Affairs 1772 سے
Ramsay Muir نے متذکرہ صدر کتاب میں ایک اقتباس بھی دیا ہے دیکھئے صفحہ ۹۲-۸۹

(۲) گورنر کونسل نے ۱۵ ستمبر [illegible]ء میں جو رپورٹ دی ہے اسمیں اکثریت کی رائے ملاحظہ ہو
اقتباس کے لئے دیکھئے Firminger کی متذکرہ صدر کتاب صفحہ ۲۲۱

انکی جگہ نو دولیتوں اور سٹہ بازوں کی ایک نئی پود کا تعلق زمین سے پیدا ہوا۔ اور ایسے حالات میں پیدا ہوا کہ یہ اس غریب کسان رعایا پر جو انکے اثر میں آئی ہر طرح کا ظلم ستم روا رکھ سکتے تھے۔ اور چونکہ انکو مقرر کرنیکی وجہ صرف یہ تھی کہ ان سے زیادہ رقم وصول ہوتی تھی۔ اسلئے یہ غریب بھی مجبور تھے کہ اپنے ماتحت رعایا سے جیسے تیسے بے جا واجب مطالبہ وصول کریں۔ ضرورت اور قوت کے اس اجتماع نے جب دیوانی علاقوں میں ایک طرف قدیم شریف خاندانوں اور دوسری طرف کسانوں کو بالکل تباہ کر دیا تو انگریز تجار کا نظریہ معاشی بدلا۔ پہلے تو زمیندار محض عہدہ دار قرار دئے گئے تھے اب ان سے مستقل معاملہ کی تجاویز ہونے لگیں اور اسکا نتیجہ وہ بندوبست دوامی ہوا جس پر تقریباً تمام مورخین نے لارڈ کارنوالس کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ اس بندوبست دوامی کی حقیقت پر بھی ہم کسی آئندہ اشاعت میں روشنی ڈالینگے۔

نظم

از لسان القوم مولانا علی نقی صاحب صفی لکھنوی

کس قوم سے ہمت میں یا حوصلے میں کم تھے
جب جوشِ حمیت تھا دنیا میں ہمیں ہم تھے

میدانِ شجاعت میں اللہ ری عرق ریزی
زخموں کے لئے اپنے ہم آپ ہی مرہم تھے

سلام کا شیرازہ ترتیب دیا کس نے
اقوام کے مجموعے جب درہم و برہم تھے

شاگرد ہمارے ہی استادِ زمانہ ہیں
ہم شرع مکمل تھے ہم خلق مجسم تھے

میزانِ توازن میں جھکتا ہی رہا پلہ
لاکھوں پہ رہے بھاری ہر چند بہت کم تھے

سینوں میں تھے گنجینے اسرارِ حقیقت کے
ایمان کی قوت سے دل قلعۂ محکم تھے

تھی ہم سے تر و تازہ کشتِ عملِ عقبیٰ
مزرعۂ دنیا پر ہم رشحۂ شبنم تھے

یوں مدِ نظر باہم تھے علم و عمل ہم کو
گویا ورقِ دل پر دونوں خط توام تھے

خود اپنے ہی ہاتھوں سے اس درجہ کو پہنچے ہم
یا سب سے مؤخر ہیں یا سب سے مقدم تھے

یا ذلت و خواری کے سامان مہیا ہیں
یا جاہ و تجمل کے اسباب فراہم تھے

احوال صفی اپنا افسانۂ عبرت ہے
انجام میں کیا ہم ہیں آغاز میں کیا ہم تھے

غزل

مولانا شرف الدین صاحب ٹونکی المتخلص بہ یاسؔ استاذ حیاؔ

بے غمِ الفت تو دم بھر زندگی اچھی نہیں
ہو ترا بیمار اچھا وہ گھڑی اچھی نہیں

جان کو اپنی نہ کوسو یہ ہنسی اچھی نہیں
کوئی اچھی ہے گھڑی کوئی گھڑی اچھی نہیں

دل میں گنجائش نہ ہو تو دل لگی اچھی نہیں
جو رُلانے کے لئے ہو وہ ہنسی اچھی نہیں

صدقہ عیش دوجہاں، قربان عمر جاوداں
تیرے غم کے سامنے کوئی خوشی اچھی نہیں

چھیڑ ناصح سے رہے، اغیار سے کچھ نوک جھونک
کچھ نہ کچھ ہو، عشق میں بیچارگی اچھی نہیں

دل یہ کہتا ہے کہ بس ان کی توقع ہو چکی
شوق کہتا ہے کہ یہ کم ہمتی اچھی نہیں

وصل ہی لے حسرتِ دل، وقت ہی لے دستِ شوق
ہو چکا پاسِ نزاکت اب کمی اچھی نہیں

لے دلِ خود کام ناکامی ہے میری آرزو
ان سے مطلب ہی مجھے خود مطلبی اچھی نہیں

ہم بھی دیکھیں، یونہی دشمن سے جو ہو انکار وصل
کونسی اچھی نہیں ہے! کونسی اچھی نہیں؟

مٹ مٹا کر دو لے، کچھ رہ گئی ہیں حسرتیں
بجھ گئی دل کی لگی پھر بھی بجھی اچھی نہیں

اک نہیں ہے تو نہیں عاشق نوازی کی ادا
ورنہ تجھ میں بات ظالم کونسی اچھی نہیں

ہائے کس کے ظلم کا روزِ جزا ہوں دادخواہ
حق تو یہ ہے میرے حق میں منصفی اچھی نہیں

بھول کر امیدوار اپنا نہ کہنا یاسؔ کو
یاد رکھنا آج سے یہ دل لگی اچھی نہیں

لینین کی کہانی

کسانوں کی زبانی

میں نے یہ قصہ ایک کسان کے بارے میں سنا جو شہر جاتے ہوئے راستہ میں پڑا تھا۔ ۱۹۱۰ء کے طوفان والے جاڑے میں نیکیتا منوشنو نامی کسان ایک سو چالیس ویسٹ سفر کر کے تازہ خبریں معلوم کرنے کے لیے شہر جا رہا تھا اور اس نے مجھے بھی ساتھ لے لیا تھا۔ تیز اور سرد ہوا اور سڑک کے کنارے کی کانٹے دار جھاڑیوں کے سبب سے ہم سرِ شام ہی سے رات کا ٹھکانا ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئے۔ آخر ہم منوشنو کی ایک واقف کار کے گھر ٹھیرے جہاں اور بھی بہت سے مسافروں نے پناہ لی تھی۔ یہ لوگ ایک ڈھیلی لکڑی کی چارپائی پر بیٹھے تھے جس کی چولیں ہل رہی تھیں اور بعضے ایک میز کے گرد جس پر سماوار رکھا تھا لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے تھے۔ یہ لوگ بھی ہماری میزبان خاتون کے واقف کار تھے اور ہماری طرح خبریں معلوم کرنے شہر جا رہے تھے باوجود اس کے کہ طوفان کے سبب سے سڑکیں نہایت خطرناک ہو گئی تھیں۔ جب تک روشنی باقی رہی یہ لوگ اپنی پراسرار کسانوں والی آنکھوں سے ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے حسبِ معمول روٹی کی قیمت اور تجارتی اشیاء کے فقدان کے متعلق تبادلہ خیالات ہو رہا تھا اور بہت دیر کے بعد آہستہ آہستہ نئے حالات کا ذکر شروع ہوا لیکن جیسے ہی کہ چھت میں قندیل لٹکائی گئی جس کی روشنی کو کسانوں کے میلے لباس نے دھندلا کر دیا اور جس کی لو چھوٹی سی جھونپڑی میں اس کثیر جماعت کی گہری سانسوں کے سبب سے ٹمٹمانے لگی عورتوں نے گپ شپ شروع کر دی اور ہماری بوڑھی میزبان جس کی بھویں تک سفید تھیں جس کے کھلے ہوئے بال راکھ کے رنگ کے تھے لیکن جس کی آنکھوں میں زندگی اور شباب کی جھلک اب تک موجود تھی ان لوگوں کو جواب تک

جاگ رہے تھے یہ کہانی لینین کے بارے میں سنانے لگی۔

ایک بار زار میکولا سکا کے پاس اُس کے سب سپہ سالاروں کا سردار آیا اور کہنے لگا "ذعیرہ ذعیرہ اے شہنشاہ فلاں سلطنت کے فلاں حصہ میں ایک سخت شریر آدمی پیدا ہوا ہے جس نے ساری بدّ پاڑہ لی ہے۔ یہ ایک بے گھر بار کا بے پیشہ کا اور بے پاسپورٹ کا آدمی مسمی لینین ہے یہ حضور کو دھمکاتا ہے اور کہتا ہے، کہ "میں زار میکولا سکا پر چڑھائی کرونگا۔ میں ایک منتر ایسا پڑھ دوں گا کہ زار کے سب سپاہی میری طرف ہو جائینگے سارے سرداروں کو حاکموں کو افسروں کو ادھایہ لیا کو اور تمکو اے زار میکولا سکا میں جلا کر خاک کر دوں گا اور سب کی خاک ہوا میں اڑا دوں گا۔ میں ایسا منتر جانتا ہوں" زار میکولا سکا کے دل میں ڈر بیٹھ گیا وہ کود کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر چلانے لگا "فوراً اُس بے گھر بار کے بے پیشہ کے اور بے پاسپورٹ کے آدمی مسمی لینین کو لکھو کہ وہ مجھپر اپنے منتر کے ساتھ چڑھائی نہ کرے مجھے میرے سرداروں کو حاکموں کو افسروں کو اور امیروں کو جلا کر خاک نہ کرے میں اس کے بدلے میں اُس آدمی کو اپنی آدھی سلطنت دیتا ہوں" جلدی جلدی ایکسانس میں زار کے پاس پڑھے لکھے گئی شاستری آئے جلدی جلدی بے سانس لئے انہوں نے اپنے تیز قلم اٹھائے اور اس لینین کو لکھا "ذعیرہ ذعیرہ اے لینین زار پر اپنے شبد کے ساتھ چڑھائی نہ کرو اور زار میکولا سکا کی آدھی سلطنت بے لڑے بھڑے اور بے گالی گلوچ کے لیلو" اور کم و بیش لیکن بہت جلد اُس بے گھر بار کے بے پیشہ کے اور بے پاسپورٹ کے آدمی مسمی لینین نے ایک تحریری جواب بھیجا۔ لکھا لینین نے زار میکولا سکا کو "ذعیرہ ذعیرہ اے زار میں راضی ہوں تم سے تمہاری آدھی سلطنت لینے پر لیکن میں وہ شرطیں لکھتا ہوں جس کی رو سے سلطنت ہم میں تم میں بانٹی جائیگی نہ تو کے لحاظ سے نہ ضلع کے لحاظ سے نہ پرگنہ کے لحاظ سے حسب ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہوں تمہارے سامنے وہ شرطیں تقسیم کی جنپر میں راضی ہوں تاکہ پھر چکانے کا جھگڑا نہ رہے لیجاؤ اپنے ساتھ۔

اے زار میکولاشکا تمام سفید ہڈیوں والے سپہ سالار، افسر، حکام اور امیر مع اُن کے اعزاز اور خطابات کے اور مع اُنکے تمغوں اور جبّوں کے مع اُنکی اونچی شان والی بیبیوں کے اور ان کے سفید ہڈیوں والے بچوں کے، تمام زمیں زمیندار مع انکے دھن دولت کے اور ریشم اور مخمل کے کپڑوں کے، سونے چاندی کے برتنوں کے اور بیوی بچوں کے۔ لیجاؤ اپنے ساتھ سوداگر مع انکے مال وتجارت کے اور انکی بیشمار دولت کے بنکوں تک سے نکال لیے دو انہیں جمع جتھا لیجاؤ اپنے ساتھ کارخانوں کے مالک مع اُنکے سارے روپیہ کے، اُنکی مشینوں کے اور انکے کارخانوں کے ساز وسامان کے۔

مگر دیدو مجھے سارے کالی ہڈیوں والے کسان، سپاہی، کارخانوں کے مزدور مع انکی بے بناوٹ سادگی کے اور انکی خاطر چھوڑ دو صرف مویشی، گھاس کے تختے، اور دھرتی ماتا کھیتی کے لئے"

اس خط کو زار میکولاشکا نے پڑھا وہ ناچنے اور تالی بجانے لگا خوشی کے مارے اور اُس نے حکم دیا اپنے سپہ سالاروں افسروں اور حکاموں کو "فوراً لکھو اُس لینین کو کہ ہم دل وجان سے راضی ہیں یہ کس طرح کا آدمی ہے جس نے ساری مدیا پڑھ لی ہے اور چھپا ہوا منتر جانتا ہے کہ وہ میرے لئے چھوڑتا ہے میری بیشمار دولت، مال تجارت اور زمینداروں کا دھن دولت اور مانگتا ہے فقط کالی ہڈیوں والے آدمی جو ذرا سی قیمت بھی نہیں رکھتے۔ اس دولت سے کرایہ پر لے لینگے دوسرے کالی ہڈیوں والے بنالیں گے اُنہیں سپاہی اور پھر بسر کرینگے امن اور خوشحالی کی زندگی"

پھر زار کے پاس گنی شاستری دوڑتے ہوئے آئے انہوں نے جلدی جلدی بے سانس لئے اپنے تیز قلم اٹھائے اور اُس لینین کو زار کی کامل رضامندی کا حال لکھا۔ مگر انہوں نے اس کی جو ہنسی اڑائی تھی اسکی بابت ایک نقطہ بھی نہ لکھا اس ڈر سے کہ کہیں وہ اپنی شرطوں کو بدل نہ دے یا اُن پر اپنے چھپے ہوئے منتر کے ذریعہ حملہ نہ کردے اور کم وبیش لیکن بہت جلد لینین آیا چپکے چپکے

اور تیز تیز اپنے سپاہیوں کسانوں اور مزدوروں کے پاس اور زادیسکولاشکا مع اپنے سفید ہڈیوں والوں کے چلا گیا بہت دور۔

کسانوں، سپاہیوں اور کارخانے کے مزدوروں کے پاس ایک سیدھا سادہ ہاکسان وضع کا آدمی آیا اور اُن سے کہا "رفیقو تم کو سلام" اُس نے جس طرف نظر اٹھائی سب کو مطیع کر لیا۔ بلند آواز سے یہ اعلان کیا "میرا تمہارا برابری کا معاملہ ہے کیونکہ اب ہم سب رفیق ہیں۔ البتہ تم میرا حکم مانو کیونکہ میں نے ساری بدیا پڑھ لی ہے اور اپنے رفیقوں کو کوئی بُری چیز نہ سکھاؤں گا"

سپاہیوں نے اپنے سپاہیانہ طریقے سے فوراً کہا "بہت ٹھیک رفیق لینین ہم تمہارا حکم مانتے ہیں" کارخانے کے مزدوروں اور پڑھے لکھے سمجھدار شہر والوں نے بھی اسکی مخالفت نہیں کی البتہ کسان خفا ہوگئے کیونکہ ان کے خیال میں لینین نے حساب لگانے میں غلطی کی تھی۔ انہوں نے بہت فساد کیا اور شور مچایا۔ انمیں بڑی ہلچل تھی۔ آخر لینین نے کس چیز کے بدلے میں سارا روپیہ اور بیشمار دھن دولت ہاتھ سے کھو دیا؟ وہ یہ سب چیزیں ہم میں بانٹ دیتا تو ہم اپنے کھیتوں کی حالت سنبھالتے

اس پر لینین ہنسا اُس نے اپنے سر کو جنبش دی اور جواب میں کہا "غل نہ مچاؤ اور مجھے ملامت نہ کرو۔ مویشی اور اپنی زمین لو اور اپنا کام کرو۔ اسوقت تمہیں اصل حقیقت معلوم ہوگی۔ اُس روپیہ سے جس کا تم نے ذکر کیا کوئی کام نہ چلتا کیونکہ تم ہزاروں کی تعداد میں ہو اور سفید ہڈیوں والے چند سو سے زیادہ نہیں اور سفید ہڈیوں والوں سے زمین کو پاک کرنے کیلئے میں ایک منتر جانتا ہوں جو میں نے اب تک نہیں پڑھا ہے میں ایک اور منتر بھی جانتا ہوں جو ساری دنیا کے کالی ہڈی والوں پر اثر کرتا ہے جب میں اُسے پڑھوں گا تو سفید ہڈی والوں کو سپاہی یا مزدور نہ ملیں گے سب میرے ماتحت ہو جائینگے۔ اور اُنکی نوکری کرنے سے انکار کرینگے کیونکہ دراصل یہ لوگ پیدا کرنیوالے نہیں ہیں بلکہ فضول خرچ ہیں اور یہ لوگ "سفید" دنیا میں زیادہ دن تک ہمارا مقابلہ نہ کر سکیں

گئے۔

بہت جلد ویسا ہی ہوا جیسا لینین نے کہا تھا ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور اس نے زار نیکولاس کا رقعہ لینین کو دیا۔ وغیرہ وغیرہ اے لینین تم نے مابدولت واقبال کو خوب الوبنایا تم نے سارے کالی ہڈی والے لے لئے اور ہمیں پیدا کرنے والوں کی جگہ خرچ کرنے والے دیدئے ہمارے سپہ سالار، حکام اور امرا محض اس کام کے ہیں کہ شراب پی کر بدمست ہوجائیں اور کھا پی کر ڈھیر ہوجائیں۔ زمیندار اپنا سارا کھانے پینے کا سامان کھا پی کر ہضم کرچکے ہیں اپنے سارے کپڑے پہن کر پھاڑ چکے ہیں۔ ہمارے سوداگران کا کاروبار بیٹھ گیا ہے۔ اب کسان ہی نہیں جو انکا سڑا گلا سامان خریدیں۔ ہمارے کارخانوں کے مالکوں نے اپنی مشینوں کو توڑ پھوڑ کر برباد کردیا ہے کیونکہ ان میں سمجھ نہیں ہے اور انہوں نے صرف کتابوں سے سیکھا ہے اسلئے وہ ایک پیچ بھی نہیں کھا سکتے۔ دوسرے ملکوں کے کالی ہڈی والے ہمارا کام کرنے سے انکار کرتے ہیں اور تمہارے لئے عرقریزی کرنے کو موجود ہیں کیونکہ تم وہ چھپا ہوا منتر جانتے ہو۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ تم جو چاہو کرو۔ میرے سپہ سالار، سردار اور امرا ایک جرار فوج لیکر تم سے لڑنے آرہے ہیں تاکہ کالی ہڈی والوں کو تم سے چھین لیں،، اور اُسوقت سے سفید ہڈیوں اور کالی ہڈیوں میں لڑائی ہورہی ہے۔ مگر سفید ہڈیاں زیادہ دن مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ سپہ سالار، سردار، امرا اس کے عادی ہیں کہ وہ سپاہیوں کو چلا چلا کر حکم دیں لیکن وہ شکست کو برداشت نہیں کرسکتے۔ کیونکہ یہ لوگ نازک ہیں اور یہ "سفید دنیا،، میں زیادہ دن باقی نہیں رہینگے۔

چراغ گل ہوگیا۔ کسان خرّاٹے لے رہے تھے۔ ایک عورت نے بڑبڑا کر کوئی سوال کیا مکان کی لاغرا و ضعیف مالکہ زمین پر بھیڑ کی کھال بچھائے بیٹھی تھی اور اپنے قصہ کو جو مضحک بھی تھا اور پر درد بھی حضور قلب کے ساتھ ایک خاص لحن سے بیان کررہی تھی گویا نماز پڑھ رہی ہو

وہ اُس میں بہت سا اضافہ کرتی جاتی تھی اور شاخیں نکالتی جاتی تھی جو مجھے یاد نہیں ۔ مجھے اُس کے صحیح الفاظ بھی یاد نہیں ۔ البتہ قصہ کا تمام انداز اس کے مضمون اور اسکی لے کا نقش میرے حافظہ میں ایسا تازہ ہے جیسے میں نے اُسے ابھی سُنا ہو ۔ اسی لئے میں نے اُسے نقل کرنیکی جرات کی ہے یہ پہلی کہانی ہے جو ایک شخص لینین نامی کے بارے میں ایسے ضلع میں مشہور ہوئی جہاں کے لوگ کہانیاں بہت کم جانتے ہیں اور بڑی عظیم الشان ہستیوں کے نام تک بھول گئے ہیں ۔ اور میرے لئے یہ بڑی بھاری دلیل ہے ۔ کسانوں کی نا آشنا شکلی طبیعت لینین پر ایمان لے آئی تھی کیونکہ کسان ہمیشہ اس چیز کی کہانی کہتے ہیں جس نے اُن کے دل میں جگہ کر لی ہے اور ان کے حافظہ میں جیتی جاگتی تصویر کی حیثیت سے جڑ پکڑ لی ہے ، اُس چیز کی کہانی جس پر وہ سچا عقیدہ رکھتے ہیں ۔ پس غم و الم کی گھڑیوں میں اُنکی کہانیوں کے مضحک پہلو سے تکلیف نہیں ہوتی ہے کیونکہ انہیں کہانیوں سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لینین کسانوں کے دل و جان میں سما گیا ہے

لینین کے متعلق جو عقیدت ہے اسکی بنیاد کو قصوں نے مستحکم کر دیا ہے اور تقدیر کا بھاری ہاتھ اس عقیدت کو دور نہیں کر سکا ہے ۔

کسان اب تک لینین کے متعلق اس طرح سوال کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے قریبی عزیز کا حال پوچھتا ہے اور پھر اس قدر تفصیل چاہتے ہیں گویا ہر شخص جو ماسکو جاتا ہے لینین کی روزمرہ زندگی سے رتی رتی واقف ہو جاتا ہے ۔

"کہو بھائی وہاں کیا چال ہے ۔ وہ کہاں رہتا ہے" ؟

"اور روٹی اور اُدھار دینے کے لئے وہ کیا کہتا ہے" ؟

"اب لینین کی طبیعت کیسی ہے ؟ لوگ کہتے ہیں سنبھلتی جاتی ہے ۔ کیا اُسے سب کچھ کھانے ملتا ہے ؟ وہ کہتا کیا ہے ؟ ہمارے گاؤں کی بابت اسکی کیا رائے ہے"

"اور تم نے اُس کے بال بچوں کو بھی دیکھا"؟

"یہ معاملہ لینین کے سامنے پیش ہونا چاہئے تھا ایسی باتوں کا وہی خوب فیصلہ کر سکتا ہے"

ایسے سوال صرف بھولے پن سے خبریں معلوم کرنے کے شوق میں پوچھے جا سکتے ہیں۔ میں برسوں دیہات میں رہا ہوں۔ مجھے وہ سوال جو کسان عموماً پوچھتے ہیں زبانی یاد ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کس غلامانہ طریقہ سے خوشامد کرتے ہیں لیکن میں وہ لہجہ بھی پہچانتا ہوں جس میں وہ اپنے سچے اور خالص جذبات کو ظاہر کرتے ہیں یہ لہجہ اکثر سننے میں نہیں آتا۔ کسان کی مقفل روح اُس کی سیرت ہے۔ اور اسمیں بہت کم کوئی بڑا عقیدہ داخل ہونے پاتا ہے۔ وہ اس قفل کو بہت کم کھولتا ہے لیکن لینین کے لئے اُس نے کھول دیا یہاں تک کہ دولتمند کسانوں کو جو نفرت نئے نظام زندگی سے ہے اس کے باوجود انکا کثر عقیدہ ہے کہ لینین اپنی سیرت کی قوت میں بے مثل ہے اور اُس افلاس کے بار گراں کو دور کرنا اُسی کا کام تھا۔ کسان سیرت کی مضبوطی اور معاملہ فہمی و دور اندیشی کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے اور وہ ان چیزوں کو صرف اُس آدمی میں تسلیم کرتا ہے جس پر اُسے عقیدہ ہو۔ ایک خوش حال کسان نے اشتراکیوں اور مقامی حکام کو بہت زور شور سے گالیاں دینے کے بعد اپنی تقریر کو اس بھولے پن کے فقرے کے ساتھ ختم کیا۔

"کاش ہر ضلع میں ایک لینین ہوتا لیکن کیا کیا جائے وہ ایک ہی ہے"

مذکورہ بالا قصہ سے جو روس کے مختلف صوبوں میں مشہور ہے وہاں کے کسانوں کے خیالات کا بڑی حد تک صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ لینین کا نام ملک روس کی لاپروائی کے موٹے چمڑے سے گذر کر اُس کی رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ میرے علم میں ایسے واقعات ہیں کہ ایک دیہاتی اشتراکی کی بیوی نے لینین کی بخشش کے لیے نمازیں پڑھوائیں اور کسی

بڑھیا نے اُس کی رُوح کو ثواب پہنچانے کے لئے گرجا میں شمع جلائی۔

مختلف عقیدوں کے اس خلط مبحث سے اور بھی ثبوت اس بات کا ملتا ہے کہ نامعلوم راہوں سے لینین کی محبت پرانی وضع کے پابند مذہب کسانوں کے دل میں بھی پہنچ گئی ہے اُس نے لینین کو قبول کرلیا ہے اُس پر عقیدہ رکھتا ہے اور اس لئے اُس کے حکم کو بھی مانتا ہے۔ اُسکے متعلق نئے نئے قصے مشہور ہوتے رہینگے۔ ضعیف دیہاتی عورت جو کچھ پہلے ماسکو کے جلسوں میں یہ کہکر روحانی تلاطم برپا کردیتی تھی کہ اُس کے گاؤں والوں کو خبر تک نہیں "کہ یہ ماسکو کیا بلا ہے اور وہاں کیا تماشا ہورہا ہے اب ماسکو سے واقف ہوچکی ہے اور سلطنت میں رائے دیچکی ہے اور گاؤں والوں کی طرف سے لینین کا "آخری بوسہ" لے چکی ہے۔ وہ لینین کے قصے نئے نئے انداز سے بیان کرے گی انمیں سے بعض قصے ملک کے عرض وطول میں پھیلیں گے وہ نام جس پر یہ حالت موجودہ بھی تاریخ ناز کرتی ہے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچیگا اسکی کہانی میں عوام کا تخیل تھوڑا تھوڑا واقعات کا رنگ دیکر ایک نہایت دلفریب تصویر تیار کرے گا۔

تنقید و تبصرہ

کتاب المواقف - الجزائر کے شیوخ میں سید عبدالقادر بن محی الدین ایک نامی گرامی شیخ ہیں
نہوں نے یہ کتاب عربی زبان میں لکھی ہے جس کو تین جلدوں میں نہایت نفیس کاغذ پر عمدہ ٹائپ میں سیٹھ
بیہ ہانم جو احمد فواد عزت پاشا سابق رکن مجلس مصریہ کی بہن ہیں اپنے صرفہ سے چھپوا کر حسبتہً للہ شائع
کیا ہے۔

علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی جو مصر میں مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لئے گئے تھے انکے توسط
سے اس کتاب کا ایک نسخہ ہمارے پاس موصول ہوا۔

یہ کتاب سرتاپا صوفیانہ رنگ کی ہے۔ مصنف وحدۃ الوجود کی شراب سے اسی طرح مست ہے
جس طرح شیخ محی الدین ابن عربی تھے۔ ہر ہر موقف کے آغاز میں بیشتر کوئی قرآنی آیت لکھتا ہے
دپھر اسکی صوفیانہ تشریح کرتا ہے۔ اسکا دعوے یہ ہے کہ کتاب کا بڑا حصہ الہامی ہے اور اس
نے خاص ربانی تعلیم کے توسط سے یہ باتیں حاصل کرکے سپرد قرطاس کی ہیں۔

ہم کو مصنف کا عقیدہ وحدۃ الوجود نہیں بلکہ وحدۃ الموجود معلوم ہوجانیکے بعد اسمیں کچھ بھی
تعجب نہیں رہتا کہ وہ اپنے اس دعوے میں سچا ہے۔ اس لئے کہ وہ خود ہی نہ صرف عابد اور معبود بلکہ عبادت
بھی ہے کیونکہ اس کے نزدیک علم۔ عالم اور معلوم عشق۔ عاشق اور معشوق میں کسی قسم کا فرق نہیں۔
یہ بھی اعتباری تفریق بھی گوارا نہیں کرتا۔

وحدۃ الوجود کا مسئلہ ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے لیکن بعض صوفیوں نے پہلے حلول و اتحاد کے طور
پر مثلاً انا الحق وغیرہ پھر بلا حلول دوسرے رنگ میں اسکو دینی عقائد میں داخل کرلیا۔ شیخ ابن عربی
اس مسئلہ کے اول تھک مبلغ تھے چنانچہ انکی فتوحات کی چاروں جلدیں اسی سے بھری پڑی ہیں اسکا

پہلا ہی حملہ یہ ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَشْیَاءَ وَهُوَ عَیْنُهَا۔

اسلام پر عجمی رنگ آمیزیاں جو ہوئیں انہیں میں سے ایک رنگ تصوف بھی ہے۔ وحدۃ الوجود کا خیال فلسفہ یونان سے عجمی متصوفین نے اخذ کیا۔ اور مصر میں ابن الفارض نے اپنی شاعری سے اس کی اشاعت کی۔

ہر چند کہ خاصان تصوف وحدۃ الوجود کو محض خواص کیلئے مخصوص گردانتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ انکا یہ بھی دعوے ہے کہ قرآن ہر فرد سے عرفان کا طالب ہے۔ چنانچہ آیت

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ

میں یعبدون کی تفسیر یعرفون کرتے ہیں اور عرفان کے معنے ان حقیقت شناسوں کے خیال میں وحدۃ الوجود کے ہیں اس وجہ سے ہر شخص کو شیخ کی ضرورت ہے۔ اور تمام عالم اسلامی انکی ارادت کے حلقہ سے نہیں نکل سکتا جو اس سے خارج وہ بے پیرا۔ بے مرشدا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرفان حق کیلئے بجز قرآن کے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے جو کچھ اس نے ذات الہی کے متعلق ہے وہ اصل حقیقت ہے۔ اور اس کے بعد گمراہی۔ اسی وجہ سے اس نے کسی بھی عرفان کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ صرف ایمان کا۔ اور نہ صرف مشرکین اور اہل کتاب بلکہ خود اہل ایمان سے اسکا مطالبہ بھی ہے۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا۔

قرآن ہی کا اتباع فرض ہے اور غیر کا اتباع ممنوع محض چنانچہ ارشاد ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِیَاءَ

یہی سبیل خاصان حق کی ہے جسکی نسبت ارشاد ہے کہ اِتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ۔ اور یہی مومنین کی ہے جس سے روگردانی پر وعید ہے کہ وَمَنْ یَّتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ

...س لئے قرآن کے سوا کوئی شخص مرجع ہدایت ہو نہیں سکتا خواہ وہ کتنا ہی بڑا شیخ ہو۔
وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ

اس کتاب میں متعدد آیات قرآنی کی تشریحات ہیں وہ سب وحدۃ الوجود کے رنگ میں ہیں ...ریہ اول سے آخر تک اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے جس رنگ میں وہ تفسیر جو شیخ ابن عربی کی ...ف منسوب ہے۔ جو لوگ فرعون اور موسیٰ کو ہم رنگ و ہم سنگ سمجھتے ہیں انکے لئے یہ کتاب دلچسپ ہے۔

مرآۃ الشعر ۔ مصنفہ مولوی عبد الرحمٰن صاحب افسر شعبہ عربی و فارسی و اردو دہلی یونیورسٹی ...مطبوعہ جید برقی پریس تعداد صفحات ۸۰۰ تقطیع ۲۶×۲۰/۸ قیمت فی نسخہ ۔۔۔

موضوع شعر پر اردو زبان میں اتبک متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں بعضوں نے اسکی حقیقت ...ر روشنی ڈالی ہے بعضوں نے بسوط کتابوں کے ترجمے کر ڈالے ہیں اور بعضوں نے تنقیدی حیثیت سے اسکے اجزا الگ الگ کرکے دکھائے ہیں۔

مذکورہ بالا کتاب میں نفس شعر پر محققانہ تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کے مختلف پہلو ...ر روشنی ڈالی ہے اور اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے اشعار جابجا تمثیلاً پیش کئے ہیں۔
مصنف کا زاویہ نگاہ خالص مشرقی ہے اور کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادبار محققین کی تصانیف خاصکر عسکری اور ابن رشیق قیروانی وغیرہ پر اچھی نظر ہے ان سب پر مستزاد یہ مذاق سلیم اور طبیعت سخن فہم ہے۔

جو کچھ لکھا ہے نہایت تحقیق و تجسس و کاوش و کوشش سے لکھا ہے۔ عبارت صاف و سلیس اور رادبیانہ ہے۔ اردو و شائقین ادب کیلئے یہ کتاب ایک دلکش ذخیرہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسکو قبولیت نصیب ہوگی۔

اس موقع پر ایک بات نہایت ضروری ہے۔ میں صاف صاف کہدینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ شعر اور اس کے متعلقات پر اب تک اُردو زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تمامتر تفصیلات اور تشریحات ہیں۔ سارے بیانات جزئی امور سے لبریز ہیں۔ علمی حیثیت سے کلی اصول ابھی تک اس زبان میں مدوّن نہ ہو سکے حالانکہ اس کی ضرورت سخت ہے۔ کیونکہ اشعار کو لیکر انکے لطائف اور محاسن پر اپنے مذاق کے مطابق ہر شخص ایک طویل و عریض تقریر کر سکتا ہے لیکن علمی حیثیت سے جب اصول سامنے ہوں تو دو لفظ کافی ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب کی اس کتاب میں بھی علمی شان پیدا نہ ہوئی۔ بلکہ لکچروں کا ایک مجموعہ ہے اگرچہ جو کچھ کہا ہے وہ علمیت سے خالی نہیں۔

آئینہ حقیقت نما ۔ ظاہر نام سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ناول یا افسانہ ہوگا مگر دیباچہ کے ابتدائی صفحات میں اعوذ باللہ و بسم اللہ کی تفسیر دیکھکر گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی تفسیر کی کتاب ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ نہ کوئی ناول یا افسانہ ہے اور نہ تفسیر و سیرت کی کتاب بلکہ یہ ایک ہندوستان کی تاریخ ہے جسے مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی نے ابھی حال میں لکھا ہے پوری کتاب کی ضخامت ۴۳۶ صفحوں کی ہے جنمیں سے ۰۷ صفحوں کا ایک مقدمہ شروع میں ہے ہندوستان کے مسلمان سلاطین پر ہندو اور یوروپین مورخین کیطرف سے مذہبی تعصب، عدم رواداری اور جور و ستم کے جو الزامات لگائے گئے ہیں اس مقدمہ میں انہی الزامات کا ایک اجمالی جواب دینے کی کوشش کیگئی ہے اور وہ اس طرح پر کہ اسلام کی رواداری، بے تعصبی اور مساوات وغیرہ کے اصول کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں پر نہ ان معترضین کا اعتراض ہے اور نہ اسکے جواب دینے کی کوئی ضرورت اسلام کے اصول و مبادیات کو

کو اس شرح و بسط کیساتھ بیان کرنے سے نہ تو معترضین کی تشفی ہوسکتی ہے اور نہ ان سلاطین اور حکمرانوں کے سر سے
وہ الزامات رفع ہوسکتے ہیں۔ کسی معترض نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اسلام میں غیر مذہب والوں کے ساتھ
ظلم و ستم کا برتاؤ کرنا جائز قرار دیا گیا ہے یا ان کے ساتھ بے تعصبی اور عدم رواداری کا سلوک کرنا
سکھایا گیا ہے۔ غلط یا صحیح جو کچھ اعتراضات عائد کئے گئے ہیں وہ ان سلاطین اور حکمرانوں کے اعمال
و افعال پر ہیں جو خود انکی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر اصل تاریخوں پر ذرا تحقیق کی نظر ڈالی جائے
تو بالعموم یہ نظر آئیگا کہ ان سلاطین اور حکمرانوں کو نہ تو اصول اسلامی سے چنداں واقفیت ہوتی تھی
اور نہ وہ اپنے افعال و اعمال میں انکے کچھ بہت زیادہ پابند ہوتے تھے۔ مطلق العنان حکمراں عموماً
خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اپنے کو قانون اور قانون دانوں کی قید و بند سے آزاد سمجھتے ہیں اور
اگر وہ کبھی کوئی صلاح و مشورہ لینے پر آمادہ بھی ہوتے ہیں تو انکے خوف و دبدبہ سے مرعوب ہوکر
بسا اوقات قانون داں اور مشیر بھی انہی کے ہمخیال ہوجاتے تھے۔ پھر بھلا ایسی صورت میں اسلام
اور اسلام کا اصول و مبادیات کو درمیان میں لانا کہاں تک مناسب اور قرین مصلحت کہا جاسکتا ہے۔

یہاں تک تو مقدمہ پر گفتگو تھی باقی رہی اصل کتاب وہ چار ابواب پر مشتمل ہے اور اسمیں
محمد بن قاسم سے لیکر خلجی خاندان تک کے حالات ہیں۔ اس تمام حصہ کتاب میں ایک بات خاص طور
سے پیش نظر رکھی گئی ہے اور وہ مسلمانوں کے حملہ سے قبل ہندوؤں کی خستہ و خراب حالت کا نقشہ ہے
مصنف موصوف نے اپنے سلسلۂ بیان میں اکثر جگہ یہ بیان کیا ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی و تمدنی حالت
ایسی خراب تھی اور ان میں اس قسم کی بے دینی اور بری رسمیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ممکن ہے کہ اس وقت
ہندوستان کی حالت کم و بیش ایسی ہی رہی ہو لیکن اپنے دعوے کے ثبوت میں مصنف نے
محض عام روایتوں اور بے بنیاد قصوں سے کام لیا ہے اور جا بجا متعدد دعوے کئے ہیں اور
انکے ثبوت میں کوئی مستند تاریخی ثبوت پیش نہیں کئے ہیں، ان سے نہ صرف یہ کہ ان دعووں

میں کسی قسم کا کوئی زور نہیں پیدا ہوتا بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ آئندہ اس قسم کے دعوے کرنے کے امکان میں کمزوری آجائیگی۔ محمد بن قاسم یا محمود غزنوی کے حملہ سے بیشتر ہندوستان کی جو حالت تھی اس کے بیان کرنیکے لئے چاہئے تو یہ تھا کہ مستند تاریخوں کے حوالہ دئے جاتے، نہ کہ صرف اسی قسم کی سُنی سنائی باتوں اور مروجہ قصوں پر یقین کر لیا گیا کہ جن کے خلاف آج وہ خود مسلمانوں کی طرف سے تردید کرنے کو آمادہ ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں بعض کتابوں کے اقتباسات بھی دئے گئے ہیں لیکن وہ اس عہد کی تاریخوں کا اصل ماخذ نہیں ہیں بلکہ بعد کی لکھی ہوئی ہیں۔ کتاب میں ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ کوئی نقشہ نہیں جسکے لئے کوئی عذر مسموع نہیں ہو سکتا۔

کتاب کا اصل موضوع خود مصنف کے قول کے مطابق ہندوؤں پر مسلمانوں کے نام نہاد مظالم کی تردید کرنا ہے نہ کہ کوئی باقاعدہ تاریخ لکھنا لیکن بجز چند صفحات کے کہ جنمیں بالخصوص اصل موضوع سے گفتگو کیگئی ہے، باقی تمام حصہ کتاب میں ترتیب وار تاریخی واقعات مذکور ہیں۔ یہ زمانہ تحقیق و تنقید کا ہے اسمیں کوئی بات بلا سند و ثبوت کے قابل تسلیم نہیں سمجھی جا سکتی اس کتاب کو اگر مسلمانوں پر بیہودہ اور غلط الزامات کی تردید میں لوگوں کے سامنے "آئینہ حقیقت نما" بنا کر پیش کرنا تھا تو اس کے لئے ضرورت تھی کہ اسمیں تحقیق و سند کی جلا بھی دیجاتی تاکہ اصل حقیقت خوب نمایاں اور روشن ہو جاتی لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ اس کتاب پر قدرے تفصیل کیساتھ جو گفتگو کی گئی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ آئندہ چونکہ اس سلسلہ میں اور کتابیں بھی نکلنے والی ہیں، اسلئے امید ہے کہ مصنف موصوف ایسے ان امور کا کافی لحاظ رکھیں گے۔ باقی رہا کتاب ویسے عام مطالعہ کیلئے اچھی ہے۔ لکھائی چھپائی اوسط درجہ کی ہے تقطیع بڑی قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ درج نہیں، غالباً خود مصنف سے مل سکتی ہے۔

س - ا

اقتباسات

ہندوستان کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اس کے دیہاتوں کے وسائل روز بروز کم ہو رہے ہیں اور موت اور فاقہ کی شکلیں دن بدن مہیب ہوتی جاتی ہیں۔ ہندوستان اور یورپ کے تمدن کا بین فرق یہ ہے کہ یورپ کی تہذیب کا مرکز شہر ہے اور ہماری تہذیب دیہاتوں اور قریوں میں پھیلی ہوئی ہے چین کی حالت بھی ہندوستان سے ملتی جلتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ چینی تہذیب باوجود باد مخالف کے پیہم جھونکوں کے ابتک برقرار ہے زندگی اسکی ہر رگ وپے میں سرایت کر چکی ہے۔ اس لئے کسی ایک عضو کا کٹ جانا اس کی فنا کے لئے کافی نہیں ہو سکتا ہندوستانی قوم کو بیدار کرنیکی جتنی تجویزیں پیش نظر ہیں انکو عمل میں لانے سے پہلے ہمیں اپنی تہذیب کی اس ہیئت خصوصی پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیئے۔ مغرب کی شہری تہذیب کے رائج کرنیکی کتنی ہی کوششیں کیوں نہ ہوں لیکن یہ پودا ہندوستان کے اُن میدانوں میں کبھی بارآور نہیں ہو سکتا جہاں سیدھے سادے کسان بستے اور نت نئی مصیبتوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ شہر ظاہرداری اور قساوت قلب کا گھر ہے۔ کسی قوم کی تخلیق شہروں میں ممکن نہیں۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ سارے ملک میں عہد قدیم کی وہ حیات پرور لہر پھر کسی طرح دوڑ جائے جس نے ہر گھر والے کو یہ سکھا دیا تھا کہ اسکا دروازہ مہمانوں کے خیر مقدم کیلئے ہمیشہ کھلا رہنا چاہیئے۔

ہندؤں اور مسلمانوں میں جو کشمکش آجکل نظر آ رہی ہے اس کی بنیاد بھی یہی ہے۔ دولت کی ہر طرف کمی ہے اور جو تھوڑا بہت ہے بھی اس کے لئے ایک شخص دوسرے سے دست و گریباں نظر آتا ہے اس وقت جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ ہمیں وراثتاً ملا ہے اس لئے ہم میں سے کوئی بھی اس سے محبت نہیں رکھتا۔ اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ ہم سب ملجائیں اور اپنے ہاتھوں کی محنت

اور دلوں کی محبت کو کام میں لاکر ایک نئی دنیا تعمیر کر سکیں تو ہم میں کا ہر فرد اپنی پیدا کی ہوئی چیز کیساتھ ایک نیا لگاؤ محسوس کریگا اور اسے اپنی زندگی کا پھل سمجھیگا۔ اس طرح ان لوگوں کے درمیان جنکا اس تخلیق میں برابر کا حصہ ہوگا۔ رشک وحسد کے جذبات کبھی حائل نہ ہوں گے۔ یہ رشتہ اخوت ایک ایسا رشتہ ہوگا جس کے قائم رکھنے کیلئے زمانہ انہیں مجبور کر دیگا۔ یہ کوئی عارضی رشتہ نہ ہوگا جس کی بنیاد کسی سمجھوتے یا معاہدے پر ہو بلکہ ایک دل کا دوسرے دل سے سچا تعلق ہوگا جو کسی طرح توڑے نہ ٹوٹے گا۔

(رابندرناتھ ٹیگور) ع۔ح

کیا واقعی بعض مسلمان ہندو کہے جاسکتے ہیں؟ اسکا جواب آغا خانی مسلمانوں کے عقائد سے لیجئے قرآن کی عظمت ان کے دلوں میں برائے نام ہے۔ انکے روزانہ اوراد و وظائف میں آیات قرآن کو بالکل دخل نہیں بلکہ اُن دعاؤں میں جو اکثر روحانی ترقی کے لئے ان میں رائج ہے۔ قرآن کی تضحیک کا عنصر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

روو ے روو ے ہندو را دو جا مسلمان
روو ے برہمن جوشی را واچے بیتک پران
روو ے ملا کجیرا ہیچے پرہن قـــرآن
روو ے جنڈا جو گیڑا اٹھا مدمئے مسان
روو ے کدا سنی سنگ سچا شاہ ہمھان

انکے نزدیک سب سے زیادہ قابل اطاعت "حاضر امام" ہے جو آجکل ہز ہائنس سر آغا سلطان محمد المعروف بہ آغا خاں کے سوا کوئی نہیں۔ انکے جماعت خانوں میں روز جو "آرتی" گائی جاتی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

اتھرو وید نہاں ہی جو کوئی ناسر
دساوین دیال پربھو بیٹھا چھے جاسر

آغاخانی اس لحاظ سے شیعہ کہے جا سکتے ہیں کہ وہ حضرت علی کی بہت عظمت کرتے ہیں اور انہیں خدا کا دسواں اوتار سمجھتے ہیں۔ سر آغا خاں کی الوہیت کے عقیدہ کی بنیاد یہ ہے کہ انکا سلسلہ نسب حضرت علی سے ملتا ہے۔ خدا کے لئے انکے یہاں لفظ "ادہم" رائج ہے جو "اُوم" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

ادہم نرنجن اک ورکش جو کیتا
اُن کو ڈالی دوہی دیتا ئے
اک نور محمد مصطفےٰ
دوجا نور علی مرتضےٰ

ان سے پہلے جو نو اوتار گذر چکے ہیں وہ بجنسہ وہی ہیں جو ہندوؤں کے ہیں "دساوتر" میں جو جماعتوں میں ہر اہم موقع پر پڑھا جاتا ہے ان تمام اوتاروں کا تھوڑا تھوڑا ذکر ہے۔ آخری باب میں حضرت علی کا ذکر ہے جنہیں "نشکالنکا" کی جگہ پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ بیان نہایت تعظیم کے ساتھ سُنا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے پڑھے جانیکے وقت حاضرین کھڑے ہو جاتے ہیں اسکے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

بھکت اُدہارئے اُسر سنہارئے دُنو دارئے
گتیاں تارئے آشاپورئے واچا پارلئے
نشکلنکا چکر لیسے شاہ ہاتھ

کیا اسکے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ علی مسلمانوں کے دیوتا ہیں (ویدک میگزین)" ع۔ ع"

"دی نیشنل کرسچین کونسل ریویو" اپنی ایک تازہ اشاعت میں دیسی ریاستوں کے اندر عیسائی مذہب کی ناکامی کے متعلق لکھتا ہے کہ "سات ریاستیں ایسی ہیں کہ جن میں کوئی ہندوستانی عیسائی ہیں ہے اور سات ایسی ہیں جنمیں صرف ۱۹۳ عیسائی ہیں۔ عیسائیوں کے پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ صرف آٹھ ریاستوں میں پائے جاتے ہیں کہ جنمیں انکی تبلیغی جماعتیں کام کر رہی ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

الور ۳۲۔ بیکانیر ۱۷۰۔ جے پور ۱۵۱۴۔ جودھپور ۴۰۹۔ بھرتپور ۸۶۸۔ دہولپور ۲۵ کوٹہ ۶۶۲۔ اودے پور ۱۳۹۔"

"ہندوستانی ریاستوں کی کل ۰۰۰،۰۰،۱۰ آبادی میں صرف ۲،۹۲۰ عیسائی ہیں اور اجمیر میرواڑہ کے کل ۰۰۰۰۰۵ اشخاص میں سے صرف ۲۵۷۸ عیسائی ہیں ان اعداد کے دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی آبادی کے لحاظ سے ہماری تعداد کس قدر کم ہے!"

"ایک اور بات جو اس سے بھی زیادہ قابل افسوس ہے، وہ شہروں اور دیہاتوں میں ہماری آبادی کا تناسب ہے۔ اجمیر میرواڑہ میں ۵ شہر ہیں اور ۷۴۶ دیہات، اور دیگر ہندوستانی ریاستوں میں ۱۴۲ شہر اور ۱۲۲۳ دیہات ہیں اگر خالص ہندوستانی عیسائی کا لحاظ رکھا جائے تو شہروں اور دیہاتوں کے درمیان یہ تقسیم ہو ہی نہیں سکتی، لیکن اگر ریاستوں کی کل عیسائی تعداد لیجائے کہ جن میں سے ۱۹۹۱ تو صرف یورپین اینگلو انڈین، اور انڈین رومن کیتھولک ہیں، اسوقت البتہ یہ تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے کہ ۳۸۰۲ عیسائی شہروں میں رہتے ہیں اور ۲۰۲۸ دیہاتوں میں۔ ان ریاستوں میں سے دس میں عیسائیوں کی کوئی دیہی آبادی نہیں ہے اور سات میں ۲۰ عیسائی فی ریاست کا اوسط پڑتا ہے۔ ان ریاستوں کے کل ۱۲۴۲۳ دیہاتوں میں سے صرف ۲۲۵ دیہاتوں میں عیسائی بستے ہیں اور عیسائیوں کی مجموعی آبادی میں سے تین چوتھائی ایسی ہے جو شہروں میں ہے اور صرف ایک چوتھائی گاؤں کی رہنے والی ہے۔"

(س-۱)

شذرات

الحمدللہ کہ صدیوں کے بعد فریضۂ حج جو اسلام کا ایک اہم رکن ہے اپنی مفید شکل میں تبدیل ہوا۔ اور امسال وہاں اُمم اسلامیہ کے نمائندے ایک دوسرے سے تعارف اور باہمی تعاون کیلئے تبادلۂ خیالات کرنیکے واسطے ایک مجمع میں مجتمع ہوئے۔

ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ اس فریضۂ مقدسہ کا بڑا مقصد اعلائے کلمۂ حق کے ساتھ یہ بھی ہے کہ تمام عالم اسلامی باہمدیگر متحد و متفق ہو کر اس غرض کیلئے کوشش کرے۔ خلافت راشدہ میں خلفاء وقت یا کم سے کم انکا قائم مقام حج میں آتا تھا۔ امراء دیار و امصار کو حکم تھا کہ وہ بھی آکر شرکت کریں تاکہ وہاں اسلامی مقاصد کی تقویت اور ملکی انتظامات کیلئے تبادلۂ خیال ہوتا رہے لیکن جس طرح اور امور دینیہ میں مسلمانوں کی سستی سے خرابیاں پڑگئیں اسی طرح حج میں بھی اس گرانمایہ مقصد کو نظرانداز کرنے سے یہ فریضہ حقیر ہو گیا تھا۔

ہندوستان کے حجاج جو جاتے تھے وہ وہاں سے آکر بجز اس کے کہ ایک یادگار مقام اایک دینی مجمع دیکھ آئے ہیں اور کچھ بیان نہیں کر سکتے تھے۔ انکو دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے خیالات اعمال اور مقاصد کی کوئی خبر نہیں ہوتی تھی۔ یہی حال دوسرے ممالک کے مسلمانوں کا بھی تھا۔

لیکن امسال یہ کیفیت نہیں تھی۔ بلکہ بقول شاعر ؎

ملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک یعنی گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی

مراکش و چین و روس و ترکی و ایران و ہند و افغانستان و مصر و جاوا وغیرہ مختلف ممالک اسلامیہ کے نمائندے ایک جگہ جمع ہو گئے اور موتمر میں پھر ایکبار وحدت اسلامی کی جھلک نمایاں ہو گئی۔

یہ مجمع اسلامی جسکی بنیاد قائم ہو گئی ہے اور جو انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ سال بسال ہوا کریگا اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک دینی اور رب العزت کی قائم کی ہوئی ایک مقدس موتمر ہے جو امت کے لئے بہت سی خیرات و برکات کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔ اور اقوام اسلامیہ میں وحدت خیال اور اتحاد و اتفاق کا ذریعہ بنیگی۔ ارکان وفد ہندیہ جو اس موتمر سے واپس آئے ہیں ان سے جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی انہیں توقعات کا اظہار کیا جو ہم نے بیان کیں۔

ترکوں نے ایک مدت تک خلافت کی اور انکا جھنڈا صدیوں تک حسین ہیں گزار ہا لیکن بینت جو خلافت عباسیہ میں مرچکی تھی انکے ہاتھوں زندہ نہ ہوسکی اور جب سے جمہوریہ ترکیہ نے دستار خلافت اپنے سر سے اتار کر پھینکدیا اور بھی اس کی توقع کم ہوگئی کہ فریضۂ حج اپنی اصلی شان سے ادا کیا جاسکیگا مگر حکمت الٰہی اپنا کام کررہی تھی چنانچہ اس نے خود عرب یعنی نجد سے ایک ایسی طاقت اٹھائی جس نے قرآن وسنت کے مطابق عمل کرکے اس رسم قدیم کو پھر زندہ کردیا۔

بعض ارکان وفد ہندیہ نے حجاز اور حج کے انتظام کے متعلق شکایتیں بھی بیان کیں لیکن وہ شکایتیں ایسی خفیف ہیں کہ اس نفع کے تقابل میں جو امام ابن سعود سے دنیائے اسلام کو پہنچا ہے اور جس نے اپنے صرفہ سے عالم اسلامی کے وفود کی مہماں نوازی کرکے انکو ایک مرکز اور ایک مجمع میں جمع کردیا ہے ذکر کے قابل بھی نہیں ہیں۔

آئندہ کے لئے ہمارا خیال یہ ہے کہ جن جن اسلامی ممالک سے لوگ حج کیلئے جائیں ان ممالک کے باشندے خود انہیں حجاج میں سے ایک معتمد شخص کو اپنے ملک کے حاجیوں کا امیر اور اپنے اہل ملک کا نمائندہ بنادیں۔ وہ اپنے قافلہ کو ساتھ لیکر جائے اور موتمر اسلامی میں انکی

دراپنے ملک کی ترجمانی کرے۔ ایسا انتخاب روانگی سے چند ماہ پیشتر ہو جانا چاہئے تاکہ امیر حاج اپنے ساتھیوں کا بندوبست کر سکے۔ اور اہل ملک اس کام میں اسکی اعانت کریں۔

یہ اصول کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ خود سلطان ابن سعود کسی ملک کی کسی جماعت کو اپنا نمائندہ منتخب کرنے کا اختیار دیں۔ اور وہ جماعت چندے کرکے انکو موتمر میں روانہ کرے اور ملک کے دیگر حجاج انکے ڈر کے منتشر حالت میں جائیں۔ وہاں نہ انکی کوئی جماعت ہو نہ کوئی امیر نہ موتمر میں کوئی آواز۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع خطہ سے اگر ایک قافلہ میں سب کا اجتماع دشوار ہو تو صوبہ وار یا اور کسی تقسیم کے مطابق انکے الگ الگ قافلے بنا دئے جائیں جنمیں سے ہر ایک پر ایک امیر ہو لیکن مکہ میں پہنچکر انکی امارت عام کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ہونی چاہئے

نظام صرف دنیاوی ہی امور میں ضروری نہیں ہے بلکہ دینی امور میں بھی اسکی بیش از بیش ضرورت ہے مجھے امید ہے کہ مسلمانان ہند کی ممتاز انجمنیں مثلاً خلافت کمیٹی، جمعیۃ علما، جمعیۃ تنظیم آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس وغیرہ میری اس عرضداشت پر توجہ فرمائیں گی۔ (ا - ح)

جامعہ ۱۶ اگست کو کھل گئی طلبہ نصف کے قریب آگئے جو باقی ہیں وہ ایک ایک دو دو کرکے آرہے ہیں دیر کا سبب یہ ہے کہ بعض طلبہ ہندوستان کے دور دراز حصوں میں رہتے ہیں اور بارش کے سبب سے مقررہ تاریخ پر روانہ نہیں ہو سکے۔

---

۳۰ تاریخ کے پیام تعلیم اور رسالہ جامعہ کے ساتھ ساتھ نکلنے سے ہمارے دفتر اور مطبع دونوں کو سخت زحمت ہوتی تھی اس لئے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ آئندہ سے پیام تعلیم بجائے ہر مہینہ کی ۱۵ اور

۳۰ ہزکے ۷۰ ہزار اور ۱۴ ہزار کو نکلا کرے۔

وفد حیدرآباد کے سلسلہ میں ہم اپنا نہایت خوشگوار فرض سمجھتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور دارالترجمہ کے کارکنوں کا دلی شکریہ ادا کریں جنہوں نے نہایت سیرچشمی سے ہمارے وفد کو ایک معقول رقم بطور چندے کے عطا کر کے کمال دلسوزی اور محبت کا ثبوت دیا ہے۔ ہم اپنے کل معاونین کے ممنون احسان ہیں اور اُنکی توجہ اور ہمدردی کی قدر کرتے ہیں لیکن اہل علم کی تائید اور امداد ہمارے لیے خصوصیت کیساتھ نازش و افتخار کا سرمایہ اور ہماری ہمت افزائی کا باعث ہے۔

ہمارے معزز معاصر معارف نے اپنی تازہ اشاعت میں جامعہ ملیہ کی سیاست سے علیحدگی کا ذکر کیا ہے اور "آزاد تعلیم سے ذوق رکھنے والوں" کو دعوت دی ہے کہ جامعہ کی مدد کریں لیکن ان ارباب ذوق کی جو تفصیل کی ہے وہ غلط نہیں تو نا مکمل ضرور ہے پھر بھی ہم اپنے معاصر کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور دعوت کے رقعہ پر بھی اس شرط سے دستخط کرنے کو موجود ہیں کہ یہ ان سب حضرات کی خدمت میں بھیجا جائے جو ہمارے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں اسمیں ہمارے خیال میں سارے اہل دل اور اہل فکر شامل ہیں۔

ہندوستان اور انگلستان کے تمدنی مدارج کا فرق اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جو شاہی کمیشن مقرر ہوتے ہیں وہ زراعت وغیرہ ایسے مسائل پر غور کرتے ہیں جن پر قوت لایموت کا انحصار ہے۔ انگلستان بظاہر اس قسم کی دقتوں سے کہیں بالا ہے وہاں تکلفات زیر غور و زیر بحث رہتے ہیں چنانچہ حال میں ایک شاہی کمیشن دیوانگی پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کیلئے مقرر کیا گیا

ں کمیشن کی رپورٹ میں اظہار مسرت کیا گیا ہے کہ دیوانہ گر ڈاکٹر احتیاط سے کام لیتے ہیں اور ہوشیار لوگوں کو زبردستی دیوانہ نہیں کہتے۔ بلکہ انکی احتیاط بخل کی حد تک پہنچ گئی ہے اور وہ مستحق افراد کو بھی دیوانگی کا سرٹیفکیٹ نہیں دینا چاہتے گویا انکا رویہ تقسیم اسناد کے معاملہ میں ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں کے بالکل برعکس ہے۔ کمیشن نے اصلاحی تجاویز بھی پیش کی ہیں جنمیں سب سے اہم یہ ہے کہ دیوانوں کو نظر بند کرنا دحشیانہ اور فرسودہ طریقہ ہے انکی اصلاح حفظ ماتقدم اور علاج کے ذریعہ سے کرنا چاہئے۔ اس تجویز پر حکومت ہند بھی غور کرے تو مناسب ہے۔

انگلستان میں کوئلہ کی ہڑتال سے جو نقصان مجموعی حیثیت سے قوم کو آخر جولائی تک پہنچا تھا اسکا اندازہ مجلس تجارت نے ۱۵۰ ملین پاونڈ اور مسٹر ریسین نام ایک بزرگ نے ۱۶۰ ملین پاونڈ کیا ہے جو اگر دو ارب چالیس کروڑ روپیہ کے برابر ہے اس سے مسٹر چرچل کے اُن الفاظ کی تصدیق ہوتی ہے جو انہوں نے گذشتہ مئی میں کہے تھے "دو یا تین ہفتہ کوئلہ بند رہنے سے جو نقصان ہوگا اسکی تلافی ممکن ہے آٹھ یا نو ہفتہ کے نقصان کا تمام قوم کی روزی پر گہرا اثر پڑے گا بارہ یا چودہ ہفتہ کے نقصان سے ایسا صدمہ پہنچیگا کہ دو یا تین سال سے کم میں سنبھلنا ناممکن ہو جائیگا"

انگلستان کے دارالامراء میں لارڈ پارمور کے سوالات کے جواب میں لارڈ بالفور نے نہایت زور کے ساتھ اس الزام کی تردید کی کہ دول یورپ چین کے اندرونی معاملات میں دخل دینا چاہتے ہیں حقیقت میں انگلستان کا استقلال اس معاملہ میں قابل داد ہے کہ ہر مشرقی ملکوں کے اندرونی معاملات میں ہر مرتبہ دخل دینے کے بعد وہ عہد واثق کرتا ہے کہ "اب ہم کبھی ان ملکوں کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینگے بشرطیکہ . . ."لیکن یہ "بشرطیکہ" زبان

نہیں آتا بلکہ دل میں رہتا ہے اور اس کے بعد کے الفاظ کے لئے خالی جگہ چھوڑ دی جاتی ہے کہ جب ... کر لی جائے گی۔

ایشیائی ملکوں کے فرمانرواں اقوال کو سچا ماننے میں اُسی سادگی سے کام لیتے ہیں جو ... ملکوں کے وعدوں پر اعتبار کرنے میں دکھاتے ہیں لیکن اس بار چین کے معاملہ میں ... کی کسی طرح گنجایش نہیں ہر طفل مکتب جانتا ہے کہ دنیا کے سیاسی پہلوانوں میں ... اور ... ستان اور امریکہ اور جاپان کی کشتیاں کئی سال سے بدی جا چکی ہیں۔ اور ان کے لیے چین کے علاوہ کوئی دوسرا اکھاڑہ نظر نہیں آتا۔ (ع - ح)

سالانہ چندہ رسالہ جامعہ پانچ روپیہ

ششماہی ۳ روپے

علاوہ محصول ڈاک

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیر ادارت

...نا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

نمبر ۳	ستمبر ۱۹۲۶ء عیسوی	جلد

فہرست مضامین

جامعہ

جلد ۴ | ماہ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۶ء | نمبر ۳

خلافت پر ایک نظر

مضمون ذیل دو حصوں پر مشتمل ہے جنمیں سے ہر ایک کا ایک مستقل عنوان بھی ہوسکتا ہے۔ پہلا حصہ نظام خلافت پر ایک تاریخی تنقیدی نظر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور دوسرے حصہ میں اس کی ہونیوالی صورت پر کچھ خیالات پیش کئے گئے ہیں ہر دو امور میں راقم الحروف نے اپنی ذاتی رائے پیش کی ہے۔ اسکا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اہم مسائل پر خواہ وہ اسکی گذشتہ تاریخ سے متعلق ہوں یا موجودہ حالت سے، آزادی کے ساتھ سوچنے اور رائے ظاہر کرنیکی تحریک ہو جن خیالات کا اظہار اس مضمون میں کیا گیا ہے ان سے ممکن ہے ناظرین کو پوری طرح اتفاق نہو۔ لیکن امید ہے کہ انکے اندر واقعیت کی جو لہر ہے، وہ ضرور محسوس کیجاسکے گی۔

عبدالقادر

آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد سب سے ضروری مسئلہ جو عرب کے مسلمانوں کو حل کرنا پڑا آپکی جانشینی یا خلافت کا تھا۔

اسلامی عرب میں مرکزی حکومت تو خود عہد رسول ہی میں قائم ہوچکی تھی لیکن اس کی

نوعیت عجیب و غریب تھی۔ اگر اس طرز حکومت کا کوئی نام رکھا جائے تو کہا جائیگا کہ یہ ایک مذہبی حکومت تھی۔ تمام مذہبی و سیاسی اختیارات حضور کی ذات میں مرکوز تھے۔ آپ کی حیثیت ع ایک ما فوق الفطرت انسان کی سی تھی جو ہر مشکل کا حل اپنے دماغ (یا وحی الہی) سے کرے اور جو مملکت میں بالکل مطلق العنان ہو۔ بحیثیت مجموعی "قوم" عرب کا حصہ امور حکومت میں اتفاقی اور اپنے پیشوا کی تعمیل حکم سے زیادہ نہ تھا۔

اسلئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ایک مرکزی سیاسی نظام کا بار پہلی مرتبہ "قوم" عرب پر حضرت کی خلافت کیساتھ شروع ہوا۔

مسئلہ خلافت کو مسلمانوں نے خفیف اختلاف کے بعد طے کر لیا۔ اسمیں جس سلامت روی اور امن پسندی کا اظہار کیا گیا وہ اسلامی تعلیم کا نتیجہ تھا جس طرح پر مسئلہ خلافت طے کیا گیا اسمیں قابل لحاظ خصوصیات ہیں۔

۱۔ مرکزی حکومت (یا خلافت) کی ضرورت بلا اختلاف تسلیم کی گئی۔
۲۔ حاکم یا خلیفہ کا تقرر انتخابی رکھا گیا۔
۳۔ انتخاب میں مدینہ کو لیڈرشپ حاصل ہوئی۔ تمام مسلمانوں نے وہی کیا جو اکابر مدینہ نے کیا
۴۔ خلیفہ کو تمام شعبہائے حکومت کا ناظم و ناسق مانا گیا۔
۵۔ کوئی آئین نہیں بنایا گیا، بلکہ خلیفہ کو بالکل مطلق العنان رہنے دیا گیا، اس توقع پر کہ اسکا عمل احکام الہی کے مطابق ہوگا
۶۔ مدت خلافت تا عمر سمجھی گئی۔

قرآن یا حدیث میں حکومت کی کوئی صورت بالتشریح نہیں بتائی گئی ہے مختلف حدیثوں اور بعض آیتوں کو یکجا کرلے سے اتنا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جمہوری طرز حکومت ہی سب سے زیادہ اسلام کی کے مطابق ہو سکتا ہے۔

آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کو اس حالت میں چھوڑا کہ انکے اخلاق بالکل سدھر گئے تھے

ندگی شریعت الہی کے عین مطابق تھی۔ اسی اسلامی اسپرٹ کو انہوں نے اپنا نظام حکومت بناتے تے ہی قائم رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ انکی حکومت ابتداً استبداد سے زیادہ جمہوریت کیطرف مائل تھی۔

لیکن نہ تو اسلام کی تعلیم سے نہ خود انکی روایات قدیمہ سے انکے ذہن میں کسی ایسے طرز حکومت کا ور آیا تھا جس کا نظام مضبوط، غیر متناقض، مکمل اور اپنی حفاظت آپ کرنے کے قابل ہوتا چنانچہ انہوں مسئلہ خلافت کا جو حل نکالا وہ محض حالت اور ضرورت وقت کے لحاظ سے تھا۔ یہ خیال مطلق نہیں کیا آئندہ اسکا اثر کیا پڑنے والا ہے اور یہ اس جماعت کے لئے ممکن بھی نہ تھا جو سیاسی تعلیم تو درکنار دوسر دل کے طریقہائے حکومت سے بھی بخوبی آشنا نہ تھی۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، خلافت کا میلان استبداد سے زیادہ جمہوریت کی طرف ضرور تھا یہ دو . ں الذکر عنصر سے بالکل معرا نہ تھی تشریح کیلئے ہر ایک عنصر کو الگ الگ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

ف۔ جمہوری عنصر

خلافت اصولاً تمام مسلمانوں کا انسٹی ٹیوشن تھی۔ اور اسکا مقصد انہیں کی فلاح و بہبود تھا۔

۔ خلیفہ کے تقرر میں رائے عامہ کا لحاظ کیا گیا۔

۳۔ خلیفہ کے احکام سربرآوردہ مسلمانوں کے مشورہ سے صادر ہوا کئے

۴ خلیفہ کے پاس کوئی ذاتی فوج نہ تھی۔ بروقت ضرورت وہ عام مسلمانوں کی مدد کا محتاج تھا۔

۵ خلیفہ کو بیت المال کی ایک قلیل رقم کے سوا اپنے لئے کچھ خرچ کرنے کا مجاز نہ سمجھا جاتا۔

۶۔ شخصی آزادی اس حد تک روا رکھی جاتی کہ لوگوں کو قابو میں رکھنے کیلئے منظم فوج اور پولیس کی ورت میں محسوس کی گئی۔

۔ استبدادی عنصر

۱۔ خلیفہ کی ذات میں قانون سازی، نفاذ قانون، اور عدالت کے تمام اختیارات کلی طور پر مرکوز تھے

۲ مجلس کا تعین و تصرف بالکل اس کے اختیار تمیزی پر تھا۔

۳۔ تمام عمال کا تقرر و تعطل خلیفہ کی جانب سے ہوتا۔

۴۔ خلیفہ کے اختیارات پر کوئی آئینی پابندی نہ تھی۔

۵۔ بروقت ضرورت خلیفہ کو معزول یا اس سے مواخذہ کرنے کا کوئی آئینی طریقہ نہ تھا۔

۶۔ مدت خلافت تاعمر رکھی گئی۔

۷۔ خلیفہ ہی بلاد اسلامیہ کا امیر العساکر بھی تھا۔

اگرچہ یہ سب کچھ تھا، لیکن حضرت ابو بکر اور انکے بعد حضرت عمر کا عہد سیاسی نقطۂ نظر سے خلافت ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں عدیم النظیر ہے۔ کہیں کسی زمانہ میں بھی ایسی سلطنت (State) کی مثال نہیں ملتی، جو ان خلفا کے عہد میں تھی۔ اسکا نہ تو کوئی باقاعدہ سیاسی نظام تھا۔ نہ عامۃ المسلمین کے علاوہ کوئی منظم فوج اور پولیس، نہ آمد و رفت کے آسان ذرائع، جنکے وسیلے سے آجکل "جمہوریت" اور "حکومت" کی حفاظت کیجاتی ہے۔ بایں ہمہ امن، آزادی، مساوات اور اخوت کی جو خصوصیتیں اس اسلامی سلطنت میں نمایاں تھیں، دنیائے جدید اپنے تمام مادی سامان حکومت کے ہوتے ہوتے بھی نہیں پیش کر سکتی۔

وہ "اسٹیٹ آف نیچر" (State of Nature) جس کا تخیل یورپ کے بعض سیاسی فلسفیوں کے ذہن میں ایک ایسی سوسائٹی کی صورت میں تھا جس کا ہر فرد اپنے افعال میں کامل خود مختار ہونے کے باوجود خلقۃً "قانون فطرت" کے تابع اور بہت ہی "شریفانہ" اور "مرنجان مرنج" زندگی بسر کرنے کا عادی تھا، اپنی خصوصیات اگر کہیں عملاً رکھتی ہے تو ایک حد تک ان دو خلفا کے عہد حکومت میں، جس کے افراد پر حکومت کا کم سے کم دباؤ تھا، تاہم عموماً ہر فرد کی زندگی ذاتی سعی سے قانون فطرت (یا مذہب) کے زیادہ سے زیادہ مطابق تھی۔

یہاں حاکم کے اختیارات اور رعایا کے حقوق آئینی طور پر متعین نہ تھے۔ مگر عملی طور پر ان کا احترام عموماً، دونوں جانب سے ہوتا تھا۔ حاکم کو رعایا کی جائز خواہش کے پورا کرنے سے عار تھا نہ رعایا کو حاکم کی اطاعت سے انکار۔ دونوں ایک دوسرے کی مرضی کے مطابق چلتے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے خلوص اور حق پسندی پر اعتماد تھا۔ حاکم و محکوم کے تعلقات جبر، بدگمانی اور فتنہ انگیز غلامی پر مبنی نہ تھے بلکہ اعتماد اور رضامندی کی اطاعت پر۔ اس طرح ان دونوں خلفاء کے عہد میں ایک

ایسی جمہوری حکومت تھی جس میں اصول جمہوریت کی لفظی نہیں بلکہ معنوی پیروی کیجاتی -
اور ایسا کیوں نہ ہوتا، کہ آنحضرت صلعم کی تعلیم اور صحبت نے اختلاف کو دور کر کے طبیعتوں کو ایک یا تھا۔ حاکم اور محکوم دونوں کی مرضی ایک ذات واحد کی مرضی میں گم ہوگئی تھی۔ ایک دین نے ان کو یک ہی رنگ میں رنگ دیا تھا اور اسلام انکی فطرت میں ایسا داخل ہو گیا تھا کہ فکر، قول اور فعل میں اسی ی مطابقت ہوتی تھی، نظام فوج اور پولیس وہاں درکار ہیں جہاں انسانی حقوق کی حفاظت کے لئے جسم پر قابو حاصل کرنے کی ضرورت ہو مگر اسلام کی حکومت دلوں پر تھی، جس سے جسم پر قابو حاصل رنے کے لئے مادی ذرائع کا مہیا کرنا ضروری نہیں رہا تھا۔
تاہم نظام حکومت کی جس طرز پر تشکیل ہوئی وہ آئندہ کے لئے بہت خطرناک تھا۔ اس کی خصوصیات ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اس کے ایسی تناقض صورتیں تھیں جو آگے چلکر ایک بہت بڑے تصادم کا باعث ہوئیں کیونکہ ایک غیر آئینی حکومت جیسی ان خلفا کی تھی جمہوریت کی محافظ نہیں ہو سکتی تھی اسی طرح تھی ز دی جو افراد کو بڑی حد تک حاصل تھی، اطاعت محکوم کی ضامن نہیں ہو سکتی تھی۔ پہلی صورت استبداد کیطرف لیجانے والی تھی اور دوسری صورت انارکی کیطرف۔
جو طرز حکومت ان خلفا کا تھا، اسکی کامیابی اسی وقت ممکن تھی جب حاکم اور محکوم ایک دوسرے کے اعتماد کا احترام کرتے۔ اور جو آزادی عمل ایک نے دوسرے کو دے رکھی تھی اسکو صحیح طور پر استعمال کرتے تاکہ دونوں کی مرضی میں کوئی شدید اور ناقابل مفاہمت اختلاف پیدا ہو کر تصادم کا باعث نہ ہوتا لیکن کچھ عرصہ میں اسلامی سوسائٹی کے اندر ایسے نئے حالات پیدا ہو گئے جنہوں نے اس کو محال بنا دیا۔
یہ معلوم ہے کہ عرب میں اسلام کی بدولت جو تغیر پیدا ہوا وہ تدریجی نہیں بلکہ انقلابی تھا۔ اور دنیا کے دوسرے انقلابوں کی طرح اسمیں بھی ردعمل کی صلاحیت موجود تھی یہ ردعمل صرف ان قوتوں کے برقرار رہنے سے رک سکتا تھا جو انقلاب کا باعث ہوئیں۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ کیونکہ اس انقلاب کی بنیاد دو قوتوں پر تھی۔ ایک اسلام کی تعلیم۔ دوسرے آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات۔ یہ دونوں قوتیں ابھی تعلیم کی سچائی نے لوگوں کو اسلام کا حلقہ بگوش کیا۔ اور آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات نے لوگوں کے سامنے تعلیمات اسلامی کا ایسا مکمل عملی نمونہ پیش کیا کہ جنہیں آپ کا فیض صحبت نصیب ہوا، صحیح معنوں میں

مسلمان ہوگئے۔ مگر آپ ہمیشہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اور آپ کی وفات کے بعد اسلام کی قوت آدھی رہ گئی اسمیں شبہ نہیں کہ آپ کے بعض اصحاب نے آپ کی قایم مقامی کو بہت نباہا۔ مگر ایسے کم تھے۔ عموماً صحابہ کی زندگی ذاتی حیثیت سے تو ضرور اچھی تھی، مگر دوسروں کو وہ اپنے جیسا نہیں بنا سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے، کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اسلام کی تعلیم کے اثرات نسبتہً کم ہوتے گئے۔ چنانچہ جو قومیں خلفاء کے عہد میں ایمان لائیں انمیں ایسے کم ملتے ہیں جو صحابہ کبار کے ہم پایہ ہوسکیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ انمیں سے بھی بعض جنہیں آپ کا فیض صحبت نصیب ہوا تھا، آپ کا ساتھ چھوٹ جانے کے کچھ عرصہ بعد پہلے سے نہیں رہے اور آنکی اولاد کا درجہ ان سے بھی کم تھا۔ علاوہ برایں جو مسلمان کہ مرکز اسلام سے دوری پر تھے، مثلاً فارس، شام، فلسطین، مصر وغیرہ میں ان کے لئے اور بھی کم موقع تھا کہ اسلامی زندگی کا صحیح نمونہ دیکھیں اور اس رنگ میں اپنے کو اسی طرح رنگ لیں جیسے جوار رسول میں رہنے والے۔ چنانچہ بعد مکانی نے بھی وہی کیا جو بعد زمانی نے۔ اور زیادہ مدت نہیں گذری جب لوگوں کی ذہنیت میں وہ تبدیلی شروع ہوگئی جس سے مذہب کی اسپرٹ اور مذہب کی شکل ظاہری میں اجنبیت پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

اسلامی تعلیم کا اثر کم ہوجانے سے وہ تمام کمزوریاں مسلمانوں میں پیدا ہونے لگیں جن کے مضر اثرات سے بچنے کیلئے حاکم کے اختیارات پر آئینی پابندیاں عاید کرنے اور محکوم کو فوج، پولیس اور خفیہ محکموں کی نگرانی اور شدید تعزیری قوانین کی بندش میں لینے کی ضرورت ہوتی ہے دولت کی حرص، دنیاوی طاقت اور جاہ جلال کی ہوس، کینہ، بغض اور حسد نے ایثار اور خوف خدا کے ان جذبوں کی جگہ لینی شروع کردی جن پر قصر خلافت تعمیر کیا گیا تھا۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اسلامی سوسائٹی کے اندر نفسانیت اور خلوص دونوں متضاد قوتوں کا بہت ہی نتیجہ خیز تصادم ہوا جس میں اول الذکر کی چالاکی نے آخر الذکر کی سادہ لوحی پر غلبہ حاصل کرنا شروع کیا۔ بد قسمتی سے خلیفہ نے اس حقیقت کو محسوس نہیں کیا جو تدارک کی معقول تدابیر اختیار کی جاتیں، اور حکومت کا وہی "اسلامی" رنگ باقی رہا جو پہلے تھا۔ باوجودیکہ محکوم کی حالت میں تغیر ہوچلا

تھا نفسانیت جس کا حربہ مکر و فریب تھا، پولیس، خفیہ محکموں اور سخت احتساب کے نہ ہونے سے بلا روک ٹوک کامیابی حاصل کرنے لگی اور رفتہ رفتہ خود حکومت کی مد مقابل بن گئی حتیٰ کہ خلیفہ کو اپنی جان اس پر نظر کرنی پڑی۔

حضرت علی نے جس وقت خلافت قبول کی تو انہیں صورت حال کی گہرائی کا اندازہ نہ تھا۔ وہ اس سے بے خبر تھے کہ آنحضرت صلعم کی تعلیم و صحبت اور پہلے دو خلفا کی دو دینی اور ریاست نے جن متضاد قوتوں کو دبا رکھا تھا وہ موقع پا کر پھر ابھر آئی تھیں وہ یہ محسوس نہیں کرتے تھے کہ انکی خلافت کی بنیاد ایک خلاف اسلام قوت پر قایم ہوئی تھی جو مسلمانوں کے لئے بہت تباہکن ثابت ہوئی۔ بلو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ مسند خلافت میں ممالک غیر کے مسلمانوں کا مدینہ کی لیڈرشپ تسلیم کر دینے سے انکار کر دینا بالکل ممکن ہے۔ چنانچہ انکی حکمت علی، جو ان واقعات سے چشم پوشی پر مبنی تھی، اختلافات کے پیدا ہونے کو نہ روک سکی اور نظام خلافت کے وہ نقائص سطح پر آگئے جو متناقض طریقہائے عمل سے اس کے اندر موجود تھے۔

گویا کہ فطرت انسانی نے اس نظام کے تابع رہنے سے انکار کر دیا جو صرف اس کے روشن رخ کو دیکھکر بنایا گیا تھا اور نیکی کے ساتھ بدی کے وجود کو بھی تسلیم کرانا چاہا تاکہ جماعت کے نظام میں اس عنصر کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ وہ اہم مسائل جو ابتک اس لیے پیدا نہیں ہوئے تھے، کہ خلوص، ایثار اور حق پسندی کے جذبات نے آرا میں اتفاق ممکن کر دیا تھا، نفسانیت اور دنیا پرستی سے پیدا ہونیوالے اختلافات کی وجہ سے اب سامنے آگئے۔

اولاً خلیفہ کے تقرر میں کس کی راے کو فوقیت حاصل ہو۔ یہ مسئلہ اگر لوگوں کو کچھ بھی سیاسی تجربہ ہوتا، تو بآسانی طے ہو جاتا۔ کیونکہ عملاً یہ مسلم ہو چکا تھا کہ خلیفہ وہی ہو جس پر جمہور کا اتفاق ہو۔ خواہ انکی رضامندی کا اظہار قولاً ہو یا عملاً۔ لیکن تقرر کے طریقے مختلف ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بہت بے اصول سے ہے۔ مثلاً پہلے خلیفہ کا انتخاب مدینہ کے سربرآوردہ لوگ کرتے ہیں۔ دوسرے خلیفہ کو پہلا نامزد کرجاتا ہے اور تمام لوگ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ تیسرے خلیفہ کا تقرر ایک عجیب و غریب طریقہ سے

ہوتا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی یعنی خلیفہ دوم کی طرف سے چھ ایسے اشخاص نامزد ہو جاتے ہیں جنکی نسبت امیدواری خلافت کا امکان ہوتا ہے۔ انکی ایک کمیٹی بنتی ہے۔ اور اس کے فیصلہ کے مطابق اسکا ایک رکن جو امیدواری سے دست بردار ہو جاتا ہے، خلیفہ کو منتخب کرتا ہے۔ اور لوگ اس سے بیعت کر لیتے ہیں۔

اس بے اصولی سے جمہور کے حق انتخاب کا معرض خطر میں پڑ جانا لازمی تھا۔ کیونکہ یہ اس خیال پر پردہ ڈالنے والی تھی کہ عامۃ المسلمین کی کثرت تعداد جسے چاہے خلیفہ بنائے۔ یہ عام دستور ہے کہ جب حکومت کے اندر کوئی نظیر قائم ہو جاتی ہے تو وہی قانون بن جاتی ہے خواہ وہ آئین کے خلاف ہی کیوں نہ ہو چونکہ خلیفہ کا انتخاب ہمیشہ قلیل جماعت کرتی رہی، لوگوں کے ذہن میں اکثریت کا اصول اچھی طرح آنے نہ پایا۔ نہ اس پر کبھی جان بوجھ کر عمل ہوا

اب اگر خلافت کے امیدوار ایک سے زائد ہوں، اور سابق مثالوں کے خلاف کسی سمجھوتہ پر نہ راضی ہوں تو کیا صورت اختیار کیجائے، اسکا کوئی فیصلہ کن جواب لوگوں کے پاس نہ تھا یہ ایک ایسی خامی تھی جس سے جمہور کے مختلف جماعتوں میں منقسم ہو کر خانہ جنگی میں مبتلا ہونے کا ہمیشہ خطرہ تھا۔

ثانیاً خلیفہ اور جمہور کی آراء میں اگر اختلاف ہو تو کس کی مرضی کو فوق ہوگا۔ چونکہ کوئی متعین آئین نہ تھا، اس لئے یہ مسئلہ بھی بالکل غیر طے شدہ رہ گیا تھا اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں فریق قرآن کے پیرو ہونے کے سبب ایک تیسری مرضی کے پابند تھے مگر یہ سوال کہ خدا کی مرضی کو سمجھنے اور اس کی تاویل میں کس کی رائے غالب رہے، ہنوز حل نہ ہوا تھا جمہور اور خلیفہ دونوں اپنے اپنے کو اسکا مستحق سمجھتے تھے یہ حالت عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی تھی نہ رہی۔ کیونکہ اسکا قیام صرف رایوں کے اتفاق ہی سے ممکن تھا۔

حقیقتہً یہ سوالات ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو تھے یعنی سلطنت اسلامی میں "حاکمیت" کسے حاصل ہے حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جو باہمی خونریزیاں ہوئیں انکی تہ میں نظام خلافت کا یہی

...پوشیدہ تھا۔ اور چونکہ امر متنازعہ فیہ "حاکمیت" تھا اس لئے ان جنگوں کی نوعیت "انارکی" سے ملتی جلتی تھی، نہ کہ "باغیانہ فتنوں" سے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو حسب ذیل نقائص کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہو گیا تھا۔

۱۔ جمہور کو بہت کچھ شخصی آزادی حاصل تھی و نیز وہ اپنے کو اسکا مستحق سمجھتے تھے کہ نظم و نسق خلافت ان کی مرضی کے مطابق ہو۔

لیکن (الف) کوئی آئینی طریقہ نہ تھا جس سے خلیفہ کا انتخاب انکی مرضی کے مطابق ہوتا۔

(ب) کوئی آئینی طریقہ ایسا نہ تھا جس سے دیگر امور خلافت میں مختلف الخیال افراد مفاہمت کی صورت پیدا کر کے خلیفہ کے سامنے "واحد مرضی" پیش کرتے۔

(ج) کوئی آئینی ذریعہ ایسا نہ تھا جس سے خلیفہ کو جمہور کی مرضی کا پابند بنایا اور اسکو خود مختار ہونے سے روکا جاسکتا۔

۲۔ بر انتخاب کیوقت قلیل جماعت اور بعدہ خلیفہ جمہور کی مرضی پر اپنی مرضی کو فوق دینے کی کوشش کرتی۔

یہ وہ خامیاں تھیں جو مدتوں کے بعد بتدریج دور ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ آئینی حکومت وہاں صدیوں کی اصلاحات کے بعد قائم ہوتی ہے جہاں سوائے مسلسل سیاسی تجربوں کے اور کوئی ذریعہ بہترین طرز حکومت معلوم کرنے کا نہ ہو۔

ان خامیوں کے موجود ہوتے ہوئے اہل عرب کے پاس سیاسی مسائل کے تصفیہ کا صرف ایک ذریعہ تھا۔ تلوار۔ یہی وجہ ہے کہ اختلاف آراء کے ظاہر ہوتے ہی جماعتیں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ امیر معاویہ کی رقابت خلیفہ چہارم کے ساتھ اور انکی باہمی آویزش، عامۃ المسلمین کا مطالبہ قاتلین عثمانؓ سے قصاص لینے کا، اور حضرت علیؓ کا پس و پیش، محض وقتی باتیں تھیں۔ اگر انکا تصفیہ ہو جاتا تو بھی انتخاب خلیفہ کے وقت امیدواروں کی کثرت، یا امور مملکت میں حاکم و محکوم کے درمیان اختلاف سے ابھرنے والے فتنوں کا ہمیشہ کے لئے سد باب ممکن نہ تھا۔ انکے لئے بہتری مواقع اور اسباب پیدا ہو سکتے تھے۔

لیکن اہل عرب نے حکومت کے مرض کی صحیح تشخیص نہ کی۔ اور محض وقتی طور پر اختلافات کی گتھی کو جو یوں نہ سلجھ سکتی تھی، تلوار سے کاٹنا علاج سمجھا۔ اسمیں بھی وہ بہک کر کہیں سے کہیں چلے گئے کیونکہ اس خونریزیوں کی تحریک میں نفسانیت کا بھی حصہ تھا۔ اور حق پسندوں کے شور و غوغے میں اہل غرض بھی شریک ہو گئے تھے یہ لوگ مسلمانوں کی خانہ جنگی میں اپنی حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے اور انکے جذبات حق پسندی کو ابھار کر اپنے اغراض کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ سیدھے سادے مسلمان انکے دام تزویر میں پھنس کر اسی آفت میں ہمیشہ کے لئے مبتلا ہو گئے جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔

یہ ناگزیر تھا۔ کیونکہ ان فتنوں کا محض یہی علاج تھا کہ خلافت کوئی قطعی شکل اختیار کر لے جمہوری یا استبدادی پہلی صورت عربوں کی غیور اور حریت پسند طبیعت کے موافق تھی۔ مگر اس کے لیے مدتوں کے سیاسی تجربہ اور آئینی طرز حکومت سے واقفیت کی ضرورت تھی، جو انہیں نہ تھی۔ دوسری صورت اقتدار پسند رہنماؤں کی خواہش اور عربوں کی سردار پرست سیرت کے موافق تھی، اور یہی اختیار کی گئی۔ اس طرح وہ کشمکش جو "حاکمیت" کے لئے شروع ہوئی جمہور کی نادانی سے استبداد کی موافقت میں ختم ہوئی!۔

امیر معاویہ کے عہد سے استبدادی طرز حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ اور معاملات تو پہلے ہی سے مبہم تھے، ایک طریق انتخاب ہی "آئین" خلافت میں جمہوری اصول پر تھا۔ یعنی بری یا بھلی طرح اسمیں رائے عامہ کے حق کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ امیر معاویہ نے اسکو بھی مٹا دیا اور ایسی رسم کی بنیاد ڈالدی جو ہر خلیفہ کے مرنے کے بعد فتنوں کے اٹھنے کو روکنے میں خواہ جس قدر بھی کامیاب ہوئی ہو، جمہوریت پر آخری اور سب سے کاری ضرب تھی۔ خلافت اسکے بعد شخصی سلطنت میں تبدیل ہو گئی یہی اسکا قدرتی راستہ بھی تھا۔ طریق حکومت نے جن ارتقائی منازل کو طے کرنیکے بعد طرز جدید اختیار کیا ہے، اسکی طرف یہ پہلا قدم تھا، مگر بدقسمتی سے عربوں کی حکومت مفید تغیرات کے لئے وقت میں پختگی پیدا ہونے سے قبل ہی جاتی رہی اور ترکی سیادت کے قیام نے عرب میں ارتقار سیاسی کے تمام مواقع کا خاتمہ کر دیا۔ تاہم خود ترکی سیاسی تغیرات سے مستفیض ہوئی، اور ایک عرصہ کے بعد پارلیمنٹری حکومت کے

قیام نے خلافت کی قدیم جمہوریت کو ایک حد تک زندہ کر دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ اسکے متعلق کچھ کہنے سے پہلے ہم ایک اور تغیر کیطرف توجہ کرتے ہیں جس نے خلافت کی عظمت اور حیثیت کو بہت کچھ گھٹا دیا تھا، اور آج جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ اسی تغیر کا لازمی نتیجہ ہے۔

خلافت سلطنت میں تبدیل ہونے کے بعد محض ایک سیاسی انسٹی ٹیوشن رہ گئی۔ مذہبی سیادت یا "امامت" علماء کے طبقہ میں چلی گئی جنہیں سیاسی قوت سے کچھ بھی سروکار نہ تھا۔ یہیں سے مذہب اور سیاست کی تفریق شروع ہوتی ہے دونوں کے اب دو مستقل انسٹی ٹیوشن قائم ہو گئے۔ ان کی امامت علماء امت کو حاصل ہوئی دوسرے کی قیادت خلیفہ کے سپرد ہوئی۔

انجام کار مذہبی معاملات میں "وحدت امامت" کا تخیل جسے کبھی فروغ حاصل نہ ہوا تھا قطعی طور سے دب گیا۔ اسکا اثر لوگوں کی ذہنیت پر یہ پڑا کہ رفتہ رفتہ سیاسی معاملات میں بھی "وحدت امامت" کی ضرورت کا احساس جاتا رہا۔ اور اسلامی سلطنت جو ہندوستان سے اسپین تک پھیلی ہوئی تھی ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگی۔ بعض دیگر وجوہ بھی تھے جو اس انشقاق میں معین ہوئے۔ اسلامی فتوحات کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ انکا ایک سلطان کے قابو میں رہنا ممکن نہ تھا بالخصوص جبکہ پہاڑ، خشکی، سمندر اور دریا وغیرہ قدرتی رکاوٹیں بکثرت تھیں اور آمد و رفت کے ذرائع بالکل ابتدائی حالت میں اور ناکافی تھے۔ لیکن اول الذکر وجہ سب سے بڑھکر تھی۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ کونسا ملک پہلے نکلا اور کونسا بعد کو۔ ہمیں صرف اس واقعہ سے تعلق ہے کہ اسلامی سوسائٹی جس کا پہلے ایک مرکز تھا مختلف آزاد مرکزوں میں تقسیم ہونے لگی۔

تعجب ہوتا ہے کہ اس وقت کسی عالم یا مدبر نے دنیائے اسلام کا سیاسی حیثیت سے متحد کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ نہ "اتحاد اسلامی" کا اس زمانہ میں کوئی ایسا چرچا ہوا جیسا آجکل سننے میں آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت اور عالم اسلام کے سیاسی اتحاد کے تخیل، جنہیں بہت سے مسلمان آج عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں، بالکل جدید اور یورپ کی سیاسی تعلیم کے اثر سے وجود میں

آتے ہیں۔ یہ خواہ اسلام کی تعلیم کے کتنے ہی مطابق ہوں، مگر مسلمانانِ سلف کے ذہن ان سے بالکل خالی تھے۔

خلیفہ کے حدود سلطنت کا رقبہ رفتہ رفتہ بہت محدود ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ باستثنائے چند تمام ممالک اسلامیہ خود مختار ہو گئے، اور خلیفہ سے انکا رشتہ محض "روحانی" رہ گیا، جو کسی ملک کے بادشاہ کے ذاتی اغراض یا عقیدتمندی سے کچھ یونہی سا بڑھ جاتا۔

بالآخر خلیفہ صرف ترکی اور عرب کا حکمراں رہ گیا۔ جنگ عظیم نے ملک عرب کو بھی خلیفہ کے ہاتھوں سے نکال دیا اور خلافت ترکی حکومت کی مرادف ہو گئی۔ جزیرۃ العرب کے نکل جانے سے ایک رہا سہا کام اماکن مقدسہ کی حفاظت اور حج کے انتظام کا بھی جاتا رہا۔ خلافت کے اس حالت میں قایم رہنے کی بظاہر کوئی عقلی دلیل نہیں معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ قطع نظر ان سیاسی پیچیدگیوں کے جو ترکی میں اس سے پیدا ہوتیں، یہ نام ہوتا بہت سی ذمہ داریوں کا جنہیں پورا کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔

چنانچہ جو سلسلہ تخریب خلافت سے رشتہ توڑ توڑ کر دیگر ممالک کے مسلمانوں نے شروع کیا تھا ترکوں نے منصب خلافت توڑ کر اسکا اتمام کر دیا۔

ترکوں کے اس فعل سے مسئلہ خلافت اپنی تمام دشواریوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ ایکبار پھر عالم اسلام کے سامنے آگیا ہے جس نظام کے انحطاط نے اسکو عرصہ دراز سے غفلت کی نظر کر رکھا تھا، اسکی شکست نے از سر نو لوگوں کی توجہ اپنی طرف پھیر لی ہے! اور اب وقت ہے کہ ہم مسلمانان سلف کی طرح خلوص کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنے میں کوشاں ہوں۔ اس موقع پر ہمیں بعض حیثیتوں سے ان پر فوقیت حاصل ہے۔ ہمارے پاس صدیوں کا سیاسی تجربہ ہے۔ ہمیں اپنی اور اقوام عالم کی تاریخ سے بہت کچھ سبق مل چکا ہے ہم سیاست بہتر جانتے ہیں۔ اور دنیا اور اس کے گوناگوں مسائل سے زیادہ آشنا ہیں ہمارے لئے موقع ہے کہ تیرہ سو سال کی مدت میں حاصل شدہ علم کو استعمال کریں، اور خلافت کا ایسا نظام بنائیں اگر ہم واقعی بنانے پر آمادہ ہیں، جو مفید، قابل عمل، مستحکم اور ترقی پذیر ہو۔

سب سے بڑا سوال جو اس موقع پر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "جو نظام ہم بنانے والے ہیں اس کی نوعیت کیا ہوگی، اور خلافت کا تعلق دنیائے اسلام سے کس قسم کا ہوگا۔"

خلافت کا بہترین تصور اسلامی نقطۂ نظر سے غالباً یہی ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی ایک متحدہ جمہوری سلطنت قایم ہو، جسکا رئیس خلیفہ کہلائے۔ مگر سلطنت کے واسطے متعین ملک چاہیئے۔ اور مسلمان اطراف عالم میں اس طرح منتشر ہیں کہ انکا ایک سلطنت کے اندر آنا ممکن نہیں۔ بہت سے ملک، مثل ہندوستان، چین، وغیرہ یا تو غیر مسلم سیادت میں رہینگے، یا اپنی آزاد حکومت قائم کرینگے۔ وہ مملکت خلافت کا جزو نہیں بن سکتے۔ اب اگر دوسری صورت اختیار کیجائے یعنی منصب خلافت کسی ایک ملک کے حکمران کو تفویض ہو تو بھی مقصد نہیں حاصل ہوگا۔ کیونکہ بلاد اسلامی کے سیاسی اتحاد میں جو دشواریاں ہیں وہ اور زیادہ ہو جائینگی۔ اب رہا خلیفہ کا "روحانی" اقتدار، سو اسکی قیمت معلوم۔ تجربہ نے بھی بتادیا ہے کہ خلافت ایک ملک کے اندر محدود کر کے تو مسلمانان عالم سے کوئی قابل لحاظ تعلق نہ رکھ سکی۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں انکا اشتراک حاصل کر سکی۔ اسکی حیثیت کسی ملک کی "قومی" حکومت سے زیادہ کبھی نہیں رہی۔

تاہم غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ خلافت کو باقاعدہ سیاسی قوت حاصل کرنے کیلئے متذکرہ بالا صورتوں میں سے ایک اختیار کرنی لازمی ہے۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ لیکن نہ تو تمام دنیا کے مسلمانوں کا سیاسی اتحاد ممکن ہے نہ خلافت کا ایک ہی سلطنت کے اندر محدود رہنا قرین عقل۔ پھر کیا کیا جائے؟

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم خلافت کو سیاسی قوت دینے کا سوال ہی چھوڑ دیں؟ اب تک تو عام مسلمانوں کا یہی خیال رہا ہے کہ خلافت کے لئے سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے۔ مگر کیا واقعۃً ایسا ہی؟ کیا خلافت اپنے فرائض بغیر سیاسی قوت کے ادا نہیں کر سکتی؟۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان فرائض کی تعیین کر لیجائے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جبتک خلافت اپنی صحیح شکل میں رہی اسکے حسب ذیل فرائض تھے۔
(۱) مسلمانوں کی حفاظت دشمنوں کے استبداد سے۔ (۲) مسلمانوں کی روحانی اصلاح (۳) مسلمانوں کی معاشرتی اور تمدنی اصلاح (۴) تبلیغ اسلام۔

انہیں صرف پہلا فرض سیاسی قوت چاہتا ہے۔ کوئی زمانہ تھا جب مذہب بھی منجملہ اسباب حرب سمجھا جاتا تھا۔ اسوقت مذہب کے لئے تلوار (سیاسی قوت) کی ضرورت تھی۔ لیکن اب سیاسیات عالم میں بہت کچھ تغیر ہوچکا ہے اور جنگ کا مرکز مذہب سے ہٹکر صرف مفاد پر آگیا ہے۔ دنیا کے اکثر حصوں میں کم و بیش ہر مذہب کے مبلغ خاموشی سے مصروف کار ہیں۔ انہیں کامل آزادی ہے کہ دنیا اور عقبیٰ کے متعلق جس قسم کی چاہیں تعلیم دیں، اور لوگوں کو روحانیت کی طرف بلائیں، اسی طرح وہ لوگ بھی جو کسی خاص تہذیب کے مداح ہیں، یا کسی خاص قسم کی اصلاح معاشرت انسانی میں چاہتے ہیں، اپنے خیالات آزادی کے ساتھ پھیلا سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ کسی ناگوار سیاسی ہیجان کے محرک نہ ہوں۔ اسلئے فی زمانہ تبلیغ مذہب یا روحانیت کی تعلیم، یا معاشرتی و تمدنی اصلاح کے لئے سیاسی طاقت ضروری نہیں۔

یہ معلوم ہے کہ خلافت کا ریاستہائے متحدہ اسلامیہ کی شکل اختیار کرنا محال ہے۔ اس لئے وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی حفاظت بھی اپنے ذمہ نہیں لے سکتی۔ اس فرض کی حیثیت اب مقامی رہ گئی ہے۔ یعنی مسلمانان عالم کو چارو ناچار اپنے اپنے ملک کی حفاظت آپ کرنی ہے، اور حریت کے حصول و قیام کے لئے خود ہی وسائل تلاش کرنے ہیں۔ یہ کام کسی بین الاسلامی نظام سے براہ راست نہیں لیا جا سکتا

پس فرض اول ساقط ہوا جاتا ہے۔ اسکے بعد خلافت کو سیاسی قوت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ وہ اس کے بغیر بھی اپنے بقیہ فرائض ادا کر سکتی ہے۔ پھر کیا ضرور ہے کہ خواہ مخواہ سیاسی طاقت خلافت کے لئے لازمی قرار دیجائے۔

اسلام کے نزدیک خلافت، نظام اور مادی قوت مقصد نہیں ہیں، بلکہ حصول مقصد کے وسائل ہیں۔ یہ صرف اسی لئے ضروری ہیں کہ دنیا کے اندر مسلمان مامون ہوکر شریعت الٰہی کی تعلیم دیں کہ اس پر کاربند ہوکر انسان اپنی نجات حاصل کر سکے۔ لیکن اگر ان تمام وسائل یا انیں سے کسی ایک کے بغیر بھی یہ کام کیا جا سکتا ہے، تو چاہیئے کہ ہم دانائی سے کام لیں، اور بیکار چیزوں کے لئے

ہے کو دشواری میں نہ ڈالیں۔

مسلمانوں کو اگر کوئی اتحاد قائم کرنا ضروری ہے تو خلافت سے زیادہ مفید اتحاد مشرق[1] ہوگا ہو! مشرق کے تمام ملکوں کا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ یہ بھی بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ اس وقت مسلمانوں کا مذہب نہیں بلکہ انکی ذات معرض خطر میں ہے۔ یورپ کو ان کی غلامی درکار ہے۔ انکے دین سے کچھ سروکار نہیں۔ سفید رنگ یورپ اور سیہ رنگ مشرقیوں کی جنگ مذہبی نہیں بلکہ اقتصادی ہے اسکے لئے انہیں بھی ایسا ہی متحد ہونا چاہئے جیسا یورپ ہے۔ اس وقت یہ مناسب نہیں کہ کوئی وقتی ارادہ اتحاد سیاسی قائم کرکے غیر مسلم مشرقیوں کو بدظن، اور توازن قوت برقرار رکھنے کے لئے متعا ہمیں کوئی دوسرا اتحاد قائم کرنے پر مجبور کیا جائے اس سے مشرق کی قوتیں تقسیم ہوجائینگی۔

پھر اگر خلافت کے فرائض محض مذہبی، روحانی، معاشرتی، اور تمدنی اصلاح سے متعلق رہجائیں اور سیاسی قوت کا سوال جاتا رہے، تو ہم باسانی ایک ایسا مرکزی نظام قائم کرسکتے ہیں جس کی شاخیں تمام ممالک اسلامیہ میں پھیلی ہوئی ہوں۔ کیونکہ پھر کسی ملک کی سیاسی آزادی خطرے میں نہیں رہیگی اس صورت میں خلافت کا تعلق مسلمانان عالم سے وہی رہے گا جو بہت سی تبلیغی اور سوشل اصلاح یا خدمت کرنے والی بین الاقوامی انجمنوں کا اپنے اپنے اراکین سے صرف اس فرق کیساتھ کہ خلافت کا تعلق مسلمانوں سے زیادہ گہرا اور مضبوط رہے گا

گویا تمام دنیا کے مسلمان متحد و متفق ہوکر ایک بین الاسلامی نظام کے ماتحت اپنی اندرونی اصلاح میں کوشاں ہوں گے۔ ہر ملک کی خلافت کمیٹیوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ تعمیری کاموں مثلاً مسلمانوں کی تعلیم، یتیم خانہ، مساجد، اور تبلیغ وغیرہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں، اور اوقاف و صدقات وغیرہ کی جو زرہائے کثیر بیکار، اور بعض اوقات، مضر کاموں میں صرف ہوتے ہیں، انہیں مفید مصرف میں لانے کی کوشش کریں جہاں تک ممکن ہو ہر ملک کا روپیہ اسی ملک میں صرف کیا

---

[1] یورپ کے ارباب سیاست "مشرق" کے جو معنی لیتے ہیں یہاں وہی مراد ہے۔

جائے۔ سوائے اس محدود رقم کے جو نظام خلافت کو قایم رکھنے یا دوسرے مشترک اغراض کیلئے نکال لی جائے۔ حج کے انتظام میں عربوں کا ہاتھ بٹانا بھی خلافت کا ایک فرض ہو۔

اس موقع پر خلافت کا کوئی تفصیلی نظام اساسی پیش کرنا غیر ضروری ہے۔ مسلمان اس فن سے اب بہت کچھ واقف ہوگئے ہیں۔ اور وقت آنے پر بہتر سے بہتر نظام اساسی تیار ہوسکتا ہے صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ مرکزی نظام ممالک اسلامیہ کے نمائندوں پر مشتمل، جس کا رئیس خلیفہ کی جگہ لے۔

اگر واقعی خلافت کی ضرورت ہے اور مسلمان اس کے قایم کرنے پر آمادہ ہیں، تو یہ اسی شکل میں ممکن ہے، اور اسکے فرائض فی الحال اسی حد کے اندر رہ سکتے ہیں، جس کا اوپر تذکرہ ہوچکا ہے۔ آگے چل کر وقت اور موقع کے لحاظ سے اس کے دائرہ عمل کو زیادہ وسیع یا محدود کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اب ضرورت ایسے مخلص اور سرگرم کارکنوں کی ہے جو ہر طرح مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرکے مقاصد خلافت کو کامیاب بنائیں حال میں موتمر اسلامی کے قیام نے ایک مرکزی نظام کی ابتدا بھی بہت آسان کر دی ہے۔ دیکھئے یہ موقع کہاں تک نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔

حضور سرور کائنات (صلعم)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ئلب یہ حالات تو حضور کی خانگی زندگی سے متعلق تھے اب یہ بھی دیکھنا ہے کہ بیرونی دنیا سے تعلقات کیا رہتا ہے۔ تمدن اور سیاست کے کیا اصول ٹھہرتے ہیں۔ معاشرت کا کیا نظام قرار پاتا ہے ئب کے لئے کیا وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔

م جرات | جنگ کیلئے عزم، استقلال، شجاعت، جرات اور قوت تنظیم کی ضرورت ہے عزم استقلال ت اور شجاعت کے ثبوت کا تو ایک ہی واقعہ سے پتہ چل سکتا ہے۔ اعلاء کلمۃ الحق پر جب قریش مخالفت زیادہ ہوئے تو وہ آپکی اکیلی ذات تھی جس کے خلاف طوفان عظیم برپا تھا جان خطرہ میں برسوں رہی عاے ہیے کی تکلیفیں روز کا معمول تھا۔ اکا دکا جو ساتھی ہوتا اس پر ظالم کی بھرمار رہتی یہ سب کچھ تھا مگر پر امی جس کو حق کی تلقین کا تہیہ ہوگیا تھا اس سے قدم نہ ڈگے۔ روپیہ کا لالچ خزانہ کی طمع عرب کی سرداری ، عدہ بھی آپ کے عزم کو نہ توڑ سکا۔ ہزاروں تکلیفوں نے بھی اس ارادہ میں کوئی تبدیلی پیدا ں سینکڑوں راحتوں کے سبز باغوں نے بھی آپ کو اپنے مشن سے دست کش ہونے پر رضامند نہ کیا اور ہی واقعات ہیں مگر یہ ایک واقعہ ایسا ہے جس پر نظر غائر ڈالنے سے برسوں کی دشواریوں اور مدتوں ں زحمتوں کا اندازہ ہوسکیگا۔ اور انکے مقابلہ میں جس عزم و استقلال، جرأت و ہمت کی ضرورت ت اس کا پتہ چل سکے گا۔

وت تنظیم | قوت تنظیم بھی ملاحظہ فرمائیے۔ تاریخ کا یہ مسلمہ واقعہ ہے کہ آپکی اکیلی ذات تھی جس نے تلقین کی ابتدا ں ایمان لانے والے رفتہ رفتہ اکٹھا ہوئے انکی جماعتیں مرتب ہوگئیں۔ مدینہ میں عقد مواخاۃ ہوا جس نے یوں سے زیادہ غیروں کو ایک دوسرے کا عزیز بنا دیا۔ رفتہ رفتہ انہیں لوگوں کا نظام قائم ہوا اور اسی تنظیم کی بدولت جو ذات بیکسی کے عالم میں ہجرت کرتی ہے اور معیت میں صرف تھوڑے سے جاں نثاروں کو لیجاتی ہے قلیل مدت کے اندر پھر مکہ میں انبوہ کثیر کے ساتھ اور فتح و نصرت

کے پرچم کے سایہ میں داخل ہوتی ہے۔

بدر کے معرکوں میں جہاں کمزوری کا طاقت سے مقابلہ تھا، احد کے میدان میں جب کہ ایک بہت بڑی فوج قلیل جماعت سے ٹکرانے والی تھی، غزوات بنی مصطلق و احزاب میں جہاں بے سروسامانی ملک کے متحدہ ساز و سامان سے مقابل تھی صفوں کی کس کس طرح ترتیب ہوئی حملہ کی مدافعت کے لئے کیا کیا ذرائع پیدا کئے گئے۔ خندقیں کس کس طرح کھودی گئیں، تین تین دن کے مسلسل فاقہ پہ خود دست مبارک نے سخت سے سخت پتھر پھوڑ کر معدودے چند جاں نثاران اسلام کی حفاظت کے لئے کیا کیا سامان کئے یہ امور تاریخ کے حالات زریں ہیں۔ موجودہ فنون جنگ نے خندقوں کا استعمال اب جنگ کے لئے ضروری سمجھا ہے مگر آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب کا امی رہبر مشارق و مغارب کا بے پڑھا لکھا آفتاب ہدایت، جسے نہ سنڈہرسٹ کی تعلیم ملتی ہے اور نہ جسے برلن کے حربی اسکولوں کا تجربہ ان چیزوں کو عالم وجود میں لاتا ہے جنکو نہ ایام گذشتہ سے انس تھا اور نہ جنہیں مستقبل قریب سے تعلق۔ میدان جنگ میں خود حضور ہی صفوں کی ترتیب کیا کرتے تھے انتظام جنگ کے ہدایات جاری کرتے تھے حملے کی صورت متعین کرتے تھے جنگ آزماؤں کے میدان میں جا بیکا نظام قرار دیتے تھے۔ جن سرایا و غزوات میں بنفس نفیس شرکت نہیں ہوسکتی تھی وہاں کے لئے آپ تحریری ہدایتیں بھیجتے تھے اور اس تنظیم و ہدایت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے وہی جو ماہر جنگ کے احکامات کا ہونا چاہئے تدبیریں کوئی پٹ نہیں پڑتیں اور لڑنے والے ہمیشہ اپنا مقصود حاصل کر کے پلٹے جنگ سے زیادہ مشکل بعد از جنگ کا انتظام اور روک تھام ہے اس قوم کے افراد کو ملاحظہ فرمائیے جنہوں نے خود اور جن کے اسلاف نے مدت نامعلوم سے لوٹ مار کو اپنے گذارہ کا ذریعہ بنایا ہو، نوچ کھسوٹ کو جو اپنا رزق حلال سمجھتے ہوں وہی لوگ جب مال غنیمت لاتے ہیں تو ایک ایک ذرہ ایک ایک پائی نہایت امانت و دیانت سے داخل بیت المال کر دیتے ہیں یہ سب کچھ اگر تنظیم کی قابلیت نہیں ہے تو آپ ہی فرمائیے کہ دنیا اپنی اصطلاح میں کیا کہیگی۔ یہ تھی وہ تنظیم جس نے فتح کو جنگ کا شریک لازم قرار دیا تھا۔ یہ تھی وہ قابلیت جنگ جس نے جنگ کو امن خلائق کا پیش خیمہ بنا دیا تھا۔ اور یہ تھی وہ معرکہ آرائی جو ترقی انسانی اور عروج بشریت کی زندگی

ول تھی۔

جنگ کے متعلق ذکر ختم کرنے سے پہلے خود مسئلہ جنگ کی نسبت ایک نظر پیش کئے بغیر نہیں
سلما معمولاً جنگ وہ چیز ہے جو نظام دنیا میں برہمی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس سے ملک تباہ و برباد
ہو جاتے ہیں۔ صدہا ہستیاں حیاتی نقطۂ نظر سے اور صدہا تمدنی و اخلاقی اور مالی لحاظ سے فنا ہو جاتی
یں س لئے جنگ پسندیدہ چیز نہیں ہو سکتی لیکن جنگ کا وجود اور اُسکی پیدا کردہ بدامنی قوم کی
ہستی ہی کیلئے بسا ضروری تھے اس لئے جہاں جنگ کا وجود ضروری تھا وہاں معائب جنگ سے
جنگوں کو پاک رکھنا بھی فرض اولین تھا۔ اسی لئے حضور سرور کائنات نے جن جنگوں کا انتظام فرمایا
ں جنگوں کو جبر و تعدی کے عقات سے پاک رکھنے کے لئے ہر جنگ کو جنگ مدافعت رکھا جنگ
ادں کے لئے اصول یہ قرار پایا کہ جبتک خود پر حملہ نہ ہو لے حملہ نہ کیا جائے یہ ضرور ہے کہ
س اصول کے لحاظ سے آپکے زمانہ کی جنگیں مسلمانوں کے لئے نہایت دشوار اور سخت تھیں کیونکہ
نیا کا ایک یہ بھی یقینی اصول ہے کہ مقابل کو سنبھلنے سے پہلے ضرب لگا دی جائے مگر جابرانہ طرز
حت سے بچانے کیلئے زندگی کی دشواریاں بڑھا دینا آسان تھا بہ نسبت اس کے کہ سہولت کی
خاطر مسلمانوں کو تعدیم حملہ کی اجازت دیجاتی ہر اول کا تقرر کیمپ کے تقرر کے لئے بہترین موقع کا انتخاب
یمپ کے تحفظ کے لئے چوکی پہروں کا انتظام صف آرائی کیلئے بہتر موقع کا تعین یہ تمام وہ واقعات ہیں
ہ ہر جنگ کی تفصیل کے ساتھ تاریخوں میں ملتے ہیں۔ ایک اور بات بھی خصوصیت کے ساتھ قابل لحاظ
ہے جس قدر جنگیں ہوئیں انکا انتظام اور انصرام اس وقت ہوا جب آپ اپنے وطن میں اور اپنے
گھر میں متمکن نہ تھے بلکہ اسوقت ہوا ہے جب آپ پرائے گھر میں مہمان تھے پرائے گھر میں رہکر کسی چھوٹے
سے چھوٹے کام کے انصرام میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ ہر شخص جانتا ہے چہ جائیکہ جنگ جیسے بڑے
کام ہوں۔

دوسرے درباروں سے سفراء کے ذریعے تعلقات پیدا کئے گئے باہمی امداد کے حدود متعین | سیاست
ہوئے ایک دوسرے کے حقوق کے تحفظ کے شرائط کا تصفیہ ہوا ان اقوام سے جو دائرہ اثر میں

آگئی تھیں معاہدے کئے گئے جو قومیں کہ نبرد آزما ہونیکے بعد شکست کھا گئی تھیں ان سے بھی آمد و
کے لئے عہد نامے پر صلح کر لی گئی قیصر روم خسرو پرویز، نجاشی ۔ عزیز مصر، رئیس یمامہ کی سفارتیں
قریش سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ یہودیوں سے عہد نامہ ۔ غزوہ تبوک کے بعد عسانی سرداروں
سے مصالحت وغیرہ وغیرہ سیاست کی زندہ مثالیں ہیں ۔

تمدن و امن | عرب کے حالات سابق میں گذارش کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ عرب کا گوشہ گوشہ
کیسی بدامنی کا آماجگاہ بنا ہوا تھا ملک کی فلاح کے لئے امن کے قیام کی شدید ضرورت تھی ۔ امن
طاقت کے بغیر ممکن نہیں سب سے بڑی چیز قانون اور اسکا نفاذ ہے اسکے بعد لوگوں میں اس قانون
کی پابندی اور اتباع کی خواہش کا پیدا کیا جانا ہے ۔ اسلام کے اقتدار کیساتھ ہی ساتھ ڈاکہ چوری
قتل، غارتگری، خیانت، زنا جھوٹ ان تمام جرائم کی سزائیں مقرر ہوئیں اور ان پر اس طرح عمل
درآمد ہوا کہ عزیز و اقربا میں مسلمان اور غیر مسلمان میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہ رہا اندرون
ملک میں امن کی خواہش کا پتہ اور عزم کا استحکام اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپنے فرمایا تھا کہ شتر سوار
صنعاء سے لیکر حضر موت تک سفر کرے گا اور اسکو خدا کے سوا یا بھیڑیئے کے سوا اور کسی کا ڈر
نہ ہوگا یا باختلاف روایت یہ ارشاد ہوا تھا کہ ایک عورت قادسیہ سے تنہا چلیگی اور آکر کعبہ کی زیارت
کرے گی لیکن راہ میں اسکو خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہو گا ۔ یہ عزم محض خواہش ہی خواہش نہ تھا ملکہ
عدی نے اسی طرح ایک عورت کے قادسیہ سے کعبہ تک صحیح سلامت آنیکی تصدیق بھی کی ہے ۔ امن کے
قیام کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی قوت و اقتدار کے بھروسہ پر قانون سے انحراف کریں اور
اپنی جماعت کی قوت پر قانونی سزاؤں سے خود کو بچائیں انکے خلاف مہمات بھیجکر انکی سرکوبی کیجائے
سرایائے زید ابن حارثہ ۔ ذات الرقاع ۔ سیف البحر ۔ غزوۂ غابہ اسی قسم کی جنگیں تھیں ۔

استقرار حقوق | حاکم کے حقوق رعایا پر، رعایا کے حقوق حاکم پر، مرد کا حق عورت پر عورت کا حق
مرد پر، ماں باپ کا حق اولاد پر، اولاد کا حق ماں باپ پر، بھائی بہن کے حقوق، ہمسایوں کے حقوق
ہمسایہ قوموں کے حقوق، غلاموں کے حقوق، مالکوں کے حقوق وقس علی ہذا اسی تمدنی دور اندیشانہ

معین اور ہدایت کی بنا پر قرار پائے تھے جس کی اخلاقی حالت ایسی کامل اور جنکی جنگ آزمائی کی قدرت ایسی
ےمثل آپ دیکھ چکے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں وہ پہلا وقت تھا جس نے مظلوم فرقہ اناث کے حقوق کو جابر
، ظالم فرقہ ذکور کے ہمدوش پہنچا دیا اور عورت کی ہستی کو ہستی ضمنی سے نکالکر حقیقی ٹھہرا دیا۔ مہذب قومیں
س کے متعلق اپنی ترقی پر جتنی بھی نازاں ہوں مگر یہ دریائے فیض جاری ہوا ہے ایک قطرۂ اشک
ے جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان مظلوموں پر گرایا گیا تھا۔

اشاعت علوم | اطلبوا العلم ولو کان بالصین کی حدیث بہت مشہور ہو چکی ہے اور اسکے اعادہ کی ضرورت باقی
ہیں رہی لیکن منہ سے کہنا کچھ اور ہے اور اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانا چیزے دیگر ہے۔ سیرت سے
یہ ثابت ہے کہ صحابۂ کرام کو اکتساب علوم کی خاطر حضور نے عبرانی کی تعلیم دلائی اصحاب صفہ کو حصول علوم
توجہ کیا مدارس شبینہ قائم کئے گئے جنگ بدر میں جو لوگ فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے اور تعلیمیافتہ
تھے انکو محض اس شرط پر آزادی عطا کی گئی کہ وہ مکہ میں لوگوں کو لکھنا سکھائیں کتابت کو عام رواج
دیا گیا مختصر یہ کہ علوم کی دلچسپی کا قوم کے دلوں میں وہ تخم بویا گیا جس کے اثمار زمانہ آئندہ نے ایسے دیکھے
جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔

شعبہ جات حکومت | حکومتوں کے صیغوں کا قیام ہوا۔ محکمہ قضا و افتا پولیس محکمہ تفتیش و تحقیق۔ محکمہ
محاصل محکمۂ احتساب جو نہ صرف معاملات مالی کا محافظ تھا بلکہ قوم کے اخلاق وعادات کا بھی جہاں محاسبہ
ہوا کرتا تھا۔ وہ صیغے ہیں جنکا قیام ایک حکومت عادل کے لئے بہا ضروری ہے۔ اور جنکو اسوقت
عالم وجود میں وہی ذات لائی جو باوجود علوم دنیاوی سے ناواقف ہونیکے ماضی اور مستقبل کے
حالات اور معلومات سے باخبر تھی۔

تجارت | زمانہ جدید نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کوئی حصۂ ملک اس وقت تک مادی منازل میں ترقی
نہیں کر سکتا جبتک وہ ملک تجارت میں بھی طاق نہو۔ تجارت کی ترقی تابع ہے پرسکون اور پرامن
زمانہ کی حالت کے۔ عرب میں تجارت تو عرصہ سے قائم تھی البتہ تاجروں کے املاک کے محافظ صرف
مٹنے والے ہی تھے۔ حضور کے زمانہ میں راہ تجارت کی حفاظت کا انتظام بھی معقول کیا گیا اور جہاں

محض چوکی پہرہ سے کام نہیں چل سکتا تھا وہاں متعدد سرایا بھیجکر سرکش فرقوں کا سدباب کیا گیا اُٹھا طور پر یہ تھے وہ فیوض اور برکات جو دنیائے مادی نے حاصل کئے اس سلطان کی ذات سے جو اپنی ذات کے لئے راحت کے تمام وسائل فراہم کرنے پر قادر تھا جو عیش و عشرت کے دن رات ڈنکے بجا سکتا تھا جو اپنے خاندان میں نسلاً بعد نسل بادشاہت قائم کر سکتا تھا مگر جس نے کھرّی چارپائیوں اور چٹائیوں پر زندگی کی راتیں بسر کیں پیٹ پر پتھر باندھ باندھ کر فاقوں کا مقابلہ کیا۔ پیوند کے کپڑے پہن پہنکر زندگی گذاری اور جس وقت دنیا کو خیرباد کہا تو اپنے پسماندوں کیلئے خدا کی اعانت کے سوا کوئی دولت نہیں چھوڑی۔ روحی فداک یا رسول صلی علی محمد

مگر جو ذات حصول راحت پر قادر تھی وہ فقیری کی زندگی بسر کرے۔ جو ذات بادشاہی کی مالک ہو وہ مزدوری کرے۔ جو ذات عیش کی زندگی گذار سکتی ہو وہ تکلیف و مصیبت کے دن کاٹے زندگی کو اس نہج پر بسر کرنے کی کچھ نہ کچھ غایت تو ہونی چاہئے جواب اسکا کوئی بڑا راز سربستہ نہیں دنیا کا مسلمہ اصول ہے کہ نصیحت یا تلقین لفظی حیثیت سے اسقدر سودمند نہیں ہوتی جتنا اس نصیحت و تلقین کے ساتھ عمل کا ہونا مفید ہوتا ہے۔ آپکی ذات چونکہ زندگی کے ہر ممکن شعبے اور دنیا کے ہر ممکن صیغے کی ترقی کے لئے عملی نمونہ ہونیوالی تھی اس لئے تلقین کے ساتھ ساتھ عملاً بھی زندگی میں ہر اصول کو برتنا پڑا یہ وجہ تھی کہ جہاں بادشاہی تھی وہاں فقیری بھی رہی جہاں حصول دنیا تھا وہاں دنیا سے اجتناب بھی تھا۔ جہاں متاہل زندگی تھی وہاں زندگی محض تاہل سے بری بھی تھی۔ جہاں رئیس العساکری تھی وہاں سپہ گری بھی تھی۔ وضاحت کے لئے دو ایک واقعات کا پیش کر دینا کافی ہوگا مثلاً متاہل زندگی کو لیجئے جوانی کا تمام حصہ تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے ساتھ گذر گیا اور انحطاط عمر میں کئی نکاح حضور نے فرمائے ان نکاحوں کی خصوصیت خاص یہ ہے کہ سوائے ایک کے آپکی باقی تمام ازواج بیوائیں تھیں زندگی کا روزانہ تجربہ بتا سکتا ہے کہ دنیا میں کنواری لڑکیوں کا ملنا دشوار نہیں۔ ذرا سی وجاہت و عزت اور ذرا سی دولت و ثروت کیلئے کنواری لڑکیاں آسانی ممکن الحصول ہیں لیکن آپکی متاہل زندگی چونکہ خواہش تاہل سے بری تھی اور ہمدردی اور دردمندی یہ دونوں چیزیں انسانیت کا شرف

اس لئے بیکس و بے یار بیواؤں کی امداد کا ذریعہ پیدا کرنے کیلئے حضور نے بیواؤں کو ترجیح دی ان
میں سے کچھ ایسی بھی تھیں جو گردشِ زمانہ کے باعث عروج سے غلامی کی ذلت میں جا پھنسی
تھیں ان کو عزت کی منزل پر از سر نو پہنچانے کیلئے آپ کو ان سے نکاح کر لینا پڑا اور نتیجہ کیا ہوا کہ اس
ایک نکاح کی بدولت اس فرقہ کے کل غلام آزاد ہو گئے۔

تجارت میں خود آپ نے حصہ لیا اور اس طرح دنیا کو اصول صحیح پر تجارت میں مشغول ہونیکا راستہ
دکھلایا مگر تجارت کا ایک مذموم پہلو بھی تھا وہ یہ کہ انسان کو اتفاقی طریقہ پر ایسے واقعات اگر پیش
آجائیں جن پر اس کا بس نہ ہو اور اپنی عدم استطاعت کے باعث جنکی کفالت پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص
کی امداد بشریت کا فرض ہے لیکن اس کی اس دشواری کا ناجائز فائدہ حاصل کر کے زندگی کی دشواریوں کو
بڑھانا دوسرے کیلئے ذلیل ترین فعل ہے۔ اسی لئے روپیہ کمانیکی ممانعت فرمائی گئی اور سودخواری
حرام قرار دیا گیا اسی کے ساتھ اسراف کی بھی ممانعت فرمائی گئی انسانی زندگی میں عبادت کا درجہ
صحیح ہے مگر آپ نے رہبانیت کو پسند نہیں فرمایا چونکہ تعلقات دنیاوی کے انقطاع سے نظام دنیا میں
خلل واقع ہو سکتا تھا۔ حضور نے نفس کشی کے اصول غلط سے باز رہنے کی تلقین فرمائی لیکن نفس پرستی
کی افراط و تفریط سے بچانے کے ذریعے بھی پیدا کئے یہ آپ ہی کا مشن تھا جو انسان کو دنیا کی ہر
سمت و سو میں شرکت کرنے کا ذریعہ سکھاتا تھا۔ مگر اس سعی کی غلط راہوں سے بھی بچاتا تھا۔ مذہب
کا تعلق اگرچہ اس مضمون سے نہیں مگر دنیائے مادیت کا جو تعلق مذہب سے ہے اس سے یہ مضمون علیحدہ
نہیں رکھا جا سکتا۔ دنیاوی نقطہ نظر سے مذہب اس نظام کا نام ہے جو انسان کی عاقبت کے سنبھالنے
کے ساتھ ساتھ دنیا میں اسکی ہستی سے جو فوائد اور نتائج مترتب ہو سکتے ہیں انکے ظہور میں مدومعاون
ہو۔ بس مذہب کی تلقین حضور نے کی اس پر نظر ڈالئے تو آپ بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ دنیائے مادیت بھی
منازل مذہبی سے برابر فیضیاب ہے جن حضرات کو تصوف سے دلچسپی ہے وہ بآسانی اس امر کی تصدیق
کر سکیں گے کہ جو ریاضت اور عبادت دنیا کے ساتھ ساتھ ہی اسکا معیار اس عبادت اور ریاضت
سے بدرجہا وسیع ہے جو ترک دنیا کے ساتھ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے عمل سے اہ

اپنی تلقین اور ارشادات سے بنی نوع انسان کو روحانیت اور عبادت کے منازل رفیع پر جا پہنچنے کی راہیں پیدا کی ہیں وہیں ملوثات دنیاوی سے بچا کر صحیح اصول کی راہیں بھی دنیا کے سامنے کھول دی ہیں مذہب اور دنیا کا مسئلہ و تعلق باہمی ایک بسیط مضمون ہے اسکا ذکر ضمناً یہاں پر محض اس وجہ سے کر دیا گیا کہ دنیائے مادیت کا مسئلہ بغیر اس اشارہ کے نامکمل رہجاتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زندگی کی تلقین اور ہدایت فرمائی اور اپنی زندگی سے دنیا کے عروج کا جو وسیلہ پیدا کیا وہ کس حد تک دنیا میں قبول کیا گیا اور اسکے نتیجے کیا نکلے خود حضور کے زمانہ حیات میں عرب کی جو کایا پلٹ ہوگئی وہ اگرچہ اس دعوے کی دلیل ہے کہ ہر اصول مقرر کردہ اپنے غرض کے حصول کے لئے ایک اسم اعظم تھا اور یہ کہ دنیا نے قلیل ہی مدت میں ان اصولوں کی خوبی معلوم کرکے انکو اختیار کرلیا۔ لیکن خود حضور کے سامنے ان اصولوں کا رائج رہنا ایک چیز دیگر ہے مگر آپ کی وفات کے بعد بھی جب کہ تخصی تاثر عمل پذیر نہو ان اصولوں کا مقبول اور رائج رہنا بالکل دوسری چیز ہے۔ خلفائے راشدین کی سوانح عمریوں کو ملاحظہ فرماسے تو پتہ چلتا ہے کہ ہادی کو گذرے عرصہ ہوچکا لیکن اسکی ہدایت انکے اور عوام کے افعال و اشغال میں اسی طرح قائم رہی جس طرح آپ کے سامنے تھی نتیجہ اسکا کیا ہے دنیاوی ہر تگ و دو میں کامیابی ہی کامیابی تھی حضور سرور کائنات کا مشن برقی رفتار سے پھیلتا ہوا چلا آتا ہے اور مغرب میں بے آف سکے اور مشرق میں چین کے ساحل سے ٹکر کھاتا ہوا تلواروں کے سایہ میں ہیں۔ دلچسپیوں کے دوش پر اور قبول عام کے رہوار پر اگرچہ تیرہ صدیوں نے درمیان میں آکر بہت کچھ انقلاب اور فرق پیدا کر دیا ہے لیکن پھر بھی رہا سہا اتنا اثر مسلمانوں میں آج بھی موجود ہے کہ اس مشن کی حفاظت و حمایت کے لئے اپنی جان سے اپنے مال سے کسی کو دریغ نہیں۔

دانتے اور اسلام

ٹالیہ کا شہرہ آفاق شاعر "دانتے الیغیری" ۱۲۶۵ء میں فلورنس میں پیدا ہوا یوں تو اسکی
بہت نظمیں مشہور و معروف ہیں لیکن جس نظم کی بدولت اسے دنیا کے بہترین شاعروں میں سے ایک
... طربیہ خداوندی" الروایۃ الالہیۃ"، ہے یہ نظم اپنی مثال آپ ہے اس نوع کی کوئی اور نظم آجتک اس کا
مقابلہ نہیں کر سکی ہے اسمیں شاعر نے ایک خیالی سفر کے واقعات نظم کئے ہیں ۱۳۰۰ء میں ایسٹر سے ایک
دن پہلے دانتے اپنے آپ کو ایک جنگل میں پاتا ہے راستہ اسے معلوم نہیں۔ آگے بڑھنے کی کوشش
... تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک شیر ایک بھیڑیا اور ایک تیندوا راستہ روکے کھڑے ہیں۔ بہت پریشان
ہوا ... رفتن نہ جائے ماندن۔ لیکن یک بیک ورجل نمودار ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ عالم بالا سے
مجھے تین عورتوں نے تمہاری رہنمائی کے لئے بھیجا ہے۔ یہ تین عورتیں "کنواری مریم"، "سینٹ لوسی"
"بیٹرس" (دانتے کی معشوقہ) ہیں۔ ورجل کی مدد سے دانتے زمین کے نیچے جاکر "جہنم" اور "مطہرہ"
کی سیر کرتا ہے راستہ میں بہت سی نیکنام اور بدنام آدمیوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ انمیں اگلے
... کے لوگ بھی ہیں اور وہ بھی جو دانتے کے زمانے میں مرے تھے پاپایان روم۔ ملوک۔ امرا
... سپہ آزما اور معمولی شہری سبھی ملتے ہیں کچھ لوگ تو جہنم میں ابدالآباد تک رہنے والے ہیں اور کچھ
ایک عرصہ مدت گذار کر اور اپنے گناہوں کی تلافی کر کے اس عذاب سی نجات پانیکی توقع رکھتے ہیں۔
سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ بات ہی کہ دانتے شاذ و نادر ہی تقسیم عذاب میں تعصب یا ذاتی عناد سے
کام لیتا ہے۔ جہنم اسکے خیال میں ایک مخروطی غار ہے جس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں جو عدم آباد
سے ماہر ہی سے وہ لوگ ملے جنہوں نے خواہشات نفسانی سے مجبور ہو کر گناہوں کا ارتکاب کیا تھا
... زیادہ عذاب نہیں ہوتا۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ہے جہاں پہنچنے کے لئے ٹوٹی ہوئی چٹانوں
سے گذرنا پڑا۔ اسمیں کفار۔ ظالم۔ خودکشی کرنیوالے اور سود خوار نظر آئے۔ اسکے بعد یعنی عذاب
کے انتہائی درجہ پر وہ بدباطن تھے جنہوں نے بالارادہ شدید ترین گناہ کئے تھے۔ یہ لوگ ایک ایسے

Purgatory . Hell at Divine Comedy

غار کی تہ میں تھے جس کی گہرائی کا صحیح اندازہ بھی نہ ہو سکا اور جہاں تک پہنچنے کیلئے ایک دیو سے مدد لینی پڑی
جس نے ان دونوں مسافروں کو اپنے بازوں پر بٹھا کر نیچے اتارا یہاں بہت شدید عذاب دیا جا رہا تھا۔
مستزاد یہ کہ انکی تشہیر بھی کی جاتی تھی یہاں پہنچکر دانتے کا رویہ بدلتا ہے۔ پہلے تو مجرموں کے حال پر اسے
رحم آتا تھا مگر ان گناہ گاروں سے اُسے نفرت سی ہونے لگی۔ اسی غار کی آخری تہ میں دانتے نے ابلیس
کو دیکھا جو سر سے پیر تک برف میں جما ہوا تھا اور بالکل حرکت نہیں کر سکتا تھا اسکے بازوں پر چڑھ کر
یہ دونوں مرکز زمین تک پہنچے اور وہاں سے ایک تاریک راستہ کے ذریعہ پھر سطح زمین پر آئے اب دانتے
نے اپنے آپ کو ایک سر بفلک پہاڑ کے دامن میں پایا جس پر "مطہرہ" واقع تھا۔ ایسٹر کی صبح طلوع
ہو چکی تھی۔ دانتے نے اس پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ خاص مطہرہ تک پہنچنے کیلئے اسے دن بھر چلنا پڑا
اور رات بھی باہر گذاری۔ مطہرہ کے اس خارجی حصہ میں وہ لوگ ملے جنہوں نے عالم نزع میں اپنے
گناہوں سے توبہ کی تھی انہیں تیرہویں صدی کے آخری تیس برس کے بہت سے مشہور لوگ شامل
تھے صبح کو "مطہرہ" کا دروازہ کھلا اور دانتے اسمیں داخل ہوا مطہرہ کے سات حصے سات قتال
گناہوں کی مناسبت سے کئے گئے تھے جو ایک دائرہ کی صورت میں پہاڑ کے چاروں طرف پھیلے ہوئے
تھے اور ایک سے دوسرے تک پہنچنے کیلئے ناہموار زینوں پر چڑھنا پڑتا تھا۔ یہاں سزائیں ذلت آمیز
نہیں تھیں بلکہ گویا لوگوں کے صبر و تحمل کا امتحان لینا مقصود تھا اور بعض اوقات خود دانتے کو بھی ان سزاؤں
سے سابقہ پڑا۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر "جنت ارضی" واقع تھی۔ یہاں بٹریس ایک ملکوتی لباس میں جلوہ
فرما ہوتی ہے اور ورجل دانتے کو اس کے سپرد کر کے رخصت ہوتا ہے۔ بٹریس کے ساتھ دانتے ان
تمام حصص کی سیر کرتا ہے جن پر ملا اعلیٰ مشتمل ہے سیر کرتا ہوا دانتے "سماء السموات" تک پہنچ جاتا
ہے جہاں الوہیت کا مرکز ہے اور یہاں اسے ایک لمحہ کے لئے جمال خداوندی سے فیض یاب ہونے کا
موقع ملتا ہے۔ دنیا کے رازہائے سربستہ کا انکشاف ایک آن واحد میں ہو جاتا ہے۔ من و تو کا پردہ اٹھ
جاتا ہے اور دانتے کا ارادہ مشیئت خداوندی میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اسطرح یہ طویل نظم ختم ہوتی ہے۔[۱]

---

[۱] Divine Comedy کا یہ خاکہ Encyc Brit سے ماخوذ ہے

ن نظم کی مقبولیت کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکی شروح اور حواشی کی تعداد ہزاروں
تک پہنچتی ہے۔ شاعر نے اس نظم میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ تیرھویں صدی کے عیسائیوں کے
ت سے بالکل مختلف ہیں۔ جنت اور دوزخ کی جو تصویر دانتے نے کھینچی ہے وہ اس تصویر سے جو
... میں عیسائیوں کے دماغ میں تھی کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کے مطالعہ
... نے باوجود ایک مدت کے بحث و مباحثہ کے بھی اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ دانتے کے ان خیالات
کا مدیا ہے۔ بعض مصنفین نے بہت کد و کاوش اس امر کے ثابت کرنے کی کی ہے کہ یہ ان افسانوں سے
خوذ ہے جو تیرھویں اور چودھویں صدی میں عیسائی دنیا میں "حیات بعد الموت" کے متعلق ہو تھے
ن محققین نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا اس لئے کہ ان افسانوں میں اول تو شعریت کا کہیں نام ہی نہیں
مواد کی بھی اتنی کمی ہے کہ انکو ایسی شاندار اور پر راز معلومات نظم کی بنیاد قرار دینا بالکل سہل نہیں تو
مسئلہ تمیز ضرور ہے۔ بالاخر جمہور کا فیصلہ یہی رہا کہ یہ نظم کسی خارجی اثر کی رہین منت نہیں بلکہ از اول تا
آخر صرف دانتے کے تخیلات کی بلند پروازی کا نتیجہ ہے جنت اور دوزخ۔ عذاب اور ثواب کی جیتی جاگتی
تصویر جو دانتے نے اس نظم کے ذریعہ آنکھوں کے سامنے لا کھڑی کی ہے وہ صرف اس کی قوت خلاقی
کا ہوا ہے اور اسکے سامنے کوئی خاکہ خواہ وہ کتنا ہی دھندھلا کیوں نہ ہو پہلے سے موجود نہ تھا۔ یورپ
کی علمی دنیا اسی دلفریب غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ ہسپانیہ کے ایک مصنف نے جسکا نام "میگوئیل آسن" ہے
اس طلسم کو توڑا یہ ایک کیتھولک پادری اور جامعہ میڈرڈ میں عربی کے پروفیسر ہیں انہوں نے اپنی عمر
کے تقریباً پچیس سال اسلام اور فلسفہ اسلام کے مطالعہ میں صرف کئے ہیں اور اب اس تحقیق میں مصروف
ہیں یورپ کی تہذیب اور خیالات کہاں تک تمدن اسلامی کے رہین منت رہے ہیں آج سے چھ
سال پہلے انہوں نے ہسپانوی زبان میں ایک ضخیم کتاب لکھی جسکا موضوع تھا "الروایۃ الالٰہیۃ در اسلام میں
... کا تخیل" اس کتاب میں بدلائل یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دانتے کی نظم کا خاکہ تو واقعہ معراج یا اسراء سے
ماخوذ ہے اور تفصیلات ابن عربی کی "فتوحات" سے لی گئی ہیں۔ اس کتاب نے دنیائے ادب میں ایک
ہلچل پیدا کر دی اور ہر طرف سے اس کی موافقت اور مخالفت میں مضامین لکھے جانے لگے اطالیہ کے

"دانتے والے، توکسی طرح تسلیم کرنیکے لئے تیار ہی نہیں ہوتے تھے کہ ایک ایسی نظم جو عہد وسطیٰ کے ... ادب کا نچوڑ سمجھی جاتی ہے کسی طرح اسلامی ادب سے بھی اثر پذیر ہو سکتی تھی اس کتاب کا انگ ... جو "الروایۃ الالہیہ در اسلام" کے نام سے موسوم ہے۔ حال ہی میں شائع ہوا ہے اور اسوقت ہمارے سامنے ہے مصنف نے اسی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول میں پہلے تو وہ تمام روایات بیان کی ہیں جو واقعہ معراج کے متعلق دنیائے اسلام میں عام طور پر مشہور رہیں پھر انہیں اور الروایۃ الالہیہ میں جو ... ہے اُسے واضح کیا ہے اس کے بعد ان تفصیلات کو لیا ہے جو مختلف تفاسیر میں اس واقعہ کے متعلق مروی ہیں پھر بعض صوفیا اور اُدبا کی اُن تصانیف کا ذکر کیا ہے جو اسی واقعہ سے ماخوذ ہیں مثلاً محی الدین ابن عربی کی "الفتوحات المکیہ" اور "کتاب الاسراء الی مقام الاسریٰ" یا ابوالعلاء المعری کا "رسالۃ الغفران" اور انکا مقابلہ دانتے کی نظم سے کیا ہے حصہ دوم میں آخرت کے متعلق دوسرے اسلامی قصص و افسانہ جات کا ذکر ہے اور انکا تشابہ اس نظم سے دکھایا گیا ہے۔ حصہ سوم میں ان افسانوں کا بیان ہے جو یورپ میں تیرھویں صدی کے اواخر میں مشہور تھے اور جنکے متعلق کہا جاتا ہے کہ دانتے نے اپنی نظم کی بنیاد انہیں پر رکھی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ مصنف نے یہ بھی دکھایا ہے کہ ان تمام افسانوں پر اسلامی اثر بہت نمایاں ہے اور حصہ چہارم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ تمام ذخیرۂ اسلامی دانتے کی دسترس سے باہر نہیں تھا بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ اسے انکا علم تھا۔ اور اس نے اپنی بے مثل نظم کی تکمیل میں اس علمی ذخیرہ سے استفادہ بھی کیا۔

واقعہ معراج اور الروایۃ الالہیہ | حصہ اول کے آخر میں اپنے تمام دلائل کو جمع کرتے ہوئے پروفیسر آسن یوں لکھتے ہیں:- "قرآن میں معراج کے متعلق صرف ایک چھوٹی سی آیت ملتی ہے اور وہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے "سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ" اسی آیت کے گرد مسلمانوں کے زرخیز دماغ نے طرح طرح کے فسانے لاکھڑے کئے ہیں اور ایک ہی واقعہ کے متعلق سینکڑوں روایتیں تیار کر رکھی ہیں۔ محدثوں کے یہاں بھی یہ قصہ بہت تفصیل ...

لہ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے اسکا ایک نسخہ برلن کے کسی کتبخانہ میں ہے اور ایک خود پروفیسر آسن کے پاس ہے۔

س تھ موجود ہے اور وہ بالوضاحت تمام ان واقعات کو بیان کرتے ہیں جو رسول عربی پر دوزخ اور
حت کی سیر کے سلسلہ میں گذرے۔ یہ تمام روایات اسلامی دنیا میں نویں صدی عیسوی سے پہلے ایک
ب صورت حاصل کر چکی تھیں۔ دانتے کی نظم کی طرح یہ روایات بھی اسی شخص کی زبان سے نکلتی ہیں
س نے خود سیر کی ہے۔ دونوں سفریات کی تاریکی میں شروع ہوتے ہیں اور ایسے وقت کہ مسافر
ی نیند سے چونکے ہیں۔ ورجل اور دانتے کا تعلق وہی ہے جو جبرئیل اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اور
دونوں راہ نما دوران سفر میں اپنے ساتھیوں کے سوالات کا تشفی بخش جواب دینے کی کوشش کرتے
ہیں جہنم کے قریب ہونیکی علامت دونوں کو یکساں نظر آتی ہے یعنی ایک شور و غل اور تھوڑی تھوڑی
دیر کے بعد شعلوں کی لپک۔ دونوں قصوں میں جہنم کا داروغہ مسافروں کو اسوقت تک داخل ہونے
کی اجازت نہیں دیتا جبتک کہ انکا راہنما اُسے حکم خداوندی نہیں سنا دیتا۔ دانتے کے جہنم کی ساخت
بالکل وہی ہے جو اسلامی روایتوں سے ظاہر ہوتی ہے دونوں کی شکل ایک مخروط معکوس کی
سی ہے اور دونوں کے کئی طبقے ہیں جنہیں سے ہر ایک ایک خاص قسم کے گناہگاروں کے لئے مخصوص
ہے پھر اس کے بعد ہر طبقے کے بھی کئی حصے کئے گئے ہیں جنہیں ایک ہی گناہ کے مرتکب شدت یا خفت
جرم کی بنا پر الگ الگ رکھے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ جرم جتنا شدید ہوتا جاتا ہے دوزخ کی گہرائی
بھی زیادہ اور عذاب کی شدت میں اتنی ہی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ دونوں میں سزا گناہ کی نسبت
سے دی جاتی ہے اور دونوں قصوں میں جہنم کا مقام شہر یروشلم کے نیچے بتایا گیا ہے اس کے علاوہ اکثر
سزائیں بھی دونوں قصوں میں یکساں ہیں مثلاً دانتے کی نظم میں زنا کے مرتکبین کو ایک جہنمی طوفان دم
بدم ادھر ادھر اڑائے پھرتا ہے اور اسلامی قصہ میں انہیں گنہگاروں کو آگ کا ایک زبردست شعلہ کبھی
اوپر اٹھاتا ہے اور کبھی نیچے پٹک دیتا ہے جہنم کے پہلے طبقے کی تصویر بھی دونوں قصوں میں بالکل ایک
سی ہے یعنی آگ کا سمندر اور شعلوں کی موجیں۔ یہاں سود خوار اور دانتے کی نظم میں قتل اور غارتگری
کے مجرم خون کے سمندر میں ایک طرح غوطہ زن نظر آتے ہیں اور قوی ہیکل دیو انکو دیکھتے ہوئے پتھر
سے مارتے ہوتے ہیں۔ دانتے شہوت رانوں اور چوروں کو اسی طرح سانپوں کے منہ میں دیکھتا ہے۔

جس طرح ایک مسلمان ظالموں اور بے ایمان اولیا کو الروایۃ الالٰہیہ میں حیل ساز اسی طرح پیاس سے بیتاب ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس طرح اسلامی قصہ میں شراب خوار اور سب سے بڑھکر دہ سخت ترین عذاب جو دانتے کی نظم میں تفرقہ پردازوں کے لئے رکھا گیا ہے یعنی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جانا اور دوبارہ صرف اسلئے زندہ کیا جانا کہ عذاب پھر شروع ہو مسلمانوں کے یہاں قاتلوں کے واسطے مخصوص ہے

اسلامی قصہ میں جس طرح مسافر اپنے راہبر کے جرات دلانے سے ایک بلند پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے بالکل اسی طرح ورجل کی ہمت افزائی سے دانتے جبل مطہرہ کی چوٹی پر جانے کے لئے راضی ہوتا ہے۔ پھر دونوں بیانات میں ایک ہی طرح استعارات سے کام لیا گیا ہے اور اکثر اوقات ایک ہی قسم کی تلمیحات اور اشارات کا استعمال کیا گیا ہے - مثال کے طور پر اس کریہہ منظر بڑھیا کو لیجئے جو دانتے کو مطہرہ کے چوتھے طبقہ میں ملتی ہے اور اسے راہ راست سے بھٹکانا چاہتی ہے بالکل اسی قسم کی ایک عورت سفر معراج کی ابتدا میں رسول عربی کے سامنے بھی آتی ہے اسکے علاوہ جبرئیل اور ورجل دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے ساتھیوں کو یہی بتاتے ہیں کہ یہ بڑھیا دنیا کی فانی دلفریبیوں اور دلکشیوں کی تصویر ہے پھر مطہرہ اور جنت ارضی کے درمیان دونوں قصوں میں ایک دریا حائل ہے اور دونوں مسافر اسکا پانی پیتے ہیں یہی نہیں بلکہ جس طرح جہنم کی سیر کے بعد دانتے کو تین بار مطہرہ کے دریاؤں میں غسل دیا جاتا ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام گناہ اس کے حافظہ سے دھل جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اسلامی افسانہ کے مطابق روحیں گلشن ابراہیمی کی نہروں میں تین بار نہلائی جاتی ہیں اور جب اس سے برآمد ہوتی ہیں تو انکے چہرے روشن اور دل گناہ کے اثر سے پاک ہوتے ہیں۔ آگے بڑھیئے تو جس طرح معرّی کے خیالی مسافر کو جنت کے دروازہ پر ایک خوبصورت عورت ملتی ہے جو اسکی بڑی آؤبھگت کرتی ہے اور اسکے ساتھ سیر کرتا ہوا ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں ایک چشمہ کے کنارے حوروں کے جھرمٹ میں اسے امرء القیس کی معشوقہ نظر آتی ہے - بالکل اسی طرح دانتے کے سامنے بھی جنت میں داخل ہوتے ہی ایک نازنین میتلڈا نامی نمودار ہوتی ہے جو اسے پھولوں کی سیر کراتی ہوئی ایک نہر کے کنارہ لے جاتی ہے جہاں بیراں با صفا در مہ جبینان خوش ادا کے ایک جلوس کے ساتھ بیٹریس (دانتے

حشوقہ) اس سے ملنے کو آتی ہے

ملأ اعلیٰ کی ساخت بھی دونوں جگہ بالکل یکساں ہے دوران سفر میں دونوں مسافر جا بجا برگزیدہ
وں سے ملاقات کرتے جاتے ہیں لیکن مرکز اصلی ان ارواح کا سماء السموات ہے جہاں پھر ان سب سے
یکجا ملاقات ہوگی۔ آسمان کی نو کرسیاں قرار دی گئی ہیں جنکے نام بھی دونوں جگہ یکساں ہیں یعنی
یں کے نام پر رکھے گئے ہیں بعض اوقات نیک روحوں کی تقسیم بھی انکے اعمال خیر کے مدارج کے لحاظ
ے کی گئی ہے اور انہیں علی قدر مراتب اونچے یا نیچے آسمان پر جگہ ملی ہے۔ معراج کی بعض روایتوں
یں بھی بہشت کی تصویر اسی قدر روحانی ہے جس قدر دانتے کی وہ تصویر جس نے الروایۃ الالٰہیہ کے
حصہ کو عرفانی بنا دیا ہے۔ دونوں جگہ مظاہر خداوندی کے بیان میں الفاظ "نور" اور "نغمہ"
کا استعمال کیا گیا ہے۔ دونوں مسافروں کی آنکھیں ہر قدم پر بڑھتی ہوئی تجلی سے خیرہ ہو جاتی ہے
دینے قابو ہو کر ہاتھ آنکھیں بند کرنے کو اٹھ جاتے ہیں لیکن راہنما کی تسلی اور خدا کی عطا کی ہوئی توفیق
سے انکی ہمت بڑھتی ہے اور پھر اس جمال جہاں آرا کے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں دونوں کئی
دفعہ اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ انکے الفاظ اس جلوہ کی صحیح تصویر کھینچنے سے قاصر ہیں جسے
انکی آنکھوں نے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں مسافر اپنے رہنما کے ساتھ فضا کو اس تیزی سے قطع
رتے ہیں کہ ہوا بھی انکی گرد کو نہیں پاتی۔ پھر دونوں رہنماؤں کے فرائض بھی یکساں ہیں یعنی صرف یہی
نہیں کہ راستہ دکھاتے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ انہیں تسکین بھی دلاتے ہیں۔ انکے لئے خدا سے دعا بھی
رتے جاتے ہیں اور خود انہیں بھی بار بار یہ تاکید کرتے رہتے ہیں کہ اس رحمت خاصہ کا جو اللہ کی طرف سے
ن پر نازل ہوئی ہے شکر ادا کریں۔ پھر آخر میں جس طرح جبریل یہ کہکر پیچھے رہ جاتے ہیں کہ ؎

اگر یک سر موئے برتر پرم — فروغ تجلی بسوزد پرم

ور رفرف رسول عربی کو خاص حریم خداوندی تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح بیٹرس بھی دانتے
و معراج کے آخری مدارج میں اس سے چھوٹ جاتی ہے اور وہ تنہا اگلی منزلیں طے کرتا ہے۔
ر آسمان پر اور جنت کے ہر طبقہ میں مسلمان مسافر کو بھی دانتے کی طرح کوئی نہ کوئی پرانا پیغمبر

ضرور ملتا ہے جس کے گرد اسکی امت کے کچھ لوگ حلقہ باندھے کھڑے ہوتے ہیں اسکے علاوہ ایسے لوگوں سے بھی ملاقات ہوتی ہے جنکا ذکر انجیل میں موجود ہے یا جو اسلامی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں رسالۃ الغفران میں جس طرح جا بجا ہر مذہب و ملت اور ہر طبقہ کے ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو ادبی دنیا میں کسی حیثیت سے ممتاز رہے ہیں۔ انمیں سے اکثر مصنف کے ہم عصر اور ملاقاتی ہیں اور سب کے سب لینے کارناموں کے لحاظ سے مختلف حلقوں میں منقسم ہیں۔ بالکل اسی طرح الروایۃ الہیۃ میں بھی دوزخ اور جنت دونوں جگہ اہل علم کے مختلف دائرے قائم کئے گئے ہیں اور یہی تقسیم ہے جو اس نظم کا مابہ الامتیاز سمجھی جاتی ہے دونوں مصنفوں کے یہاں تعارف کا طریقہ بھی ایک ہی ہے، یا تو مسافر خود کسی مشہور آدمی کے متعلق دریافت کرتا ہے کہ وہ کہاں ملیگا اور اس پر وہ شخص نمودار ہوتا ہے یا یکایک کوئی روح سامنے آتی ہے اور رہنما یا آس پاس کے لوگ اسے مسافر سے ملاتے ہیں دونوں قصوں میں مسافران مشاہیر سے یا تو دینی اور ادبی مسائل پر گفتگو کرتا ہے یا انکی دنیاوی زندگی کا کوئی اہم واقعہ معرض بحث میں آتا ہے۔ سب سے بڑھکر یہ بات کہ دونوں مصنف لوگوں کو دوزخ یا جنت میں جگہ دیتے وقت اکثر فیاضانہ رواداری سے کام لیتے ہیں اور شاذ و نادر ہی تعصب کا قدم درمیان میں آتا ہے دونوں جب کسی روح پر عذاب یا ثواب ہوتے دیکھتے ہیں تو ایک ہی طرح مسرت یا غم کا اظہار کرتے ہیں۔

یہی نہیں کہ دونوں قصوں کا عام خاکہ ملتا جلتا ہے بلکہ دونوں مسافروں کے مشاہدات میں بھی اکثر یکسانیت نظر آتی ہے مثلاً فلک مریخ، میں دانتے کو ایک بہت بڑا عقاب دکھائی دیتا ہے جسکے تمام جسم پر بجز چہروں اور پروں کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ پرندہ اپنے بازوؤں کو پھڑپھڑاتا ہے گیت گاتا ہے کرانسانوں کو حق پرستی کی تعلیم دیتا ہے اور پھر چپ ہو جاتا ہے۔ رسول عربی کو بھی جنت میں ایک فرشتہ ایک عظیم الشان مرغ کی صورت میں نظر آتا ہے جو اپنے پر پھیلا کر لوگوں کو نماز پڑھنے کی تلقین کرتا ہے اور پھر رک جاتا ہے اسکے بعد انہیں ایسے نورانی فرشتے نظر آتے ہیں جنمیں سے ہر ایک کے جسم میں بے شمار چہرے اور پر ہیں اور جو اپنی صدہا زبانوں سے ایک ساتھ خدا کی ستائش میں مشغول ہیں

ان دونوں تصویروں کو ملائے تو دانتے کے "آسمانی عقاب" کا نقشہ پیدا ہو جائیگا آگے بڑھکر دانتے "جل" میں ایک سنہرا زینہ نظر آتا ہے جو آخری آسمان تک پہنچاتا ہے اور جس کے ذریعہ برگزیدہ روحیں اترتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ بٹریس کے کہنے سے دانتے اس زینہ پر چڑھتا ہے اور "آنکھ میچنے میں جتنی دیر لگتی ہے اس سے بھی کم عرصہ میں" اسے طے کر جاتا ہے۔ معراج کی ایک روایت کے مطابق محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی ایک زینہ نظر آتا ہے جو شہر یروشلم سے آسمان کیطرف جاتا ہے جس کے ادہر ادہر فرشتے پرا باندھے کھڑے ہیں۔ اس زینے کے ڈنڈے سونے چاندی اور زمرد کے ہیں اور ان پر چڑھکر روحیں آسمان پر جاتی ہیں جبریل کی رہنمائی میں رسولؐ ایک چشم زدن میں اس پر سے گزر جاتے ہیں۔ افلاک کی بلندی پر پہنچنے کے بعد دونوں مسافروں کو انکے راہنما نیچے دیکھنے کی ہدایت دیتے ہیں اور انہیں یہ دیکھکر سخت حیرت ہوتی ہے کہ عالم بالا کے مقابلہ میں دنیا کیسی چھوٹی سی چیز ہے

ان شہادتوں کی بنا پر جو "مشتے نمونہ از خروارے" یہاں پر بیان کی گئی ہیں حسب ذیل نتیجہ کا نکالنا کچھ غیر مناسب نہ ہوگا۔ اس زمانہ سے جبکہ دانتے کے ذہن میں اس عجیب و غریب نظم کا خاکہ بھی تیار نہ ہوا تھا تقریباً چھ سو برس پہلے اسلام میں رسول عربی کی معراج کے متعلق ایک افسانہ موجود تھا پھر آٹھویں صدی عیسوی سے لیکر تیرھویں صدی تک (جب دانتے پیدا ہوا) مسلمان محدثین اور مفسرین فقہا، صوفیا فلاسفہ اور شعرا اپنی اپنی جگہ پر اس دینی افسانہ کی توسیع اور تزئین میں لگے رہے ایک نے اسکے جزئی واقعات گنائے تو دوسرے نے استعارات اور تلمیحات کی تشریح کی کہیں اسے توسن خیال کیلئے مہمیز کا کام دیا تو کسی کو اسمیں محاکات اور محاضرات کا ایک نمونہ ہاتھ آیا ان انفرادی کوششوں کو ایک جگہ جمع کرکے اگر الروایۃ الالہیہ کے سامنے رکھا جائے تو صرف جزوی مشابہت ہی نہیں بلکہ اکثر کلی مطابقت بھی نظر آئیگی سفر کے مختلف مدارج اور واقعات جنت اور دوزخ کی ساخت اور انکی اخلاقی تقسیم۔ عذاب اور ثواب کی تفصیل تلمیحات اور اشارات مسافر، راہنما اور ملاقاتیوں کے حرکات اور سکنات اور سب سے بڑھکر ادبی قدر و قیمت غرض ہر چیز میں اس قدر یکسانیت اور مطابقت نظر آتی ہے کہ اسے محض اتفاق یا توارد ذہنی پر محمول

نہیں کیا جا سکتا [1]

پہلے حصہ میں واقعہ معراج اور اسکے متعلقات سے عام مشابہت کا ثبوت بہم پہنچانیکے بعد مصنف نے حصہ دوم میں الروایۃ الالہیہ کے پانچوں حصوں کو الگ الگ جانچا ہے اور ہر ایک کے مقابل ایک اسلامی خاکہ بھی پیش کیا ہے چنانچہ Limbo کے مقابل میں "الاعراف" Inferno کے مقابل میں "جہنم" Purgatory کے مقابل میں "الصراط" Earthly + Celestial Paradise کے مقابل میں جنت ارضی وسماوی کو رکھا ہے اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ دانتے کی تصویریں اسلامی نقش ونگار کی بہت حد تک رہین منت ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ دلچسپ اور مفصل بیانات چونکہ جہنم اور جنت ہی کے ہیں اسلئے ہم فی الحال انہیں دونوں پر اکتفا کرینگے۔

جہنم: "دانتے کے مداح ہر زمانہ میں اس بے نظیر تصور کی داد دینے میں رطب اللسان رہے ہیں جس سے اس نے جہنم کی ساخت میں مدد لی ہے۔ تعریف وتوصیف بالکل حق بجانب ہے لیکن اس تصویر کے طبعزاد ہونیکا دعوی اسوقت تک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا جبتک یقینی طور پر ثابت ہو جائے کہ کسی دوسرے مذہب کے افسانوں میں ایسی تصویر موجود نہ تھی اکثر اس کی کوشش بھی کی گئی ہے چنانچہ "واسلر" نے ان تمام کوششوں کو جمع کیا ہے۔ اس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک مذہب نظر انداز کیا گیا ہے اور وہ اسلام ہے حالانکہ اگر اسکی طرف ذرا سی توجہ بھی کی جاتی تو ہزاروں بدیہی مشابہتیں سامنے آجاتیں۔ علاوہ بریں کسی دوسرے مذہب میں عذاب اور ثواب کا بیان اس تفصیل سے نہیں ملتا اس لئے دانتے کے جہنم کا مقابلہ اگر اسلامی جہنم سے کیا جائے تو الروایۃ الالہیہ کے ماخذ کی تعیین کے مسئلہ پر کافی روشنی پڑے گی۔"

---

[1] مصنف نے اس بحث کے سلسلہ میں ایک طرف تو الروایۃ الالہیہ کے مختلف ابواب سے اور دوسری طرف قرآن مجید، بخاری، تفسیر قمی، تذکرۃ القرطبی، منہاج للغزالی، کنز العمال، المعراج الکبیر للغیطی، حاشیہ الدردیر، حیوٰۃ الحیوان للدمیری، فتوحات ابن عربی، رسالۃ الغفران، رسالۃ الطیر لابی سینا اور النظر فی امور الآخرۃ لابن مخلوف سے بہت سے حوالے دئے ہیں جو طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دئے گئے۔

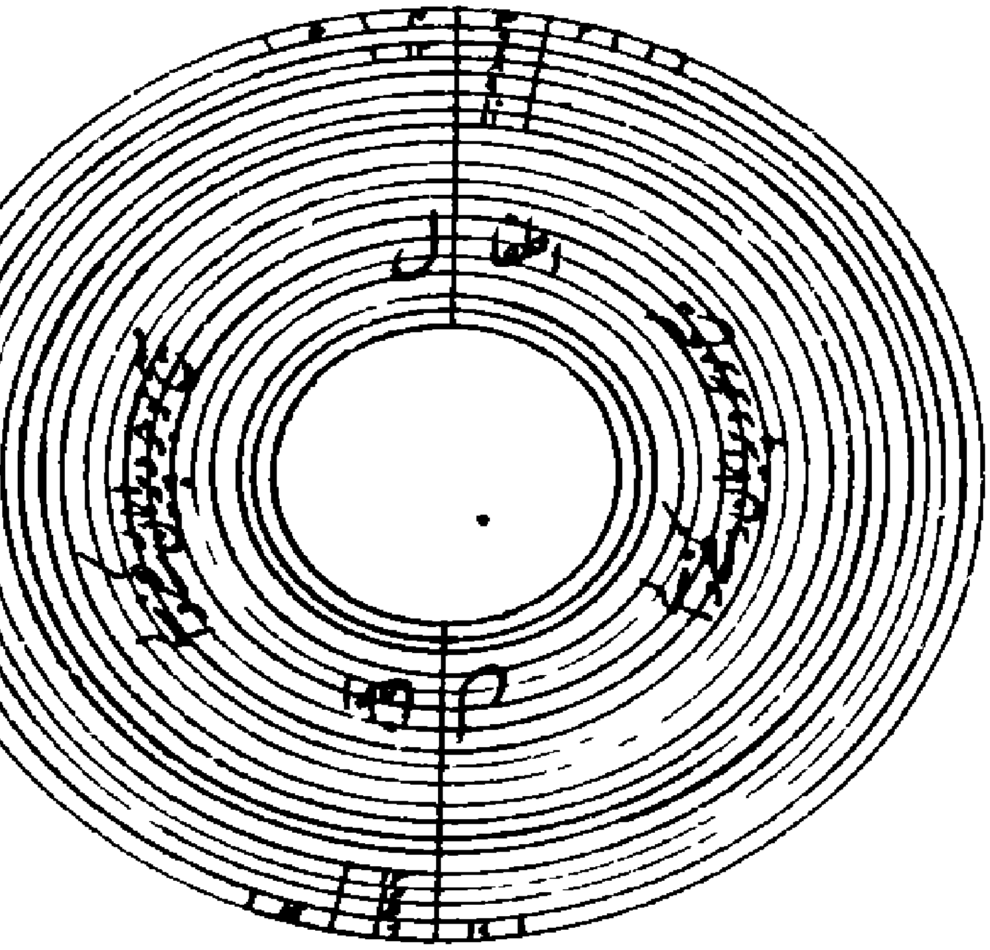
"قرآن سے بالکل پتہ نہیں چلتا ہے کہ جہنم کس جگہ واقع ہے لیکن عام اسلامی روایتیں اسکے زیر زمیں ہونے پر متحد ہیں اور یہی خیال دانتے کا بھی ہے۔ قصوں میں بیان کیا گیا ہے کہ جہنم ایک تیرہ و تار غار ہے جسمیں اگر سطح زمین سے ایک پتھر پھینکا جائے تو اسے تہ تک پہنچنے کے لئے ستر برس کی مدت درکار ہوگی[1] اسی طرح دونوں جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ جہنم کا دروازہ یروشلم میں ہیکل سلیمان کی مشرقی دیوار کے قریب واقع ہے[2] یہی نہیں بلکہ جہنم کی تقسیم بھی ایک ہی طرح مختلف طبقوں میں کی گئی ہے اور ہر ایک کی گہرائی گناہ کی شدت کیساتھ بڑھتی جاتی ہے پھر ہر طبقے کے بھی کئی حصے کئے گئے ہیں جنکے الگ الگ نام ہیں اور ایک حصہ ایک خاص قسم کے گناہگاروں کے لئے مخصوص ہے۔ ابتدائی عہد کے مسلمانوں نے جو خاکہ جہنم کا تیار کیا تھا اسمیں بعد والوں نے بہت سی تفصیلات کا اضافہ کیا خصوصاً صوفیا نے طرح طرح کی جدت طرازی کی ہے اور بعض اوقات ایک نقشہ بنا کر پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے اسمیں سب سے آگے محی الدین ابن عربی ہے جس کی تصنیف کے متعلق دکھایا جا چکا ہے کہ دانتے کی نظم سے کس قدر مشابہت رکھتی ہے۔ فتوحات کے صفحے کے صفحے جہنم کے بیان سے سیاہ کئے گئے ہیں "جو ایک بہت گہرا غار ہے اور سات مدور طبقوں پر منقسم ہے"[3] اس کے علاوہ ابن عربی نے اپنی کتاب میں ایک دائرہ کھینچکر جہنم کی شکل دکھائی ہے اور اسکی تمام تقسیمیں بھی واضح کی ہیں۔ (ملاحظہ ہو شکل نمبر ایک) الروایۃ الالہیہ کے شارحین نے بھی دانتے کے تخیل کی توضیح کیلئے دوزخ اور جنت کے نقشے تیار کئے ہیں چنانچہ ایک نقشہ ابن عربی کے نقشہ سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسمیں جہنم کے دس حصے کئے گئے ہیں اور ابن عربی کے یہاں صرف سات ہیں (ملاحظہ ہو شکل نمبر ۲) اس شکل میں گہرائی کی نسبت بھی دکھائی گئی ہے ابن عربی کے یہاں اگرچہ یہ صاف نہیں ہے لیکن اسلامی جہنم کے عمق کا اندازہ شکل نمبر ۳ سے ہوسکتا ہے جو ترکی انسائیکلوپیڈیا 'معرفت نامہ' سے لیگئی ہے۔ دونوں کی یکسانیت اہل نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔"

---

[1] کنز العمال (۷-۲۴۴) [2] کنز العمال (۶-۱۰۲) اور (۷-۲۷۷)
[3] فتوحات (۳-۵۵۷)

جنت | جہاں تک جنت کی تصویر اور تفصیل کا تعلق ہے بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام اسلامی تخیلات کو اکٹھا کرنے میں ابن عربی سے زیادہ کوئی کامیاب نہیں ہوا ہے۔ فتوحات کے مصنف نے صرف خیالی تزئین اور تصوری آرائش پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ جابجا خاکے اور نقشے بھی شامل کئے ہیں جس کی وجہ سے اس کے خیالات کا صحیح اندازہ آسان ہو گیا ہے اور ہمارے مقصد کے لئے تو یہ بہت ہی مفید ہیں چنانچہ ابن عربی کی جنت کا جو نقشہ فتوحات جلد سوم صفحہ ۵۵۴ سے لیا گیا ہے اور دانتے کی اس جنت کی تصویر جس کی تشبیہ اس نے گلاب سے دی ہے اور جو پوربنا (شارح الروایۃ الالہیہ) کی کتاب میں موجود ہے۔ دونوں کو اگر سامنے رکھئے تو صرف ایک نظر میں آپ یہ معلوم کر لینگے کہ ان دونوں کی یکسانیت اتفاقی نہیں ہے بلکہ اسمیں ارادے کو بھی کوئی دخل ضرور ہے (ملاحظہ ہوں اشکال نمبر ۴ و ۵)

ان تمام تفصیلی مقابلوں اور موازنوں سے (جو اس کتاب کے حصہ دوم میں موجود ہیں لیکن مضمون میں طوالت کے خوف سے صرف اشارۃً مذکور ہیں)۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ



۵

الروایۃ الالٰہیہ کے بہت سے بیانات اور اکثر تفصیلیں جنکی مثالیں ہیں معراج کے بیانات میں ذیل کی تیں اسلامی ادب میں کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہیں خواہ وہ قرآن میں ہوں یا احادیث میں عرب کے عام افسانوں میں ہوں یا فقہا کے عقائد میں۔ فلاسفہ کی تصانیف میں ہوں یا صوفیا کے ملفوظات میں۔

اسلامی مصنفین میں سب سے زیادہ حصہ اس نمونہ کے فراہم کرنے میں جس سے دانتے نے آخرت کی تصویر کھینچنے میں مدد لی ہے، محی الدین ابن عربی کا ہے۔ نہ صرف خاکہ بلکہ حصص کی تقسیم، عذاب و ثواب کی نوعیت۔ مشاہدات اور مناظر کی کیفیت غرض ہر چیز میں الروایۃ الالٰہیہ اور الفتوحات المکیہ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔

تاریخی واقعات کا جہاں تک تعلق ہے وہ یہ ہیں:- تیرہویں صدی عیسوی میں دانتے کی پیدائش سے تقریباً پچیس برس پہلے ابن عربی اپنی ایک تصنیف کے ذریعہ دوسری دنیا کا ایک خاکہ پیش کرتا ہے اور اپنے خیالات کی توضیح کے لئے جابجا نقشے بھی بنا دیتا ہے۔ اسی برس بعد دانتے اپنی نظم میں آخرت کی ایک مکمل شاعرانہ تصویر کھینچتا ہے جس کے خط و خال اتنے واضح ہیں کہ بیسویں صدی کے شارحین اسکو لوح خیال سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ یہ تصویر جو اب دانتے کے شارحین نے بنائی ہے اور وہ نقشہ جو ابن عربی نے سات سو برس پہلے کھینچا تھا دونوں میں اسقدر مطابقت ہے کہ محض اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا اب اگر یہ نظریہ کہ دانتے نے ابن عربی کا نقشہ اپنے سامنے رکھا تھا کسی طرح مسترد بھی کر دیا جائے تو یہ بدیہی مشابہت تو ایک ناقابل حل معمہ ہے یا ایجاد کا ایک محیر العقول معجزہ۔ اب صرف ایک سوال باقی رہجاتا ہے اور وہ یہ کہ کیا درحقیقت اسکا امکان ہے کہ دانتے کو اسلامی ادب سے واقفیت رہی ہو اس مسئلہ پر تین قسم کی شہادتیں پیش کیجا سکتی ہیں (۱) یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عہد وسطی میں مسیحی یورپ نے باہمی تعلقات کی بنا پر مسلمانوں کے مذہب، عقائد، رسم و رواج اور آخرت کے تصور کے متعلق کافی علم حاصل کر لیا تھا۔ (۲) اسکا امکان ہے کہ دانتے نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اسلامی ادب سے اپنی نظم کے لئے مواد حاصل کیا ہو (۳) اسکی

شہادتیں موجود ہیں کہ وہ ادب اسلامی سے شوق رکھتا تھا اور اسکا اثر بھی اس پر پڑا تھا۔ اسلام ان ممالک کی فتح کے بعد جو عرب سے متصل تھے بڑی سرعت کے ساتھ اندلس ۔ جنوبی فرانس ۔ اطالیہ اور سسلی میں پھیل گیا ۔ جنگ کے زمانہ میں بھی دو قومیں بہت جلد ایک دوسرے سے واقف ہو جاتی ہیں اور یہاں تو ایک مدت تک اسلامی اور مسیحی تہذیبیں امن کے ایام میں دوش بدوش رہی ہیں ۔ عرب تجار برابر روس اور شمالی یورپ میں جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی تو فنلینڈ ڈنمارک اور آئسلینڈ تک پہنچ جاتے تھے اسکے علاوہ اندلس اور سسلی میں جو باہمی تعلقات تھے انکا پوچھنا ہی کیا ۔ دانتے کی اسلامی تاریخ سے واقفیت کی صرف ایک دلیل خود الروایۃ الالہیہ سے کافی ہوگی اسنے رسول عربی اور علی کو جہنم کے اس حصہ میں رکھا ہے جو تفرقہ پردازوں کیلئے مخصوص ہے (عیاذاً باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق تو کسی تشریح کی ضرورت نہیں لیکن آخر علی کو انکے ہمراہ کیوں رکھا؟ آجکل اسلامی تاریخ سے عام واقفیت پیدا ہوگئی ہے اور لوگ جانتے ہونگے کہ علی کے تعلق سے خواہ وہ خود اسکو پسند نہ کرتے رہے ہوں اسلام میں ایک بڑا تفرقہ پڑ گیا اور وہ شیعہ سنی کا جھگڑا تھا لیکن اسلامی تاریخ سے ایسی تفصیلی واقفیت جس کا اظہار دانتے نے کیا ہے تیرہویں صدی کی مسیحی دنیا کے لئے کوئی عام بات نہ تھی اسی واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دانتے کا تعلق اسلام سے صرف ادبی حیثیت سے تھا اور مذہب اسلام نے اسپر کچھ بھی اثر نہیں کیا ۔ اسکے علاوہ دانتے کی دوسری تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الفارابی ۔ بوعلی سینا ابن رشد اور غزالی کے فلسفہ سے واقف تھا چنانچہ بعض اوقات اسنے حوالے بھی دئے ہیں اور الروایۃ الالہیہ میں بھی انہیں مطہرہ میں رکھا ہے ۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ دانتے کا استاد برونٹو ایک عرصہ تک اندلس میں رہا تھا اور اسلامی ادب سے کافی واقفیت رکھتا تھا ۔ پھر ایسی حالت میں کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ دانتے نے بھی اپنی بے نظیر نظم کیلئے یہیں سے مواد حاصل کیا ہو ۔ لیکن اس تحقیق کا یہ مطلب کبھی نہیں ہے کہ دانتے کی شہرت میں یا اسکی بے مثل نظم کی قدر و قیمت میں کوئی بٹہ لگے ۔ دانتے ملک اور قومیت کی قیود سے مستغنی ہے اور اسکی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسنے تمام دنیا کے اخلاق اور تصوف کو اپنی نظم میں ایک نرالے انداز سے جمع کر دیا ہے ۔

برسرِکار

ستمبر کی ایک اندھیری شام کو، نو اور دس بجے کے درمیان، ضلع کے ڈاکٹر کریلوف کا چھ سال کا اکلوتا بچہ اینڈری گل سوئی کے عارضے سے مرگیا۔ ڈاکٹر کی بیوی مردہ بچے کے بستر کے کنارے جھکی ہی تھی اور محرومیت کی پہلی یورش تھی کہ اتنے میں دروازے سے زور سے گھنٹی کی آواز آئی۔

مرض چونکہ متعدی تھا، اس لئے تمام نوکر صبح کو باہر بھیج دئے گئے تھے۔ کریلوف جس حالت میں تھا، اسی طرح، کوٹ اتارے، واسکٹ کے بٹن کھولے، بغیر منہ کا پسینہ یا ہاتھوں کو پونچھے جو کاربالک سے جل گئے تھے، دروازہ کھولنے گیا، پھاٹک میں اندھیرا تھا اور نووارد کے میانہ قد، سفید گلوبند، اور نہایت زرد چہرے کے علاوہ، جو اتنا زرد تھا کہ اُس سے پھاٹک کی تاریکی کسی قدر دب گئی تھی، اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب گھر پر ہیں؟"

"جی ہاں۔ فرمائیے؟"

اجنبی نے اطمینان کے لہجہ میں کہا "اچھا آپ ہیں۔ مجھے نہایت خوشی ہوئی" وہ اندھیرے میں ڈاکٹر کا ہاتھ ٹٹولنے لگا، اور اُسے اپنے ہاتھ میں لیکر زور سے دبایا۔ "مجھے نہایت . . . بیحد خوشی ہوئی! ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ میرا نام ابوگن ہے، اور گرمی میں نوحیف کے ہاں آپ سے نیاز حاصل کر چکا ہوں۔ نہایت خوشی ہوئی کہ آپ گھر پر مل گئے . . . خدا کے لیے، میرے ساتھ تشریف لے چلئے . . . میری بیوی یک لخت سخت بیمار ہو گئی . . . گاڑی کھڑی ہے"

بولنے والے کی آواز اور حرکات و سکنات سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھبراہٹ کی حالت میں ہے اُس آدمی کی طرح جو جلتے ہوئے مکان یا پاگل کتے سے خوف زدہ ہو، وہ ہانپ رہا تھا اور اُسکا سانس مشکل اس کے قابو میں تھا، وہ تیز تیز کانپتی ہوئی آواز سے بول رہا تھا، اور اُس کے لہجے میں غیر مصنوعی خلوص اور طفلانہ اندیشہ تھا، خائف اور حواس باختہ لوگوں کی طرح، چھوٹے،

شکستہ فقروں میں بات کر رہا تھا، اور بہت سے غیر ضروری، غیر متعلق الفاظ اس کی زبان سے نکل رہے تھے۔

"مجھے خوف تھا کہ شاید آپ نہ ملیں یہاں آتے وقت میں ضیق کے عالم میں تھا، کپڑے پہن لیجئے اور خدا کے واسطے تشریف لے چلئے۔ ہوا یہ کہ الیکسانڈر سیمیونووچ پیپ چنسکی، جسے آپ جانتے ہیں، مجھ سے ملنے آیا... ہم کچھ دیر باتیں کر کے چائے پینے بیٹھے ہی تھے، کہ دفعتہً میری بیوی نے چیخ ماری، اپنا سینہ کھسوٹنے لگی، اور کرسی پر گر پڑی۔ ہم نے اُسے پلنگ پر لٹایا اور... میں نے اس کی پیشانی پر امونیا ملا اور پانی چھڑکا... وہ اس طرح لیٹی رہی جیسے مردہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اُسے اینورزم ہے... تشریف لے چلئے... اُس کے والد کا بھی اینورزم سے انتقال ہوا تھا۔"

کریلوف چپ چاپ سنتا رہا، گویا روسی زبان سے نا واقف ہو۔

جب ابوگن نے پیپ چنسکی اور اپنی بیوی کا دوبارہ نام لیا اور پھر اندھیرے میں ڈاکٹر کا ہاتھ ٹٹولنے لگا تو اُس نے سر ہلایا اور افسردگی سے بدقت تمام یہ الفاظ ادا کئے۔

"معاف فرمائیے، میں نہیں جا سکتا۔ میرا لڑکا مر گیا... پانچ منٹ ہوئے!"

ابوگن نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر آہستہ سے کہا "واقعی! خدایا کیسے برے وقت پہنچا ہوں، نہایت نحس دن ہے۔ عجب اتفاق ہے۔ گویا قصداً ہوا ہے!"

ابوگن نے دروازہ کا دستہ پکڑا اور سر جھکا لیا۔ وہ صریحاً شش و پنج میں تھا، کہ کیا کرے۔ واپس چلا جائے یا ٹھیر کر پھر ڈاکٹر کی منت سماجت کرے۔

پھر ڈاکٹر کی آستین پکڑ کر اُس نے جوش کے ساتھ کہا "سنئے مجھے آپ کی حالت کا اچھی طرح اندازہ ہے! خدا شاہد ہے، ایسے موقع پر مخل ہونے سے مجھے کتنی شرمندگی ہے، مگر کیا کروں؟ خود ہی فرمائیے، کس کے پاس جاؤں؟ آپ جانتے ہیں، یہاں کوئی اور ڈاکٹر نہیں ہے برائے خدا چلئے! میں اپنے لئے نہیں کہتا... مریض میں نہیں ہوں!"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ کریلوف نے ابوگن کی طرف سے پیٹھ پھیر لی، لمحہ بھر ساکت کھڑا رہا، پھر آہستہ سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔ اس کی لڑکھڑاتی ہوئی، کھوئی ہوئی چال سے، ڈرائنگ روم کے یہ جلتے لیمپ کی ملائم جھالر کو احتیاط سے درست کرنے سے، اور میز پر جو کتاب رکھی تھی، اُس پر نظر یہ کارے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس وقت اُس کے دل میں نہ کوئی ارادہ ہے، نہ خواہش، نہ کسی بات کا خیال ہے۔ اور نہ غالباً یہ دھیان ہے کہ پھاٹک میں ایک اجنبی کھڑا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ڈرائنگ روم کے دھندلکے اور خاموشی سے اُس کی بے حسی بڑھ گئی ہے۔ وہاں سے اپنے مطالعہ کے کمرہ میں جاتے ہوئے اُس نے سیدھا پاؤں ضرورت سے زیادہ اٹھایا، اور ہاتھوں سے دروازے کو ٹٹولتے وقت اس کے وجود سے ایسی حیرانی ٹپک رہی تھی جیسے وہ کسی اور کے گھر میں ہے، یا عمر میں پہلی بار شراب سے مست ہوا ہے اور متعجب ہو کر نشہ کی ترنگ کے چٹخارے لے رہا ہے۔ مطالعہ کے کمرے کی دیوار پر کتابوں کی الماری پر سے ہوتی ہوئی، روشنی کی ایک چوڑی لکیر پڑی تھی، یہ روشنی کاربالک ایسڈ اور ایتھر کی کثیف، بھبک دار بو سے ملتی تھی جو خوابگاہ کے نیم وا دروازہ سے آرہی تھی۔ ڈاکٹر میز کے آگے جو نیچی کرسی رکھی تھی، اُس پر گر پڑا، منٹ بھر اپنی کتابوں کو جن پر روشنی پڑ رہی تھی، نیند بھری نظروں سے گھورتا رہا، پھر اُٹھا اور خوابگاہ میں چلا گیا۔

یہاں خوابگاہ میں مکمل سکوت تھا، ہر چیز سرتاسر اُس طوفان، اُس تھکن کا پتہ دیتی تھی جسے حال ہی میں دور کیا گیا تھا، اور ہر چیز ساکن تھی۔ بوتلوں کے ہجوم میں ایک موم بتی، بہت سے بکس، اسٹول پیالے پیالیاں، اور خانے دار الماری پر رکھا ہوا ایک بڑا لیمپ پورے کمرہ پر تیز روشنی ڈال رہا تھا۔ کھڑکی کے قریب پلنگ پر ایک لڑکا لیٹا تھا جس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور چہرے سے حیرت برستی تھی وہ بے حس و حرکت تھا، مگر معلوم ہوتا تھا کہ اسکی کھلی ہوئی آنکھیں ہر آن تاریک تر ہوتی اور اُس کے سر میں گھستی جاتی ہیں، ماں پلنگ کے کنارے اُس کے جسم سے لپٹی ہوئی، بچھونے میں سر چھپائے جھکی ہوئی تھی۔ بچے کی طرح وہ بھی بے حس و حرکت تھی، مگر اُس کے جسم کے خطوط سے اور بازوؤں سے زندگی کس طرح پھٹی پڑتی تھی! اُسکا پورا وجود پلنگ کے سہارے پوری طاقت سے حریصانہ چمٹا ہوا

تھا، گویا وہ ڈرتی تھی کہ کہیں اُس پُرسکون او با آرام طرزِ نشست میں خلل نہ پڑجائے جو بالآخر اُس کے جسم نے اختیار کرلیا تھا، بچھونا جیتھڑے اور طشت، فرش پر پانی کے چھینٹے، ادھر اُدھر بکھرے ہوئے چھوٹے برش اور چمچے، لیموں کے عرق کی سفید بوتل، یہاں تک کہ کثیف ہوا جس سے دم گھٹتا تھا سب پر سناٹا تھا اور سب سکوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر اپنی بیوی کے پاس آکر کھڑا ہوا، ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے، اور گردن ایک طرف کو جھکا کے آنکھیں اپنے بیٹے پر گاڑیں، اُس کے چہرے سے بے رُخی نمایاں تھی، اور صرف اُن قطروں سے جو اُس کی داڑھی میں جھلک رہے تھے، یہ اندازہ ہوسکتا تھا کہ وہ ابھی رو رہا تھا۔

کمرہ اُس دہشت سے خالی تھا جس کا خیال موت کے ساتھ وابستہ ہے ہر چیز کی بے حسی میں، ماں کے طرزِ نشست میں، ڈاکٹر کے چہرے کی بے رخی میں ایک خاص بات تھی جو دل کو کھینچتی اور متاثر کرتی تھی۔ انسانی غم کا وہ حسن پراں جسے عرصہ تک انسان نہ سمجھ سکیگا، نہ بیان کرسکے گا، اور جسے صرف موسیقی ادا کرسکتی ہے۔ یہ جمود سکون میں بھی حسن کا رنگ جھلکتا تھا۔ کریلوف اور اُس کی بیوی چپ تھے اور رو نہیں رہے تھے، گویا اپنے صدمے کی تلخی کے پہلو بہ پہلو انہیں اپنی حالت کی المیت کا بھی احساس ہو، جیسے اُنکی جوانی ڈھل چکی تھی، بالکل اسی طرح اس بچے کے ساتھ اُنکے صاحبِ اولاد ہونے کا حق بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا تھا! ڈاکٹر کی عمر چوالیس سال تھی، اُس کے بال سفید تھے اور وہ بڈھا معلوم ہوتا تھا، اُسکی پژمردہ اور دائم المرض بیوی پینتیس سال کی تھی۔ اینڈری ان کا نہ صرف اکلوتا، بلکہ آخری بچہ تھا۔

برخلاف اپنی بیوی کے، ڈاکٹر اُن لوگوں میں سے تھا کہ جو کسی روحانی صدمے کی حالت میں حرکت کے طالب ہوتے ہیں، پانچ منٹ تک اپنی بیوی کے پاس کھڑے رہ کر وہ خوابگاہ سے سیدھے لمبے قدم اٹھاتا ہوا ایک چھوٹے کمرے کی طرف چلا جو سوفا سے آدھا بھرا ہوا تھا، وہاں سے باورچی خانے گیا۔ آتش دان اور باورچی کے پلنگ کے قریب ٹہلنے کے بعد جھکا اور ایک چھوٹے دروازے سے پھاٹک میں پہنچا۔

وہاں اُسے پھر وہی سفید گلوبند اور زرد چہرہ دکھائی دیا۔
،بوگن نے دروازے کے دستے کیطرف بڑھ کر آہ بھری" خدا خدا کرکے آپ تشریف لائے۔
ہے تشریف لے چلیے"
ڈاکٹر ٹھٹکا، اُس پر نظر ڈالی اور حافظے پر زور دے کر کچھ سوچا، پھر شدید تر لہجے میں کہا۔
میں آپ سے کہہ تو چکا میں نہیں چل سکتا! کیسے تعجب کی بات ہے!"
ابوگن نے اپنا ہاتھ گلوبند پر رکھ کر ایک انداز التجا سے کہا" ڈاکٹر صاحب، میں پتھر نہیں ہوں
ہے کیفیت بخوبی محسوس کر رہا ہوں، آپ کے صدمے میں شریک ہوں، مگر میں آپ سے اپنے لئے
یں کہتا میری بیوی جاں بلب ہے۔ اگر آپ نے وہ چیخ سنی ہوتی، اگر آپ نے اُسکا چہرہ دیکھا ہوتا تو آپ
ہے اصرار کی حقیقت سمجھ جاتے۔ یا اللہ میں تو سمجھتا تھا آپ تیار ہونے گئے ہیں! ڈاکٹر صاحب وقت
یتی ہے برائے خدا تشریف لے چلیے!"
ڈاکٹر نے سختی سے کہا" میں نہیں جا سکتا" اور ڈرائنگ روم کیطرف قدم اٹھایا۔
ابوگن اُس کے پیچھے بڑھا اور اُسکی آستین پکڑ لی۔
"آپ کو صدمہ ہے، میں جانتا ہوں مگر میں آپ کو دانتوں کے درد کے علاج یا محض شورے
کے لئے نہیں بلاتا، ایک انسانی جان بچانے کو بلاتا ہوں" اسے برابر سائلانہ انداز سے گڑگڑا رہے گیا
زندگی ذاتی صدمے پر مقدم ہے! میں آپ سے ہمت اپنا ر طلب کرتا ہوں! برائے انسانیت!"
کرلوف نے جھلا کر کہا" برائے انسانیت اس کے تو دو پہلو ہیں۔ برائے انسانیت میں آپ
سے درخواست کرتا ہوں مجھے نہ لے جائیے۔ اور واقعی کیا مزے کی بات ہے! مجھ سے کھڑا تک نہیں ہوا
جاتا، اور آپ مجھے انسانیت کا واسطہ دیتے ہیں! فی الحال میں کسی کام کے قابل نہیں ہوں میں
ہرگز نہیں جاؤں گا، اپنی بیوی کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا، نہیں ہرگز نہیں۔"
کرلوف نے بازو ہلائے، پیچھے کیطرف لڑکھڑایا، پھر خوف آمیز لہجے میں کہا۔
"اور اور مجھ سے نہ کہئے۔ مجھے معاف کیجئے۔ قانون نمبر ۱۳ کی رو سے میں جانے پر مجبور

ہوں اور آپ مجھے گردن پکڑ کر لیجا سکتے ہیں ۔ اگر آپ چاہیں تو زبردستی لے جا سکتے ہیں، لیکن . . میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے . . مجھ سے بولا تک نہیں جاتا . . مجھے معاف کیجیے . .''

ابوگن نے پھر ڈاکٹر کی آستین پکڑ کر کہا، ''ڈاکٹر صاحب، اس پہلو سے گفتگو نہ کیجیے، مجھے مرنے سے کیا! آپ کی مرضی کے خلاف آپ کو مجبور کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں، اگر آپ کا جی چاہے تو چلیے، چاہے تو خدا آپکا بھلا کرے، مگر میرا خطاب آپکے ارادہ سے نہیں، آپکے جذبات سے ہے۔ ایک تو جوان عورت جاں بلب ہے۔ ابھی آپ اپنے بیٹے کی موت کا ذکر کر رہے تھے، آپ سے زیادہ میری پریشانی کو اور کون سمجھ سکتا ہے؟''

ابوگن کی آواز میں رقت کے مارے لرزہ تھا، اس لرزہ اور اس کے لہجے نے اس کے لفظوں سے زیادہ کام کیا۔ ابوگن کی باتیں دل سے نکل رہی تھیں مگر عجیب بات ہے۔ وہ جو کچھ کہتا تھا، اس کے الفاظ اکھڑے اکھڑے، بے روح اور ناموزوں طور پر مرصع معلوم ہوتے تھے، بلکہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ اُن سے ڈاکٹر کے گھر کی فضا کی اور اس عورت کی جو جاں بلب تھی، بے حرمتی ہو رہی ہے، اُسے خود اسکا احساس تھا، چنانچہ اس خوف سے کہ شاید اُسکا مطلب سمجھ میں نہ آئے، وہ پوری کوشش کر تھا کہ اپنی آواز میں نرمی اور تاثیر کوٹ کوٹ کر بھر دے تاکہ اس کی باتوں کا نہیں تو کم از کم اس کے لہجے کا خلوص اثر کر جائے، عموماً، خواہ کوئی فقرہ کسی قدر سلیس اور خلوص بھرا ہو، اس کا اثر صرف غیر متعلق لوگوں پر پڑتا ہے، انہیں پوری طرح تسکین نہیں بخشتا جو مسرور یا مغموم ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بے زبانی اکثر خوشی یا غم کا بلند ترین طرز ادا ہوتی ہے، چاہنے والے ایک دوسرے کا مطلب خاموشی کے عالم میں زیادہ ہیں، اور لب گور پر جوش ستائشی تقریر کا صرف غیروں پر اثر پڑتا ہے، مرحوم کی بیوہ اور بچوں کو وہ بارد اور خفیف معلوم ہوتی ہے۔

کریلوف چپ چاپ کھڑا تھا۔ ابوگن نے چند اور جملے ڈاکٹری کے تعریف پیشے اور ایثار وغیرہ کے متعلق کہے، تو اس نے بگڑ کر پوچھا۔ ''دور جانا ہے؟''

''آٹھ نو میل کے قریب۔ میرے گھوڑے خوب قوی ہیں! قسمیہ وعدہ کرتا ہوں گھنٹہ بھر

میں آپ کو واپس پہنچا دوں گا۔ صرف گھنٹہ بھر میں۔"

ان لفظوں کا اثر جذبۂ انسانیت یا ڈاکٹری کے شریف پیشے کو متحرک کرنے سے زیادہ ہوا۔ اُس نے تھوڑی دیر سوچا اور آہ بھر کر کہا "بہت اچھا، چلیئے!"

پھر جلدی سے، پہلے کی بنسبت قدم زیادہ سنبھالے ہوئے، اپنے مطالعہ کے کمرے میں گیا اور ایک لمبا فراک کوٹ پہنکر واپس آیا۔ ابوگن نے پریشانی دور ہونے پر، اُس کے چاروں طرف چکر کاٹنے شروع کئے اور اوورکوٹ پہناتے وقت اُسکا پاؤں کچل دیا، اور اُس کے ساتھ گھر سے نکلا۔

باہر اندھیرا تھا، گو ہال تک سے کم۔ ڈاکٹر کا قدآور جھکا ہوا جسم اُس کی لمبی، پتلی داڑھی اور ستواں ناک اندھیرے میں صاف نمایاں تھے۔ ابوگن کا بڑا سر اور چھوٹی طالبعلموں کی وضع کی ٹوپی جس سے وہ بمشکل ڈھکا ہوا تھا، اور اسکا زرد چہرہ اب اچھی طرح دکھاتی دیتے تھے۔ گلوبند صرف سامنے سے سفید نظر آتا تھا، پیچھے سے اُس کے لمبے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔

ابوگن نے منہ ہی منہ میں، ڈاکٹر کو گاڑی میں چڑھاتے وقت کہا "یقین مانئے، میں آپ کے ایثار کی تہ دل سے قدر کرتا ہوں۔ ابھی پہنچے جاتے ہیں لوکا، جتنا تیز ہو سکے چلاؤ، شاباش!"

کوچوان نے گاڑی تیزی سے چلائی۔ پہلے دھندلی عمارتوں کی قطار نظر آئی جو ہسپتال کے صحن کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھیں۔ سوائے ایک تیز روشنی کے جو ایک کھڑکی میں سے صحن کے حصہ کو روشن کر رہی تھی، ہر طرف اندھیرا تھا، اور ہسپتال کی بالائی منزل کی تین کھڑکیاں گرد و پیش کی فضا سے بھی زیادہ دھندلی تھیں۔ اسکے بعد گاڑی گھنی تاریکی میں گھسی، یہاں رطوبت اور سانپ کی چھتری کی بو اور درختوں کی سرسراہٹ پھیلی ہوئی تھی، کوؤں نے جو پہیوں کی آواز سے جاگ گئے تھے، اپنے بسیروں میں دکھ بھری کائیں کائیں شروع کی، گویا انہیں علم ہے کہ ڈاکٹر کا لڑکا مر گیا اور ابوگن کی بیوی بیمار ہے۔ پھر الگ الگ درختوں کی جھاڑیوں کی جھلک دکھائی دینی شروع ہوئی ایک تالاب، جس پر سیاہ سائے خوابیدہ تھے، ڈراؤنی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اور گاڑی

صاف ہموار زمین پر سے گزر رہی تھی۔ کووں کی چیخیں بہت دور سے دھیمی دھیمی آ رہی تھیں اور تھوڑی دیر میں آنی بند ہو گئیں۔

کم و بیش تمام راستہ کریلوف اور رابوگن چپ رہے۔ صرف ایک مرتبہ رابوگن نے ٹھنڈا سانس بھرا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔

"کرب کی سی کیفیت ہے! انسان کو ان لوگوں سے جو اُس کے پاس ہوتے ہیں، اُس وقت سے زیادہ کبھی محبت نہیں ہوتی جب اُن سے جدائی کا احتمال ہونے لگتا ہے۔"

اور جب گاڑی آہستہ آہستہ دریا پر سے گزر رہی تھی، تو کریلوف دفعتاً اس طرح ٹھٹکا جیسے پانی کے تھپیڑوں سے ڈر گیا، اپنی جگہ سے ہلا اور درد آگیں لہجے میں بولا۔

"سنیے مجھے جانے دیجئے۔ ٹھہر کر آپکے یہاں آجاؤں گا اپنے مددگار کو اپنی بیوی کے پاس بھیج آؤں۔ آپ کو معلوم ہے وہ اکیلی ہے!"

ابوگن چپ رہا۔ گاڑی کبھی ادھر کبھی اُدھر جھکتی ہوئی اور پتھروں پر سے کھڑکھڑاتی ہوئی دریا کے کنارے کنارے جا رہی تھی۔ کریلوف بے چین تھا اور چاروں طرف بیزارانہ نظریں ڈال رہا تھا ان کے پیچھے تاروں کی مدہم روشنی میں، سڑک اور ساحل کے کنارے بید کے درخت اندھیرے میں غائب ہوتے دکھائی دیتے تھے۔

دائیں جانب، آسمان کی طرح یک رنگ اور اسی قدر نامحدود، ایک میدان پڑا تھا، کہیں کہیں فاصلے پر، غالباً گھاس کی دلدلوں میں مدہم روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ بائیں طرف، سڑک کے متوازی ایک پہاڑی چلی گئی تھی جس پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، اور پہاڑوں کے اوپر، کہر کے نقاب میں ننھے ننھے بادلوں سے گھرا ہوا، سرخ چاند ساکن کھڑا تھا، اور بادل ہر سمت سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے اور نگہبانی کر رہے تھے کہ بھاگنے نہ پائے۔

تمام قدرت پر حرمان اور درد کا احساس چھایا ہوا تھا۔ زمین اُس غم نصیب عورت کی طرح جو کسی تاریک کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوئی گذرے ہوئے زمانے کا خیال دل سے بھلاتی ہو، بہار اور

ا ی کی کیفیتوں پر غور اور رائل جاڑے کا بے حسی سے انتظار کر رہی تھی۔ ہر طرف جدھر نظر جاتی تھی قدرت
ایک رنگ، اتھاہ سرد گڑھے کی طرح معلوم ہوتی تھی جس سے نہ کریلوف بچ سکتا تھا نہ ابوگن نہ سرخ چاند
گاڑی جتنی منزل مقصود کے قریب پہنچتی جاتی تھی، ابوگن کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا وہ برابر جنبش
کرتا اور پیچھے جاتا تھا، کوچوان کے سر پر سے دیکھے جاتا تھا۔ جب گاڑی مکان کے دروازے کے آگے
رکی اس پر دھاری دار کپڑے کا نفیس پردہ پڑا ہوا تھا۔ اور اس کی نظر دوسری منزل کی روشن کھڑکیوں
پر پڑی، تو وہ دم بخود ہو کے رہ گیا۔

ڈاکٹر کے ساتھ ہال میں جاتے ہوئے، گھبراہٹ سے ہاتھ مل کر اس نے کہا، "اگر کوئی حادثہ
ہو گیا تو میں جاں بر نہ ہو سکوں گا۔ مگر کوئی ہنگامہ نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک
جیتی ہے۔" یہ کہکر اس نے سناٹے میں کان لگائے۔

ہال میں نہ قدموں کی آہٹ تھی نہ بولنے کی آواز، اور باوجود اس کے کہ کھڑکیوں میں روشنی
تھی معلوم ہوتا تھا کہ پورا مکان سو رہا ہے اب ڈاکٹر اور ابوگن جو اس وقت تک اندھیرے میں تھا
ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ ڈاکٹر کشیدہ قامت اور جھکا ہوا تھا، اس کے کپڑوں سے
نادار رستا تھا۔ اور اس کی صورت اچھی نہ تھی۔ اس کے ہونٹوں سے جو حبشیوں کی طرح موٹے
موٹے تھے، اس کی ستواں ناک اور بے توجہ بے حس آنکھوں سے ناخوشگوار درشتی، ترشی اور
بے رحمی ٹپکتی تھی۔

اسکے پریشان بال اور پچکی ہوئی پیشانی، اسکی لمبی، چوڑی داڑھی کی قبل از وقت سفیدی
جس میں سے اس کی ٹھوڑی نظر آتی تھی، اسکی جلد کا زردی مائل خاکی رنگ، اور اس کے بے پروایانہ
طور اوضاع و اطوار۔ ان سب کی درشتی سے سالہا سال کی غربت کا حرماں نصیبی کا، زندگی اور انسانوں
سے بے زاری کا پتہ چلتا تھا۔ اس کی بار دشکل کو دیکھ کر مشکل یقین آتا تھا کہ اس شخص کے بیوی ہے اور
یہ اپنے بچے کی موت پر آنسو بہا سکتا ہے۔ ابوگن کی شکل اس سے بہت مختلف تھی، وہ گٹھا ہوا، قوی الجثہ
تھا، بڑے سر والا اور بڑے خط و خال کا آدمی تھا اور تازہ ترین قطع کے کپڑے پہنے ہوئے تھا،

اُس کی گاڑی، اُس کے چست کوٹ، اس کے لمبے بالوں، اور اُسکے چہرہ سے ایک خاص قسم کی دریالی، ایک گونہ شہرت کا انداز ٹپکتا تھا، وہ سر اٹھا کر اور سینہ نکال کے چلتا تھا، خوش گوار لہجے میں گفتگو کرتا تھا اور جس انداز سے اپنا گلوبند اُتارتا اور بالوں کو درست کرتا تھا، اُس میں شائستہ بلکہ نسوانی تکلف کا رنگ جھلکتا تھا۔ اُس کی زرد روئی سے اور اُس طفلانہ دہشت سے جو کوٹ اُتارتے وقت، زینے کے اوپر دیکھتے ہوئے، اُس کے چہرہ پر نمایاں تھی، نہ اُسکا وقار زائل ہوتا تھا اور نہ اُس کے چکیلے پن، تونمندی اور عمدہ وضع میں کمی آتی تھی جو اُس کے وجود کی خصوصیت تھی۔

سیڑھیوں پر چڑھتے وقت اُس نے کہا "نہ کوئی انسان ہے، نہ آواز، نہ ہنگامہ، خدا کرے خیریت ہو!"

وہ ڈاکٹر کو ہال میں سے ایک بڑے ڈرائنگ روم میں لے گیا، جہاں ایک سیاہ پیانو اور سفید غلاف میں ایک جھاڑ رکھا ہوا تھا، وہاں سے وہ دونوں ایک نہایت پرتکلف چھوٹے سے خوش وضع ڈرائنگ روم میں پہنچے جس میں خوشگوار دھیمی گلابی روشنی پڑ رہی تھی۔

"آپ یہاں تشریف رکھئے، اور میں . . . ابھی آتا ہوں، ذرا جا کر دیکھوں اور انہیں تیار کر دوں۔ "

کریلوف اکیلا رہ گیا، ڈرائنگ روم کی آراستگی، خوشگوار دھیمی روشنی، ایک انجان کے مکان میں اُس کی موجودگی جس میں ایک افسانے کا رنگ پیدا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان باتوں سے متاثر نہیں ہے۔ ایک نیچی کرسی پر بیٹھا ہوا وہ اپنے ہاتھوں کا جائزہ لے رہا تھا جو کاربالک سے جلے ہوئے تھے۔ گہرے سرخ شمع پوش اور رباب کے خانے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی، اور جدھر گھنٹہ ٹک ٹک کر رہا تھا، اُدھر نظر ڈالی تو ایک ابوگن کا سا بھاری بھرکم اور چکیلا بھیڑیا دکھلائی دیا۔

ہر طرف سکوت تھا . . . کچھ دور پر کسی متصل کمرہ میں کسی نے بلند آواز سے آہ بھری تیتے کے دروازے کھلنے کی آواز آئی جو غالباً توشہ خانے کے تھے۔ اور پھر خاموشی چھا گئی، پانچ منٹ انتظار کرنے کے بعد کریلوف نے اپنے ہاتھوں کا جائزہ لینا چھوڑ دیا اور جس دروازے سے

وگن غائب ہوا تھا ادہر نظر دوڑائی ۔

دروازہ میں ابوگن کھڑا تھا مگر اب اس کی حالت پہلے سے بہت مختلف تھی چمکیلا پن اور شائستہ ... کا رنگ جا تا رہا تھا ۔ اُسکا چہرہ اُس کے ہاتھ اس کی وضع قطع سب ایک ایسے بدقوارہ انداز ... ہو گئے تھے جیسیں دہشت اور شدید جسمانی درد دونوں کی آمیزش تھی ۔ اُسکی ناک ، اُس کے ... ہونٹ ، اُس کے سب خط و خال پر رعشہ تھا ، اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب اُس کے چہرے سے زبردستی ... نوچ رہے ہیں ، اُسکی آنکھیں کرب سے ہنستی نظر آتی تھیں ۔

... وگن نے ڈرائنگ روم کیطرف آہستہ سے قدم اٹھایا ، آگے جھکا ، آہ کھینچی ، اور مٹھی بند کرکے ... ہوکا " کے دوسرے حصے پر زور دیکر چیخا " اُس نے مجھے دہوکا دیا دہوکا دیا ، بھاگ گئی تو ... گئی اور مجھے ڈاکٹر کے لیئے بھیجدیا ! تاکہ اُس مسخرے بیہ جنکی کے ساتھ فرار ہو جائے ! یا اللہ !

... لوگن ڈاکٹر کی طرف بڑھا ، اپنی ملائم سفید ہتیلیاں چہرے پر رکھ لیں ، اور انہیں مل مل کے ... چِلّا یا ۔ " بھاگ گئی !! مجھے دہوکا دیا ! آخر یہ دہوکا کیوں ؟ یا میرے اللہ ، یا میرے اللہ ! اس ... چال ، اس شیطانی بہانے کی کیا ضرورت تھی ! میں لے اُس کے ساتھ کیا کیا ؟ بھاگ گئی ! "

آنسو اُس کی آنکھوں سے جاری ہو گئے ۔ ایک پاؤں سے مڑا اور کمرے میں ٹہلنے لگا ، اب ... چھوٹے کوٹ ، قطع دار چُست پتلون (جس سے اُس کی ٹانگیں نامناسب طور پر پتلی معلوم ہوتی تھیں) اور ... بڑے سر اور لمبے ایال کی وجہ سے وہ شیر ببر سے بہت مشابہ تھا ۔ ڈاکٹر کے بے حس چہرے میں ... سی جھلک پیدا ہوئی ۔ وہ اٹھا اور ابوگن کو دیکھنے لگا ۔

" معاف کیجیے گا ، بیمار کہاں ہے ؟ "

" بیمار ! بیمار ! " ہنس کر ، چیخ کر ، مٹھی بھینچ کے ، ابوگن نے زور سے جواب دیا " وہ ... نہیں ہوں ہے کمینی ! ذلیل ! شیطان کے ذہن میں بھی اس سے زیادہ ذلیل حرکت ... نہیں آسکتی ! مجھے چلتا کیا تاکہ ایک مسخرے ، فاترالعقل نقال کے ساتھ بھاگ جائے ! کاش وہ مر گئی ... ہوتی ! میں یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکتا ! کبھی نہیں کر سکتا ! "

ڈاکٹر تن کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں جھپکائیں اور اُس میں آنسو ڈبڈبا آئے اُس کی تھوڑی
ڈاڑھی کانپنے لگی۔ پھر چاروں طرف تجسس آمیز نظر ڈال کے پوچھا۔

" یہ تو فرمائیے آخر اسکا مطلب کیا ہے؟ میرا بچہ مرا پڑا ہے، میری بیوی پورے مکان میں تنہا
ماتم میں ہے خود مجھسے کھڑا نہیں ہوا جاتا، میں نے تین راتیں جاگ جاگ کر کاٹی ہیں اور
یہاں مجھے مجبور کیا جا رہا ہے کہ ایک بازاری تماشہ میں حصہ لوں! میں بالکل نہیں مطلق نہیں سمجھا
کہ ماجرا کیا ہے!"

ابوگن نے ایک مٹھی کھولی، فرش پر ایک مسلا ہوا رجہ پھینکا، اور اُسے اس طرح کچلا گویا وہ
کوئی کیڑا ہے جسے وہ مارنا چاہتا ہے، اور دانت پیس کر، ایک گھونسا اپنے چہرے کے آگے تان کر کہا
" میں نے نہ دیکھا نہ سمجھا مجھے یہ نہیں سوجھا کہ وہ روز آتا ہے! یہ نہ سوجھا کہ آج سڈگاڑی
میں آیا تھا! بندگاڑی میں کیوں آیا تھا؟ میں اُس وقت بھی نہ سمجھا۔ احمق کہیں کا!"

ڈاکٹر بڑبڑایا " میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، اسکا مطلب کیا ہے؟ یہ تو شخصی وقار کی بے حرمتی
انسانی غم کا مضحکہ ہے! یہ حرکت ناگفتنی ہے۔ میری زندگی میں اپنی قسم کا یہ پہلا اتفاق ہے
اُس شخص کی طرح جسے رفتہ رفتہ حیرت کے ساتھ اندازہ ہو کہ اس کی اہانت کی گئی ہے ڈاکٹر نے
اپنے شانے ہلائے، بازو زور سے جھٹکے، اور جب سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے تو بے بس ہو کر کرسی
گر پڑا۔

ابوگن رقت آمیز آواز میں کہے گیا " اگر تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی اور کسی اور سے ہو گئی
تو خیر یوں ہی سہی، مگر یہ دہوکا، یہ یاراری، غدارانہ چال کیوں؟ اس کا کیا مطلب ہے؟" تم
کیسے حق بجانب ٹھہرا سکتے ہیں؟ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ پھر کر بلوف کے قریب آکر پر حرارت
طریقے سے کہا " ڈاکٹر صاحب سنئے۔ آپنے اتفاقیہ میری بدنصیبی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہے
آپسے اصل حقیقت نہیں چھپانی چاہتا قسمیہ کہتا ہوں میں اُس کو چاہتا تھا، دیوانہ وار چاہتا تھا غلام
چاہتا تھا میں نے اُس کے لئے ہر چیز تج دی، اپنے عزیزوں سے لڑا، نوکری اور موسیقی

سوزی، اپنی ماں اور بہن کو جو معاف نہ کرتا، وہ اُسے معاف کیا   کبھی ٹیڑھی نظر سے نہیں دیکھا کسی کوئی بات نہیں کاٹی۔ پھر یہ دھوکا کیا؟ میں محبت نہیں چاہتا، مگر یہ مکروہ عیاری کیسی؟ اگر اُسے مجھ سے محبت نہ تھی، تو صاف صاف کیوں نہ کہا؟ اس مضمون پر میرے جو خیالات ہیں، اُن سے وہ واقف تھی!“

آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے، اوگن نے نہایت مکمل خلوص و صداقت کے ساتھ اپنا دل چیر کے ڈاکٹر کے سامنے رکھدیا، وہ جوش سے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے، اپنی ساری زندگی کے راز بلا تامل افشا کر رہا تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ خوش ہے کہ آخر یہ راز اُس کے سینے میں پوشیدہ نہ رہے۔ اگر گھنٹے دو گھنٹے اسی طرح باتیں کئے جاتا، تو یقیناً اُس پر اسکا اچھا اثر پڑتا، کون کہہ سکتا ہے، کہ اگر ڈاکٹر اس کی باتیں سنتا اور دوستانہ دل سوزی ظاہر کرتا تو شاید جیسا اکثر ہوتا ہے، وہ بغیر چیخے چلائے، بغیر شکوہ شکایت کے یہ صدمہ سہار لیتا۔ مگر ہوا کچھ اور۔ اوگن باتیں کر رہا تھا کہ غصب آلود ڈاکٹر کے تیور بگڑ گئے، اُس کے چہرے کی بے رحمی اور حیرت، تلخ غضب، طیش اور خفگی سے بدل گئی اُس کے خط و خال اور زیادہ درشت، بھدے، اور ناخوشگوار ہوگئے جب اوگن نے اُس کے سامنے ایک ایسی جوان عورت کی تصویر کھینچی جس کا خوب صورت چہرہ کسی راہبہ کی مانند بارد اور علامات حیات سے عاری ہو، اور اُس سے پوچھا کہ کیا اس چہرہ کو دیکھکر کوئی گمان کر سکتا ہے کہ اسمیں عیاری کی صلاحیت بھی ہو گی، تو ڈاکٹر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور اس نے تڑپ کر سنگدلانہ کہا۔

”مجھے تمہارے رازوں کی ضرورت نہیں! اُن پر لعنت ہو! ایسی عامیانہ حرکتوں کا مجھ سے ذکر نہ کرو! تم سمجھتے ہو ابھی میری ذلت نہیں ہوئی؟ مجھے کوئی خوشامدی سمجھا ہے کہ چپ چاپ تمہاری باتیں سنے جاؤں؟ یہ بات ہے؟“

اوگن، کریلوف کے پاس سے پیچھے کیطرف لڑکھڑایا اور اُس کی طرف حیرت سے گھورنے لگا، ڈاکٹر نے پھر بولنا شروع کیا۔ اُس کی داڑھی لرز رہی تھی“ مجھے یہاں لائے کیوں؟ اگر

تماش بینی کرتے کرتے تمہارا جی اتنا اکتا گیا کہ تم گئے اور شادی کر لائے اور پھر اس قسم کا تماشا دکھاؤ مجھے اُس سے کیا؟ مجھے تمہارے محبت کے افسانوں سے کیا؟ میرا پیچھا چھوڑو! اپنے شریفانہ انداز سے غریبوں کا روپیہ خوب ٹھگو، نرم ولانہ خیالات کی نمائش کرو۔ گاؤ بجاؤ (ڈاکٹر نے ترچھی نظر سے رباب کے خانہ کیطرف دیکھا) مرغے کی طرح پھولو، مگر شخصی وقار کو پامال کرنے کی جسارت نہ کرو! اگر تم سے اسکا احترام نہیں ہو سکتا، تو کم از کم اپنے التفات سے تو اُسے محروم رکھو!"

ابوگن نے سرخ ہو کر پوچھا "معاف کیجئے، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ لوگوں کے ساتھ اس طرح مذاق کرنا کمینہ پن ہے! میں ڈاکٹر ہوں، تم ڈاکٹروں کو اور عموماً اُن سب لوگوں کو جو ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں اور تمہاری طرح عطر اور زناکاری میں ملوث نہیں ہوتے، اپنا خدمت گار سمجھتے ہو، خیر، تم انہیں یہی سمجھو، مگر تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ کسی سوگوار شخص کے ساتھ ایسا عامیانہ مذاق کرو!"

ابوگن نے آہستہ سے کہا "آپ یہ کیسے کہتے ہیں؟" اور اُس کے چہرے پر پھر، اس مرتبہ غصہ سے تشنج طاری ہو گیا۔

"ہیں میرے صدمے کو دیکھتے ہوئے، تم مجھے ایسی بازاری باتیں سنانے کیسے لائے؟" یہ کہکر ڈاکٹر نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ "دوسروں کے غم کا مضحکہ اُڑانے کا حق تمہیں کس نے دیا؟"

ابوگن نے چیخ کر کہا "آپ کے حواس جاتے رہے ہیں، یہ سراسر نا انصافی ہے میں خود نہایت غم زدہ ہوں اور ... اور ..."

ڈاکٹر طعن آمیز ہنسی ہنسا "غم زدہ! یہ لفظ زبان سے نہ نکالو، تمہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں وہ فضول خرچ بھی جسے قرض نہیں ملتا، اپنے کو غم زدہ سمجھتا ہے۔ وہ مرغا جو زیادہ زہر مار کرنے سے کاہل ہو جاتا ہے وہ بھی غم زدہ ہوتا ہے۔ ناکارہ لوگ!"

"جناب آپ بہت بڑھ رہے ہیں۔ اس قسم کی حرکتوں پر لوگ سزا پاتے ہیں، سمجھے؟"

ابوگن نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، ایک پاکٹ بک نکالی، اور دو نوٹ نکال کے

سر پہ پھینکے اور غضب ناک ہو کر کہا۔ "آپ کا حق ادا ہو گیا۔"

ڈاکٹر چلایا "فیس دینے کی جرأت کیسے کرتے ہو؟" اور نوٹ میز سے فرش پر پھینک دئے۔ بانت کا بدلہ روپے سے نہیں ہوتا!"

ابوگن اور ڈاکٹر آمنے سامنے کھڑے تھے، اور غصہ میں ایک دوسرے کی ناواجب توہین کر رہے تھے میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں، بحران کی حالت میں بھی، ایسی نامنصفانہ، تند تلخ، اور لغو باتیں نہ کہی ہوں گی۔ مغمومیت کی خود پرستی دونوں میں کام کر رہی تھی۔ غم زدہ لوگ خود غرض، کینہ ور، ناانصاف، سنگدل اور بادلوں سے بھی زیادہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے ناقابل ہوتے ہیں۔ غم لوگوں کو متحد نہیں کرتا، بلکہ ان میں فصل پیدا کرتا ہے، خیال تو یہ ہوتا ہے کہ اشتراک غم سے وہ ترو شکر ہو جائیں گے مگر واقعتاً اُن کے دلوں میں پرسکون حالات کی نسبت زیادہ ناانصافی اور بے رحمی راہ پا جاتی ہے۔

ڈاکٹر نے زور سے، تیز تیز سانس لیکر کہا "مجھے گھر جانے دو۔"

ابوگن نے زور سے گھنٹی بجائی جب گھنٹی سے کوئی نہیں آیا، تو پھر بجائی اور غصے میں زمین پر پٹخ دی، وہ دھیمی آواز سے قالین پر گری اور اس میں ایک دردناک آواز نکلی گویا اُسکی جان نکل رہی ہے، ایک خدمتگار آیا اُس کے آقا نے اُسے مٹھی بھینچ کر ڈانٹا "مردود کہاں چھپا ہوا تھا؟ اس وقت کہاں تھا؟ جا اور ان صاحب کے لئے وکٹوریا گاڑی تیار کرا کے لا، اور میرے لئے بند گاڑی لانے کو کہو۔" خدمت گار جانے لگا تو وہ پھر چیخا "ٹھہرو کل تک میں کسی نمک حرام کو اپنے ہاں نہیں رکھوں گا! تم سب کو نکال دوں گا! نئے نوکر رکھوں گا! حشرات الارض!"

ابوگن اور ڈاکٹر گاڑی کے انتظار میں چپ چاپ کھڑے تھے، ابوگن کا چھیلا پن اور شائستہ تکلف پھر عود کر آیا، وہ کمرے میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا تکلف کے انداز سے سر ہلاتا تھا اور صریحاً کسی بات پر غور کر رہا تھا، اُسکا غصہ فرو نہیں ہوا تھا مگر وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اپنے دشمن کو نظر انداز کر رہا ہے ڈاکٹر میز کے کنارے ہاتھ ٹکائے کھڑا تھا، اور ابوگن کو اُس عمیق کلبی حقارت سے دیکھ رہا تھا،

جو صرف غم وغربت کی آنکھوں میں پائی جاتی ہے جب اُنکا سامنا شکم سیر آسائش اور تکلف سے ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر وکٹوریہ میں سوار ہوکر روانہ ہوگیا، اُس وقت بھی اُسکی آنکھوں میں حقارت کی جھلک باقی تھی۔ گھنٹہ بھر پہلے کی نسبت بہت زیادہ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سرخ چاند پہاڑی اور بادلوں کے پیچھے جن کے سیاہ ٹکڑے تاروں کے قریب، اُس کی نگہبانی کر رہے تھے چھپ چکا تھا۔ سرخ لالٹینوں والی گاڑی نے تھوڑی دیر میں ڈاکٹر کو جالیا۔ اسمیں ابوگن تھا جو شکوہ شکایت کرنے، بے سروپا حرکتیں کرنے جارہا تھا۔

گھر جاتے وقت تمام راستہ ڈاکٹر کو نہ اپنی بیوی کا دھیان تھا، نہ اپنے اینڈری کا، تھا تو لوگ اور اُس مکان کے لوگوں کا جہاں سے وہ آرہا تھا۔ اُس کے خیالات نامنصفانہ اور شدید سنگدلی سے ملوث تھے، وہ ابوگن اور اُس کی بیوی اور پیپ چنسکی اور اُن سب کو جو گلابی، دھیمی روشنی میں بھینی بھینی خوشبوؤں میں رہتے ہیں، لعنت ملامت کرتا، اور تمام راستے نفرت وحقارت سے اُنکا خیال کرتا رہا، یہانتک کہ اُسکا سر چکرا گیا۔ اور ان لوگوں کے متعلق ایک قوی عقیدہ نے اُس کے دل میں شکل اختیار کرلی۔

وقت گذر جائے گا اور کریلوف کا غم زائل ہو جائے گا، مگر وہ عقیدہ قلب انسانی کی شان سے بعید، نامنصفانہ عقیدہ نہیں جائیگا۔ بلکہ مرتے دم تک ڈاکٹر کے ساتھ رہے گا۔

خواجہ منظور حسین

دنیا کا آئندہ نظام

(۱)

اکثر مرد و عورتوں کی روزانہ زندگی میں خوف کو امید سے زیادہ دخل ہے۔ انہیں اپنے ان مقبوضات
کا خیال زیادہ ہے جو دوسرے ان سے چھین سکتے ہیں بہ نسبت اس خوشی اور مسرت کے جو یہ خود اپنی زندگی
میں پیدا کر سکتے ہیں اور ان زندگیوں میں جن سے انہیں واسطہ پیدا ہو۔

۔ دگی اس طرح جینے کے لئے نہیں ہے۔

جن لوگوں کی زندگیاں خود اپنے لئے، اپنے دوستوں کے لئے یا دنیا کے لئے بار آور ہیں انہیں
ید اعادتی ہے اور خوشی سہارا دیتی ہے یہ اپنے تخیل میں ان چیزوں کو جو ہو سکتی ہیں اور انہیں عالم وجود
میں لانے کی راہ کو دیکھتے ہیں شخصی تعلقات میں انہیں اسکی بہت فکر نہیں ہوتی کہ یہ جس محبت اور عزت
ـ ورہ ہیں کہیں اسے زائل نہ کر دیں یہ فراخدستی سے محبت اور عزت دیتے ہیں، اور انعام بلا انکے مانگے
ہ خود آتا ہے۔ اپنے کام میں انہیں مقابلہ کرنیوالوں کا رشک نہیں ستاتا، انہیں سروکار رہتا ہے
ں معاملے سے جو انجام دینا ہے سیاست میں یہ اپنا وقت اپنے طبقہ یا اپنی قوم کے ناجائز مراعات کی
ن حمایت میں صرف نہیں کرتے بلکہ ساری دنیا کو بہ حیثیت کل زیادہ خوش، کم بیرحم، متقابل حرصوں کے
ٹکراؤں سے کم اور ان انسانی وجودوں سے زیادہ پر بنانا چاہتے ہیں جنکی نشو و نما ظلم اور دباؤ سے مسدود
ہو کر باری نہ گئی ہو۔

جس زندگی کی روح یہ ہو جس روح کا مقصد چیزوں پر قبضہ کرنیکے بجائے انکا بنانا ہو۔ اس زندگی
میں ایک گہری مسرت ہوتی ہے جسے ناساعد اسباب اس سے کلیتہً نہیں چھین سکتے یہی وہ طریقہ زندگی ہے جو
انجیل مقدس نے اور دنیا کے بڑے بڑے معلموں نے پیش کیا ہے جنہوں نے اسے پالیا وہ خوف کے استبداد

ـه یہ انگلستان کے مشہور اہل قلم جناب برٹرینڈ رسل کی کتاب "راہ آزادی" (Roads to Freedom)
کے آٹھویں باب کا ترجمہ ہے۔ ایڈیٹر

سے آزاد ہو گئے، کیونکہ انہیں اپنی زندگی میں جو چیز سب سے عزیز ہے وہ کسی خارجی قوت کے دسترس میں نہیں۔ اگر سب انسان باوجود مشکلات اور مایوسیوں سے اُس زندگی کا منظر دیکھ لیتے اور ایسی زندگی گذارنے کی ہمت کر لیتے تو کچھ ضرورت نہ تھی کہ دنیا کی تجدید سیاسی اور معاشی اصلاح سے شروع کیجاتی بر اصلاح کی ضرورت ہو وہ افراد کی اخلاقی تجدید کی وجہ سے خود بخود بلا مقاومت پیدا ہو جاتی لیکن اگرچہ کئی صدیوں سے دنیا نے مسیح کی تعلیم کو قبول کر لیا ہے تاہم آج بھی اسکی اتباع کرنے والوں کو اسی طرح ایذا دیجاتی ہے جس طرح قسطنطین سے قبل کے زمانہ میں دیجاتی تھی تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ایک کذات زندگی کی بدیہی برائی کی تہ میں ایمان اور تخلیقی امید کی مخفی مسرت دیکھ سکیں اگر خوف کے غلبہ کو دور کرنا ہے تو جہانتک عام انسانوں کا تعلق ہے یہ کافی نہیں کہ ہمت اور بدنصیبی سے لاپروائی کی تلقین کیجائے بلکہ خوف کے اسباب کا دور کرنا ضروری ہے، ضروری ہے کہ اچھی زندگی دنیاوی اعتبار سے ناکام زندگی نہ ہو۔ ضروری ہے کہ اس ضرر کو کم کیا جائے جو ان لوگوں کو پہنچایا جا سکتا ہے جو اپنی مدافعت میں چالاک نہیں۔

ہم جن زندگیوں سے واقف ہیں اُنکی برائیوں پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ برائیاں تین گروہوں میں تقسیم کیجا سکتی ہیں۔ اول تو وہ برائیاں ہیں جنکی وجہ فطرت طبیعی ہے، انمیں موت، درد، اور زمین سے غذا پیدا کرنیکی دشواری، انہیں ہم "طبیعی برائیاں" کہینگے۔ دوسری وہ برائیاں ہیں جو بھگتنے والے کی سیرت یا صلاحیت کے نقص سے پیدا ہوتی ہیں۔ انمیں جہل، قوت ارادی کی کمی، اور شدید جذبات ہیں جنہیں ہم "سیرت کی برائیاں" کہیں گے۔ تیسرے وہ برائیاں ہیں جو ایک شخص یا گروہ کے دوسرے پر اقتدار و قوت سے وابستہ ہیں، انمیں صرف کھلا استبداد ہی نہیں بلکہ آزاد نشوونما کی راہ میں ہر مداخلت شامل ہے خواہ یہ جبر سے پیدا ہو یا شدید دماغی تاثر سے جیسا کہ تعلیم میں ہو سکتا ہے۔ انہیں ہم "قوت کی برائیاں" کہیں گے۔ نظام اجتماعی کا ان تین قسم کی برائیوں سے جو تعلق ہے اسی کے اعتبار سے اس نظام پر حکم لگایا جا سکتا ہے۔

ان تین قسموں میں ایک دوسرے سے کوئی صاف و صریح فرق نہیں کیا جا سکتا۔ خالص طبیعی برائی

یک حد ہے اور کبھی یقین نہیں کیا جاسکتا کہ ہم اس حد کو پہنچ جائینگے ۔ ہم موت کو نہیں مٹا سکتے ۔ ہاں حکمت کے زور سے اسے اکثر ملتوی کرسکتے ہیں ، اور آگے چلکر یہ بات حاصل کرنا ممکن ہے کہ ایک بڑی اکثریت بڑھاپے کی عمر تک زندہ رہے ۔ ہم درد کو مطلقاً نہیں مٹا سکتے ، لیکن سب کے لئے تندرست زندگی حاصل کرکے ہم اسے بہت کم ضرور کرسکتے ہیں ۔ بے محنت ہم زمین کو فراوانی کے ساتھ اپنے پھل دینے پر مجبور نہیں کرسکتے لیکن ہم محنت کی مقدار گھٹا سکتے اور اس کے حالات کو ایسا بہتر بنا سکتے ہیں کہ یہ کوئی برائی نہ رہے ۔ سیرت کی برائیاں اکثر طبیعی برائیوں (بشکل بیماری) کا ، اور اس سے زیادہ قوت کی برائیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں ، کیونکہ استبداد اسے بھی پست کرتا ہے جو اسے برتتے اور (معمولاً) اسے بھی جو اسے جھیلے جنکے ہاتھ میں قوت ہے انکی قوت کی برائیاں خود انکی سیرت کی برائیوں سے اور ان طبیعی برائیوں کے خوف سے جو ان لوگوں کی قسمت میں لکھی ہیں جن کے پاس قوت نہیں اور بھی بڑھ جاتی ہیں ان وجوہ سے یہ تینوں قسم کی برائیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں تا ہم عام طور پر ہم اپنی بدنصیبیوں میں یہ تین قسمیں پہچان سکتے ہیں وہ جنکی قریبی علت مادی دنیا میں ہے ۔ وہ جو ہماری ذات کے نقائص سے پیدا ہوتی ہیں ، اور وہ جو ہمارے دوسروں کے قابو میں ہونیکا نتیجہ ہیں ۔

ان برائیوں کے مقابلہ کے خاص خاص طریقہ یہ ہیں ۔ طبیعی برائیوں کیلئے حکمت ؛ سیرت کی برائیوں کے لئے تعلیم (وسیع ترین معنوں میں) اور تمام ایسے ہیجانات کیلئے بے روک نکاسی جنمیں دوسروں پر تسلط نہ پیدا ہو ؛ قوت کے عیوب کیلئے جماعت کے سیاسی اور معاشی نظام کی اصلاح اس طرح سے کہ ایک شخص کی زندگی میں دوسرے کی مداخلت کو جتنا ممکن ہو کم کردیا جائے ہم ان برائیوں میں سب سے پہلے تیسری قسم سے شروع کرینگے کیونکہ اشتراک اور نراج لے سب سے زیادہ انہیں قوت کی برائیوں کو رفع کرنا چاہا ہے ۔ دولت کی عدم مساوات پر انکا اعتراض زیادہ تر انہیں برائیوں کے احساس پر مبنی ہے جو دولت کی دی ہوئی قوت سے پیدا ہوتی ہیں ۔ مسٹر جی ۔ ڈی ۔ ایچ کول نے اس نکتہ کو خوب بیان کیا ہے ۔

" میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہمارے موجودہ ہیئت اجتماعی کی وہ کونسی بنیادی برائی ہے جسے

ہمیں مٹانا چاہئے ؟

اس سوال کے دو جواب ممکن ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ بہتیرے نیک نیت انہیں سے غلط جواب دینگے۔ جو یہ ہوگا کہ "افلاس" حالانکہ جواب ہونا چاہئے "غلامی"، انکے روبرو چونکہ روز مالدار اور نادار کا شرمناک تضاد پیش آتا ہے، اونچے منافع اور نیچی مزدوری کا اور خیرات کے ذریعہ خواہ وہ شخصی ہو یا عمومی اس تباین کو پورا کرنیکی عبث کوشش کا تکلیف دہ احساس چونکہ انہیں ہوتا ہے اس لئے بلا تامل جواب دیدینگے کہ یہ افلاس کے مٹانے کے لئے ہیں۔

درست اور بجا! اس بات میں ہر اشتراکی انکے ساتھ ہے لیکن پھر بھی میرے سوال کا جواب انہوں نے غلط دیا۔

افلاس علامت ہے اور غلامی مرض۔ دولت اور افلاس کی انتہائی شکلیں اختیار اور بندگی کی انتہائی شکلوں کا لازمی نتیجہ ہیں۔ یہ بہتیرے اس لئے غلام نہیں ہیں کہ یہ مفلس ہیں بلکہ یہ مفلس ہیں اس وجہ سے کہ غلام ہیں۔ تاہم اشتراکیوں نے اپنی نظر ضرورت سے زیادہ مفلس کی مادی مصیبت پر رکھی ہے اور یہ نہیں سمجھا کہ اسکی بنیاد غلام کی روحانی پستی پر ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی معقول آدمی اسمیں شک کریگا کہ موجودہ نظام میں قوت کی برائیاں جتنی کہ لازمی ہیں اس سے کہیں زیادہ ہیں نہ اسمیں کہ اشتراک کی ایک مناسب شکل سے انہیں بیحد کمی ہوسکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تھوڑے سے خوش نصیب لوگ آج نہایت آزادی سے لگان یا سود پر زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہیں کسی دوسرے نظام میں مشکل ہی سے اس سے زائد آزادی مل سکتی ہے لیکن نہ صرف نہایت مفلس لوگوں کی بلکہ مزدوروں کے تمام حصوں کی اور پیشہ ور طبقوں کی بھی بہت بڑی تعداد روپیہ حاصل کرنے کی ضرورت کی غلام ہے۔ وہ تقریباً اس قدر سخت کام کرنے پر مجبور ہیں کہ انہیں تفریح کے لئے یا اپنے معمولی کام کے علاوہ کسی اور شغل کے لئے مشکل ہی سے مہلت ملتی ہے جو درمیانی عمر کے آخر میں کام چھوڑ سکتے ہیں وہ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے ہیں، کیونکہ انہوں نے یہ نہیں سیکھا

Self Govt. in Industry صفحہ ۱۱۰ - ۱۱۱ مطبوعہ G. Bell & Sons, 1917.

کہ جب خالی ہوں تو اپنے وقت کو کیسے صرف کریں اور اپنے کام کے علاوہ پہلے جو کچھ ان کی دلچسپیاں تھیں وہ اب سب ختم ہو گئیں۔ اور پھر یہی غیر معمولی طور پر خوش نصیب ہیں۔ زیادہ تعداد کو تو بڑھاپے تک سخت مشقت کرنی پڑتی ہے، افلاس کا ڈر ہمیشہ انکے سامنے ہوتا ہے، ان میں جو مالدار ہیں انہیں یہ خوف لگا ہوتا ہے کہ اپنے بچوں کے لئے خاطر خواہ تعلیم یا طبی نگرانی فراہم نہ کر سکینگے (جیسی یہ چاہتے ہیں) جو غریب ہیں وہ فاقہ سے کچھ بہت دور نہیں۔ اور تقریباً جتنے کام کرنیوالے ہیں انہیں سے کسی کو اپنے کام کی ترتیب میں ذرا بولنے کا اختیار نہیں، کام کے پورے وقت میں یہ بس کلیں ہیں جو اپنے آقا کی مرضی بجالا رہے ہیں۔ کام عموماً ایسے ناگوار حالات میں کیا جاتا ہے جس سے تکلیف اور جسمانی مشکلات وابستہ ہوتی ہیں۔ کام کرنیکی تنہا محرک اُجرت ہے یہ خیال بھی کہ کام صناع کے کام کی طرح خوشی کا باعث ہو سکتا ہے عموماً ایک بلند پرواز خیال سمجھا جاتا ہے۔

لیکن ان برائیوں کا بہت بڑا حصہ بالکل غیر ضروری ہے اگر نوع انسان کے مہذب حصہ کو اس بات پر راضی کیا جا سکتا کہ وہ دوسروں کے دُکھ سے زیادہ اپنی خوشی کا طالب ہو، اگر انہیں آمادہ کیا جا سکتا کہ یہ ایسی ترقیوں کے لئے تعمیری کام کریں جنمیں یہ ساری دنیا کے ساتھ حصہ دار ہو سکیں بجائے اس کے کہ دوسرے طبقوں یا قوموں کے اپنے اوپر سبقت لیجانے کو تباہ کن طریقوں سے روکیں تو اس سارے نظام کی جس سے دنیا کا کام ہو رہا ہے ایک نسل کے اندر جڑ سے اصلاح ہو جائے۔

حریت کے نقطۂ نظر سے کونسا نظام سب سے اچھا ہے؟ ہمیں کیا خواہش کرنی چاہیئے کہ ترقی کی قوتیں کس سمت حرکت کریں۔

اس نقطۂ نظر سے اور تھوڑی دیر کے لئے تمام دوسرے خیالات سے قطع نظر کر کے، مجھے ذرا شبہ نہیں کہ بہترین نظام اس سے چنداں دور نہیں جو کروپاٹکن[۱] نے پیش کیا ہے اور جو گلڈ[۲] اشتراکیت

---

[۱] یہ روس کے ان امرا میں سے ہے جنکی تصانیف میں نراجی تخیلات کی منظم ترجمانی پائی جاتی ہے، مترجم

[۲] یہ ایک تحریک ہے جو صنعتی دنیا میں خود اختیاری اور ریاست کے اختیارات میں کمی کی حامی ہے، مترجم

کے خاص خاص اصولوں کو اختیار کرنے کے بعد زیادہ قابل عمل ہوجاتا ہے۔ چونکہ ہر پہلو پر بحث ممکن ہے اس لئے میں بلا دلیل تنظیم کار کی وہ شکل پیش کئے دیتا ہوں جو میرے نزدیک سب سے اچھی ہے۔

سولہ برس یا اس سے زیادہ عمر تک تعلیم لازمی ہونی چاہیئے، اس کے بعد متعلم کو اختیار رہے کہ اسے جاری رکھے یا نہ رکھے، لیکن جو جاری رکھنا چاہیں انکے لئے کم از کم اکیس سال کی عمر تک بلا معاوضہ رہے ختم تعلیم کے بعد کسی کو کام کرنے پر مجبور نہ کیا جائے جو کام کرنا چاہیں انہیں محض گذارہ کے لائق دیا جائے اور انہیں بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے لیکن غالباً یہ زیادہ پسندیدہ بات ہوگی کہ کام کی موافقت میں قوی رائے عامہ ہو تاکہ مقابلۃً بہت کم لوگ کاہل رہنا پسند کریں۔ کاہلی کو معاشی طور پر ممکن بنا دینے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کام کو ناگوار نہ بننے دینے کے لئے ایک قوی محرک حاصل ہوجائے گا اور جس جمعیت میں کام کا اکثر حصہ ناگوار ہو اسکے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے مسائل معاشی کا حل دریافت کرلیا ہے۔ میرے خیال میں معقولیت کے ساتھ فرض کیا جاسکتا ہے کہ بہت ہی کم لوگ کاہل رہنا پسند کرینگے جب ہم اس امر واقعہ کو پیش نظر رکھیں کہ آج بھی اپنے اصل سے فرض کیجئے سو پونڈ سالانہ کی آمدنی رکھنے والوں میں سے ۔ ایس ۹ اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے اجرت پر کام کرتے ہیں۔

اب اس بڑی تعداد پر آئے جو کاہلی نہیں پسند کرے گی تو میرے خیال میں ہم فرض کرسکتے ہیں کہ حکمت کی مدد سے، اور غیر پیدا آور کام کی اس مقدار عظیم کو ہٹا کر جو داخلی اور بین الاقوامی مقابلہ میں صرف ہوتی ہے۔ ساری جمعیت کو روزانہ ۴ گھنٹے کے کام سے آرام کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ تجربہ کار آجر اب بھی اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ انکے مزدور ۶ گھنٹے روزانہ کے کام میں بھی اتنی ہی چیزیں تیار کرسکتے ہیں جتنی کہ ۸ گھنٹے روزانہ کام کرکے۔ پھر جس دنیا میں صنعتی تعلیم کی سطح آج کل کے مقابلہ میں بہت بلند ہوگی اسمیں تو اس رجحان کو اور بھی تقویت پہونچیگی۔ آج کل کی طرح لوگوں کو ایک صنعت یا ایک صنعت کا بھی کوئی چھوٹا سا حصہ نہ سکھایا جائیگا بلکہ کئی کام سکھائے جائیں گے تاکہ موسم اور مانگ کے تغیر تبدل کے مطابق یہ اپنا شغل بدل سکیں۔ تمام اندرونی معاملات میں ہر صنعت اپنے اوپر آپ حکومت کرے گی اور جو معاملے صرف کارخانہ میں کام کرنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں انہیں بھی علیحدہ علیحدہ کارخانے

ے کرلیا کرینگے آج کل کی طرح سرمایہ داری انتظام نہ ہوگا بلکہ جیسے سیاست میں ہوتا ہے منتخب کردہ نمائندے انتظام کرینگے۔ مختلف دولت پیدا کرنے والے گروہوں کے معاملات گلڈ کانگریس طے کیا کرے گی، ایک خاص رقبہ زمین کے باشندوں کی حیثیت سے جو معاملات جمعیت کو پیش آئیں گے انکا فیصلہ پارلیمنٹ ہی کیا کرے گی۔ اور گلڈ کانگریس اور پارلیمنٹ کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ ایک ایسی جماعت سے ہوگا جس میں دونوں کے برابر رکن ہوں گے۔

آج کل کی طرح دام صرف اسی کام کے نہیں دے جائینگے جس کی مانگ ہو اور واقعی انجام دیا گیا ہو۔ بلکہ دام دئے جائینگے کام کرنیکی آمادگی پر۔ اکثر کاموں میں جہاں اچھے دام ملتے ہیں آج کل بھی یہ طریقہ اختیار کرلیا گیا ہے۔ ایک شخص کسی عہدہ پر مقرر ہے اور جب بہت تھوڑا کام بھی ہوتا ہے تو وہ اسوقت بھی مقرر رہتا ہے بیکاری اور روزی چلے جانیکا خوف انسانوں کے سروں پر بھوت کی طرح سوار نہ رہے گا۔ کام کرنے پر جو لوگ آمادہ ہیں آیا ان سب کو برابر دام ملیں گے یا خاص غیر معمولی ہنرمندی کے لئے اب بھی غیر معمولی اجرت دیجائے گی؟ یہ ایسے سوال ہیں جنکا فیصلہ ہر گلڈ پر چھوڑا جاسکتا ہے۔ اوپرا میں گانے والے کو اگر پردہ بدلنے والوں سے زیادہ دام نہ ملیں تو ممکن ہے کہ جبتک یہ طریقہ بدل نہ جائے وہ پردہ بدلنے کا کام ہی پسند کرے۔ ایسا ہوا تو زیادہ دام دینا غالبا ضروری ہوگا۔ لیکن اگر یہ گلڈ کی آزاد رائے سے طے ہو تو پھر مشکل ہی سے شکایت کی صورت باقی رہ سکتی ہے۔

کام کو خوشگوار بنانیکے لئے کچھ بھی کیوں نہ کیا جائے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ بعض کام ہمیشہ ناگوار باقی رہینگے۔ انہیں لوگوں کو کم وقت کام کراکے یا زیادہ اجرت دیکر لایا جاسکتا ہے بجائے اس کے کہ افلاس کی وجہ سے وہ انکے کرنے پر مجبور ہوں۔ ان غیر معمولی کاموں کی ناگواری کو کم کرنے کے لئے اس طرح جمعیت کے پاس نہایت قوی معاشی محرک موجود ہوگا۔

ہم جس قسم کی جمعیت کا تصور کر رہے ہیں اسمیں اب بھی زر یا اس سے ملتی جلتی کسی اور چیز کی ضرورت ہو گی۔ مزاجیوں کی اس تجویز میں بھی کہ محنت کی ساری پیداوار کو برابر حصہ میں تقسیم کردیا جائے

ایک معیاری قدر مبادلہ کی ضرورت سے نجات نہیں ملتی کیونکہ ایک آدمی چاہیگا کہ اپنا حصہ ایک شکل میں لے اور دوسرا دوسری میں۔ جب سامان عیش کی تقسیم کا دن آئےگا تو بڑھی عورتیں اپنا سگاروں کا حصہ نہیں طلب کرینگی اور نوجوان مرد گود کے کتوں میں اپنا جائز حق لینا چاہیں گے اس لئے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ کتنے سگار ایک گود کے کتے کے مساوی ہوتے ہیں۔ سب سے آسان طریقہ تو یہ ہے کہ جیسے آجکل ہوتا ہے کہ ایک آمدنی دیدی جائے اور پھر قدر اعتباری کا باہمی تناسب طلب پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اگر سچ مچ نقود ادا کئے گئے، تو کوئی شخص انہیں جمع کر کرکے ایک دن سرمایہ دار بن سکتا ہے اسے روکنے کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ نوٹ دیتے جائیں جو ایک خاص مدت کیلئے چالو ہوں مثلاً تاریخ اشاعت سے سال بھر تک۔ اس سے یہ ہوگا کہ ایک شخص اپنی سالانہ تعطیل کے لئے تو کچھ پس انداز کر سکے گا، لیکن اس سے زیادہ غیر محدود دولت نہ بچا سکیگا۔

اس نراجی تجویز کی موافقت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے کہ ضروریات زندگی اور وہ چیزیں جو آسانی سے مانگ کے مطابق تیار ہو سکیں انہیں جو مانگے بے دام مول دیا جائے اور جتنی مقدار اسے درکار ہو اتنی دیجائے۔ یہ تجویز اختیار کیجائے یا نہیں یہ میرے نزدیک بالکل ایک ضابطہ کا سوال ہے۔ کیا واقعاً اسکا اختیار کرنا ممکن ہوگا بلا اسکے کہ محنت کی بہت سی مقدار ضائع ہو اور اجناس ضروریہ کی تیاری میں منتقل ہو درانحالیکہ یہ اس سے بہتر کام میں لگائی جا سکتی ہے؟ میرے پاس اس سوال کے جواب دینے کے لئے کوئی ذرائع نہیں لیکن میں اسے نہایت اغلب سمجھتا ہوں کہ جلد یا بدیر جب طریقہ پیدایش میں برابر ترقی ہوتی رہے گی تو یہ نراجی تجویز قابل عمل ہو جائیگی اور جب یہ قابل عمل ہو جائے تو اسے ضرور اختیار کر لینا چاہئے۔

خانگی کام میں عورتوں کو خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، وہی اجرت ملے گی جو صنعتی کام میں ملتی۔ اس سے بیویوں کو کامل معاشی خودمختاری حاصل ہو جائیگی جس کا حصول اور کسی طریقہ سے دشوار ہے کیونکہ چھوٹے بچوں کی ماؤں سے یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ وہ گھر سے باہر کام کریں۔

بچوں کا خرچ، جیسا کہ آج کل ہوتا ہے، والدین پر نہیں پڑے گا، بالغوں کی طرح انہیں بھی

ضروریات زندگی میں اپنا حصہ رسد لیگا اور انکی تعلیم جو ہوگی وہ بے معاوضہ ۔ قابل بچوں کو وظیفوں کے لئے آج کل کے سے مقابلہ کا سامنا نہ کرنا ہوگا ۔ بچپن ہی سے انمیں مقابلہ و مسابقت کی روح نہیں پیدا کیجائیگی اور نہ انہیں اسپر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے دماغوں پر غیر فطری بار ڈالیں جسکا نتیجہ بعد کو کند ذہنی اور عدم صحت ہوتا ہے ۔ تعلیم میں آجکل کے مقابلہ میں زیادہ تنوع ہوگا اس بات کا زیادہ خیال رکھا جائے گا کہ تعلیم مختلف قسم کے بچوں کے مطابق حال ہو ۔ متعلمین میں اپج پیدا پیدا کرنیکی زیادہ کوشش کیجائیگی اور اس بات کی خواہش کم ہوگی کہ انکے دماغوں کو ایسے عقائد و عادات ذہنی سے ٹھونسا جائے جنہیں ریاست خصوصاً اسوجہ سے پسندیدہ خیال کرتی ہے کہ یہ موجودہ صورت حال کے قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں ۔ غالباً بچوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے یہ ضروری بات ہوگا کہ انکی تعلیم دیہات کے کھلے میدان میں ہو ۔ ذرا زیادہ عمر کے ایسے لڑکے لڑکیوں کے لئے جنہیں کوئی علمی یا فنی دلچسپی نہیں انکے لئے صنعتی تعلیم اگر آزاد طریقہ سے دیجائے تو انکے اعمال ذہنی کو ترقی دینے کے لئے کتابی تعلیم سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوگی کیونکہ اس موخرالذکر کو تو یہ (چاہے غلط ہی سہی) سوائے امتحان کے کام کے اور تو بالکل فضول جانتے ہیں ۔ واقعی مفید تعلیم وہ ہی جو خود بچے کے جبلی رجحانات کا اتباع کرے ، وہ علم فراہم کرے جس کی اسے تلاش ہے نہ کہ وہ خشک جزوی معلومات جو اسکے فطری خواہشات سے بالکل بے تعلق ہیں ۔ باقی آئندہ

---

[1] بعض لوگوں کو اندیشہ ہو سکتا ہے کہ اس سے آبادی کی بیجا فراوانی عمل میں آئیگی لیکن میں ان اندیشوں کو بے بنیاد تصور کرتا ہوں ۔ [2] ملاحظہ ہو اسی کتاب کا باب "کام اور اجرت" نیز "اجتماعی تعمیر نو کے اصول" کا باب ۲ مطبوعہ جارج ایلن اینڈ انوین لمیٹیڈ ۔

غزل

مولانا شرف الدین صاحب ٹونکی متخلص یاس استاد جامعہ

ہائے کیسا جان سے بیزار ہے
جو تمہارے ہجر کا بیمار ہے

لب پہ وعدہ دل میں صاف انکار ہے
واہ کیا انکار کیا اقرار ہے

سد رہ یہ پردۂ پندار ہے
آپ سے گذرے تو بیڑا پار ہے

آج رخصت آپ کا بیمار ہے
دیکھ لیجے آخری دیدار ہے

جان پر کھیلا کئے ہم عشق میں
یہ نہ دیکھا جیت ہے یا ہار ہے

جب بڑھی وحشت اسی کوچہ میں ہوں
جب اٹھایا سر وہی دیوار ہے

دیکھ لینگے آج برپا کرکے حشر
حشر کے دن وعدۂ دیدار ہے

کیا کھلے ہیں زخم تیری تیغ کے
سینۂ بسمل یہ گویا ہار ہے

اس کے دم تک تھیں وہ ساری شہرتیں
اب مسیحا تم نہ وہ بیمار ہے

تیرے دربانوں کی بندش ہے غضب
در بھی میرے واسطے دیوار ہے

ذبح کرکے نفس کو پائی غذا
خون دل سے روزہ آج افطار ہے

بند کر آنکھیں ذرا آنکھوں سے دیکھ
طالب دیدار یہ دیدار ہے

تم سے ہی شاید کھلے تو کچھ کھلے
جو تمہارا محرم اسرار ہے

آپ میں آنے نہ دے اے بیخودی
ڈوب ہی جاؤں تو بیڑا پار ہے

کیوں نہ نکلے بوالہوس کی آرزو
اُس کے دل سے آرزو بیزار ہے

یاس کو دی اک جہاں کی آرزو
واہ کیا لکھ لٹ تری سرکار ہے

غزل

جناب مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خانصاحب شیدا

حکیم صاحب موصوف جیسی جامع شخصیتیں ملک میں کم ہیں، آپ کو بحیثیت شاعر کے بہت کم لوگ جانتے ہوں گے، ہم ذیل میں آپ کی ایک فارسی کی غزل ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ آپ کا پورا دیوان جو نہایت اہتمام کیساتھ جرمنی میں چھپا ہے عنقریب مکتبہ جامعہ سے شائع ہونیوالا ہے

ایڈیٹر

یاد ایامیکہ فریاد و فغانے داشتم — بہر درد سینۂ سوزاں زبانے داشتم

یاد ایامیکہ من ہم در گلستان مراد — ہم گل خنداں و ہم سرو جوانے داشتم

یاد عہدے کن کہ از تیر نگاہ مست تو — درد پنہانے و چشم خونچکانے داشتم

یاد عہدے کن کہ من از بہر تقدیم نیاز — ہم جبینے داشتم ہم آستانے داشتم

ازکمیں برجست برق ناگہاں آتش ریخت — گرچہ من در کنج گلشن آشیانے داشتم

زیں نیفتادم بدام آرزو مرغ مراد — داشتم یارے و لے نامہربانے داشتم

لذت از کامم نخواہد رفت تا آخر کہ من — ساغر ریحانی و دست جوانے داشتم

آں شب مہ شد کجا یاران کہ پائے سنبلے — زلف پیچانے و روئے زرفشانے داشتم

یاد کن شیدا کہ در روز نبرد عشق او
من ز مژگاں تیر و از ابرو کمانے داشتم

تنقید و تبصرہ

تاریخ ہند (قرون وسطیٰ) مصنفہ ایشوری پرشاد۔ صفحے ۴۰۲، قیمت عہ مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد

یہ ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ ہے جو الہ آباد یونیورسٹی کے ایک لائق پروفیسر بابو ایشوری پرشاد کی لکھی ہوئی ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس پر ریویو کرتے ہوئے سب سے پہلے تو یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا تاریخ میں کوئی اس قسم کی تقسیم ہو بھی سکتی ہے جیسی مصنف نے کی ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ سنہ ۶۴۷ء تک ہندوستان کی قدیم تاریخ کا زمانہ ہے۔ اسکے بعد ”قرون وسطیٰ“ کا دور شروع ہو جاتا ہے اور پھر اس کے بعد سے عہد جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ تاریخ اگر افعال انسانی کے ایک سلسلہ کا نام ہے تو اس قسم کی تقسیم نہ صرف غلط بلکہ لغو ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں قسم کی تہذیب و معاشرت فلاں تاریخ تک جاری رہی اور پھر اس کے بعد دوسرے دن سے دوسرے طرز کی تہذیب و معاشرت شروع ہو گئی بلکہ واقعہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ جب ایک دور یا عہد دوسرے دور یا عہد کی جگہ لیتا ہے تو ہوتا یہ ہے کہ گذشتہ زمانہ کی تمام نمایاں خصوصیات رفتہ رفتہ مٹتی جاتی ہیں اور دوسرے دور کی نئی نئی باتیں آہستہ آہستہ رواج پذیر ہونے لگتی ہیں۔ یہ تغیر و تبدل اس قدر بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر ہوتا ہے کہ کسی ایک دن یا تاریخ کی تعیین دشوار ہے لیکن باوجود اس کے اکثر آسانی و سہولت کے خیال سے مصنفین تاریخ و سال کی تعیین کر لیتے ہیں اور اسی بنا پر انہوں نے عہد قدیم و عہد جدید، قرون وسطیٰ و ازمنہ مظلمہ وغیرہ کی تقسیم کی ہے۔ ہمارے مورخین ہند نے بھی یورپین مصنفین کی تقلید میں ہندوستان کی تاریخ کو تین زمانوں میں تقسیم کیا ہے ایک ہندوؤں کا عہد قدیم، دوسرا مسلمانوں کے قرون وسطیٰ کا زمانہ اور تیسرا عہد جدید۔

قرون وسطیٰ کا دور انکے نزدیک اسوقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ ہندوؤں کی سب سے آخری بڑی سلطنت یعنی ہرش کی ٹوٹتی ہے اور ہندوستان چھوٹی چھوٹی مختلف ریاستوں اور سلطنتوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اسی اثنا میں مسلمانوں کے پیہم حملے شروع ہوتے ہیں، جن سے ہندوستان

کی تہذیب و معاشرت میں رفتہ رفتہ ایک نمایاں تغیر شروع ہوتا ہے اور عہد قدیم کی وہ تمام خصوصیات مٹتی چلی جاتی ہیں جسکی وجہ سے تاریخ کے اس دور کی ایک خاص اور مستقل حیثیت ہو جاتی ہے جو اسوقت تک قایم رہتی ہے جبتک کہ پھر جدید اور مختلف حالات کے پیدا ہونے سے ایک نئی صورت رونما نہیں ہو جاتی جسے عہد جدید کہتے ہیں چنانچہ کتاب زیر تنقید کے مصنف نے بھی اسی تقسیم کو اپنے پیش نظر رکھا ہے جو صرف اسی سہولت و آسانی کے خیال سے جائز قرار دیجا سکتی ہے۔

اس عہد جدید میں ہندوستان کی تاریخ لکھنے کیطرف جب توجہ ہوئی تو سب سے پہلے قدیم عہد کی طرف رخ کیا گیا، اسلئے کہ انگریزی تمدن و معاشرت کے رواج نے ہندوستان کی قدیم تہذیب و تمدن کو لوگوں کی نظروں میں ایک حد تک حقیر اور ذلیل کر دیا تھا اس بنا پر اسکو روشن اور درخشاں دکھانے کیلئے سنسکرت علوم و تہذیب کیطرف توجہ کی گئی لیکن رہا اسکے بعد کا زمانہ جسکی تاریخ عہد قدیم کی تاریخ سے کہیں زیادہ مرتب صورت میں موجود تھی، اس کی طرف کوئی اعتنا نہ کیا گیا۔ خدا بھلا کرے آئی۔ سی۔ ایس کے بعض حکام کا کہ جنہوں نے اس عہد کے بیشتر تاریخی ذخیروں کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا۔ لوگ اسے ہزار برا کہیں کہ یہاں کے نایاب نسخے اٹھا اٹھا کر یورپ کی الماریوں میں بھر دئے گئے لیکن شکر ہے کہ وہ آج موجود تو ہیں اور ان سے استفادہ تو کیا جاسکتا ہے۔ برعکس اس کے ہندوستان کے اندر کتنے نسخے تو بد احتیاطی کی وجہ سے کیڑوں کی نذر ہو چکے اور جو موجود ہیں وہ ان دفینوں سے کم نہیں کہ جن کے مالک مار گنج کیطرح دوسروں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ ہندوستان کے مورخین ممنون ہوں ایلیٹ اور ڈاوسن کے کہ انہوں نے ان تمام نسخوں کے مختصر حالات اور انکے ضروری حصوں کے ترجمے آٹھ جلدوں میں شائع کر دئے ہیں جن سے ہمارے انگریزی داں مورخین برابر مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ یہ انہی کا طفیل ہے کہ اس عہد کی ایک دو تاریخیں مثلاً الفنسٹن اور لین پول وغیرہ کی انگریزی میں نظر آجاتی ہیں۔ لیکن ان کتابوں کو شائع ہوئے آج ایک زمانہ گذر گیا اور اس دوران میں کتنے تاریخی انکشافات ہوئے اور تاریخی نظرئے بدلے جس سے اور کتابوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی

ہمارے پروفیسر ایشوری پرشاد نے انہی تاریخی انکشافات کو مدنظر رکھکر اور اسی ضرورت زمانہ کو محسوس کر کے یہ نئی تصنیف ملک کے سامنے پیش کی ہے اور بحمداللہ کہ اپنے مقاصد میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اس عہد کے ہمارے بعض مورخین کا ابتک یہ خیال رہا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کا یہ ابتدائی زمانہ ہندوستان کے لئے تنزل و پستی کا باعث رہا ہے، لیکن ہمارا منصف مزاج ہندو مورخ اپنی تاریخی تحقیقات کی بنا پر لکھتا ہے کہ

"اسلامی فتوحات نے مختلف ریاستوں اور سلطنتوں کی بجائے جو ہمیشہ باہم دست و گریباں رہا کرتی تھیں، ایک شہنشاہی اتحاد قائم کر دیا اور لوگوں کو یہ سکھایا کہ وہ ملک کے اندر ایک واحد حکمراں کا اتباع کریں۔ اس نے ہمارے قومیت کے ذخیرہ میں روح اور سرگرمی کے اجزا کا اضافہ کیا اور ایک ایسی نئی تہذیب کا رواج دیا جو ہر طرح سے تحسین کے قابل ہے مسلمانوں کے رسوم و عادات نے اونچی ذات کے ہندوؤں کی عادات و رسوم کو بہت کچھ ابھارا اور جو لطافت و نزاکت کہ ہماری موجودہ سوسائٹی میں پائی جاتی ہے وہ زیادہ تر انہی کا طفیل ہے مسلمانوں نے ملک کے اندر ایک نئی زبان رائج کی جو اپنے ساتھ ایک حیرت انگیز ادبی ذخیرہ رکھتی ہے۔ انہوں نے شاندار اور خوبصورت عمارتیں تعمیر کرا کے ہندوستان کے فن تعمیرات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے"

اسی طرح جہاں مصنف نے مسلمانوں کی کامیابی اور ہندوؤں کی ناکامی کا ذکر کیا ہے وہاں انکے اسباب و علل کے بیان کرنے میں اسی بے تعصبی اور انصاف پسندی سے کام لیا ہے۔ برعکس دیگر مورخین کے جو ہندوستان کی حالت کو مسلمانوں کے حملہ کے وقت نہایت خراب اور ناگفتہ بہ بتاتے ہیں مصنف ممدوح نے صرف ایسے حالات بیان کئے ہیں جو تاریخی حیثیت سے قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے حملہ کے وقت "سارا ملک متعدد خودمختار سلطنتوں میں منقسم تھا جو باہم برسر پیکار رہا کرتی تھیں" انکا اعتراف حق دیکھئے وہ کہتے ہیں کہ "ملک میں فوجی لیاقت یا جنگی قابلیت کا چنداں قحط نہ تھا، اس لئے کہ راجپوت بہترین سپاہی تھے جو ہمت و جوانمردی اور عزم و استقلال میں

دنیا کے کسی دوسری ملک کے لوگوں سے پیچھے نہ تھے۔" یہیں تک نہیں اسلام کے اصولوں اور مسلمانوں کے متعلق انکے خیالات اس سے بھی زیادہ قابل داد ہیں اسی کے آگے چلکر وہ لکھتے ہیں کہ "اسلام ایک ایسی برادری ہے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ، امیر و غریب سب برابر ہیں اور اسمیں افراد کی یا جماعت کو دوسری جماعت سے جدا رکھنے کیلئے کوئی مصنوعی دیواریں موجود نہیں ہیں۔ ایک شخص جو اسلام قبول کرلیتا ہے ایک ایسی برادری میں داخل ہوجاتا ہے جو ایک انسان سے دوسرے انسان میں کوئی امتیاز نہیں رکھتی اور جو سب کو برابر کے حقوق دیتی ہے۔ یہ مسلمانوں کے لئے طاقت و قوت کا ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے وہ اخوت و مساوات کے رشتہ میں باہم جکڑے ہوئے تھے اور اپنے مشترک مفاد کی حفاظت کے لئے باہم متحد و متفق ہوکر سینہ سپر ہوجاتے تھے۔"

لیکن یہ بڑی ناانصافی ہوگی خود مصنف کے ساتھ اگر ان کی بعض خامیوں اور انکے بعض غلط فیصلوں کیطرف بھی مختصراً اشارہ نہ کردیا جائے۔ تمہید میں انہوں نے جس بے تعصبی اور حق پسندی کا ثبوت دیا ہے آگے چلکر افسوس ہے کہ ان اوصاف کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔ آخری باب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے اندر اسلام کی ترقی بیشتر اسکے عقائد کی سادگی کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس وجہ سے تھی کہ یہ حکمراں طاقت کا مذہب تھا جس نے بعض وقت اپنے ماتحت لوگوں سے بزور شمشیر بھی اسے منوایا۔" یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر ایک عرصہ سے سر مغزی ہوتی آئی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ اسقدر بے بنیاد بھی ہے کہ آجتک تحقیق کی روشنی میں فروغ نہ پا سکا۔ افسوس ہے کہ ہمارے محقق مصنف نے بھی اسی غلطی کا ارتکاب کیا اور اس دعوے کے ثبوت میں واقعات و دلائل کا کوئی حوالہ نہیں دیا اسی کے آگے چلکر ایک ذریعہ وہ اور لکھتے ہیں کہ "ذاتی نفع کا خیال مثلاً حکومت میں کسی بڑے عہدے کا حصول بعض وقت لوگوں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر آمادہ کردیتا تھا۔" حالانکہ راجہ مان سنگھ اور راجہ ٹوڈرمل جو عہد اکبری کے آفتاب و ماہتاب تھے انہوں نے اس لالچ میں اسلام تو درکنار اکبر کے نو ایجاد مذہب "دین الٰہی" کے قبول کرنے کا بھی کبھی خیال نہیں کیا بلکہ اس سے صاف انکار کردیا علاوہ انکے ہر عہد میں کتنے اور ہندو عہدیدار تھے جو ہندو رہ کر بھی اپنے عہدوں پر قایم تھے افسوس

ہے کہ جہاں ہمارے لایق مصنف نے اسلام کے پھیلنے کے اس قسم کے ذرائع تلاش کر کے نکالے ہیں وہاں انکی نظر سے اشاعت اسلام کا ایک بہت بڑا ذریعہ رہ گیا اور وہ مشایخ اور بزرگان دین کی صحبت وملاقات کا اثر ہے جس پر اگر وہ غور کریں گے تو اسے اسلام کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ پائیں گے۔

سلطان فیروز تغلق کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ " اس کے ماتحت اسلامی حکومت بالکل مذہبی نوعیت کی ہو گئی اور اس نے ہندو کافروں اور مسلمان ملحدوں پر یکساں تشدد رکھا۔ سلطان کی عدم رواداری کا اظہار اسکے انتظامات ملکی سے ہوتا ہے جس نے مخالفین پر بہت سخت قیود عاید کر رکھی تھیں "۔ یہ ریمارک کرتے وقت ہمارے لایق مصنف شاید اس امر کو فراموش کر گئے ہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مذہب ہر چیز پر غالب تھا اور مذہب حکومت سے کوئی غیر متعلق شے نہیں بلکہ اسکا ایک بہت بڑا جزو ہوتا تھا اسی بنا پر مسلمان بادشاہوں کے ہاں بھی اشاعت دین کا ایک شعبہ رہا کرتا تھا اگر صرف اس بنا پر فیروز تغلق کی حکومت " مذہبی نوعیت " کی ہو گئی تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ باقی رہا اس کے " عدم رواداری " اور دوسرے مذاہب کیساتھ " تشدد " کا سوال، وہ کہیں بھی اسکے انتظامات ملکی سے ظاہر نہیں ہوتا ہے۔ تلقین مذہب کے لئے ' عمال ' کا تقرر جو ہمارے لایق مصنف کے نزدیک سلطان کی " عدم رواداری اور مذہبی " تشدد " کا سب سے بڑا ثبوت ہے، یہ طریقہ آج اس رواداری اور بے تعصبی کے زمانہ میں بھی کچھ برا نہیں ہے۔ ہاں اگر فیروز تغلق کا طرز حکومت ہمارے لایق مصنف کو اس بنا پر کھٹکتا ہے کہ اس کا پیشرو محمد تغلق ایک نہایت آزاد خیال اور غیر مذہبی شخص تھا یا اس سے پیشتر علاؤ الدین خلجی کو مذہب کی اشاعت و تبلیغ سے کوئی سروکار نہ تھا تو البتہ ایک حد تک بجا ہے لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ انکا یہ طرز عمل فرائض حکومت کے ایک بڑے شعبہ سے کوتاہی کرنا تھا۔ لیکن سلطان کے انتظامات ملکی سے کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ صرف مسلمانوں کا بادشاہ تھا۔ نہر، باغات، شفا خانے اور رفاہ عام کے دوسرے ایسے کام جو اس نے کئے وہ کچھ مسلمانوں کے لئے مخصوص نہ تھے بلکہ ان سے ہر مذہب و ملت کا شخص خواہ وہ دوست ہو یا دشمن، یکساں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ علاوہ اس کے اس نے

بیسوں قسم کے ناجائز محاصل اٹھاکر صرف چار قسم کے ضروری اور جائز محاصل باقی رکھے جوان الزامات کی صاف تردید کرتے ہیں۔ بہرحال اس موضوع پر آئندہ کبھی تفصیل کے ساتھ اور بھی لکھا جائیگا اس وقت صرف ان چند اشارات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

تاریخ زوال روما، جلد اوّل۔ یہ انگلستان کے مشہور مورخ اور فاضل ادیب ایڈورڈ گبن کی "ہسٹری آف دی ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر" کی پہلی جلد کا ترجمہ ہے، یہ کتاب کل آٹھ جلدوں میں ہے جس کے مقبول ہونے کا اندازہ صرف اس سے ہوسکتا ہے کہ ابتک اسکے متعدد اور مختلف ایڈیشن نکل چکے ہیں اسکی سب سے پہلی جلد ۱۷۷۶ء میں شائع ہوئی تھی باقی جلدیں بعد میں نکلتی ہیں اردو میں اس کے ترجمہ کا ایک عرصہ سے خیال تھا، بحمداللہ کہ یہ فخر دائرہ ادبیہ لکھنؤ کو اپنے معزز مترجم سید مطلب حسین صاحب بی۔ اے کی مدد سے نصیب ہوا۔ بہرحال جہاں تک کتاب کی تاریخی حیثیت کا تعلق ہے اس کے لئے یکہدینا کافی ہوکہ اسکا زمانہ تصنیف آج سے تقریباً دو صدی پیچھے ہے جس کی وجہ سے اسکی تاریخی اہمیت اب چنداں باقی نہیں رہی ہے اس عرصہ میں یورپ میں اس عہد کی تاریخ پر ہزارہا کتابیں نکلی ہیں جو تحقیق کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بڑھکر ہیں۔ اس کتاب کو جو خاص اہمیت اور شہرت حاصل ہے وہ تاریخی حیثیت سے زیادہ اسکی ادبی حیثیت کی بنا پر ہے۔ ایڈورڈ گبن جہاں ایک بڑا مورخ تھا وہاں اسے ایک بہت بڑے ادیب اور انشا پرداز ہونیکا بھی فخر حاصل ہے۔ اسکی کتاب ناظرین کیلئے جو ایک خاص دلچسپی کا باعث ہے وہ اسکی ادبی حیثیت کیوجہ سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی تصنیف کا ترجمہ جس کی ادبی حیثیت اسکی تاریخی حیثیت پر غالب ہو محض اسکی دوسری ضمنی حیثیت کو ملحوظ رکھکر کرنا کہاں تک حق بجانب ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ترجمہ میں انگریزی کیطرح وہ زور بیان اور وہ خوبی زبان پیدا نہ ہوسکی اور نہ صرف یہی بلکہ بعض جگہ ترجمہ مطابق اصل سے بھی بہت دور ہے جس کا ذکر بہت تفصیل طلب ہے۔

اردو ترجمہ میں ادبی خوبیاں پیدا ہوئیں نہ سہی لیکن اگر کتاب کو اس کے مطالب کی حیثیت سے بھی زیادہ قابل فہم اور آسان بنایا جاتا تو بھی غنیمت تھا۔ مثلاً ان تمام فٹ نوٹوں کا ترجمہ بھی دیا جاتا جو اصل کتاب میں ہیں تو بہتر تھا اور نہ صرف یہی بلکہ اردو خواں طبقہ کے لئے خود اپنی طرف سے بھی فٹ نوٹ بڑھانے کی ضرورت تھی تاکہ قدیم ناموں اور رواقعات کے سمجھنے میں دشواری نہ ہوتی بعض مجالس اور اصطلاحات کا ترجمہ ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے تھا بلکہ ان پر تشریحی نوٹ بھی دینے کی ضرورت تھی۔

لیکن اگر دائرہ ادبیہ لکھنؤ کو اس پورے سلسلہ کا ترجمہ ہی شائع کرنا تھا تو بہتر تھا کہ سب سے پہلے اسکی پانچویں اور چھٹی جلدوں کا ترجمہ شائع کیا جاتا جنمیں ایک بڑی حد تک عرب فتوحات کا ذکر ہے اس صورت میں اردو خواں طبقہ کے سامنے سلسلہ کا سب سے دلچسپ حصہ پہلے آجاتا جس سے انکی دلچسپی پوری کتاب کے ساتھ قایم ہوجاتی اور پھر دائرہ کو بھی یوں مالی امداد کی اپیل نہ کرنی پڑتی۔

ایک بات اور دائرہ کے قابل توجہ ہے اور وہ اسکی طباعت و کاغذ اور سائز و جلد کے بہتر کرنیکے متعلق ہے۔ امید ہے کہ آئندہ جلدوں کی اشاعت میں ان سب امور کا لحاظ رکھا جائے گا اور اسکا بھی کہ مترجم صاحب اپنی تصویر واپس لے لیں جو ایک ایسی بلندپایہ کتاب کے لئے کسی طرح شایاں شان نہیں۔

س - ا

شذرات

وسط ستمبر میں مسز سروجنی نائڈو جامعہ میں رونق افروز ہوئیں آپ نے مدرسہ اور دارالاقامہ کو ملاحظہ کیا اور طلبہ کے سامنے بہت پرجوش اور ہمت افزا تقریر کی اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد میر سنڈیکیٹ اور اساتذہ جامعہ کے ساتھ چائے نوش فرمائی اور مقاصد جامعہ اور عام قومی مسائل پر گفتگو کرتی رہیں۔

ایک چھوٹے سے بچہ نے مسز نائڈو اور مولانا ابوالکلام سے کہا کہ آپ لوگ باوجود اپنی تمامی کوششوں کے ہندوستان میں "امن" قائم نہ کرسکے۔ اب انشاء اللہ ہم بڑے ہوکر اس کام کو انجام دینگے۔ بچہ کی ہمت اور نیک ارادوں پر سب نے تحسین و آفریں کی لیکن قیام امن کے لئے اسکے بڑے ہونے کا انتظار کرنے پر لوگ راضی نہیں ہوئے۔

نومبر میں جامعہ ملیہ کے وفود اکابر قوم کی سرکردگی میں مختلف اقطاع ملک کے دورہ کیلئے چلیں گے مفصل پروگرام آخر اکتوبر تک شائع ہوجائیگا۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے معاصر اخبار و رسائل ان حضرات کی آواز کو لوگوں کے کانوں تک پہنچانے میں ہماری مدد کرینگے۔

اس نمبر میں جامعہ کے لائق طالب علم عبدالقادر صاحب جونپوری نے خلافت اسلامیہ پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے اس اہم مسئلہ سے محض علمی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ بعض اہل علم کو مضمون نگار کے چند مقدمات و نتائج سے اختلاف ہو۔ ہم ان حضرات سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ضرور اس مضمون کا مدلل جواب لکھیں لیکن اسی سلامت روی اور متانت کے ساتھ جو مضمون نگار نے مدنظر رکھی ہے۔

۲۹ر اکتوبر کو جامعہ میں یوم التاسیس کا جلسہ ہے جو اس دارالعلوم کی تاریخ میں یوم الست کا حکم رکھتا ہے۔ جامعہ کے پرانے طالبعلموں اور عموماً "یاران نکتہ داں" سے درخواست ہے کہ اس جلسہ میں تشریف لاکر عہدِ وفا کو تازہ کریں۔

جرمنی مجلس اقوام میں داخل ہوگیا۔ داخلہ کی درخواست باتفاق رائے منظور ہوئی۔ ۱۸۱۵ء جب ڈیوک آف ولنگٹن واٹرلو کے میدان میں نپولین سے لڑ رہا تھا تو اسکی فوج نے بھی جرمن سپہ سالار ربلوشر کی یہ درخواست کہ وہ انکے ساتھ مل کر نپولین سے جنگ کرے باتفاق رائے منظور کی تھی۔

۳۰ر اگست کو بجواڑہ میں گورنر مدراس نے انذہرا یونیورسٹی کی سینیٹ (مجلس تعلیمی) کا افتتاح کیا۔ آپنے اپنی تقریر میں دیسی زبانوں پر زیادہ زور دینے کی مخالفت کی اور انذہرا یونیورسٹی کے اس فیصلہ پر کہ اعلیٰ تعلیم انگریزی میں ہوگی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ آپنے فرمایا کہ "انگریزی زبان و ادب اعلیٰ درجہ کے ذہنی عطیے ہیں جو مغرب نے مشرق کو دئیے ہیں اور ان مضامین کا معیار گھٹا دینے سے یونیورسٹی کے مقاصد کو سخت نقصان پہنچے گا۔ تہذیب عالمگیر چیز ہے اور اس کے حدود وہی ہیں جو انسانیت کے ہیں"۔

گورنر صاحب کی یہ تقریر اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی تحریک تنگ نظر نہیں بلکہ وسیع النظر ہے اور دنیا میں تفریق نہیں بلکہ اتحاد پیدا کرنا چاہتی ہے۔ سیاست داں عالمگیر برادری۔ عالمگیر زبان عالمگیر تہذیب اور ان سب کے عطر مجموعہ انجمن اقوام کے سب سے بڑے حامی ہیں لیکن ایک شرط کے ساتھ سب قوموں میں اخوت قائم ہو مگر انکی ابوت کا شرف انگلستان کو حاصل ہو تمام دنیا میں ایک زبان بولی جائے مگر وہ انگریزی زبان ہو ایک تہذیب

کا دور دورہ رہے لیکن وہ انگریزی تہذیب ہو۔ انجمن اقوام دنیا کی تمام قوموں کے نزاعات فیصل کرے لیکن انگریزی مصالح کے مطابق خدا جانے عالمگیر ہو توف اس ذراسی شرط کو کیوں قبول نہیں کر لیتے۔

مجلس اقوام کا جو سیشن ستمبر سے شروع ہوگا اُس میں ہندوستان کے نمائندے سر ولیم ونسنٹ، شیخ عبدالقادر صاحب اور مہاراجہ کپورتھلہ ہونگے۔

ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب مجلس اقوام اپنے نظام کی رو سے سلطنتوں کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دے سکتی تو ہندوستان کے نمائندے اُس کے اجلاس میں کیوں بھیجے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ممالک غیر اور ہندوستان کے تعلقات کے بابتہ یہ نمائندے ایک لفظ کہنے کے مجاز نہیں اور ہندوستان کے اندرونی معاملات کی نسبت دوسرے ممالک کے نمائندے اظہار رائے سے معذور ہیں تو پھر ان دونوں کی باہمی گفتگو کا نتیجہ ہندوستان کے لئے کیا نکلے گا۔ البتہ اگر یہ اجتماع علم الانسان کی ترقی اور بہبود کے لئے ہے اور اسمیں مختلف قوموں اور نسلوں کے نمونوں کی ضرورت ہے تو دوسری بات ہے لیکن ایسی حالت میں ہندوستانی نمونوں کی تعداد بہت زیادہ ہونے کی ضرورت تھی۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ مہاراجہ صاحب کشمیر نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے ریاست کشمیر کے مدارس میں اچھوت ذات کے بچوں کے پڑھنے کی اجازت دیدی ہے خدا کرے اور ریاستیں بھی اسکی تقلید کریں لیکن یہ واضح رہے کہ ملک کی موجودہ حالت دیکھتے ہوئے صرف اجازت دیدینا کافی نہیں ہے اچھوت ذاتوں کو صدیوں سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ کچھ اس سبب سے اور کچھ اپنے افلاس کے بدولت انہیں طلب علم کی خواہش ایسی دب گئی ہے

کہ اس کے ابھار کے لئے خاص کوششوں کی ضرورت ہے۔

مہاراجہ صاحب کوٹہ نے ایک جدید قانون کی رو سے اپنی ریاست میں ۱۸ برس سے کم عمر کی عورتوں کو تبدیل مذہب کی ممانعت کر دی ہے اسکے علاوہ ہر شخص کے لئے جو اپنا مذہب بدلنا چاہے یہ لازمی کر دیا ہے کہ وہ مجسٹریٹ سے ایک تصدیق نامہ لے لیا کرے۔ ہمیں امید ہے کہ ریاست کے مجسٹریٹ اور وہاں کی پولیس اس قانون پر دیانت داری سے عمل کر کے ہر مذہب کے نیک نیت مبلغین کے لئے آسانی اور مفسدوں کے لئے دشواری پیدا کرے گی۔

انگلستان کے معزز اخبار نیشن نے اپنے ملک کے لوگوں کے مذہبی عقائد معلوم کرنے کیلئے چند سوالات شائع کر کے اپنے پڑھنے والوں سے جوابات مانگے ہیں اور وعدہ کیا ہے کہ ان جوابات کا خلاصہ بغیر ناموں کے اظہار کے چھپے گا اگرچہ ایک اخبار کے پڑھنے والوں میں ہر قسم کے عقائد کے ماننے والوں کا ہونا ضروری نہیں پھر بھی اس تفتیش کا نتیجہ یقیناً بہت دلچسپ اور مفید ہوگا۔

اس کی تقلید میں اگر ہندوستان کا کوئی اخبار اس طرح کے سوالات شائع کرے اور لوگ جواب بھی دیں تو غالباً اس کے پورے ایک سال کے نمبر بھی ان جوابات کو شائع کرنیکے لئے کافی نہ ہوں بلکہ اگر اور مذاہب کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کے مختلف عقائد کا شمار کیا جائے تو شمار کرنے والا یقیناً تھک کر چھوڑ بیٹھے۔

افراد کے عقائد سے قطع نظر کر کے اگر فرقوں کی تعداد گنی جائے تو صرف مسلمانوں کے فرقوں کی تعداد حیرت و افسوس کا قابل عبرت نمونہ پیش کرے گی۔ اصولاً وہ لوگ حق پر ہیں جو اس بات کے دعویدار ہیں کہ اسلام ایک ہی مذہب ہے اور اسمیں کوئی فرقہ نہیں لیکن صورت حال یہ ہے

کہ اپنے سوا سب کو کافر سمجھنے والے فرقوں کی تعداد بلا مبالغہ کئی سو سے کم نہیں ہے۔

(ع - ح)

ناظرین رسالہ جامعہ غالباً بھولے نہوں گے کہ تین چار مہینہ قبل ہمارے رسالہ میں پروفیسر مارگولیتھ کے ایک مضمون کا ترجمہ شائع ہوا تھا جسکا مقصد مختصر الفاظ میں یہ ثابت کرنا تھا کہ عربی شاعری کا وہ حصہ جو زمانہ جاہلیت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے درحقیقت عہد اسلام کا ایک شاندار عمل ہے۔ اسلام سے قبل شاعری کی صورت ہرگز وہ نہ تھی جو دکھائی جاتی ہے۔ نہ امراء القیس کا وجود تھا اور نہ اسکے مشہور معلقہ کا۔ نہ طرفہ کی کوئی حقیقت تھی اور نہ "لخولۃ اطلال" کی عمرو بن کلثوم عرب میں کوئی شاعر گذرا ہے اور نہ "الاھبی ..." سے جو قصیدہ شروع ہوتا ہے وہ اسکی تصنیف ہے۔

ابھی ابھی مصر سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جسکا نام "فی الشعر الجاہلی" ہے اور پروفیسر طٰہٰ حسین استاد جامعہ مصریہ کی تالیف ہے۔ اسکا مقصد بھی قریب قریب وہی ہے جو پروفیسر مارگولیتھ کے مضمون کا تھا۔ تمہید میں خود مولف نے مختصراً ان تمام مباحث کو جمع کر دیا ہے جو بالتفصیل کتاب میں درج ہیں فرماتے ہیں "سب سے پہلی بات جو میں کہنی چاہتا ہوں یہ ہے کہ مجھے ایک زمانہ میں شعر جاہلی کی قدر و قیمت پر شبہ ہوا اور یہ شبہ روز بروز بڑھتا گیا میں نے غور و فکر سے کام لیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس شاعری کا بیشتر حصہ جو جاہلیۃ سے منسوب کیجاتی ہے کسی طرح زمانہ جاہلیۃ کا نہیں ہو سکتا بلکہ یہ سب کا سب عہد اسلامی کی اختراع ہے اور بجائے اس کے کہ حیات جاہلی کا اس سے کچھ اندازہ ہوسکے یہ آئینہ ہے اسلامیوں کی تہذیب اور انکی خواہشات کا۔ اب اگر کچھ حصہ واقعی زمانہ جاہلیۃ کا ہے بھی تو وہ اتنا قلیل ہے کہ اس سے ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور نہ یہ مناسب ہے کہ زمانہ جاہلیۃ کی ادبی حالت کی صحیح تصویر کھینچنے میں ہم اس پر اعتماد کریں۔ بس یہ کہنے سے ذرا بھی نہیں جھجکتا کہ وہ اشعار جنہیں آپ امراء القیس یا طرفہ یا ابن کلثوم یا عنترہ کے سمجھکر پڑھتے ہیں

ہرگز انکے نہیں ہیں بلکہ وہ یا تو رواۃ کے گھڑے ہوئے ہیں یا نحویین مفسرین۔ محدثین اور متکلمین کی صنعت کا نتیجہ ہیں۔ بحث کا خاتمہ یہیں نہیں ہوتا بلکہ میں آپ کو یہ بھی دکھاؤں گا کہ فنی اور لغوی حیثیت سے بھی انکے نہیں ہو سکتے۔ یہ بحث ہمیں ایک عجیب و غریب نتیجہ پر پہنچاتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کی تفسیر یا احادیث کی تاویل میں جو استشہاد اشعار عرب سے کیا جاتا ہے وہ بالکل غیر مناسب ہے اور بجائے اس کے کہ قرآن کی تفسیر ان اشعار سے ہو ہمیں خود [illegible] کی تحقیق اور تعین کے لئے قرآن کی مدد درکار ہوگی۔ مجھے بالکل یقین ہے کہ ان اشعار سے ہم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے اور نہ قرآن اور حدیث کا یقینی مفہوم سمجھنے میں ان سے کچھ مدد مل سکتی ہے اصل یہ ہے کہ علمائے قرآن اور حدیث سے جو مفہوم نکالنا چاہا اسکے لئے اشعار گھڑ کر شعرا کیطرف منسوب کر دیئے۔

مصر میں اس کتاب سے ایک ہلچل پیدا ہوگئی ہے چنانچہ وہاں کے علماء نے بہت کچھ رد و قدح بھی کی ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ شیخ اظہر نے علمائے جامع اظہر کی ایک مجلس منعقد کرکے اس کتاب کو انکے سامنے پیش کیا اور انہوں نے بعض اعتراضات کی وجہ سے جو مولف نے دوران بحث میں قرآن پر کئے ہیں اس تصنیف کو ملحدانہ قرار دیا۔ انکا یہ فیصلہ المنار بابت مئی ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا ہے۔ ہم انشاء اللہ کسی قریبی اشاعت میں اس کتاب کے مباحث کا خلاصہ ناظرین "جامعہ" کی خدمت میں پیش کرینگے اور علمی حیثیت سے اس پر کچھ تبصرہ بھی کرینگے۔

ع - ع

رجسٹرڈ نمبر ۱۸۹۲

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد [illegible]	اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ عیسوی	نمبر ۴

فہرست مضامین

جامعہ

جلد ۷ | ماہ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ مطابق اکتوبر ۱۹۲۶ء | نمبر ۴

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ

(۴)

مضمون سابق میں ہم جامعہ یا دارالعلوم کے دوسرے مقصد یعنی علمی تحقیقات کے اصولی اور عملی پہلو سے بحث کر چکے ہیں۔ اس مضمون میں ہم اسکے تیسرے مقصد یعنی اشاعت علوم کا مختصر ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

علمی تحقیقات سے جن لوگوں کو شغف ہے انکا دائرہ محدود ہے محققین کی تعداد تو کم ہوتی ہی ہے لیکن وہ لوگ بھی جو بلند پایہ علمی کتابوں کو سمجھ سکتے ہیں تھوڑے ہیں۔ اس کے کئی سبب ہیں اول تو اس زبان اور انداز بیان سے جس کے اختیار کرنے پر محقق اختصار اور صحت کے خیال سے مجبور ہے۔ عام لوگ غیر مانوس ہوتے ہیں۔ دوسرے اُن مسائل کا جن سے علمی کتابوں میں بحث کیجاتی ہے۔ عام تمدنی زندگی سے تعلق ہر شخص کے پیش نظر نہیں ہوتا تیسرے وہ جزویات

جنہیں محقق اپنے کلام کی تکمیل اور استدلال کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ سوائے ماہرین فن کے کسی کیلئے دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس لئے یہ توقع بالکل بجا ہے کہ علمی تحقیقات کے نتائج سے عام افراد قوم براہ راست مستفید ہوسکیں گے۔

ان نتائج سے عام لوگوں کو آگاہ کرنے کیلئے ضرورت ہے کہ ہر مسئلہ کا تعلق مجموعی تمدنی زندگی سے دکھایا جائے تاکہ ٹھوس علمی مذاق نہ رکھنے والے بھی اسکی طرف متوجہ ہوں انداز بیان دلکش اور زبان عام فہم اور سلیس ہو مثالیں کثرت سے استعمال کیجائیں اور حتی الامکان غیر دلچسپ جزئیات کو نظر انداز کر دیا جائے۔

لیکن علمی مسائل کو عام پسند بنانے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ عوام کے مذاق اور فہم کی رعایت سے حقیقت سے سر مو تجاوز کیا جائے یا انداز بیان میں ثقاہت کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ اشاعت علوم میں یہ غلطی اکثر ہوتی ہے کہ مصنفین نفس مضمون اور طرز ادا دونوں میں عوام کے مذاق کا نامناسب حد تک تتبع کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انکو صید ہارنے کے لئے اپنے آپ کو بگاڑ لینا جائز ہے یہ نہایت خطرناک طریقہ ہے علم و ادب میں جہاں ایک بار رکاکت اور سوقیانہ پن پیدا ہوگیا تو پھر اسکی اصلاح کسی طرح ممکن نہیں۔ شاعر کا مشہور قول۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج

چونے اور گارے کے مکان سے کہیں زیادہ تصورات و معانی کی عمارت پر صادق آتا ہے

ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اگر ہم علوم فنون کو سہل اور دلچسپ بنا سکیں تو بہت بڑی بات ہے۔ اگر اہل علم کی ذہنی کمائی سے وہ لوگ بھی بالواسطہ مستفید ہوسکیں جنہیں بلاواسطہ فیضیاب ہونے سے فطرت یا زندگی نے محروم رکھا ہے تو قوم کا عام علمی معیار بلند ہوجائیگا اور اسکی بدولت دوسرے تمدنی شعبوں میں بھی اس کے لئے ترقی کے دروازے کھل جائینگے۔

اشاعت علوم کے معنی کی توضیح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اسمیں اور سیاسی و مذہبی تبلیغ

میں جو فرق ہے اُسے نمایاں کیا جائے۔ اشاعت علوم کا مقصد اصولی حیثیت سے ان دونوں سے اُسی طرح مختلف ہے جس طرح اُسکا موضوع ان دونوں کے موضوع سے سیاست قلبی جذبات سے تعلق رکھتی ہے اور مذہب عقیدہ اور وجدان سے جو احساسات کی سب سے لطیف شکل ہے یہ دونوں چیزیں علمی تنقید اور منطقی تحلیل کی خشکی کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتیں۔ برخلاف اس کے علم سراسر عقل کا تابع اور اسکی کسوٹی یعنی منطق کا پابند ہے اس لئے سیاست، مذہب اور علم کی نشر و اشاعت کے طریقے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔

سیاسی خیالات کا ناشر خطابت کی مدد سے لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ اور اُن کے دماغ کو مسحور کرتا ہے۔ مذہبی عقائد کا مبلغ اسرار معرفت کا جلوہ دکھا کر انکے دلوں کو موہ لیتا ہے لیکن علمی مسائل کا شائع کرنے والا اُن کی عقل سے خطاب کرتا ہے اور انہیں دلائل و براہین سے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اشاعت علوم میں سیاسی یا مذہبی تبلیغ کا طریقہ اختیار کرنے سے ممکن ہے کہ عوام زیادہ متاثر ہوں لیکن اصل مقصد یعنی ان میں غور و فکر کی عادت اور علمی تنقید کی صلاحیت پیدا کرنا فوت ہو جائے گا۔

مگر یہ واضح رہے کہ باوجود مقصد اور طریق کار کے اختلاف کے اشاعت علوم مذہب اور سیاست سے بے تعلق نہیں ہو سکتی۔ اسے ان دونوں سے مثبت اور منفی دونوں طرح کا علاقہ تو یہ ہے کہ خود سیاست اور مذہب کتنے ہی محدود معنی میں سہی علم کے موضوع ضرور ہیں۔ اشاعت علوم اُسوقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جبتک کہ علم دین اور فن سیاست کے مسائل بھی عام فہم انداز میں افراد قوم کے سامنے پیش نہ کر دیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں طرز بیان خطیبانہ اور مبلغانہ نہیں بلکہ ناقدانہ ہوگا اور یہ ناگزیر ہے۔ سیاست اور مذہب جبتک قلوب کے حجلہ میں پوشیدہ ہیں عقل سے بالا ہیں لیکن جب علم کے میدان میں آئینگے تو انہیں منطقی تحلیل اور علمی تنقید کی ناگوار روشنی کا مقابلہ کرنا پڑیگا۔ منفی علاقہ اشاعت علوم کا مذہب اور سیاست سے یہ ہے کہ قابل اشاعت کتابوں کے انتخاب میں سیاسی اور مذہبی مصالح کے ماتحت احتساب کی ضرورت ہے۔ علمی

تحقیق میں ہیں جو آزادی تھی وہ اشاعت علوم میں نہیں ہو سکتی کیونکہ اسکے مخاطب پختہ مغز
خواص نہیں بلکہ خام دل عوام ہوتے ہیں۔ ایسی تصانیف جن سے ہمارے تمدن پر غیروں کے
تمدن کی برتری ثابت ہوتی ہو اہل نظر کے لئے عبرت اور بصیرت رکھتی ہیں لیکن کوتاہ اندیشوں
میں انکی اشاعت قومیت کے شریف احساس کو دباتی ہے اور غلامی کے جذبہ کو ابھارتی ہے
اسی طرح جو کتابیں کفر و الحاد کے نقطۂ نظر سے لکھی جاتی ہیں۔ وہ ممکن ہے کہ محققین کے لئے خاص
علمی قدر رکھتی ہوں لیکن عوام ان سے سوائے بے دینی اور استخفاف مذہب کے کچھ نہیں سیکھتے
اسلئے ناشران علوم کا فرض ہے کہ ایسی چیزوں کو جو علمی طرز ادا کے پردہ میں عوام سے پوشیدہ
ہوتی ہیں عام فہم اسلوب میں لاکر انکی ذہنی ہلاکت کا سامان نہ کریں غیر ذمہ دار غفلت مآب
اور آزادی پرست اس پر بہت چراغ پا ہونگے لیکن جو لوگ فلسفہ تمدن کے ماہرین اور اخلاقی
ذمہ واری کا احساس رکھتے ہیں وہ اس اصول سے حرف بحرف اتفاق کریں گے۔ نفی
حکمت مکن از بہر دل عامے چند ایسا قول ہے جسے ہر عاقل تسلیم کریگا لیکن اسکا اطلاق موجودہ
صورت پر نہیں ہوتا۔

ان سب باتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچیگا کہ اشاعت علوم آسان کام نہیں
ہے ایسی کتابیں جنمیں علمی مسائل سے بحث کیجائے لیکن علمی طرز ادا نہ اختیار کیا جائے جنکی زبان
عام فہم ہو لیکن بازاری نہ ہو جو لوگوں کو معقول کریں لیکن مسحور کریں جو ذہنی اور سیاسی اغراض
کی محافظ ہوں لیکن پابند نہ ہوں ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ اس کے لئے ایسے شخص کی ضرورت
ہے جو ایک علم یا مختلف علوم پر اتنا عبور رکھتا ہو کہ اصطلاحات کے پردے کو ہٹا کر معانی کو
بے نقاب دیکھ سکے اور دوسروں کو دکھا سکے۔ جسے زبان اور طرز ادا پر اتنا قابو ہو کہ مشکل
مطلب کو آسان پیرایہ میں ادا کر سکے۔ جسے عوام کی نفسی زندگی میں اتنا درک ہو کہ انکی ذہنی
ضروریات کا پورا احساس کر سکے اور ان سے اتنی محبت کہ انکی خدمت کو کسر شان نہ سمجھے
جو اسقدر دیانت دار ہو کہ مذہب و سیاست کے نام سے بیجا فائدہ نہ اٹھائے اور اس درجہ

فرض شناس کہ انکی مخالفت سے باز رہنے کے لئے اپنے دائرہ عمل کو محدود کرینگے ایسے لوگ دنیا میں کم ہوتے ہیں اور مشکل سے ملتے ہیں۔

اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ جامعہ ملیہ جس کے فرائض میں اشاعت علوم بھی داخل ہے اس کام کو کس طرح انجام دے سکتی ہے۔ علمی تحقیقات کیلئے ہم اردو اکادمی کے قیام کی تجویز پیش کر چکے ہیں۔ کیا اسی سے اشاعت علوم کی خدمت بھی لیجا سکتی ہے؟ اس میں شک نہیں کہ علمی تحقیقات اور اشاعت علوم کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں بہت سے فائدے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک ہی شخص کی ذات میں دونوں کاموں کی صلاحیت شاذ و نادر ہی ہوتی ہے اس لئے۔ اکادمی کو چاہئے کہ اپنے اراکین میں ایسے لوگوں کو بھی شامل کرے جو ہر حیثیت سے نشر علوم کے اہل ہوں یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو باہر کے لوگوں سے کام لے۔

غالباً اس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ اشاعت علوم میں سب سے مقدم مدارس کے لئے نصاب تعلیم کا تیار کرنا اور شائع کرنا ہے۔ کیونکہ بچوں کو طلب علم کے راستہ پر لگانا قوم کی ذہنی اصلاح کی پہلی منزل ہے بدقسمتی سے ابتک ہمارے ملک میں نصاب تعلیم کے بنانے میں یا تو سرے سے کوئی اصول مدنظر نہیں رکھا جاتا یا زیادہ سے زیادہ اسکی کوشش ہوتی ہے کہ علوم متداولہ کے حاصل کرنے میں کسی قدر آسانی پیدا کیجائے۔ نصاب تعلیم کو وسیع تمدنی نقطۂ نگاہ سے ترتیب دینا اسمیں سارے قوائے ذہنی کی ہم آہنگ نشو و نما کو ملحوظ رکھنا ہم لوگ ابھی جانتے ہی نہیں۔ اردو اکادمی کو اپنے شعبۂ اشاعت علوم میں سب سے پہلے ان اصول کے ماتحت جنکا ذکر ہم اس مضمون کے پہلے حصہ میں تعلیمی دستور العمل کی ضمن میں کر چکے ہیں نصاب تعلیم کے ترتیب دینے اور شائع کرنے کیطرف توجہ کرنا چاہئے۔

عام لوگوں میں اشاعت علوم کی ابتدا ادب اور دوسرے فنون لطیفہ سے ہونا چاہئے تاریخ تمدن شاہد ہے کہ قومیں اپنے ذہنی ارتقا کی پہلی سیڑھی فنون لطیفہ کو بناتی ہیں۔ ذہن انسانی اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے "حق" اور "خیر" کی بلندی تک پہونچنے کے لئے

"حسن اس کے زینہ کا محتاج ہے۔ علمی غور وفکر کی بنیاد تخئیل ہے اور تخیل کو مجرد معانی کے ادراک سے پہلے مشاہدہ جمال کی منزل سے گذرنا پڑتا ہے۔ جس طرح بعض مذاہب دنیا اور عقبیٰ کے درمیان ایک برزخ کے قائل ہیں بعض فلسفی بھی انسان کی حسی اور شہوانی پستی اور خالص اخلاقی و روحانی بلندی کا درمیانی برزخ ذوق حسن کی کیفیت کو قرار دیتے ہیں۔ پس اشاعت علوم کے ارتقائے مدارج میں ادب اور فنون لطیفہ کا نمبر اور علوم سے پہلے آنا چاہئے۔

ادب خصوصاً شاعری کا چرچا ہمارے ملک میں ضرورت سے زیادہ ہے مگر تنقید کی کمی سے لوگوں کا مذاق نہایت ناہموار ہے۔ وہی لوگ جو ادبی روح کے بہترین مظاہر کا لطف اٹھاتے ہیں ادنیٰ فسانوں اور رکیک اشعار پر بھی سر دھنتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ادب اردو کے بہترین نمونے تنقیدی مقدمات کے ساتھ شائع کئے جائیں۔ ان چیزوں کی اشاعت میں کتابت، طباعت اور کاغذ کی عمدگی اور خوشنمائی پر بھی بہت زور دینا چاہئے تاکہ روح کے ساتھ نظر بھی مسرور ہو۔ اسی سلسلہ میں غیر زبانوں کی بہترین ادبی کتابوں کا ترجمہ بھی عوام کے مذاق کو وسیع اور بلند کرنے کے لئے لازمی ہے۔

دوسرے فنون لطیفہ موسیقی، نقاشی، سنگتراشی اور فن تعمیر وغیرہ پر افسوس ہے کہ اردو میں کوئی معقول کتاب موجود نہیں کیونکہ ابھی تک بظاہر لوگوں کو ان فنون سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ حسن جس کے مختلف مظاہر یہ فنون ہیں ہر جگہ اور ہر چیز میں ایک ہے۔ اگر کوئی شعر کے آئینہ میں اسکی جھلک دیکھ سکتا ہے تو یقیناً وہ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ دوسرے فنون لطیفہ میں بھی اس کے جلوہ کا مشاہدہ کرے۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ صلاحیت اب تک عام تمدنی انحطاط کے سبب سے جس کا ایک نتیجہ تشدد فی المذہب بھی ہے دبی ہوئی ہے اور کوشش کرنے سے ابھر سکتی ہے۔ اگر ہم اپنی قوم میں ذوق جمال پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ادب اور شاعری گلزار حسن کی صرف ایک کیاری ہے جس سے شاہد چمن کی خوبی کا بہت کم اور بالکل یک طرفہ اندازہ ہوتا ہے۔ کامل نظارے کے لئے ضرورت

ہے کہ ہم باغ کے ہر گوشہ کو دیکھیں اور ہر پہلو سے دیکھیں۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

ادب اور فنون لطیفہ سے بہ قدر ضرورت مذاق پیدا ہونیکے بعد عام افراد قوم کا ذہن اس قابل ہو جاتا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ کر سکے۔ تاریخ کا مواد ظاہر ہے کہ واقعات اور حالات کا ایک بار ہوتا ہے جس پر عبور پانا بادی النظر میں ناممکن معلوم ہوتا ہے صرف ایسی نظر جو بغیر کسی تلاش و کوشش کے اہم حصوں کا انتخاب کر لیتی ہے اور ایسا تخیل جو بلا کسی سعی کے انکو ملا کر ایک مکمل جیتی جاگتی تصویر گزرے ہوئے زمانہ کی تیار کر سکتا ہے تاریخ کے مشاہدہ پر قادر ہے نظر اور یہ تخیل صرف وہ لوگ رکھتے ہیں جو فنون لطیفہ کے اعلیٰ نمونوں میں مرکزی نقوش اور ضمنی خطوط کا فرق معلوم کرنے کی مشق کر چکے ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ کی اہمیت قوموں کی ذہنی اور تمدنی ترقی کیلئے دلائل کی محتاج نہیں وہ بغیر اپنی تاریخ سے واقفیت حاصل کئے یہ نہیں جان سکتیں کہ انکے تمدن کی نشو ونما کا کیا رخ رہا ہے اور بغیر یہ جانے اندازہ نہیں کر سکتیں کہ آئندہ اسکا رخ کیا رہیگا۔ ہماری قوم میں ادب اور شاعری کی طرح تو نہیں پھر بھی کسی قدر شوق تاریخ کا موجود ہے لیکن بدقسمتی سے اسمیں بھی ہمارا مذاق صحیح نہیں خصوصاً اسلامی تاریخ کیطرف ہمارا جو رویہ ہے وہ علمی گہرائی اور تنقید سے بہت دور ہے ہم یا تو ہر ملک کے اور ہر زمانہ کے مسلمانوں کو معصوم مانتے ہیں اور انکے ہر فعل کو جائز ثابت کرنے میں حق ناحق کا امتیاز اٹھا دیتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے متعلق کچھ دن پہلے تک جاہل و متعصب مورخوں کی بدولت اہل یوروپ کے جو خیالات تھے وہ حرف بحرف صحیح ہیں۔

اردو اکادمی کا فرض ہے کہ اسلامی تاریخ اور دوسری قوموں کی تاریخ پر منصف مزاج اور قابل لوگوں سے کتابیں لکھوا کر شائع کرے۔ قوم کے عام مذاق کو بلند کرنے کیلئے اگر فلسفہ تاریخ پر بھی بعض کتابیں شائع ہو جائیں تو بہتر ہے۔

تاریخ کے بعد علوم صحیحہ کی باری آتی ہے۔ سائنس اور ریاضی سے مسلمانوں کی ناواقفیت

کا نوحہ اتنی بار بلند کیا جا چکا ہے کہ ہم اُسے از سرِ نو بلند کرنا ضروری نہیں سمجھتے ۔ ہم اُردو اکاڈمی کو اس میدان میں بھی دعوتِ عمل دیتے ہیں ۔

فلسفہ اور مذہب کی (علمی) کتابیں شائع کرنے کا وقت ان سب کے بعد آتا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ علوم اُن علوم سے کم درجہ کے ہیں جنکی اشاعت کو ہم نے مقدم رکھا ہے بلکہ اس ترتیب میں یہ مصلحت ہے کہ جیسے جیسے قوم کا دماغ ذہنی ارتقا کے مدارج طے کرتا جائے اور نئی قوتیں حاصل کرتا جائے اُس کے سامنے زیادہ اہم اور زیادہ پیچیدہ مسائل پیش کئے جائیں دوسرے الفاظ میں یہ ترتیب اہمیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اسمیں آسان چیزوں کو پہلے اور مشکل چیزوں کو بعد میں رکھا گیا ہے ۔ فلسفہ اور مذہب کا علمی پہلو وہ چیزیں ہیں جنکے مطالعہ کے لئے اعلیٰ درجہ کے بالغ النظر اور پختہ مغز لوگوں کی ضرورت ہے ۔ عام افرادِ قوم ان سے اسی وقت استفادہ حاصل کر سکتے ہیں جب وہ تمدن کے دوسرے شعبوں پر پورا قابو حاصل کر چکے ہوں ۔

یہ دستور العمل جو ہم نے پیش کیا ہے اصولی ہے عمل میں اکثر انسان اصول سے تجاوز کرنے پر مجبور ہوتا ہے ہندوستان کے ناشرانِ علوم کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے ہمیں امید نہیں کہ ہماری مجوزہ ترتیب پر پورا عمل ہو سکیگا ۔ پھر بھی جہاں تک ہو سکے اُردو اکادمی کو اس کی کوشش کرنا چاہیئے ۔

ہندوستانی زراعت کی کمزوریاں

(نمبر ۱) زمین

ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ یہاں کی تقریباً ۷۰ فیصدی آبادی کی گذر صرف زراعت پر ہوتی ہے۔ یہاں کی آبادی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ زراعت پیشہ لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں زراعت ایک قابل عزت پیشہ سمجھا جاتا ہے اور ہندوستانی کاشتکار زراعت کے علاوہ اور پیشوں سے جو بے اعتنائی برتتے ہیں اسے دیکھکر تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ غالباً یہ بھی فرانس کے علمائے متوکلین (PHYSIOCRATS) کی طرح زراعت کے علاوہ دوسرے پیشوں کو پیداآور نہیں سمجھتے۔ ہندوستانی کاشتکار کا زراعت سے اس درجہ شغف ایک بالکل فطری امر ہے کیونکہ ملک خاص طور پر اسی کام کے لئے موزوں ہے اور صدیوں سے ہی یہاں کا پیشہ رہا ہے۔

ہندوستان میں تقریباً ہر قسم کی زرعی پیداوار ہوتی ہیں اور وہ بھی نہایت کثرت کے ساتھ۔ چاول جو کہ انسانوں کی عام غذا ہے اسکا تقریباً نصف حصہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ گیہوں بھی کافی مقدار میں ہوتا ہے چائے جو متمدن ممالک کی ایک اشد ضرورت پوری کرنیوالی چیز ہے اس کی ۷۰ فیصدی طلب ہندوستان اور سیلون ملکر پورا کرتے ہیں۔ ارنڈی وغیرہ کی قسم کی بعض چیزیں جن سے تیل نکالا جاتا ہے۔ ہندوستان کے سوا اور کسی جگہ پیدا نہیں ہوتیں۔ مندرجہ ذیل نقشے سے ہندوستان کی وسیع زرعی پیداوار کا کسی قدر اندازہ ہوسکے گا۔

فصل	سنہ ۱۹۱۵ ۱۹۲۰ء	سنہ ۱۹۲۰ – ۱۹۲۱ء
چاول ٹن	۳۲،۰۰۰،۰	۲۸۰۳۳۰۰۰
گیہوں "	۱۰۱۲۲۰۰۰	۶۷۱۹۰۰۰
گنا "	۳ ۳۶۰۰۰	۲۴۶۵۰۰۰

فصل	سنہ ۱۹۱۹-۱۹۲۰ء	سنہ ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء
السی ٹن	۴۱۹۰۰۰	۲۶۹۰۰۰
سرسوں "	۱۱۵۳۲۰۰	۸۴۸۰۰۰
سمسم تل "	۴۴۹۰۰۰	۲۶۸۰۰۰
سپاری "	۸۲۲۰۰۰	۹۳۰۰۰۰
روئی گٹھے	۵۷۹۶۰۰۰	۳۵۵۵۰۰۰
سن "	۸۴۸۱۰۰۰	۵۹۱۵۰۰۰
نیل ہنڈرویٹ	۳۸۰۰۰	۴۰,۰۰۰
چائے پونڈ	۳۷۷۲۵۵۰۰۰	۳۴۵۳۴۰,۰۰۰

لیکن اگر ہندوستان کی فی ایکڑ پیداوار کا خواہ وہ کسی چیز کی ہو دوسرے ممالک کی فی ایکڑ پیداوار سے مقابلہ کیا جائے تو ہندوستان کے صدیوں زراعت میں مشغول رہنے کے باوجود اس کی پستی دیکھ کر حیرت ہوگی۔ ہندوستان میں گنے کی پیداوار فی ایکڑ دس ٹن ہوتی ہے اور یہی چیز جاوہ میں فی ایکڑ چالیس ٹن پیدا ہوتی ہے روئی کی پیداوار ہندوستان میں فی ایکڑ صرف ۹۰ پونڈ ہے حالانکہ یہی پیداوار امریکہ میں فی ایکڑ ۲۰۰ پونڈ اور مصر میں ۴۵۰ پونڈ ہے۔ ہمارے ہاں ایک ایکڑ زمین میں جتنا چاول ہوتا ہے جاپان میں اس سے پورے دوگنا پیدا ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل نقشے میں دنیا کے دیگر ممالک میں مختلف اشیاء کی فی ایکڑ پیداوار اور اسی کے مقابلے پر ہندوستان میں انہی اشیاء کی فی ایکڑ پیداوار کا موازنہ کرنے سے ہندوستانی زراعت کی پست حالت کا صحیح اندازہ ہوسکے گا۔

نام ملک	گیہوں	جو	مکا	چاول	چائے	روئی	السی	سرسوں	سن
برطانیہ عظمیٰ	۱۸۶۱	۱۵۵۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
فرانس	۱۱۸۵	۱۰۱۵	۸۸۲	۵۳۴	۰	۰	۴۲۹	۱۱۲۷۴	

نام ملک	گیہوں	جو	مکا	چاول	چائے	روئی	السی	سرسوں	سن
ٹلی	۹۰۰	۷۷۵	۱۳۵۴	۳۵۰۰	۰	۰	۴۶۳	۰	۰
مریکہ	۷۷۵	۱۰۷۷	۱۶۸۴	۱۷۵۵	۰	۱۵۱	۳۳۰	۰	۰
ینیڈا	۷۴۸	۱۰۷۷	۳۰۴۶	۰	۰	۰	۳۲۱	۰	۰
سٹریلیا	۷۷۵	۸۰۲	۱۴۲۵	۰	۰	۰	۳۴۷	۰	۰
جاپان	۱۳۱۸	۱۴۹۶	۱۴۸۷	۳۲۳۲	۶۴۰	۳۴۷	۴۰۱	۸۸۲	۱۷۱۹
مصر	۱۴۹۶	۱۴۲۵	۲۰۱۳	۲۶۱۰	۰	۲۹۴	۱۰۳۳	۰	۰
ہندوستان	۶۷۷	۹۹۴	۱۱۶۳	۱۳۲۶	۵۱۸	۸۹	۲۵۵	۳۹۲	۱۰۷۷

مندرجہ بالا نقشہ سے ہندوستانی زراعت کی جو نازک حالت ہمارے سامنے پیش کی ہے اس کے صحیح اسباب اگر تلاش کرنے ہوں تو زراعت کے چاروں عاملین یعنی زمین محنت، اصل اور تنظیم کی حالت کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ چاروں عاملین کسقدر کمزور ہیں اور یہی ہماری زراعت کی کمزوری کا بھی اصل سبب ہیں۔

چونکہ ہندوستان میں ابھی زراعت بر پیمانۂ کثیر رائج نہیں ہوئی ہے اس لئے تنظیم کا مطالعہ فی الحال تنا اہم نہیں ہے۔ البتہ باقی تین عاملین کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی مضمون میں تینوں عاملین پر غور کیا جائے اس لئے آج ہم صرف زمین کو لینگے اور اسکی موجودہ ناقابل طمینان حالت اس کے اسباب و نتائج اور اس کی اصلاح کے طریقوں سے بحث کرینگے باقی دو عاملین یعنی محنت و اصل سے انشاء اللہ کسی آئندہ مضمون میں بحث کیجائیگی۔

زمین کی تقسیم در تقسیم

ہندوستان کی زراعت عموماً چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کے ہاتھ میں ہے اور رفتہ رفتہ ان سے بھی چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کے ہاتھ میں جارہی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جب کسی مشترکہ خاندان میں وراثت تقسیم ہونے لگتی ہے تو زمین بھی تقسیم ہوتی ہے۔ اکثر اوقات ورثا میں

سے مختلف افراد کو زمین کا ایک ایک ٹکڑا نہیں دیا جاتا بلکہ مختلف قسم اور درجہ کی زمین میں غرض کو ایک ایک حصہ ملتا ہے اور اسی کا نام زمین کی تقسیم در تقسیم ہے۔ اسکا نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک ہی گاؤں کے مختلف کھیتوں میں بہت سے لوگوں کا حصہ ہوتا ہے۔ یہ حصہ عموماً بہت چھوٹا ہوتا ہے اور اکثر اوقات ایسے ہی حصے جو ایک ہی شخص کی ملک ہوں ایک دوسرے سے کافی دور واقع ہوتے ہیں زمانہ حال میں زمین کی اس غیر محدود تقسیم در تقسیم کے مسئلے نے معاشیات ہند کا مطالعہ کرنیوالوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے اور اسکے خطرناک نتائج سے بچنے کے لئے انہوں نے مختلف حل بھی پیش کئے ہیں۔

قبل اس سے کہ زمین کی اس تقسیم در تقسیم کے اسباب و نتائج سے بحث کیجائے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں یہ تقسیم در تقسیم جس حد تک پہنچ چکی ہے اسکا ایک صحیح خاکہ ہم چند اعداد و شمار کے ذریعہ پیش کرنیکی کوشش کریں گے۔

دکن کے ایک گاؤں کی معاشی حالت کا مطالعہ کرنے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ۱۷۷۱ء میں مالکان زمین کی تعداد صرف ۲۴ تھی لیکن اسی رقبہ زمین کے مالکوں کی تعداد ۱۹۱۴ء میں ۱۵۶ ہوگئی ہے مندرجہ ذیل نقشہ سے مختلف اوقات میں اس رقبہ زمین کے مالکوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوتا گیا ہے اسکا اندازہ ہو سکے گا (۱)

سنہ	۱۷۷۱	۱۷۹۱	۱۷۹۷	۱۸۱۱	۱۸۱۷	۱۸۲۹	۱۸۴۰	۱۹۱۴
مالکان زمین کی تعداد	۲۴	۴۱	۳۴	۵۴	۴۸	۵۸	۶۰	۱۵۶
انکی ملکیت کا اوسط رقبہ (ایکڑ)	۴۴	۲۵	۳۱	۱۹	۲۲	۱۸	۱۷½	۷

اسی گاؤں میں مختلف رقبوں کی ملکیتوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔

زمین کا رقبہ (ایکڑ)	۴۰ ایکڑ سے زیادہ	۳۰ سے ۴۰ ایکڑ	۲۰ سے ۳۰ ایکڑ	۱۰ سے ۲۰ ایکڑ	۵ سے ۱۰ ایکڑ	۱ سے ۵ ایکڑ	ایک ایکڑ سے کم
ایسے رقبوں کی تعداد	۱	۱	۹	۱۸	۳۴	۷۱	۲۲

(۱) Harold Mann. The Economics of a Deccan Village

یہ بھی اندازہ لگایا گیا تھا کہ ملک کے اس حصے میں ہندوستانی کاشتکار کی طرز زندگی اور طریقہ
ہ رکھنے کے لئے اس کے پاس کم از کم ۱۰ سے ۱۵ ایکڑ زمین کا ہونا معاشی نقطہ نظر سے ضروری تھا یعنی اتنے
لے کی کاشت سے اسے جو آمدنی ہوتی اس سے لگان وغیرہ ضروری مدات ادا کرنیکے بعد وہ اپنی
ور اپنے اہل وعیال کی پرورش کر سکتا تھا۔ اب اگر اسی معیار سے دیکھا جائے اور ایک ہی شخص کی
ساری جو مختلف مقامات پر تھی اسے یکجا شمار کیا جائے تب بھی ۸۱ فیصدی کاشتکار اس گاؤں میں ایسے
تھے جنکے پاس اتنی زمین نہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ ایک شخص کی زمین ایک ہی جگہ نہیں ہوتی۔ ۱۵۶
لکان زمین میں صرف ۲۰ ایسے خوش قسمت تھے جنکی ساری زمین ایک ہی جگہ تھی۔ پورے گاؤں
کی زمین ۷۱۱ چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں منقسم تھی اور نسبتاً سب سے بڑا حصہ ایسے کھیتوں کا تھا جن کا
قبہ ایک ایکڑ سے بھی کم تھا۔ مندرجہ ذیل نقشے میں مختلف رقبے کے کھیتوں کی تعداد درج ہے۔

کھیت کا رقبہ (ایکڑ)	۲۰ ایکڑ سے زیادہ	۱۰ سے ۲۰	۵ سے ۱۰	۱ سے ۵	½ سے ۱	½ سے بھی کم
ایسے کھیتوں کی تعداد	۱	۷	۲۱	۲۶۹	۲۱۱	۲۱۲

صوبہ بمبئی کی مزروعہ زمین کی تقسیم کا اندازہ ذیل کے نقشے (۱) سے ہو سکیگا۔ پھر بھی اس نقشے
میں ایک ہی شخص کی ملوکہ زمین جو مختلف مقامات پر ہو ایک ہی رقبے میں شمار کی گئی ہے۔ ظاہر ہے
کہ اس سے زمین کی تقسیم در تقسیم کا تو اندازہ نہیں ہوگا پھر بھی چھوٹے چھوٹے رقبوں اور انکے مالکوں
کی کثرت تعداد اس سے معلوم ہوگی۔ ورنہ کھیتوں کی تعداد جو اکثر ایک دوسرے سے
تھوڑے یا بہت فصل پر ہوں گے۔ ایک ایک مالک کے قبضہ میں کہیں زیادہ
ہوگی۔

ملاحظہ ہو

(1) Report of the Land Revenue Administration of the Bombay Presidency for 1921–22 Appendix

رقبہ	ایسے رقبوں سے بنی ہوئی کل زمین	اس زمین کے مالکوں کی تعداد
ایک سے لیکر ۵ ایکڑ تک	۲۰,۲۹۴۶۱	۸,۷۲,۴۸۵
۵ 〃 ۱۵ 〃	۴۹,۳۲,۲۶۶	۵,۲۹,۶۴۹
۱۵ 〃 ۲۵ 〃	۴۳,۳۷,۱۴۳	۲۲۱۴۴۹
۲۵ 〃 ۱۰ 〃	۸۸,۵۴,۱۴۴	۲۰۶۱۴۳
۱۰۰ 〃 ۵۰۰ 〃	۲۷۰۷۷۰۰۰۵	۱۸۱۷۳
۵۰۰ سے زائد	۵,۵۶,۵۹۲	۵۵۱
میزان	۲۳۴,۸۶,۶۱۲	۱۸۴۸۴۵۰

صوبہ مدراس کے بعض گاؤں کے حالات دیکھکر اسی قسم کے نتائج نکالے گئے ہیں (۱) گنگائی کونڈن (Gangai Kondon) نامی ایک گاؤں میں مختلف زمین کے رقبوں کے مالکوں کی مندرجہ ذیل تعداد معلوم ہوئی۔

رقبہ	ایک ایکڑ سے کم	۱ سے ۵	۵ سے ۱۰	۱۰ سے ۲۰	۲۰ سے ۳	۳۰ سے ۴۰	۴۰ سے ۵۰	۵۰ سے زائد
مالکوں کی تعداد	۱۰۵	۲۲۰	۲۵۰	۱۰۰	۵۰	۶۰	۵۰	۹۰

کھیتوں کی تعداد ۱۹۱۲ تھی اور بلحاظ رقبہ ان کی تقسیم حسب ذیل ہے:۔

رقبہ	½ ایکڑ سے کم	½ سے ۱	۱ سے ۵	۵ سے ۱۰	۱۰ سے ۲۰	۲۰ سے ۵۰	۵۰ سے ۱۰۰	۱۰۰ سے ۱۵۰	۲۵۰ سے ۴۰۰	۴۰۰ سے زائد
اس قسم کے کھیت	۶۰۰	۵۵۰	۵۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۵	۵	۴	۲	۰

ملاحظہ ہو

(۱) "Some South Indian Villages," edited by G. Slater

انکے علاوہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک کھیت کا رقبہ ۱/۸ یا ۱/۱۰ ایکڑ ہوا اور ایک ہی شخص کی ملک میں ایسے ۵۰ کھیت ہوں جو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ مقامات پر ہوں (۱)

پروفیسر گلبرٹ سلیٹر نے اپنی کتاب "جنوبی ہند کے بعض دیہات"(۲) Some South Indian Villages میں زمین کی تقسیم در تقسیم اور انکے خطرناک نتائج کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"بعض اوقات چاول کے کھیتوں کا رقبہ اتنا محدود ہوتا ہے کہ ان میں ہل چلانا بھی دشوار ہوتا ہے اور چونکہ اس قسم کے ہر رقبے کی مٹی کے بدے حد بندی کیجاتی ہے اس لئے زرعی زمین کا ایک بڑا حصہ بیکار رہتا ہے۔ بعض اوقات ایک ایسا شخص جس کی پوری ملک اگر ایک ہی مقام پر ہوتی تو آسانی کنواں کھدوا کر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ایسا نہیں کر سکتا ہے کیونکہ اگر اس کے پاس دس ایکڑ زمین ہوتی ہے تو وہ دس مختلف مقامات پر ہوتی ہے اکثر اوقات کسی غریب کاشتکار کا ایک ہی کھیت ہوتا ہے اور اسکے ارد گرد کسی بڑے زمیندار کی زمین ہوتی ہے جس سے اس کے تعلقات بدقسمتی سے اچھے نہیں ہوتے اب وہ غریب آبپاشی جیسے اہم معاملات میں بھی اس زمیندار کا دست نگر ہوتا ہے کبھی کبھی ایک ہی مقام پر مختلف مالکوں کے کھیت نشیب و فراز میں واقع ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص کو اپنے کھیت کی نگرانی میں بڑا وقت صرف کرنا پڑتا ہے کیونکہ اسے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی دوسرا شخص جسکا کھیت بلندی پر واقع ہے اپنے کھیت کا ضرورت سے زیادہ پانی اس کے کھیت میں نہ بھر دے یا کوئی ایسا شخص جس کا کھیت نشیب میں واقع ہے اور جسے پانی کی ضرورت ہو اس کے کھیت سے پانی نہ نکال لے"۔

پنجاب کے اکثر اضلاع میں اور خاصکر وسط پنجاب کے گاؤں میں بھی زمین کی تقسیم در تقسیم کا یہی حال ہے۔

---

(۱) Proceedings of the Board of Agriculture in India at Poona 10 Dec. 1917.

(۲) G. Slater. "Some South Indian Villages" Page 243.

ایسے گاؤں کی مثالیں بکثرت دیجا سکتی ہیں جنہیں کھیتوں کی تعداد ایک ہزار یا اس سے زیادہ ہو اور ہر کھیت کا اوسط رقبہ ایک ایکڑ سے زیادہ نہ ہو بہت سے گاؤں میں کھیتوں کا اوسط رقبہ ½ ایکڑ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ان کھیتوں میں بعض اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ انہیں کاشت کرنی بیکار ہوتی ہے اور بعض اتنے تنگ ہوتے ہیں کہ انہیں دو طرفہ ہل چلانا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔"(۳)

صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں کے اکثر مقبوضات کا رقبہ ۵ ایکڑ سے کم ہوتا ہے اور زمین کی تقسیم در تقسیم بھی بہت زیادہ ہو چکی ہے۔

ہندوستان کے ہر حصے کے متعلق صحیح اعداد و شمار ابتک مہیا نہیں ہوئے ہیں تاہم مندرجہ بالا حوالوں سے قابل کاشت زمین کی موجودہ حالت اور اسکی تقسیم در تقسیم کا بہت بڑے حد تک اندازہ ہوسکتا ہے۔

زمین کی تقسیم در تقسیم کے اسباب و نتائج

عام طور پر زمین کی اس تقسیم در تقسیم کا سبب ہندو اور اسلامی قانون وراثت بتایا جاتا ہے۔ مشترکہ خاندان کا ہر فرد اپنی پیدائش کے وقت سے خاندانی ملکیت میں ورثے کا حقدار بن جاتا ہے یہی نہیں بلکہ ہر فرد کو تقسیم دولت کے مطالبے کا حق کلی حاصل ہوتا ہے۔ مشترکہ خاندان کا مقصد دولت اور حصول دولت کے ذرائع کی مساویانہ تقسیم تھا۔ دراصل زمین کی تقسیم در تقسیم ہندو قانون وراثت کے اجرا کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ ان رسوم کی پابندی کا نتیجہ ہے جو اس قانون کے ساتھ رائج ہو چکی ہیں۔ ان رسوم کا مقصد خاندانی ملک کے ہر اچھے اور برے حصہ زمین میں خاندان کے ہر فرد کو مساوی حصہ عطا کرنا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ زمین کی تقسیم در تقسیم کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو تقسیم وراثت کا یہ دلچسپ طریقہ بھی نظر آتا ہے کہ خاندانی ملک کا ہر حصہ باری باری مختلف لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس حصہ زمین پر کسی فرد واحد کا مستقل قبضہ نہیں ہوتا بلکہ

---

۳) H Calver : "The Wealth & Welfare of the Punjab" Pages 81 – 82

ایک محدود عرصے کے لئے حق کاشت حاصل ہوتا ہے (۱) اس جذبۂ مساوات کا اکثر غلط استعمال کیا جاتا ہے اس سے زراعت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً چاول کی کاشت میں آب پاشی کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اگر بارش کم ہوتی تو کنوؤں وغیرہ کے پانی سے کھیتی کو سیراب کرنا پڑتا ہے اور اگر بارش ضرورت سے زیادہ ہوجاتی ہے تو غیرضروری پانی کھیت سے نکالکر کھیت خشک کرنیکی فکر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی مقام پر بہت سے چھوٹے چھوٹے کھیت ہوں اور وہ مختلف لوگوں کی ملکیت میں ہوں تو آبپاشی کا یہ اہم مسئلہ خاطر خواہ حل نہیں ہوسکتا اور کاشتکاری ایک مشکل کام بنجاتا ہے۔ قبضہ اگر ایک محدود عرصے کے لئے ہو تو دائمی اصلاح کی بھی تدبیر نہیں کیجاسکتی لہٰذا ایسے موقعوں پر لڑائی جھگڑوں کا بھی بہت زیادہ احتمال ہوتا ہے اور پھر معاملات قانونی چارہ جوئی تک پہنچ جاتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض کھیتوں کی کاشت موقوف کرنا پڑتی ہے۔

زمین کی تقسیم در تقسیم کا سارا بار ہندو اور اسلامی قانون وراثت پر ڈالنا اور یہ کہنا کہ جب تک انکی اصلاح نہ کیجائے یہ مسئلہ خاطر خواہ حل نہیں ہوسکتا۔ ہماری رائے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ صحیح ہے کہ قانون وراثت زمین کی تقسیم کی اجازت دیتا ہے اور انکے اجرا کے ساتھ جو رسوم و روایات قائم ہوچکی ہیں ان سے زمین کی تقسیم در تقسیم کا بھی امکان ہے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ قوانین تو صدیوں سے چلے آرہے ہیں اور زمین کی تقسیم در تقسیم کے مسئلہ کی پیچیدہ صورت کچھ پرانی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس خرابی کی وجہ بذات خود قانون وراثت نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی تہ میں کوئی اور ہی سبب ہونا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشترکہ خاندان اسوقت اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں ہے بلکہ اسمیں رفتہ رفتہ تغیر پیدا ہورہا ہے۔ اس کی وجہ انفرادی آزادی کے احساس کی نشو و نما ہے۔ تقسیم دولت اور خاندان سے علیحدگی جو کسی زمانے میں ایک مستثنیٰ تھی اب عام کلیہ بن رہی ہے اور شاید مستقبل قریب میں بہت کم لوگ ہندوستان میں ایسے ملیں گے جو

---

(1) G. F. Outeng's Article on "Size of Landholdings in the Bombay Presidency" published in I. J. of Economics of Allahabad 1918 Vol I Part II

ہندوستان کی ایک مشہور ضرب المثل کے معیار سے خوش حال کہلانیکے مستحق ہوں کیونکہ ہندوستانی نقطہ نگاہ سے وہی شخص خوشحال ہے جس کی سات نسلیں ایک ہی چھت تلے بیٹھی ہوں۔

قانون وراثت کے اچھے یا برے اثر کے علاوہ زمین کی تقسیم در تقسیم کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ ہندوستان کی آبادی میں اضافہ ہے مختلف پیشوں میں مزدوروں کی غیر مساوی تقسیم سے ملک کے نظام معاشی میں خلل پڑگیا ہے۔ جب سے ہندوستان اور انگلستان میں تعلق پیدا ہوا ہندوستان کی آبادی شہروں سے ہٹکر دیہات میں آنے لگی۔ دیسی صنعتوں کی تباہی کی وجہ سے آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ چار و ناچار زراعت کیطرف متوجہ ہوا۔ ہندوستانی جلاہوں اور دیگر صناعوں کے لئے زراعت کا پیشہ اختیار نہ کرنے کے معنی موت کا لقمہ بننے کے تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی رپورٹ مردم شماری نے یہی بات ثابت کی ہے کہ زراعت پیشہ مزدوروں کی تعداد میں نہایت سرعت سے اضافہ ہو رہا ہے۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں کل آبادی کا ۶۱ فیصدی حصہ زراعت میں مصروف تھا سنہ ۱۹۰۱ء میں یہی تعداد کل آبادی کی ۶۶ فیصدی ہوگئی سنہ ۱۹۱۱ء میں یہی آبادی بڑھکر مجموعی آبادی کا ۷۱ فیصدی ہوگئی اور سنہ ۱۹۲۱ء میں اسمیں اور اضافہ ہوا اور اب ہندوستان کی کل آبادی کا ۷۳ فیصدی حصہ صرف زراعت ہی میں مصروف ہے۔

زراعت پیشہ آبادی کے اس غیر معمولی اضافے سے ملک کا نظام معاشی درہم برہم ہوگیا جو لوگ غیر زرعی پیشوں میں کھپ نہیں سکتے تھے انہوں نے چار و ناچار زراعت کی طرف رُخ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کی تقسیم در تقسیم میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوئی جنہوں نے زراعت کو بطور پیشہ کے اختیار تو کرلیا لیکن جن کے لئے اس پیشہ میں کام کی کافی مقدار موجود نہ تھی۔

یہ حالت آجکل کی پیدا شدہ نہیں ہے۔ یہی نہیں کہ صرف سنہ ۱۹۲۱ء کی رپورٹ مردم شماری ہی اسکی دلیل میں پیش کیجاسکتی ہے بلکہ آج سے تقریباً پچاس سال قبل یعنی سنہ ۱۸۸۰ء کے قحط کے زمانہ میں جو کمیشن مقرر ہوا تھا اس نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ ایسے لوگوں کی تعداد جنکے پاس

زراعت کے سوا کوئی اور پیشہ نہیں ہے ملک کی زرعی ضروریات سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کمیشن کے ایک رکن جیمس کیرڈ (James Caird) نے سچ کہا تھا کہ،

"میرے علم میں دنیا کا کوئی زرعی ملک سوائے ہندوستان کے ایسا نہیں ہے جہاں مزدور اپنے کام کے اوقات کا بڑا حصہ گپ بازی کی نذر کرتے ہوں۔ ہر جگہ بیکاروں کی ایک کثیر تعداد نظر آتی ہے۔ دن کے کسی وقت میں بھی آپ کسی گاؤں میں داخل ہوں تو بیکاروں کی ایک بہت بڑی جماعت آپ کے ارد گرد ہوگی۔ اس بیکاری کی بڑی وجہ زراعت کے علاوہ اور پیشوں کا فقدان اور ملک کے اکثر حصوں میں اراضی پر حقوق ملک و استعمال کی ناقابل اطمینان حالت ہے"

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں ہندوستان کی مزروعہ زمین بہت ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہے ایسی حالت میں ضروری تھا کہ کاشت عمیق (Intensive Cultivation) کا طریقہ اختیار کیا جاتا لیکن یہاں کاشت وسیع (Extensive Cultivation) کا طریقہ رائج ہے جو اتنے چھوٹے چھوٹے رقبوں کے لئے کسی طرح بھی مناسب نہیں طریقہ کاشت کے اس خلاف مصلحت رواج کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ کاشتکاروں کی محنت کا ایک بڑا حصہ اکارت ہوتا ہے ملک کے تقریباً ہر صوبہ کی یہی حالت ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے بعض صوبوں میں کاشتکاروں کی تعداد اور مزروعہ زمین کے رقبہ کا تناسب معلوم ہوگا۔ (۱)

صوبہ	سو کاشتکار کتنے ایکڑ زمین کی کاشت کرتے ہیں	صوبہ	سو کاشتکار کتنے ایکڑ زمین کی کاشت کرتے ہیں
آسام	۲۹۶	بمبئی	۱۲۱۵
بنگال	۳۱۲	برما	۵۶۵
بہار اور اڑیسہ	۳۰۹	صوبجات متوسط و برار	۸۴۸

(۱) Census Report of India 1921, Vol. I, Part I. Page 244.

صوبہ	سو کاشتکار کتنے ایکڑ زمین کی کاشت کرتے ہیں	صوبہ	سو کاشتکار کتنے ایکڑ زمین کی کاشت کرتے ہیں
مدراس	۴۹۱	پنجاب	۹۱۸
صوبہ سرحد	۱۱۲۲	صوبجات متحدہ	۲۵۱

صوبہ بنگال کی رپورٹ مردم شماری میں کمشنر نے اپنے صوبہ کی زرعی حالت کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے:۔

"۱۹۲۱ء کے اعداد و شمار بابت زراعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ بنگال کے برطانوی علاقوں میں مزروعہ زمین کا رقبہ ۲۴۴۹۶۸۰۰ ایکڑ ہے اور اس رقبہ پر کام کرنیوالے مزدوروں کی تعداد ۱۱۰۶۰۶۲۹ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مزدور کے حصے میں صرف ۲۰۲۱۵ ایکڑ زمین آتی ہے کاشتکاروں کی غربت و افلاس کا پتہ انہی اعداد و شمار سے مل سکتا ہے ۲½ ایکڑ سے بھی کم رقبہ کی کاشت ایک مزدور کو پورے چھ مہینہ بھی مصروف کار نہیں رکھ سکتی چہ جائیکہ پورا سال۔ کاشتکار کچھ دنوں کے لئے یعنی زمین جوتنے فصل بونے اور کاٹنے کے زمانہ میں تو بڑی محنت و جانفشانی سے کام کرتا ہے لیکن سال کا بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے جس میں اس کے پاس کسی قسم کا بھی کام نہیں ہوتا اور اسے مجبوراً بیکار رہنا پڑتا ہے۔ ہر کاشتکار کے پاس زمین کا اتنا قلیل رقبہ ہوتا ہے کہ جو اُسے زیادہ عرصہ کیلئے مصروف کار نہیں رکھ سکتا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے پاس کوئی اور کام بھی نہیں ہوتا جس میں وہ اپنا بقیہ وقت صرف کرے۔ (۲)

صورت حال کی اصلاح کے طریقے

اب تک ہم ہندوستانی زراعت کے اہم ترین عامل یعنی زمین کی موجودہ کمزور حالت کا مطالعہ کر چکے

(۲) Census of India 1921, Vol. 5, Part-I, by W.H. Thompson Chapter XI. on 'Occupation'

ہیں۔ اس اہم مسئلہ کی نازک صورت حال نے ملک کے معاشین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرلیا ہے اور انہوں نے اس کے حسب ذیل حل بتائے ہیں۔

(۱) قانون وراثت کی اصلاح۔

(۲) قانونی ذرائع سے ایک مقررہ حد کے بعد تقسیم زمین کو روکنا اور بڑے بڑے رقبوں کا غرض کاشت وجود میں لانا۔

ان دونو طریقوں میں سے پہلا تو تقریباً ناممکن ہے کیونکہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے قانون وراثت کو خدائی تسلیم کرتے ہیں اور اسمیں کسی قسم کی مداخلت کو خلاف مذہب اور بیجا دست درازی سمجھکر گوارا نہیں کر سکتے چنانچہ اس قسم کی ایک کوشش جو ۱۹۱۶ء میں صوبہ بمبئی میں کی گئی تھی ناکام رہی۔ علاوہ اسکے جن لوگوں کی یہ تجویز ہے وہ اس خرابی کے اصلی اسباب نظر انداز کرتے ہیں ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ یہ قوانین صدیوں سے چلے آرہے ہیں اور موجودہ خرابی کے قانون وراثت کے علاوہ اور اسباب ہیں۔ جبتک ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے زراعت کے علاوہ اور ذرائع معاش بہم نہ پہنچائے جائیں قانون وراثت میں ترمیم کا مطلق اثر نہوگا۔ جہاں صدیوں سے باپ کے بعد اس کے بیٹوں میں خاندانی ملک کی مساوی تقسیم کا خیال لوگوں کے دلوں میں جم گیا ہو اس قسم کے قوانین قانونی کتب کو زینت بخشنے سے زیادہ کام نہیں کر سکتے۔

دوسرے طریقہ پر عمل کرنے سے اصلاح کی امید تو بہت کم ہے البتہ ہندوستان کی فضا میں بہت سے خطرات کا ضرور امکان ہے۔ ہندوستانی کاشتکار کی ضروریات زندگی فطرتاً بہت محدود ہیں اسکا معاشی نقطۂ نگاہ سادہ زندگی بسر کرنا ہوتا ہے نہ کہ دھن دولت جمع کرنا ملک کی طبعی حالت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ بہت قلیل آمدنی میں گذر ہو سکتی ہے۔ ملک کی سیاسی حالت نے کاشتکار کو کچھ ایسا غیر مطمئن بنا دیا ہے کہ اسے اس بات کا یقین ہی نہیں آسکتا کہ اگر اسکی آمدنی میں اضافہ ہوا تو وہ خود ہی اسکا مالک بھی ہوگا۔ وہ تو یہی سمجھتا ہے

کہ اس کے لئے ہر حال میں صرف کھانیکو خشک ٹکڑا اور پہننے کو معمولی کپڑا اس سے زیادہ کا امکان ہی نہیں۔ ان حالات میں اس قسم کے اثرات کو دور کئے بغیر اس کے رقبہ کاشت کو وسیع کرنے کے معنی اسے کاہلی کی ترغیب دینا ہے۔ ہندوستان کی معاشی حالت میں وقتاً فوقتاً ہونیوالی تبدیلیوں کا بغور مطالعہ کرنیوالوں کا تجربہ ہے کہ زرعی پیداوار کی قیمت میں جب اضافہ ہوتا ہے تو ہندوستانی کاشتکار بجائے زیادہ تن دہی سے کام کرنے کے کاہل بنجاتا ہے۔

علاوہ ان خطرات کے اوپر جو حل بیان کئے گئے ہیں ان میں ہندوستانی کاشتکار کے ذرائع کاشت کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ہندوستانی کاشتکار کے ذرائع کاشت نہایت محدود ہیں۔ اسکے اصل کی کمی تو ضرب المثل ہے اگر اس کے ذرائع کاشت میں خاطر خواہ ترقی نہ ہوئی تو رقبہ کاشت کی توسیع نہ محض بیکار بلکہ نقصان دہ ثابت ہوگی۔ بعض لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ

> "یہی نہیں کہ ہندوستانی کاشتکار کے موجودہ ذرائع کاشت توسیع کی اجازت نہیں دیتے بلکہ موجودہ رقبہ کاشت خواہ وہ کتنا ہی قلیل کیوں نہو اگر ذرائع کاشت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ اس قسم کے واقعات ہمیں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں کہ موجودہ رقبہائے کاشت غیر معاشی (معاشی نقطہ نگاہ سے ناقابل اطمینان) ہیں اس لئے نہیں کہ وہ بہت چھوٹے ہیں بلکہ اس لئے کہ ذرائع کاشت کے تناسب سے وہ بہت بڑے ہیں" (۱)

آخر اس اہم اور پیچیدہ مسئلہ کا حل کیا ہو سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک اسکا صرف ایک حل ہو سکتا ہے اور وہ یہی کہ آبادی کے اضافے سے قابل کاشت زمین پر جو ناقابل برداشت بار پڑ رہا ہے اسے دور کرنے کی کوشش کیجائے۔ اس کے حصول کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔

---

(1) Ambedkar's Article on "Small Holdings in India and their Remedies," published in the Journal of Indian Economic Society, Vol I No 2,3.

(۱) آبادی کی مساوی تقسیم ہونی چاہئے جن صوبوں میں آبادی کم ہو وہ دوسرے صوبوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو اپنے ہاں جگہ دیں حکومت اس نقل مکان میں آبادی کی ہر طرح مدد کرے

(۲) ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے زراعت کے علاوہ اور پیشے بہم پہنچائے جائیں آج سے تقریباً پچاس سال قبل سرکاری حلقوں میں بھی اس امر کا اعتراف کیا گیا تھا کہ موجودہ خرابیوں کا پورے طور پر سدباب اسوقت تک نہیں ہوسکتا جبتک کہ ایسے مختلف پیشے نہ تلاش کئے جائیں جنکی مدد سے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی زراعت سے ہٹکر صنعت وحرفت کی طرف متوجہ ہو اور اسے اپنا ذریعۂ معاش بنالے،، (۱)

یہی خیال تھا جس کی بناپر ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ملک کی صنعت وحرفت کو غیر ملکی اشیاء پر محصول بڑھا کر ترقی دیجائے اور یہی خیال ہے جس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی سے ملک میں ایک ایسی جماعت پیدا کر دی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر دس سال میں موجودہ کارخانوں اور انہیں کام کرنیوالوں کی تعداد دوگنی ہو جائے تب بھی ہر سال دو ڈھائی لاکھ سے زیادہ آدمی برسرکار نہ آسکیں گے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس طریقے کے رواج سے صناعوں اور کاریگروں کی ایک بڑی تعداد بیکار ہو جائے گی اور وہ مجبوراً زراعت کے دامن میں پناہ ڈھونڈے گی اسی لئے اس جماعت کا خیال ہے کہ ہاتھ سے سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی تحریک کو فروغ دے کر اسے سارے ہندوستان کی ایک صنعت بنایا جائے۔ اس خیال کے موئدین کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے اور آثار وقرائن سے اس کے کامیابی کی بھی امید کیجاسکتی ہے۔

ان تدابیر کے ساتھ ساتھ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستانی کاشتکار کا معیار زندگی بلند کرنے کی کوشش کیجائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ وہ چھوٹے سے رقبہ پر کاشت کرنے سے انکار کر دیگا اور زراعت سے ہٹ کر کسی دوسرے کام میں مصروف ہوگا۔ اس کے حصول کا ذریعہ ابتدائی تعلیم عام اور لازمی کرنا ہے۔ اس کے علاوہ کاشتکاروں کو

(1) Report of the Famine Commission 1880, Vol. I, Page 175.

جدید طریقہ کاشت سے بھی آگاہ کرنے کا انتظام ہونا ضروری ہے تاکہ وہ کاشت عمیق کی طرف جو ہندوستان کیلئے موجودہ حالات میں مناسب طریقہ ہے۔ متوجہ ہوں اور بہتر فصلوں کا انتخاب کرسکیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک رقبہ جو کاشت وسیع کے لئے بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہو وہی کاشت عمیق کے لئے کافی ثابت ہو۔ اسی طرح جس زمین پر گیہوں کی کاشت غیر معاشی ثابت ہوئی ہو ممکن ہے کہ اس زمین پر تمباکو یا کسی اور چیز کی کاشت مفید ثابت ہو۔ ہندوستانی کاشتکار کے ذرائع کاشت کی کمیوں کا مقابلہ اسے مناسب شرائط پر قرض دے کر کیا جائے کیونکہ جب تک اس کی مالی حالت قابل اطمینان نہ ہو دوسرے اصلاحات محض بیکار ثابت ہوں گی۔

چینی اور مغربی تہذیب کا مقابلہ

چین کے حالات و سیاسیات پر برٹرنیڈ رسل نے حال میں ایک نہایت مبصرانہ کتاب "مسئلہ چین" کے نام سے لکھی ہے جسکا ترجمہ امید ہے کہ ناظرین مستقبل قریب میں ملاحظہ فرمائیں لیکن اسوقت ہم اسکے گیارھویں باب کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جو عام دلچسپی سے تعلق رکھتا ہے

ایڈیٹر

موجودہ چین کے اندر جیسا کہ ابواب ماقبل میں ہم دیکھ چکے ہیں ہماری تہذیب اور اُس تمدن میں جو "بہشتی سلطنت" کا ملکی نژاد ہے ایک گہرا ربط ہے۔ یہ اب بھی ایک مشکوک سوال ہے کہ آیا یہ باہمی ربط ایک ایسی تہذیب کو پیدا کریگا جو اپنے ہر دو والدین سے بہتر ہوگی یا کہ وہ محض وطنی شائستگی کو تباہ کر دے گا اور اسکا جانشین امریکن تہذیب کو بنا دیگا مختلف تمدنوں کے درمیان اس قسم کا موازنہ عہد ماضی میں ارتقائے انسانی کے میدان میں "نشان راہ" ثابت ہوا ہے۔ یونان نے مصر سے سیکھا، روما نے یونان سے تعلیم حاصل کی، عربوں نے رومن سلطنت کی شاگردی کی، قرون وسطیٰ کے یورپ نے عربوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، اور اپنی "نشاۃ ثانیہ" کے دور میں یورپ بازنطینیوں کے نقش قدم پر چلا۔ بیشتر حالتوں میں شاگرد اپنے استادوں سے گوئے سبقت لے گئے۔ چین کے معاملہ میں اگر ہم اہل چین کو بھی شاگردوں کے زمرے میں شمار کریں تو یہاں بھی وہی تاریخ اپنا اعادہ کرتی نظر آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمکو اُنسے اتنا ہی استفادہ کرنا ہے جیسا کہ انکو ہم سے تمتع کرنا ہے لیکن یہاں ہمارے سیکھنے کے بہت کم مواقع ہیں۔ اگر ہم چینیوں کو خود اپنے حلقہ درس میں شمار کریں بجائے اس کے کہ خود انکو اپنا استاد تسلیم کریں تو مجھکو خوف ہے کہ یہ صرف اسی معنی میں صحیح ہوگا کہ ہم نالائق اور غیر تربیت پذیر لڑکے ہیں۔

چین اور مغرب کے باہمی مس و ربط سے جو مسائل معرض بحث میں آئے ہیں اُنکے خالص تمدنی پہلوؤں پر میں اس باب میں نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ آئندہ تین ابواب میں میں اُن مسائل سے

بحث کروں گا جو چین کی داخلی حالت سے متعلق ہیں اور آخر کار ایک اختتامی باب میں مستقبل کی اُن امیدوں کے تذکرے سے رجوع کروں گا جنکی موجودہ پُر اشکال صورت حالات میں پیش بینی کیجا سکتی ہے۔ چین اور یورپ کے درمیان جس طرح دو تمدنوں نے جداگانہ میدانوں میں عرصہ دراز تک ارتقائی منازل طے کی ہیں اور پھر باہم ہم آغوش ہوگئے ہیں۔ اسکی کوئی تاریخی نظیر سولہویں صدی کے اسپین اور امریکہ کے باہمی تمدنی تعلق کے استثناء کے علاوہ نہیں پیش کیجا سکتی۔ اس غیر معمولی علیحدگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ امر حیرت انگیز ہے کہ یورپینوں اور چینیوں کے درمیان دو طرفہ افہام و تفہیم کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس نقطۂ بحث کو زیادہ مشرح بنانے کیلئے یہ بات ضروری ہوگی کہ ہر دو تمدنوں کے تاریخی آخذ پر ایک لمحہ کیلئے روشنی ڈال لیجائے۔

مغربی یورپ اور امریکہ عملاً ایک ہم جنس ذہنی زندگی رکھتے ہیں جسکا سراغ تین سرچشموں تک جا کر لگتا ہے: (۱) یونانی تہذیب، (۲) یہودی مذہب و اخلاقیات اور (۳) دور حاضر کا جدید نظام حرفتی جو بجائے خود مولود ہے، موجودہ سائنس کا۔ ہم افلاطون، عہد نامۂ عتیق، اور گیلیلیو کو جداگانہ عناصر کے مظاہر کی حیثیت سے لے سکتے ہیں جو روز اول سے آج کے دن تک ایک نرالے طریقے سے الگ الگ رہے ہیں۔ یونانیوں سے ہم ادبیات و صناعات کو استخراج کرتے ہیں، نیز فلسفہ اور ریاضیات مجردہ کو۔ مزید براں اپنے معاشرتی نقطۂ نظر کے زیادہ شائستگی نواز عناصر کے لئے بھی ہم اہل یونان ہی کے مرہون منت ہیں۔ یہودیوں سے ہمارا مجذوبانہ اعتقاد دینی ماخوذ ہے جسکو اس کے حامئین "ایمان" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، نیز اخلاقی جوش بھی جسمیں گناہ کا وہ مخصوص تخیل بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں مذہبی عدم رواداری اور ہماری موجودہ قوم پرستی و ملت نوازی کے بعض خصائص بھی یہود ہی کا ورثہ ہیں۔ سائنس سے، اُس سائنس سے جو ہمارے نظام حرفتی میں معمول ہے ہم طاقت اور احساس طاقت حاصل کرتے ہیں، نیز یہ ادعا کہ ہم گویا دیوتاؤں کی طرح ہیں اور ہم کو یہ حق از روئے انصاف پہنچتا ہے کہ ہم غیر سائنسداں اقوام کی موت و حیات کے احکام صادر کریں۔ ہم نے "اصول تجربی" بھی استخراج کیا ہے جو قریباً سارے حقیقی علم کا وسیلۂ حصول بنا ہے۔ یہ ہر سہ عناصر میں خیال

کرتا ہوں کہ ہماری موجودہ ذہنیت کے بیشتر حصہ کی توجیہ کرتے ہیں۔

ان تینوں عناصر میں سے کسی ایک کا بھی کوئی معتد بہ دخل چین کی ترقی و تہذیب میں نہیں ہے بجز اس کے کہ اہل چین کے فن مصوری کو یونان نے بالواسطہ طور سے کچھ متاثر کیا ہے۔ اس حلقہ اثر انداز ی میں چین کی سنگ تراشی اور موسیقی بھی آتی ہے۔ چین اپنی تاریخ کی صبح آفرینش ہی سے ان عظیم الشان نہری سلطنتوں کی معنوی ملکیت رہا ہے جنہیں سے مصر اور بابل نے ہمارے تمدنی سرچشموں کے لئے ساز و برگ بہم پہنچایا اور یہ اُس نفوذ و اثر کے واسطہ سے جو اُنکا یونانیوں اور یہودیوں پر پڑا تھا۔ جس طرح دریائے نیل اور دریائے دجلہ و فرات کی زرخیز و زرریز سرزمینوں نے ان تمدنوں کی تخم ریزی و کاشت کی، بعینہ اسیطرح چینی تہذیب دریائے زرد کے طفیل میں وجود میں آئی۔ کنفیوشیس کے عہد میں بھی چینی سلطنت اس دریا کے نہ تو شمال میں اور نہ جنوب میں کچھ زیادہ دور تک وسعت پذیر ہوئی۔ لیکن باینہمہ اس طبعی و اقتصادی مشابہت کے چینیوں اور اہل مصر و بابل کے دماغی نقطۂ نظر میں کوئی شے برائے نام ہی مابہ الاشتراک تھی۔ لاؤتزے اور کنفیوشیس کے دل و دماغ میں جو ہر دو چھٹی صدی قبل مسیح میں گذرے ہیں۔ اس لئے قبل ہی سے وہ خصائص موجود ہیں جنکے متعلق ہمکو خیال کرنا چاہئے کہ وہ عہد موجودہ کے چینیوں کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہیں۔ وہ لوگ جو ہر چیز کو اقتصادی اسباب و علل سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ مشکل ہی اس بات سے ان اختلافات کی توجیہ کرینگے جو عہد عتیق کے چینیوں اور عہد عتیق کے مصریوں و بابلیوں کے درمیان موجود تھے۔ اگر مجھسے پوچھا جائے تو میں کوئی چارہ کار نہیں دیکھتا کہ اس نظریہ کا کوئی نعم البدل پیش کروں۔ میں نہیں خیال کرتا کہ سائنس بحالت موجودہ قومی مزاج و سیرت کی تمام و کمال تشریح کر سکتی ہے۔ آب وہوا اور اقتصادی حالات اس کے صرف ایک جزو کے اسباب ضرور ہیں لیکن نہ اُس کے جزو کل کے بلکہ غالباً بہت بڑا حصہ اُن صاحب اُمر و عزم شخصیتوں کا رہین اثر ہے جو ایک تخلیقی دور میں ظہور و خروج کرتے ہیں، مثلاً موسیٰؑ، محمدؐ، اور کنفیوشیس۔

قدیم ترین چینی دانشمند جو تاریخ میں روشناس ہے وہ لاؤتزے ہے جو دین "تاؤیت"

کا بانی ہے۔ لاؤ تزے دراصل کوئی اسم علم نہیں ہے بلکہ اس کے معنی ہیں "فیلسوف قدیم" ۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کنفیوسیس کا ایک معاصر تھا جو آخر الذکر سے زیادہ کبیر السن تھا۔ اور میرے خیال میں اسکا فلسفہ نسبتاً بہت زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسان، ہر حیوان اور ہر شے کا ایک خاص طریقہ ہے اور یہ کہ ہمکو چاہئے کہ اسی طریقہ کی مطابقت کریں اور دوسروں کو بھی اسکی متابعت کرنیکی تلقین و ہمت افزائی کریں۔ "تاؤ" کے معنی طریقہ کے ہیں لیکن متن میں یہ لغت کم و بیش ایک پُراسرار قسم کے مفہوم میں استعمال ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ آتا ہے: "میں ہی راہ (ہدایت) ہوں، صداقت ہوں، اور زندگی ہوں"۔ میرا خیال ہے کہ اُسکا تخیل یہ تھا کہ موت نتیجہ ہے اس "صراط المستقیم" سے انحراف کرنیکا اور یہ کہ اگر ہم سب ٹھیک ٹھیک فطرت کے مطابق زندگی بسر کریں تو ہم غیر فانی ہو سکتے ہیں جس طرح کہ اجرام فلکی غیر فنا پذیر ہیں۔ بعد کے ادوار میں "مذہب تاویت" بدعت کے گرداب میں آکر محض جادو منتر ہو کر رہ گیا اور زیادہ تر اُسکا مقصد جد و جہد "اکسیر حیات" کی تلاش سے وابستہ ہو گیا۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اپنے وقت ظہور کے آغاز ہی سے "مذہب تاویت" میں موت سے نجات پا جانیکی امید کا عنصر موجود تھا۔

لاؤ تزے کا صحیفہ، یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ صحیفہ جو لاؤ تزے سے منسوب کیا جاتا ہے، بہت مختصر کتاب ہے لیکن اس کے تخیلات و عقائد اس کے مرید چوانگ زی کے ساختہ پرداختہ ہیں، جو اپنے پیر سے بھی زیادہ دلچسپ شخصیت ہے۔ وہ فلسفہ جس کی دونوں نے وکالت کی ہے ایک فلسفہ حریت تھا۔ وہ حکومت کے طریقہ کو بُرا خیال کرتے تھے اور یہی عقیدہ اُنکا اُن تمام تصرفات و بدعات کے لئے تھا جو ہم فطرت میں کرتے رہتے ہیں۔ وہ دور حاضر کی قسم کی مضطرب و شتاب کار زندگی سے نالاں و شاکی تھے جنکا مقابلہ وہ اُن لوگوں کی پرسکون "حیات طیبہ" سے کرتے تھے جنکو وہ عہد قدیم اور عہد فطرت کے خالص و مطہر انسان کہکر پکارتے تھے۔ تاؤ کے نظریہ میں پراسراریت کی ایک چاشنی ہے لیکن باوجود اشیائے ذی روح کی کثرت و تعدد کے "تاؤ" کسی نہ کسی معنی پر "ایک" ہی ہے۔ لہذا اگر ہم سب اُسی کے مطابق زندگی بسر کریں تو دنیا میں کوئی کشمکش باقی نہ رہ

لیکن یہ دونوں دانشمند شوخی و ظرافت حزم و احتیاط اور کم سخنی و کوتاہ قلمی کی چینی خصوصیات برابر اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اُنکی ظرافت کا مظہر وہ سیرت ہی جو چوانگ زے نے پولو کی لکھی ہے جس کے متعلق اُس نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ "وہ گھوڑوں کی داشت و پرداخت کے کام کو سمجھتا تھا" اور اُنکی وہاں تک تعلیم و تربیت کرتا تھا کہ ہر دس گھوڑوں میں سے پانچ جاں بحق تسلیم ہو جاتے تھے۔ اُنکی حزم و احتیاط اور اُنکی کم سخنی و کوتاہ قلمی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی جبکہ وہ مغربی صوفیا کا باہمدگر موازنہ کیا کرتے تھے۔ سرد و خصوصیات خاصہ ہیں چینی ادبیات و فنون لطیفہ کا اور دور حاضر کے تعلیمیافتہ و تہذیب یافتہ چینیوں کی طرز گفتگو کا۔ چین کے تمام طبقات آبادی "قہقہہ" کے شایق ہیں اور مزاح و دل لگی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تعلیمیافتہ حلقوں میں ظرافت ذرا طباعانہ و لطیف قسم کی ہے یہانتک کہ یوریپن لوگ اکثر اُس کے احساس و سخن فہمی سے قاصر ثابت ہوتے ہیں اور اس بات سے چینی اور بھی زیادہ محظوظ ہوتے ہیں۔ اُنکی کم سخنی کی عادت حیرت انگیز ہے میں ایک دن پیکن میں ایک متوسط العمر آدمی سے ملا جس نے مجھسے کہا کہ میں صرف علمی نقطہ نظر سے سیاسیات کے نظریہ سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں چونکہ اس ملک میں نو وارد و اجنبی تھا اسلئے میں نے اُس کی بات کے لفظی معنے لئے لیکن بعد میں مجھپر یہ راز کھلا کہ وہ ایک صوبہ کا گورنر بھی رہ چکا تھا اور سالہا سال تک صف اول کا ایک نہایت سربرآوردہ ماہر سیاسیات رہا تھا۔ چین کی شاعری میں جوش و جذبات کا ظاہری فقدان نظر آتا ہے جسکا راز یہی کم گوئی کی عادت ہی۔ اُنکا خیال ہے کہ عقلمند آدمی کو ہمیشہ خاموش و متین رہنا چاہئے اور گرچہ اُنکے ہاں بھی جذباتی حرکات و سکنات ہوتے ہیں (کیونکہ چینی درحقیقت ایک بہت ہی متلون المزاج قوم ہے) لیکن وہ اس بات کو چاہتے ہیں کہ دائمی طور سے اپنے فنون جمیلہ میں اس رنگ کو لازوال بنا دیں۔ کیونکہ وہ اس امر کو معیوب سمجھتے ہیں۔ ہماری تحریک "اومان" جس نے لوگوں کو اسی جوش و خروش کی تعلیم دیدی ہے۔ اُسکی کوئی نظیر اُنکے لٹریچر میں جہانتک کہ میں جانتا ہوں آجتک پیدا نہیں ہے۔ اُنکی قدیم موسیقی کا، کچھ حصہ بلاشبہ بیحد شیریں و سامعہ نواز ہے مگر اسمیں اسقدر "سرد خموشی"

کی شان ہوتی ہے کہ آدمی بس اُسکو بشکل سن ہی لیتا ہے۔ فنون لطیفہ میں انکا مطمح نظر جدحسین وجمیل ہے اور اپنی عام روش زندگی میں انکا اصول معقولیت وسنجیدگی ہے۔ وہاں کسی ظالم وجابر کے لئے کوئی خراج تحسین پیش نہیں کرتا علی ہذا بے لگام سیلاب جوش وجذبہ کی بھی داد دینے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ مغرب کی زیادہ غوغائی زندگی کے بعد ایک شخص کو پہلی نظر میں وہ اثرات مفقود نظر آتی ہیں۔ جو چینیوں کا نصب العین، اور مقصود زندگی ہیں لیکن درجہ بدرجہ آکی حیات اصلیہ کا جمال وجلال منصہ شہود پر آنے لگتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ لوگ جو چین میں سب سے زیادہ رہے ہیں وہی لوگ ہیں جو چینیوں کے سب سے زیادہ عاشق ومداح ہیں۔

"تاویت" کے متبعین اگرچہ وہ اب بھی ساحروں کی حیثیت سے باقی ہیں لیکن مذہب کنفیوسیس نے انکو تعلیمیافتہ طبقات کے حلقہ نوازش سے بالکل خارج البلد کر دیا تھا۔ مجھکو اعتراف کرنا چاہئے کہ میں مذہب کنفیوسیس کے محاسن کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کنفیوسیس کے نوشتوں کا بیشتر حصہ آداب مجلسی کے متعلق معمولی معمولی اور رکیک قسم کے تذکروں پر وقف ہے اور اُسکا عام موضوع فکر یہی ہے کہ لوگوں کو تلقین کرے کہ انکو مختلف مواقع پر کیونکر عمل پیرا ہونا چاہئے تاہم جب کوئی اُسکا موازنہ دیگر قرون وامم کے روایتی مذہبی معلمین سے کرتا ہے تو اُسکو ماننا پڑتا ہے کہ اسمیں بڑے بڑے فضائل موجود ہیں، گو وہ عموماً منفی نوعیت کے ہوں۔ اُس کا نظام جس سے کہ اُسکو اُسکے حواریین نے نشو ونما دی ہے اخلاقیات خالصہ کا ایک دستور العمل ہے جسمیں کوئی شرعی ارکان وعقائد نہیں ہیں۔ وہ کسی با اقتدار "پاپائیت" کا سرچشمہ نہیں بنا۔ اور مذہبی مظالم و تعذیب سے اُسکا دامن پاک ہے۔ وہ بیشک ایک پوری قوم کے معرض وجود میں لانیکا باعث ہوا ہے، جو نازک ونفیس آداب ومراسم اور کامل اخلاق ومروت کے زیور سے آراستہ ہے۔ چینی طریق اخلاق وتپاک محض رسمی بھی نہیں۔ وہ ایسے ایسے موقعوں پر قابل اعتماد ثابت ہوا ہے جس کے لئے کوئی سابقہ نظیر پیش نہیں کیجاسکتی، اور وہ کسی ایک فرقہ یا طبقہ سے مخصوص ومحدود بھی نہیں۔ چنانچہ اُسکو آپ حقیر ترین قلی کے اندر بھی زندہ وپائندہ پائینگے۔ اب اس کے مقابلہ میں

"سفید آدمیوں" کی وحشیانہ شوخ چشمی کو دیکھو کہ کس درجہ اہانت انگیز واقع ہوئی ہے! اگرچہ اُن کی پذیرائی چینی لوگ بالکل ایک ایسی خاموش شان متانت سے کرتے ہیں جو وحشت کا جواب وحشت سے دینا نہیں چاہتی۔ یورپین لوگ اکثر اسکو کمزوری پر محمول کرتے ہیں لیکن سچ ہے کہ یہ ایک طاقت ہے، وہ طاقت جس کے ذریعہ سے چینی آجتک اپنے تمام فاتحوں کو مفتوح بناتے رہے ہیں!"

چین کی روایتی تہذیب میں ایک، اور صرف ایک عنصر ہے، اور وہ روح بدھ ہے۔ بدھ مذہب چین میں مسیح کی ابتدائی صدیوں میں ہندوستان سے آیا۔ اور ملک کی مذہبیات میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی۔ ہم معہ اپنی اُس رواداری سوز روش کے جو ورثۃً ہم کو پہنچی ہے، یہ خیال کیا کرتے ہیں کہ جب ایک شخص ایک مذہب کو اختیار کر چکا ہے تو وہ پھر کسی دوسرے مذہب کا حلقہ بگوش نہیں ہو سکتا۔ عیسائیت اور اسلام کے عقائد و کلمات اپنی کٹر شکل میں کچھ اس طرح ترتیب دئے گئے ہیں کہ کوئی شخص ہر دو سے تعلق گیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن چین کے اندر یہ تضاد وعدم تطبیق دیکھنے میں نہیں آتی۔ ایک ہی شخص بدھ اور کنفیوشیس ہر دو کا اُمتی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اُنمیں کوئی چیز باہم متصادم نہیں ہے۔ جاپان میں بھی علی ہذا بیشتر لوگ بدھ اور شنتو دونوں کے حلقہائے ارادت سے منسلک ہیں تاہم بدھ اور کنفیوشیس کے مذاہب کے مزاجوں میں فرق ہے۔ جو کسی شخص سے جس نے ہر دو کو اختیار کر رکھا ہے صرف یہ تقاضہ کریگا کہ دونوں میں کسی ایک کو اولیٰ و افضل سمجھے بدھ کا مذہب اُسی مفہوم میں ایک مذہب ہے جسمیں ہم نے اُسکو سمجھا ہے اُسکا ایک پراسرار عقیدہ اور ایک طریق نجات اور ایک حیات بعد الممات ہے۔ اسکے پاس دنیا کے لئے ایک پیغام ہے جسکا مقصود یہ ہے کہ وہ اس یاس و قنوط کے لئے دارو ئے شفا ہو جس میں اُس کے خیال میں اُن لوگوں کا مبتلا ہونا بالکل تقاضائے طبیعت ہے جو اپنی سکینۂ روح کیلئے کوئی مذہب نہیں رکھتے۔ بخیال اُس کے انسانی قلب و روح میں ایک فطری و اضطراری یاس پسندی کا داعیہ موجود ہے جس کی دوا کوئی آسمانی پیام ہی ہو سکتا ہے۔ "کنفیوسیت" میں

اعلیٰ تعلیم اخراجات کی کمی کی وجہ سے معرضِ ضرر میں ہے۔ نیز کتبخانوں کا فقدان ہے، لیکن تعلیمات عالیہ کے مقصد کو اس بنا پر کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے کہ بہترین انسانی مواد دل و دماغ کی کمی ہو۔ اگرچہ چینی تہذیب ابھی تک سائنس میں ناقص و تہیدست رہی ہے لیکن اس میں کوئی عنصر سائنس کا مزاحم و معاند نہیں ہوا ہے، اور اسلئے سائنٹفک علوم کی نشر و اشاعت میں اس قسم کی کوئی مشکلات اور رخنے نہیں ہیں۔ جن سے کلیسا نے یوروپ کو پابہ زنجیر بنایا تھا۔ مجھے کچھ بھی شبہ نہیں کہ اگر چینیوں کے سروں پر ایک مضبوط حکومت ہوتی اور انکی جیبوں میں کافی زر ہوتا تو وہ آئندہ تیس سال کے اندر اندر حیرت انگیز کارنامے سائنس میں دکھانے لگتے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ وہ ہم پر بھی گوے سبقت لیجاتے۔ کیونکہ وہ تازہ دم اس معرکہ گاہ میں داخل ہوتے اور ایک "نشاۃ ثانیہ" کے پورے جوش و خروش کے ساتھ تمام نوجوانانِ چین میں تحصیل علوم و معارف کا ذوق و شوق اُس "حیات جدید" کی روح کو بار بار یاد دلاتا؛ جو ایطالیہ میں پندرہویں صدی میں مشاہدہ کی گئی تھی۔

چینیوں اور جاپانیوں میں مابہ الامتیاز کی حیثیت سے یہ امر بہت حیرت انگیز ہے کہ اول الذکر جن علوم و فنون کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اُنکا ثمر ملو نہ دولت یا عسکری طاقت نہیں ہے بلکہ اُنکے مدنظر اور زیر اکتساب کسیقدر وہ چیزیں ہوتی ہیں جو یا تو کوئی اخلاقی یا معاشرتی قدر و قیمت رکھنے والی ہوتی ہیں۔ یا پھر خالص ذہنی دلچسپی کا سامان اپنے اندر رکھتی ہیں چینی کسی طرح بھی ہماری تہذیب کو کورانہ و غیر ناقدانہ نظر سے نہیں دیکھتے۔ اُن میں سے بعض لوگوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ۱۹۱۴ء کے قبل یوروپ کے معاملہ میں کم نقادی سے کام لیتے تھے، لیکن جنگ نے اُنکے لئے ایک دعوت فکر بہم پہنچائی۔ اور اُنہوں نے سمجھا کہ مغربی طرز زندگی میں کچھ نقائص ضرور رہنے چاہئیں۔ تاہم عقل و دانش کے لئے مغرب کے دست نگر ہونے کی عادت اب بھی بہت قوی تھی چنانچہ بعض طفلانہ مزاج اور خامکار لوگوں نے یہ خیال کیا کہ "اتمام نعمت و تکمیل دین" کے لئے جس چیز کی کمی رہ گئی تھی، اُس کو بالشوزم بہم پہنچا رہا ہے مگر یہ "آرزو" بھی "خاک شدہ" کا مصداق

...ت ہوگئی۔ اور زیادہ عرصہ نہ گذرے گا کہ وہ اس حقیقت کو پہنچ جائینگے کہ انکو اپنی نجات کسی اور ...ی شاہ راہ حیات پر چلکر حاصل کرنی چاہئے۔ جاپانیوں نے ہمارے عیوب کو اختیار کیا اور اپنے عیوب کو انپر مستزاد کیا، لیکن یہ امید قرین قیاس ہے کہ چینی برعکس انتخاب کریں گے کہ اپنے فضائل ...محفوظ رکھینگے اور ہمارے محاسن کو اخذ کرینگے۔

مجھکو کہنا چاہئے کہ امتیازی خوبی ہماری تہذیب کی سائنٹفک طریق کار رہے، امتیازی فضیلت اہل چین کی یہ وہ مقاصد حیات کا تصور رہے۔ یہ دو سعادتیں ہیں جنکے لئے ہر شخص کو آرزو ...رنا چاہیئے کہ وہ رفتہ رفتہ یکجا ہوجائیں۔

لاؤٹزے "تاؤ" کے عمل کی یوں تفسیر کرتا ہے کہ وہ "ایک پیدا وار ہے بغیر قبضہ کے، ...س بیاری" ہے بغیر عمل برکشی" کے، نشو ونما ہے بغیر احاطہ و استیلا کے" میں خیال کرتا ہوں ...ایک شخص ان الفاظ سے مقاصد زندگی کے متعلق ایک ایسا ہی تخیل استخراج کریگا جیسا کہ صاحب تفکر و تدبر چینی اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ مقاصد بہت ہی مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ ان مقاصد سے جو بیشتر سفید آدمیوں کے مدنظر ہوتے ہیں جنکی قوم اور قوم کا ہر فرد ...ے شوق و شغف کیسا تھ اس قبضہ کے، اس ذاتی نود و نما س لے اور اس غلبہ و استیلا کے ...ریلے ہے۔ انکو بلند پروازی سکھائی ہے نیٹشے کے فلسفہ نے، اور یاد رہے کہ نیٹشے کے شاگرد ...مہ جرمنی کی حدود ہی میں محدود نہیں ہیں!۔

لیکن یہ کہا جائے گا کہ تم مغرب کا تو عمل لیتے ہو اور اہل چین کا نظریہ! اور ان دونوں چیزوں کا باہم مقابلہ کرتے ہو اگر تم اسی طرح مغربی نظریہ کا چینی عمل سے مقابلہ کرتے تو دو طرفہ فضائل و معائب کا توازن بالکل برعکس شکل میں ظاہر ہوتا!۔ حق یہ ہے کہ اس اعتراض میں صداقت کا ایک بہت بڑا عنصر ہے قبضہ جو منجملہ ان تین چیزوں کے ہے جنکو لاؤٹزے نظرانداز کرنا چاہتا ہے، وہ یقیناً ایک متوسط قسم کے چینی کے قلب کی محبوب اشیا میں سے ہے من حیث القوم وہ روپیہ کے معاملہ میں سخت ہیں لیکن شاید فرانسیسیوں سے زیادہ

نہیں، لیکن انگریزوں اور امریکنوں سے بلا شبہ زیادہ ۔ اُنکی سیاسیات میں بدعات پیدا ہو گئی ہیں اور انکی قوم کے صاحب طاقت و امارت لوگ مکروہ طریقوں سے جلب منفعت کرتے ہیں ۔ اُن ساری باتوں سے انکار کرنا ناممکن ہے ۔

تاہم باقی دو مفاسد (یعنی ذاتی نمود و نمائش اور غلبہ و نفوذ حاصل کرنے کی عادت) کے متعلق چینیوں کی عملی زندگی میں میں اہل یوروپ کے مقابلہ میں قطعی فضیلت دیکھتا ہوں ۔ سفید اقوام کی بہ نسبت وہاں "زبردستوں" کی "زیردست آزاری" کی بدرجہا کم خواہش نظر آتی ہے ۔ اہل چین کی اسی نیکی کا اور نیز اس تغلب و تصرف اور غبن و رشوت ستانی کا بھی نتیجہ ہے کہ عین محفل اقوام میں کمزور رہے اگرچہ محض موخر الذکر مفاسد ملک کے انحطاط کے تنہا علت العلل سمجھ لیے گئے ہیں ۔ اگر کبھی دنیا میں کوئی قوم "اسقدر صاحب وقار ہوتی کہ جدال و قتال کو اپنی شان جلالت سے فروتر سمجھتی" تو وہ قوم چینیوں کی تھی ! چینیوں کی طبعی روش روا داری و دوستداری ہے ، وہ اخلاق و مروت سے خود بھی پیش آتے ہیں اور دوسروں سے بھی اُس کے معاوضہ میں اُسی قسم کے سلوک کے متوقع ہوا کرتے ہیں ۔ اگر چینی چاہتے تو وہ دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور قوم بن سکتے تھے ۔ یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ دوسری قومیں اُنکو اپنی آزادی کی حفاظت کیلئے لڑنے پر مجبور بنا دیں ۔ اگر ایسا ہوا تو اس بات کا امکان ہے کہ وہ اپنے فضائل کو کھو دیں اور پھر اُن میں بھی ملوکیت اور جوع الارض کا مذاق پیدا ہو جائے ۔ لیکن اگرچہ وہ گذشتہ دو ہزار سال سے ایک ایسی قوم رہے ہیں جو شہنشاہیت سے وابستہ رہی ہے ۔ لیکن اس وقت بھی اُنکا ذوق شہنشاہیت غیر معمولی طور سے خفیف ہے !۔

اگرچہ چین بہت سی جنگوں کا معرکہ گاہ رہا ہے ۔ لیکن چینی قوم کی طبعی افتاد مزاج بہت ہی امن پسند واقع ہوئی ہے ۔ میں نہیں جانتا کہ دنیا میں کوئی اور قوم ایسی ہے جسکا کوئی شاعر چینی شاعر تو چوئی کی طرح ، اپنی ایک نظم کا جس کا ترجمہ مسٹر ویلی نے کیا ہے ، اور جسکا عنوان ہے :- "بازو شکستہ مرد ضعیف" موضوع اور رئیس القصہ (ہیرو) ایک ایسے ریکروٹ (نو آموز

فوجی سپاہی، کو بنایا جس نے فوجی ملازمت سے گریز و گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے اپنے کو بے دست و پا
کر لیا تھا۔ انکی اس امن پرستی کا راز انکے مفکرانہ مذاق طبیعت میں ہے، نیز اسمیں انکے مزاج کی
اس خصوصیت کو بھی دخل ہے کہ وہ قدرتی صورت حالات میں کوئی تغیر و تصرف کرنیکی خواہش
نہیں رکھتے۔ زندگی کے مختلف انواع کے خاص خاص مظاہر کے مطالعہ و معائنہ میں وہ ایک
لطف محسوس کرتے ہیں۔ اور اس بات کا آئینہ دار نگار خانہ چینی ہے وہ ہر ایک چیز کی ایک
مخصوص مجوزہ نمونہ کے مطابق قطع و برید کرنیکا کوئی تقاضائے نفس اپنے اندر نہیں رکھتے۔ ترقی کے لئے
کا نصب العین وہ نہیں ہے جس کی مغربی اقوام کے دماغوں پر فرمانروائی ہے۔ اور جو ہمارے
ان داعیات نفس کو جو بروئے کار آنا چاہتے ہیں "عصبیت" کے شکنجہ میں جکڑنا چاہتا ہے اس
قسم کی ترقی بلاشبہ دور حاضر کا ایک نو بہو نصب العین ہے اور خود ہم بھی اس سے ابھی حال ہی
میں آشنا ہوئے ہیں جن برکات کے لئے ہم سائنس اور نظام حرفتی کے رہین منت ہیں انکا ایک ایک
جز ولاینفک ہے۔ اس زمانہ کے بھی قدامت پرست قسم کے شائستہ چینی بعینہ اسی طرح کی گفتگو کرتے
ہیں جس طرح کے ان عہد عتیق کے دانشمندوں کے نوشتے موجود ہیں۔ اگر کوئی ان سے کہتا ہے کہ دیکھئے
یہ اس بات کا مظہر ہے کہ آپ صدیوں تک کس طرح ساکن و ساکت رہے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ "جس
وقت تم بہترین چیزوں سے لطف اندوز ہو رہے ہو تو پھر اس کے بعد بھی ترقی کی تلاش میں لب تشنہ
رہنے کی کیا ضرورت ہے؟" پہلی نظر میں دیکھنے سے ایک یوروپین کو اس زاویہ نگاہ میں ضرورت
سے زیادہ کاہل الوجودی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ جبکہ عقل و دانش میں ترقی ہوتی جاتی
ہے تو اسکو اپنے خیال کے متعلق شکوک لاحق ہوتے جاتے ہیں، اور وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ
جس چیز کو ہم "ترقی" کہتے ہیں اسکا غالب عنصر ایک بے چین قسم کی تغیر پسندی ہے جو ہمکو کسی مستحسن قسم
کی منزل مقصود سے کچھ بھی قریب تر نہیں کرتی۔

کہ اہل چین نے جو کچھ مغرب سے لیا ہے اسکا تقابل اس چیز سے کرنا جو اہل مغرب نے چین
سے اخذ کیا ہے ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ مغرب میں چینی علم کے درپے تلاش ہیں اور انکو یہ

امید ہے جو کہ مجھکو اندیشہ ہے کہ ایک امید موہوم ثابت ہوگی کہ یہ علم سفلی حقیقی دانش و بینش کا دائرہ ہے۔ سفید قومیں چین کو ان تین اغراض سے گئی ہیں، جنگ، جنگ زرگری، اور چینیوں کو دعوت مذہبی اور مسیحی اصطباغ دینا۔ آخرالذکر مقصد اس قابل ہے کہ ہم اسکو ایک بلند پایہ مقصد سے تعبیر کریں۔ مسیحی دعوت نے چین میں بہت ہی عظیم الشان اور رستم صفت شخصیتوں کے لئے سامان الہام و عزم فراہم کیا ہے لیکن یوروپ کا سپاہی، تاجر، اور داعی سب یکساں طور سے مغربی تہذیب کو ساحل فنا سے لگا دینے میں شریک و ذمہ دار ہیں یہ تینوں گروہ ایک معنی میں رکھتے ہیں کیونکہ گو مذاہب میں تعدد ہے لیکن وحدت حق سب میں موجود ہے،، اور جبکہ ہم بھی اس سے بہرہ یاب ہیں تو وہ ہمکو ہماری شریعت اور ہماری مسلک پر چلتے رہنے پر قانع رہینگے اور کوئی تعرض نہ کرینگے وہ اچھے تاجر ہیں لیکن چین کے۔ یوروپین تاجروں کے طریق کاروبار سے انکے طریقے بالکل مختلف ہیں۔ یہ مغربی سرمایہ دار مراعات، اجارے، ریلویجات، اور معادن کے ٹھیکے لینے کی جد وجہد میں ہمیشہ غرق رہتے ہیں،، اور وہاں توپ سے اپنے دعاوی کی تائید کیا کرتے ہیں۔ چینی اصولاً اچھے سپاہی نہیں ہیں، لیکن یہ تو محض اُن کی معقولیت پسندی کا ثبوت ہے۔

اگر یوروپین لوگ اپنے وطن کے تجربات و واقعات کو دیکھیں تو انکا شہپر تخیل بھی اُس رواداری تک نہ پہنچ سکے گا۔ جو چینیوں میں نظر آتی ہے۔ ہم اپنی بھی رواداری کے خواب دیکھا کرتے ہیں مگر اسکے یہی اضافی معنی ہیں کہ ہم اپنے آبا و اجداد کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ روادار ہیں، لیکن اس وقت بھی ہم میں سیاسی اور معاشرتی مظالم کا معمول ہے، اور طرہ تو یہ ہے کہ ہمکو تلقین کیجاتی ہے کہ ہمارا تمدن اور طرز معاشرت ہر ایک تمدن و طرز حیات سے بمراحل اعلیٰ و ارفع ہے،، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جب ہمارا سابقہ چینیوں کی ایسی قوم سے پڑتا ہے تو ہمکو یقین و ایمان ہو جاتا ہے کہ سب سے زیادہ جس نوازش کا مورد لطف ہم چینیوں کو بنا سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم انکو فرنگی مآب بنا لیں۔ میرے علم و یقین میں یہ ایک فاش غلطی ہے۔ مجھکو ایسا محسوس ہوا ہے کہ ایک متوسط

قسم کا چینی، چاہے وہ کتنا ہی نادار و قلاش ہو، ایک متوسط درجہ کے انگریز سے زیادہ آسودہ ہوتا ہے اور اس نسبتاً برتر قسم کی آسودگی کا سبب یہ ہے کہ قوم کی تعمیر بمقابلہ ہمارے ایک زیادہ انسانی اور شائستگی نواز اساس پر ہوئی ہے۔ یورپ کا نچلا پن اور دہکا پیل صرف ظاہری برائیاں ہی نہیں پیدا کرتیں بلکہ ہماری روحوں کی طمانیت کو سلب کر لیتی ہیں ، اور ہمکو "حسن و جمال" سے لطف اندوز ہونے سے عاری کر دیتا ہے۔ اور ہر قسم کے فکر و فضائل سے محروم بنا دیتا ہے گذشتہ ایک صدی کے اندر ہم ان مفاسد میں بہت عاجلانہ رفتار سے بڑھ گئے ہیں۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ چین کی "تفریط" برعکس سمت میں ضرورت سے زیادہ چلی گئی ہے لیکن عین اسی وجہ سے میں یہ خیال کیا کرتا ہوں کہ مشرق و مغرب کا مس و وصل ہر دو کے لئے موجب برکات ہوگا وہ ہم سے عملی تکمیل فن کی وہ کم سے کم مقدار سیکھ سکتے ہیں جو بالکل ناگزیر ہے، اور ہم انکی اس فکر و دانش سے قدرے مستفیض ہو سکتے ہیں جس نے انکو اس زمانہ تک زندہ رہنے کے قابل بنایا، اگرچہ عہد عتیق کی بقیہ ساری قومیں فنا ہو گئیں ؟ -

میں چین کو گیا تھا تو چینیوں کو کچھ سکھانے کے زعم میں گیا تھا۔ لیکن ہر دن جو میرے قیام کے زمانہ میں وہاں گذر رہا تھا، اسمیں میرا دماغ اپنی "تعلیم" سے زیادہ اپنے "تعلم" کی طرف منتقل ہوتا گیا اُن یوروپیوں میں جو ایک عرصہ دراز چین میں گذار چکے تھے میں نے یہ میلان طبع کچھ کم نہ دیکھا، لیکن اُن لوگوں میں جنکا قیام وہاں مختصر ہوتا ہے، یا جو محض وہاں روپیہ کمانے کیلئے جاتے ہیں میں نے اس ذہنیت کا اندوہناک فقدان پایا یہ محض اس بات کا نتیجہ ہے کہ اہل یوروپ کی نظر میں حقیقۃً جن چیزوں کی قدر و قیمت ہے انہیں چینیوں کو کچھ زیادہ امتیاز و دخل حاصل نہیں ہے۔ وہ لوگ جو حکمت و دانش یا "جمالیات" کا ذوق و قدر رکھتے ہیں یا جو کہ زندگی کی محض سادہ لذتوں سے ذائقہ چش ہوا چاہتے ہیں وہ ان چیزوں کو چین میں بمقابلہ مغرب کے زیادہ پائینگے جہاں ایک تیزی و تندی اور ایک انتشار و اضطراب کی فرمانروائی ہے اور یہ لوگ ایسی ہی جگہ کو رہنے کے قابل سمجھینگے جہاں ان برکات و سعادات کی فراوانی ہو۔

کاش چین ہمارے سائنٹفک علم کے معاوضہ میں ہمکو اپنی وسیع المشربی اور مفکرانہ طمانیت روح کا تھوڑا سا حصہ دیتا!

یہ ہے یوروپین تہذیب کی قدر و قیمت جسکا صحیح ترین اندازہ اس طرح یوروپ کے مستند ارباب حل وعقد کر رہے ہیں۔ اور یہ ہے وہ روح کی تڑپ جو ایشیائیت اور مشرقیت کی معصومیت اور سکینت کے لئے یوروپ کا دل و دماغ محسوس کر رہا ہے مگر ہم مغرب پرستوں کے عشق مغرب اور فرنگی مآبی کا جو حال ہے وہ اس روشنی میں ہماری بے بصری کو ایک مضحکہ خیز شکل میں پیش کرتا ہے۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

ہندوستان کی تعلیمی حالت

(۱)

جب ہم اپنے گرد وپیش انسانی تہذیب و تمدن پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت سے مختلف شعبوں پر مشتمل ہے۔ زندگی نے اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ان شعبوں کو شکل دی ہے۔ مثلاً اس نے اپنی ضروریات کی تشفی کے لئے مذہب کی تنظیم کی قانون جاری کیا۔ عدالتیں، پولیس، جیل خانے، شفا خانے اور اس قسم کی بہت سی افادہ گاہیں (Institutions) قائم کیں۔ اسی طرح انسان کو حیوانی منزل سے نکالنے اور اس کے تمام پوشیدہ امکانات کو ظاہر کرنے کے لئے تعلیم کا نظام رائج ہوا ہے۔

زندگی اور اسکی تمام افادہ گاہوں میں ایک نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ وہ ان تمام حوادث، تبدیلیوں اور خیالات سے متاثر ہوتی ہیں جو زندگی پر اپنا اثر ڈالیں مختلف لوگوں نے اور مختلف زمانوں نے زندگی کا مفہوم جداگانہ سمجھا ہے۔ اس کے نصب العین کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ اسکے اغراض و مقاصد مختلف قرار دئے ہیں۔ اس وجہ سے ان افادہ گاہوں نے کبھی ایک مقصد پورا کیا ہے۔ کبھی دوسرا۔ اگر ایک طرف مذہب غالب فرقوں کا اقتدار قائم رکھنے میں معین ہوا ہے تو دوسری طرف اس نے مغلوب کی جنبہ داری بھی کی ہے سرمایہ داری کے نظام میں قانون کا فرض عام طور پر یہ رہا ہے کہ "جس کے پاس (کچھ) ہے اس کو (اور) دیا جائے گا اور جس کے پاس (کچھ) نہیں ہے اس سے وہ بھی لے لیا جائے گا جو اس کے پاس ہے" لیکن آج کل اشتراکی نظام نے قانون ہی کو ان لوگوں کا طرفدار بنا دیا ہے جو مدتوں سے سرمایہ اور ملکیت دونوں سے محروم تھے۔ اسی طرح جوں جوں زندگی کا نصب العین بدلتا رہا ہے تعلیم کی غرض بھی، لوگوں کی رائے میں بدلتی رہی ہے۔

یونانیوں کے عہد زریں میں جسمانی نشو و نما، طاقت اور حسن کا فروغ، تعلیم کا اعلیٰ مقصد

سمجھا جاتا تھا۔ یوروپ کے ازمنۂ متوسطہ میں، جب عیسائیت کی سخت گیریاں اور مذہبی نظام جنون کی حد تک پہنچ گئے تھے، تعلیم راہبانہ رنگ میں رنگی گئی تھی۔ گذشتہ صدی میں بہت زیادہ اور کسی قدر کم اس زمانہ میں بھی صنعت وحرفت کا زور ہونے کی وجہ سے تعلیم کا مقصد ایک مستعد اور کماؤ کاریگر ہونا قرار دیا گیا۔ چونکہ زندگی کا میکانیکی رُخ غالب اور پیش پیش تھا اس لئے مدرسوں نے اس خیال سے مرعوب ہو کر اس بات کی کوشش کی کہ وہ محض طلبہ کی کارکردگی (Efficiency) میں اضافہ کریں اور دوسرے مقاصد کو محض اس مرکزی غرض کے تابع رکھیں۔ یہ نقطہ نظر اس قدر تنگ اور ضرر رساں ہے کہ اسکی عام قبولیت تعجب کا باعث ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان بالطبع بیوقوف ہے۔ جیسا کہ شکسپیر اپنی ایک ہوائی روح پک کی زبان سے کہلواتا ہے "بارالہا! یہ انسان کیسے بے وقوف ہوتے ہیں!" اس کی دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ یہ میکانکی مفہوم اس زمانہ کے فلسفہ زندگی اور عمل کا ایک جزو ہوچکا تھا اس لئے اس کو تعلیم کے شعبہ اور فلسفے میں راہ پالینا کچھ ایسا دشوار نہ تھا۔

(۳)

ہم نے اب تک یہ بیان کیا ہے کہ کسی ملک یا قوم کی زندگی کی عام حالت کا عکس اس کے نظام تعلیم میں بھی نظر آتا ہے۔ اس اصول کو رہبر بنا کر ہم ہندوستان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک کی بے نظمی اور قومی زندگی کے تمام شعبوں کا انتشار ہماری تعلیم میں نمایاں ہے۔ چونکہ ملک کی زندگی کسی مرکز پر مجتمع نہیں، کسی زبردست نصب العین کی تابع نہیں اور نہ کسی تخلیقی خیال کے برقی اثر سے متاثر ہے۔ اس لئے اسکی تعلیم میں بھی کوئی ممتاز خصوصیت تلاش کرنا عبث ہے۔ پرانا نظام عمل اور نظام خیال شکست ہوچکا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسرے نظام نے نہیں لی۔ اس لئے نہ تو ہماری تعلیم اس فلسفہ زندگی کا آئینہ ہے جو مدتوں تک ہمارا امتیازی نشان رہا ہے یعنی امن وسکون، رضا جوئی، ابدی قدور کی تلاش اور نہ اسکا کوئی بدل ہمیں نصیب ہوا۔

مغربی تاثرات سے ہم ضرور متاثر ہوئے ہیں لیکن کئی وجوہات سے انہوں نے ہمارے
اوپر پوری طرح غلبہ نہیں کیا۔ ہماری تہذیب بہت پرانی ہے اور اس کے بہت سے اثرات ہمارے
رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ ان گہری جڑوں کو زمین سے نکالنا آسان نہیں سیاسی
مخالفتوں اور مغربی تہذیب کو ایک حد تک حقیر سمجھنے کی وجہ سے بھی ہمیں اس کے اثرات قبول
کرنے میں تامل ہوا ہے۔ اس لئے مغرب میں جو تعلیمی خیالات رائج ہیں انکو بھی ہم نے تمام تر قبول
نہیں کیا۔ البتہ جہاں تک خارجی نظام کا تعلق ہے گورنمنٹ نے ہمارے اوپر اس قسم کے مدارس
عائد کر دئے ہیں جیسے انگلستان میں پچاس برس پیشتر رائج تھے "عائد کر دئے ہیں" اس سے
یہ مراد ہے کہ انہوں نے اس سرزمین میں جڑ نہیں پکڑی نشوونما نہیں پائی اور اس لئے وہ ان
تمام مفید اصلاحوں، ترمیموں، تبدیلیوں سے بیگانہ ہیں جو قدرتی طور پر ماحول کے اثرات
کی وجہ سے ہر زندہ افادہ گاہ میں ہونی چاہئیں۔

پھر ہمارے تعلیمی نظام اور تعلیمی خیالات کا رجحان کس طرف ہے؟ تعلیم خواہ کیسی ہی ناقابل
ہیجان ہو ملک کے حالات اور تحریکات کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتی ہماری تعلیم پر بھی ملک
کی سیاسی اور اقتصادی حالت کا ردعمل ہوا ہے ملک کی سیاسی حالت کیا ہے؟ ایک فرنگی حکومت
برسر اقتدار ہے۔ اس کے دفاتر میں جگہ پانے اور اس میں رسوخ حاصل کرنے کیلئے اس بات
کی ضرورت ہے کہ وہ خاص انگریزی تعلیم حاصل کی جائے جو ان دفاتر کا دروازہ کھولنے کیلئے
ضروری ہے۔ جب تعلیم کا یہ مقصد قرار پایا، ارادی طور پر نہیں بلکہ ضروریات اور صورت حال
کے منطقی نتیجہ کی بنا پر، تو ظاہر ہے کہ اس کی تمام عمارت اس خیال سے بنائی جائے گی کہ وہ اسی
اس غرض کو پورا کرے۔ لہذا مدرسوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں اس قسم کی تعلیم رواج
پا گئی جو نام نہاد "تعلیم یافتہ" لوگوں کو مختلف قسم کی سرکاری ملازمتوں کے لیے تیار کرتی ہے۔

تعلیم کے اس غرض کے لئے محدود ہو جانے سے اسمیں تقریباً وہ تمام نقائص پیدا ہو گئے
ہیں جو اختصاصی یا پیشہ کی تعلیم میں ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ ان تمام فوائد اور خوبیوں سے معرا ہے

جو بالعموم پیشہ کی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں۔ بظاہر وہ "عام تعلیم" ہے یعنی کسی مفید پیشہ سکھانے سے اسکو سروکار نہیں۔ یا بقول ولخوش کن جملہ گروں کے اسکا کام "زندگی کا پیشہ" سکھانا ہے۔ جو شخص بی اے پاس کرلیتا ہے وہ اکثر سوائے ملازمت کے کوئی فائدہ بخش کام نہیں کرسکتا بقول حالی ؎

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر — یہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر!

لیکن "عام تعلیم" کی جو غایت اصلی ہے وہ اس سے پوری نہیں ہوتی یعنی شوقوں کا ابھار، دلچسپیوں کی وسعت، مختلف حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنیکی صلاحیت، انسانی حقوق و فرائض سے آگاہی اور انکا احترام، رواداری وغیرہ۔

میں نے کہا ہے کہ "بظاہر وہ عام تعلیم ہے" "بظاہر" اس لئے کہ فی نفسہ "اختصاصی تعلیم ہے" یعنی وہ ایک پیشہ کے لئے تیار کرتی ہے اور وہ پیشہ ملازمت کا پیشہ ہے۔ ہم "ملازمت" کو حقیر نہیں سمجھتے معمولی حالات میں وہ بھی ملک اور قوم کی خدمت کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن اسکو تعلیم کا منتہا بنا لینا ایک تو اسکے نصب العین کو گرانا ہے۔ دوسرے اس کے فوائد اور عمدہ اثرات کو محدود کرنا۔ ملازمت کے لئے امیدوار تیار کرنے سے وہ فائدے بھی حاصل نہیں ہوتے جو پیشہ کی تعلیم سے عام طور پر حاصل ہوتے ہیں یعنی انفرادی رجحانات کا معلوم ہونا اور مخصوص انفرادی قوتوں کی نشو ونما۔ عملی مشاغل کی مصروفیت میں ذہنی طاقتوں کی ترقی۔ توجہ اور خیالات کی یکسوئی، انسانی جذبۂ تخلیق و ایجاد کی تشفی اور ان طلبہ کی صلاحیتوں کا اظہار جن کے لئے کتابی تعلیم موزوں نہیں۔

مختصر یہ کہ موجودہ تعلیم کے حاصل کرنے میں یہ اندیشہ ہرگز نہیں کہ اس سے لازمًا "تہذیب عمومی" میں کوئی اضافہ ہوگا۔ نہ اس کی وجہ سے عام طور پر جدت اور تحقیق کا مادہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کے لئے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں رعایت ہی نہیں رکھی گئی۔ نہ وہ تمام مختلف قسم کی قوتوں کو بیدار کرتی ہے۔ کیونکہ اس کی نظر کا دائرہ تنگ ہے اور حلقۂ اثر محدود۔ وہ انفرادی

طلبہ پر شوقِ خدمت یا جذبہ ترقی کو نہیں اُبھارتی کیونکہ تعلیم گاہوں کی زندگی اور نصب العین میں ان مقاصد کو عملاً تسلیم نہیں کیا گیا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس تعلیم کو حاصل کرنے والوں میں اعلیٰ درجہ کے تہذیب یافتہ صاحبانِ تحقیق، خادمانِ قوم و ملک ہوئے ہیں۔ لیکن اس کی ذمہ داری اس نظامِ تعلیم پر عائد نہیں ہوتی بلکہ خود ان لوگوں کے جوہرِ قابل پر جو باوجود ناقص ماحول کے باوجود رکاوٹوں کے اپنا اظہار کئے بغیر نہ رہا۔ برنارڈ شا نے کہا ہے "میں جیسا کچھ بھی ہوا باوجود اپنی تعلیم کے ہوں نہ کہ بوجہ اپنی تعلیم کے"۔ غالباً ہندوستان کے بہت سے مایہ ناز فرزند اس مقولہ کو اپنے پر صادق پائیں گے ہمارے طریقۂ تعلیم کی اصلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ اس نے بہت سے ایسے جوہرِ قابل خاک میں ملا دئے جو مناسب تربیت ملنے پر چمکتے اور ملک کے لئے بیش بہا سرمایہ ثابت ہوتے۔ اور عملاً نعمتِ الٰہی کا شکر ادا کرتے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اقتصادی حالت کا ردِ عمل کیا ہوا؟ ملک میں صنعت و حرفت بہت کم ہے، تجارت کے راستے اکثر اقوام کیلئے بند ہیں، زراعت ایسے پرانے اور نکمے طریقوں سے ہوتی ہے کہ اسمیں معقول اور حسبِ توقع فائدہ نہیں ہوتا۔ "عام تعلیم" ایسی ہے کہ مختلف فنون اور صنعتوں کی جانب رغبت دلائے اور نہ ہی "اختصاصی تعلیم" اسقدر عام اور سستی ہے کہ بہت سے لوگ اس سے مستفید ہو سکیں نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے راستوں کے بند ہونے اور تعلیم کی غلط راہ روی کی وجہ سے جو نوجوان تعلیم کا شوق اور استطاعت رکھتے ہیں انہی مدارس کی جانب رجوع کرتے ہیں جن سے گذرنے کے بعد ملازمت کی منزل آتی ہے لیکن دنیا کے کسی ملک میں بھی کوئی ایک شعبہ اتنا وسیع نہیں ہو سکتا کہ ملک کی قریب قریب ساری تعلیم یافتہ آبادی سما سکے۔ نوکریوں میں تو گنجائش پہلے ہی کم ہے۔ چنانچہ ملازمت کی شاہراہیں بہت جلد امیدواروں کے ہجوم کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ بھر گئیں ایک بے تحاشا اور بے اعتدال مقابلہ شروع ہو گیا جس نے لوگوں کے اخلاق اور کیرکٹر پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ قوموں کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے رواداری جاتی رہی۔ معمولی معمولی ملازمتوں کی قیمتیں بڑھ گئیں جس جگہ کے لئے چند سال پیشتر ایک انٹرنس

پاس شخص موزوں خیال کیا جاتا تھا اسکا حصول امید واروں کی کثرت کی وجہ سے اب بی۔ اے اور ایم۔ اے پاس لوگوں کے لیے بھی مشکل ہوگیا ہے۔ اور اکثر "مکمل" تعلیم پائے ہوئے آدمی یا تو نہایت کم مایہ ملازمت پر پڑے ہوئے ہیں (اور وہ خود کو مقابلتہً خوش قسمت سمجھتے ہیں) یا محض امیدواری کی منزلیں طے کرنے میں بیکاری کے سال بسر کرتے ہیں۔

اس صورت حال کے معنی قومی نقطہ نظر سے کیا ہوئے؟ یہی کہ قوم جو سرمایہ اور محنت اپنے افراد پر لگاتی ہے اس سے قرار واقعی منافع حاصل نہیں ہوتا۔ معاوضہ کے طور پر قومی خدمت توکجا یہ لوگ اکثر خود اپنا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتے اور دوسرے لوگوں پر بار ہو کر تیرتے آدمی کیلئے گردن کے پتھر کا کام دیتے ہیں نفسیاتی نقطہ نظر سے اسکی اہمیت اور بھی افسوسناک ہے افراد قوم کی طاقتیں جو قوم کی تعمیر میں صرف ہونی چاہئے تھیں۔ کم و بیش بے فیض طریقوں سے خرچ ہوتی ہیں۔ یا بالکل بیکار رہتی ہیں تعلیم کے یک طرفہ اور محدود ہونے سے متنوع صلاحیتوں کا ارتقاء نہیں ہوتا اور قومی زندگی مالا مال نہیں ہو سکتی اس طرح سے ایک ایسا مضر سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ملک کی حالت تعلیم پر برا اثر ڈالتی ہے اور تعلیم کے اثرات ملک کے لئے خراب ثابت ہوتے ہیں

(۳)

یہ ہے مختصر خاکہ اس تعلیم کا جو گورنمنٹ کے زیر اثر ہندوستان میں رائج ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری تحریک کا ذکر بھی ضروری ہے جو ملک کی حالت کی بعض تبدیلیوں سے پیدا ہوئی ہے تاریخی نظیروں سے، اور ان سے زیادہ موجودہ سیاسی اور اقتصادی حالت اور آزادی کی فطرتی امنگ سے متاثر ہو کر لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اپنے ملک کو غیر ملکی غلبہ سے خواہ وہ سیاسی ہو یا تمدنی، آزاد کریں۔ وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ ملک پوری طرح اسوقت تک ترقی نہیں کر سکتا جبتک اسے اپنی فطرت کے قوانین پر عمل پیرا ہونے کا موقع نہ ملے جب تک وہ خود اپنی زندگی کے نظام کو مرتب نہ کرے غلطیاں کرے اور ان سے سبق سیکھے، ترقی کرے اور اس سے خود اعتمادی میں اضافہ ہو، اور سب

سے ضروری یہ ہے کہ ماتحتی اور بے بسی کی وہ ذہنیت دور ہو جائے جو ہر قسم کی ترقی کا سدباب اور قوت عمل کو شل کئے ہوئے ہے۔

ہمیں اسوقت اس عظیم الشان تحریک کے سیاسی اور ادبی پہلوؤں سے بحث نہیں یہاں اسکا تعلیمی رخ پیش نظر ہے۔ بہت عرصے تک سیاسی اور قومی رہنماؤں نے محض آئینی جد وجہد تک اپنی کوششوں کو محدود رکھا۔ انکا خیال تھا کہ اگر ملک کو پہلے سیاسی آزادی میسر ہو جائے تو اس کے بعد قومی زندگی کی تعمیر نو کامیابی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ یا زیادہ تنگ نظر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ محض سیاسی اختیارات اور آزادی کا حاصل ہو جانا اس اندرونی اصلاح کے لئے کافی ہے جو قومی اور شخصی زندگی کی سلامت روی کی ضامن ہوتی ہے یعنی وہ چاہتے تھے کہ اپنا اصلاحی کام باہر سے اندر کی جانب کریں۔ حالانکہ پائدار کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب اصلاح اندر سے شروع ہو اور اپنا زبردست اثر ڈال کر بیرونی حالات کو بدل دے اس سے یہ مراد نہیں کہ سیاسی جد وجہد بیکار ہے۔ نہیں وہ بھی ضروری ہے کیونکہ جب تک وہ حاصل نہ ہو ہم ایسی فضا پیدا نہیں کر سکتے جو حقیقی اصلاح کے لئے پوری طرح سازگار ہو لیکن صرف اس پر قناعت کرنا مصلحت اور ضرورت دونوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو سیاسی آزادی کا جائز استعمال سکھانے کیلئے تعلیم کی ضرورت ہے۔ اور دوسری طرف ہم ہر قسم کی اصلاح کے لئے اس خوش آئند وقت کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے کیسے بیٹھے رہ سکتے ہیں جب آزادی حاصل ہو گی۔ ایسا کرنا ان نسلوں کے حق میں بے انصافی ہو گی جو اپنی ایک ہی زندگی اس وقت تک گذار چکیں گی اور مستقبل کے حق میں ظلم ہے جس کو ماضی کی بدعنوانیوں اور غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

غرض اس خیال کو قبول کر کے، گذشتہ نصف صدی سے ملک کے بعض بہی خواہ اور رہنما ملک کی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے اور بہت سی درسگاہیں قائم ہوئی ہیں۔ تاکہ ملک میں تعلیم پھیلائیں۔ ان مصلحین میں اولیت کا فخر سرسید کو حاصل ہے جنہوں نے بڑے پیمانے

پہلی پرائیویٹ درسگاہ مغربی علوم و مشرقی علوم دونوں کی ترویج اور امتزاج کے لیے قائم کی۔ اس کے بعد مختلف ہندوستانی قوموں نے اپنے اپنے خیالات اور احساس و ہمت کے موافق تعلیم گاہیں بنائیں۔ لیکن اس قسم کی تمام درسگاہیں حقیقی معنوں میں قومی تعلیم گاہیں نہیں بن سکیں۔ کیونکہ صرف چند مضامین کی کمی زیادتی یا انتظام کا غیر سرکاری جماعتوں کے سپرد ہونا تعلیم کی نوعیت بدلنے کے لئے کافی نہیں۔ اسکے لئے نصب العین اور نقطۂ نظر کے بدلنے کی ضرورت تھی۔ اور اس بات کی کہ آہستہ آہستہ نظام معاشرت میں ایسی ترمیم ہوتی جائے کہ تعلیم جدید اپنا اثر پوری طرح دکھا سکے۔

علاوہ اس کے، اس تحریک کا زیادہ تر زور "اعلیٰ تعلیم" پر رہا جس کے معنی یہ ہیں کہ قوم کی محنت اور دولت کا بیشتر حصہ مقابلتہً ایک بہت چھوٹی تعداد پر صرف ہوگیا۔ ابتدائی تعلیم کی نہ تو اصلاح ہوپائی نہ اس کو عام طور پر رواج دیا جاسکے (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بہت غنیمت ہی کیونکہ ناقص تعلیم (تعلیم نہ ہونے سے بدتر ہے! بہر حال) اعلیٰ تعلیم کو زیادہ اہمیت دینے کی موافقت میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اسوقت ایک ایسا اعلیٰ تعلیمیافتہ طبقہ پیدا کرنے کی ضرورت تھی جو ملکی ذمہ داریوں کو سنبھال سکے اور عام تعلیم کی تحریک کا حامل ہو سکے لیکن اول تو اس مقصد میں جو کامیابی ہوئی وہ جزوی تھی۔ دوسرے اگر یہ طریقہ عمل فوری ضرورتوں کا خیال کرکے اختیار کیا گیا تھا تو دور اندیشی اور ملک کے تغیر پذیر حالات کا تقاضا تھا کہ اسکو بدل دیا جاتا لیکن صورت حال یہ ہوئی کہ ابتدائی تعلیم جو عوام کے لئے ایک لازمہ زندگی تھی ماہرین تعلیم وغیرہ کی توجہ سے محروم رہی۔ تعلیم کی عمارت ایسی بنائی گئی کہ اسکی ابتدائی منزل کمزور تنگ اور معمولی رہ گئی۔ اور اوپر کی منزل بھاری۔ ایسی صورت میں جو تعلیمی اور معاشرتی نتائج قدرتی طور پر پیدا ہونے تھے پیدا ہوئے۔ تعلیم سطحی اور غیر موثر رہی۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک خلیج حائل ہوگئی۔ انکے خیالات، امنگوں، مالی حالت، دلچسپیوں، غرض ہر چیز میں تفاوت بڑھتا گیا۔ اور اسی سبب سے جو سیاسی یا معاشرتی تحریکیں تعلیمیافتہ طبقے نے شروع کیں

وہ ملک میں مضبوط جڑ نہ پکڑ سکیں۔ عوام کی جہالت اور خواص کی بے تعلقی کی وجہ سے انکے لئے مناسب فضا پیدا نہ ہوئی۔

(۴)

قومی تعلیم میں پچھلے چند سال سے ایک نئے باب کا آغاز ہوا ہے۔ ملک میں جو سیاسی واقعات وقوع پذیر ہوئے انکا ایک ردعمل یہ بھی تھا کہ تعلیم کو گورنمنٹ کے اثر و اقتدار سے نکالنے کی کوشش کی گئی۔ اور اسکو اس طرح ڈھالنے کی خواہش پیدا ہوئی کہ اس کو ملک کی ضروریات اور مطالبات سے ہم آہنگ بنا دیا جائے تاکہ وہ حال کی بہتری اور مستقبل کی امیدوں کی ضامن ہو سکیں۔ خیال بہت اچھا تھا اور نصب العین صحیح لیکن اس کو عمل میں لانے میں دشواریاں اور ناکامیاں ہوئیں۔ مقصد تو یہ تھا کہ تعلیم کو گورنمنٹ کے رسوخ سے علیحدہ کرکے اس میں ایک نئی روح پھونکی جائے۔ لیکن اسمیں کامیابی صرف اسقدر ہوئی کہ قومی مدرسوں میں گورنمنٹ سے امداد لینا بند کر دیا گیا اور گورنمنٹ کی یونیورسٹیاں انکی ممتحن نہ رہیں یہ کامیابی ایک منفی کامیابی تھی یعنی اس سے بعض ایسی رکاوٹیں دور ہو گئیں جو اصلاح تعلیم میں سدراہ تھیں لیکن اس سے کوئی دور رس نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اگر سرکاری امداد بند کر دینے سے تعلیم کے اخراجات بھی باقی نہ رہتے تو ہمیں بہت سی آسانیاں حاصل ہو جاتیں! لیکن در اصل نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے انکا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا۔ بلکہ بہت سی درسگاہیں جو وقتی جوش اور ابھار کی وجہ سے قائم ہوئی تھیں تھوڑی گمنامی کی زندگی کے بعد ختم ہو گئیں۔ جن لوگوں کا ایثار اور دعوے زمانہ کی ہوا کو دیکھکر اور شہرت کی خواہش سے مخمور ہو کر پیدا ہوئے تھے انہوں نے بہت جلد ان درسگاہوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لہذا اس مستعجل تعلیمی تجربہ کا انجام وہی ہوا جو اکثر ہندوستانی تجربوں کا ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک دور کی یونیورسٹی سے، جو محض ایک امتحانی مشین ہو، قطع تعلق کر لینا مفید ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اب امتحانوں کو معقول اور قرین عقل بنانا زیادہ آسانی کیساتھ ممکن ہے۔ لیکن صرف ممکن ہی ہے۔ لازمی نہیں ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اپنے فاضلانہ مضمون "مسلمانوں کی

تعلیم اور جامعہ ملیہ" میں جو اصول اور طریقے امتحان کے یا عام نصاب اور تعلیم کے لئے بتائے ہیں ان سے قومی درسگاہیں بھی اتنی ہی دور ہیں جتنی سرکاری درسگاہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ محض ایک سرکاری یونیورسٹی سے علیحدگی سے نصاب یا طریقہ تعلیم بہتر نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے ماہرین فن کی کاوش اور سنجیدہ مطالعہ اور تجربہ کی ضرورت ہے۔ اور یہ چیزیں بالعموم قومی درسگاہوں میں بھی مفقود ہیں اس لئے قومی تعلیم کے ضمن میں جو کچھ نتائج پچھلے چند سالوں کے مختصر تجربے سے ظاہر ہوتے ہیں وہ اپنی عملی صورت میں ملک کیلئے کوئی قابل تقلید نظام پیش نہیں کر سکتے چنانچہ وہ لوگ جو تعصب یا تنگ نظری یا محض کج دماغی سے قومی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں انکو عارفانہ انداز سے سر ہلانے کا موقع ملتا ہے "ہم نے تو پہلے ہی کہدیا تھا"۔ "یہ کوششیں یقیناً نیک نیتی پر مبنی ہیں لیکن ہمیں انکا انجام پہلے ہی معلوم تھا" وہ ایک نصب العین کو صورت حال کے ساتھ خلط مبحث کر دیتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ سب سے زیادہ ضروری بات تو یہ ہے کہ ہما رخ کس طرف ہے؟ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ یہ بات کہ ہم منزل پر تقریباً پہنچ گئے ہیں یا اس سے بہت دور ہیں مقابلتہً غیر اہم ہے۔

قومی تعلیم پر اس تنقید کے ضمن میں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ہندوستان میں چند قومی * درسگاہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایسی ہیں جنہوں نے اپنے میں بعض ممتاز اور امید افزا خصوصیتیں پیدا کر لی ہیں کسی مقتدر تعلیمی جماعت کو چاہئے کہ چند معقول اشخاص کا ایک وفد ان تعلیم گاہوں کے مطالعہ اور معائنہ کے لئے بھیجے تاکہ انکی خوبیوں اور قابل تقلید خصوصیات سے پبلک کو، اور ان کی قابل اصلاح باتوں سے خود انکے کارکنوں کو آگاہی ہو۔

زغم چشم

از عارف قزوینی

برغم چشم تو بی پا من از شراب شدم	خدا خراب کند خانه ات خراب شدم
فروخت خرقه و شیخ آب آتشی میخواست	میان میکده من از خجالت آب شدم
زدست هجر تو لب ریز گریه ام چکنم	ز پای تا سر و سر تا به پا سحاب شدم
چو ماه روی تو از ابر زلف بیرون شد	قسم بموی تو بیزار ز آفتاب شدم
مرا در آتش هجران گداختی یک عمر	چه شد که این همه مستوجب عذاب شدم
اگر چه بکشتم میکشد و لیک خوشم	که در عداد شهیدانش انتخاب شدم
سوال کرد ز من عارف از بری وفا	وفا چه دیدی ؟ من عاجز از جواب شدم

باد فرح بخش بهاری وزید	پیرهن عصمت گل بر درید
نالهٔ جان سوز مرغ قفس	تا به گلستان رسید

تا به گلستان رسید

قهقههٔ کبک دری	بود چو از خود سری
پنجهٔ شاهین چرخ	بی درنگ زد بچنگ

رشتهٔ عمرش برید

تا به قفس اندرم	ریخته یکسر پرم	یادم از سر گذشت

شاید از این در پرید

غنچہ پژمردہ

دست نازک میں ترے یہ غنچہ پژمردہ ہے
یا کسی ناشاد عاشق کا دل افسردہ ہے

ہو گیا ہے اس کی حالت میں یہ کیا انقلاب
عالم امکاں میں کم ہوتا ہے ایسا انقلاب

آج ہی وقت سحر زینت دہ گلشن تھا یہ
عاشقی کے صدمۂ جانکاہ کا دشمن تھا یہ

تھی نہ اسکو بلبل ناشاد کی الفت کی قدر
جس نے خود چاہا نہ ہو کیا اسکو ہو چاہت کی قدر

کھیل سمجھا تھا یہ مظلوموں کی آہِ سرد کو
دل دکھانے میں مزا آتا تھا اس بیدرد کو

ناگہاں گلشن میں اس پر پڑ گئی تیری نظر
کیا نظر تھی جس سے گھائل ہو گئے قلب و جگر

تیر الفت اس کے سینہ میں ترازو کر دیا
اس پہ تیری نرگس جادو نے جادو کر دیا

اب یہ ہے خار محبت کی خلش سے اسکا حال
آہ لب پر درد دل میں چشم پرنم جی نڈھال

رنگ فق ہے عاشق ناشاد ہجراں کی طرح
زرد چہرہ ہے رخ بیمار ہجراں کی طرح

یہ زبان حال سے محو بیان عشق ہے
اسکی ہر اک پنکھڑی اک داستان عشق ہے

اس کی خاموشی حدیث شوق کی تفسیر ہے
درد الفت کی یہ جیتی جاگتی تصویر ہے

او تغافل کیش تاثیر محبت دیکھ لے
اس کی کمھلائی ہوئی صورت کی حسرت دیکھ لے

دوستی

مجھ سے گر پوچھو تو دنیا عرصہ ظلمات ہے
زندگی انساں کی کیا ہے اک اندھیری رات ہے

ہے مگر اک شمع روشن اس شب دیجور میں
روشنی جس کی کبھی چمکی تھی شمع طور میں

اسکو کہتا ہے جہاں الفت۔ محبت۔ دوستی
ہے مجاز زندگانی کی حقیقت دوستی

دوستی تھی جس نے اس دنیا کو دنیا کر دیا
یہ نہ ہوتی گر تو عالم دیدۂ بے نور تھا

"بشکند دستے کہ خم در گردن یارے نہ شد
کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نہ شد" عابد

گمشدہ خط

وہی پر گر پڑا کبوتر کا   جسمیں نامہ بند ہا تھا دلبر کا!

تراوشِ خامہ اینز یکو کیتیل نودو

پروفیسر انیطلیو شر نیری جو "مصریات" کے ایک ممتاز فاضل تھے نیز ایوان حکومت کے رکن، کثیر التعداد اعزازات و خطابات کے حامل، ایلتی کے ایک سرگرم عمل ممبر، اور اطالیہ اور ممالک غیر کی لاتعداد علمی مجلسوں اور دار الفضلا کے رفیق علمی۔ یہ صاحب ایک دن اپنے ملازم پاسپو نیو سے کتابوں کے دو صندوقوں کو کھلوا رہے تھے جو پیڈوا (مرکز یونیورسٹی) سے گذشتہ شام کو موصول ہوئے تھے۔

یہ کتابیں اس کتب خانہ کی باقیات الصالحات تھیں جو ۲ سال اُدھر انہوں نے پیڈوا میں اُن ایام میں جمع کی تھی جبکہ جامعہ مذکور میں انہوں نے "لاطینی جدید" کی مسند درس کو زینت دی تھی بعد ازاں انہوں نے علمی مقاصد سے بہت کچھ سیر و سیاحت کی اور یکے بعد دیگرے جامعہ دریائے عالیہ فلورنس اور جامعہ نیپلس میں مدعو ہوئے، اور بالآخر وزارت (تعلیم) نے اُن سے روما میں قدم رنجہ فرمانے کی بصد منت درخواست کی۔ سینیٹرا میں خاص طور پر انکے لئے ایک "کرسی درس" نکالی گئی اور گرانقدر مراعات و معاوضات پیشکش کئے گئے۔

پروفیسر کی "گردش علمی" کے دوران میں ایک زمانہ تک یہ کتبخانہ مقفل کر کے ایک رفیق کار کی تفویض میں دیدیا گیا تھا اور پیڈوا میں اس طرح امانت رکھا رہا تھا کہ کسی نے ان کتابوں کو مس بھی نہ کیا تھا۔ شر نیری موصوف نے اس دار الکتب کا ایک حصہ اپنے زمانہ قیام فلورینس میں منگا بھی بھیجا تھا اور ایک دوسرا جزو اُسوقت منتقل کر لیا تھا جبکہ وہ نیپلس میں اقامت پذیر تھے۔ اب چونکہ انہوں نے روما کو مراجعت کر لی تھی۔ اور یہاں مستقل قیام کا ارادہ تھا۔ اسلئے کتابوں کے باقی دو صندوقوں کو بھی طلب کر لیا تھا۔

بلاشبہ یہ کتابیں ایک ایسے عالم وفاضل کے لئے قطعاً غیر ضروری تھیں جس نے خود اپنی ایک ذاتی لائبریری آراستہ کرلی تھی۔ نیز پایۂ تخت کے سارے پبلک اور پرائیویٹ کتبخانے اُس کے اشارہ چشم وابرو پر اس کے مطالعہ کے لئے حاضر تھے!۔

ہم ایک ایسی صدی میں زندگی بسر کررہے ہیں جبمیں ہر چیز دخانی طاقت سی متحرک ہے حتیٰ کہ سائنس بھی اس کلیہ میں کوئی استثنا نہیں ہے۔ آج جو صحیح ہے ممکن ہے کہ کل غلط ہوجائے علم وفن کی ہر کتاب ایک شب گذرنے پر تقویم پارینہ بنجانے کے خطرہ میں مبتلا ہے!

لیکن دس برس کا طویل زمانہ گذرنے پر بھی وہ مقالہ جسمیں ہمارے اس "علمی رستم" نے علمی مظاہرات وتجربات دکھائے تھے اور بڑے بڑے دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ پیش کئے تھے اور "فِنش" زبان کے خاندان لسانی کی ملکیت میں ایک مجموعہ الفاظ ولغات دیدیا تھا جنکی اصلیت اب تک "کیلٹک" ہوزمنگ سی وابستہ بھی جاتی تھی وہ (مقالہ) ہنوز ٹکسال باہر نہیں ہوا تھا۔ متذکرہ کتاب اگرچہ خفیف الوزن تھی مگر ثقیل المعنی تھی، یوروپ کی ساری زبانوں میں اُسکا ترجمہ ہوچکا تھا۔ اور جس قسم کی مجددانہ ومجتہدانہ معلومات اسمیں پیش کی گئی تھیں اُنہوں نے پروفیسر موصوف کو "قصر علمی" کے منارہ کی چوٹی پر بٹھادیا تھا۔ یہ الفاظ پروفیسر کے ایک پرجوش شاگرد کے ہیں منارۂ علمی کی یہ ذروہ نشینی اُس کو اُسکے مشہور ہمعصر عالم لسانیات (جامعہ اُپسالا کے پروفیسر یوانیسٹین) کے پہلو بہ پہلو حاصل تھی۔ لیکن معلوم منارہ کی چوٹی دو آدمیوں کے لئے ایک تکلیف دہ نشست گاہ ہی پایا گیا؟ کہ شنر نیری اور یوانیسٹین نے اول اول دو ایسے نبرد آزماؤں کا دلچسپ منظر پیش کیا ہے جو ایک دوسرے کو ڈھکیل دینے کیلئے زور آزمائی اور کشمکش کرتے ہیں لیکن آخر کار اس مبازرطلبی کو بے سود دیکھکر دونوں نے اپنی رقابت کو دوستی کی شکل میں تبدیل کردیا!۔

یہ دونوں فاضل بیشک علمی اکھاڑے کے دو پہلوان تھے لیکن آپس ہی میں دست وگریبان ہونیکے بجائے انہوں نے باہم ایتلاف کرکے ساری دنیا کو اعلان جنگ دیدیا۔ اگر ان دونوں رقیبوں یا دوستوں کے اعماق قلب کے اسرار کو کوئی چیز منصہ شہود پر لانیوالی ملجاتی تو ایسے

اوقات میں جبکہ دونوں میں سے کوئی پیشقدمی پر آمادہ ہوتا اور اپنا طرۂ افتخار دوسرے سے بلند کرنا چاہتا تو یہ واقعہ ہوتا تھا کہ ہر ایک دوسرے کی قدر وقیمت کا بہت حقیر اندازہ کیا کرتا تھا۔ یوانسیٹین کا "فنش" زبان کے "مادوں" (لغات مصدری و اشتقاقی) پر بہت کم اعتماد تھا اور علی ہذا القیاس سر نیری اس اکتشافی انقلاب کو بہت کم قابل اعتنا و اعتبار سمجھتا تھا جو یوانسیٹین نے سنسکرت اور فارسی زبانوں کے لسانی اشتراک کے متعلق علمی دنیا میں پیدا کیا تھا لیکن ہمیں سر دست یوانسیٹین کو دور دراز ملک ناروے میں آرام سے گوشہ نشین بنا دینا چاہئے اور اپنی ساری توجہ اپنے ہموطن فاضل علامہ کی ذات پر مرکوز کر دینا چاہئے۔ اور اب آغاز داستان اسی دوپہر کے تذکرہ سے ہونا چاہئے جبکہ پروفیسر کا ملازم یاتیپو نو کتابوں کے صندوقوں کو کھول رہا ہے اس وقت پروفیسر کی عمر اپنے منازل حیات سے چالیس منزلیں طے کر چکی ہے گو چہرہ اور قویٰ کے آثار سے دس سال سے زیادہ کبر سن معلوم ہوتا ہے۔

پروفیسر کے شانے کسیقدر جھک گئے تھے اور اس کی وسیع پیشانی پر قبل از وقت بڑھاپے کی جھریاں نمودار تھیں۔ اسکی کم نظر آنکھیں اس کی عینک کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں اور وہ قریباً نیم باز تھیں بالکل ایسی جیسی کہ کسی غنودگی آلود پالتو بلی کی ہوتی ہیں۔ اس کے بال باریک کھچڑی ہو رہے تھے اور اسکی داڑھی پریشان تھی جسکو کنگھی پٹی کچھ نصیب نہ تھی اور وہ قریباً ایک ریش سفید ہو گئی تھی۔ جوانی کے زمانہ میں سر نیری داڑھی منڈانے کا معمول رکھتا تھا لیکن جب متعدد بار اپنی خود فراموشی میں ایسا سانحہ پیش آیا کہ اس نے صرف نصف چہرہ منڈا کر مصدقاً استرہ دانی کی گردان ختم کر دی اور اسی ہیئت کذائی سے کمرہ درس میں داخل ہو گیا تو اس کے بعد سے اس نے خلوت و علیحدگی میں رہنا پسند کیا۔ پروفیسروں کی از خود رفتگی اور استغراق ضرب المثل ہے اور اس جگہ اس کے لئے کوئی شواہد جمع کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر تبرکاً یہ واقعہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ایکدفعہ بولونا ریلوے اسٹیشن پر اس نے ٹرین محض اس وجہ سے مس کر دی کہ وہ اس ہینڈبیگ کے لئے سارے اسٹیشن کی خانہ تلاشی کرتا رہا جسکو وہ خود اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا!

خودفراموش لوگ بالعموم نیکدل لوگ ہوا کرتے ہیں لیکن ہمارا پروفیسر اس کلیہ میں ایک استثنا تھا۔ معمولاً اُس کے لبوں پر عالمانہ قسم کا تبسم رہا کرتا تھا جس میں اُس تفوق و تمسخر کی آمیزش ہوتی تھی جس کیساتھ وہ کسی مجلس کی یا عوام کالانعام کی لغویتوں کو سنا کرتا تھا۔ عام مجالس و محافل میں وہ بمشکل تمام جبراً و قہراً قدم رکھتا تھا۔ اور وہاں بیشتر کھڑے رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اور عورتوں سے خاص طور پر گریزاں و متوحش تھا کیونکہ مشکل اسکو یہ پیش آتی تھی کہ اپنی انتہائی پرواز تخیل میں بھی اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُن سے (عورتوں سے) کس موضوع پر لب کشائی کرے اور خود غریب اس صنف لطیف کے افراد بھی یہ سمجھنے سے قاصر رہتے تھے کہ حضرت سے کن امور پر سلسلہ جنبانی کیجائے۔ اگرچہ ۵ یا ۶ سال قبل اس "وادی کلفت" میں متعدد عورتوں نے اس نیت سے اُس پر نظر ڈالی تھی کہ ممکن ہے وہ اُنکی لڑکیوں میں سے جو "شوہروں کے قحط الرجال" سے تنگ تھیں کسی کے لئے موزوں رفیق زندگی ثابت ہو۔

چنانچہ ایک دفعہ کاؤنٹس بیسٹوری نے کسی قدر بے تکلفی و بے حجابی کے ساتھ اُسکو کھانے پر دعوت دی تھی تاکہ اپنی دوسری لڑکی کو حبالۂ زوجیت میں قبول کر لینے کیلئے پروفیسر سے اثر آفرینی کرے۔ اس لڑکی کو دانتوں کی خرابی اور آنکھوں کی کمزوری کے عیب کی وجہ سے کوئی شوہر نہیں ملتا تھا۔ اس نوجوان دوشیزہ نے جس کو پوری پوری ہدایات اس موقع کے لئے پہلے سے تعلیم کر دی گئی تھیں پروفیسر صاحب کا غیر معمولی تپاک سے خیر مقدم کیا۔ بیچاری نے خود اپنے ہاتھ سے چاولوں کی ایک لذیذ و مرغوب قسم کی فرینی تیار کی حتیٰ کہ مصیبت کی ماری نے معاملہ کو اس نوبت تک پہنچایا کہ فنش زبان کی لسانیات اور پروفیسر صاحب موصوف کے انکشاف کردہ مصادر سے دلچسپی کا بھی اظہار کیا! لیکن رحمدل شرنیری نے اس "چوگے" پر منقار تک نہ ماری! وہ اس "جال" کی تار و پود کو فوراً سمجھ گیا اور جلدی جلدی اپنی ملاقات کو ختم کر دیا اور عہد کیا کہ بیسٹوری کے محل میں دوبارہ قدم نہ رکھے تا آنکہ نوجوان کاؤنٹس نکسو مچھلیوں کے ایک تاجر سے منسوب ہوگئی جو "سامن" مچھلی کی "آبی کاشت" کے ذوق کیساتھ ساتھ امرا کے طبقہ کی تعظیم

و پرستش کا میلان بھی اپنی طبیعت میں رکھتا تھا۔

غرض اس تلخ تجربہ سے چوکنا ہو جانیکے بعد وہ اور بھی خشک وخشن ہو گیا اور نسائیات کے تخیلات کیلئے اُسکا دماغ ہمیشہ سے زیادہ ناقابل رسائی ہو گیا۔

ہر شخص اپنی کتاب زندگی میں ایک ایسا صفحہ رکھتا ہے جس کو ایک عورت زرین یا تاریک بنا دیا کرتی ہے۔ جہانتک شرنیری کی ذات کا تعلق تھا اُسکے نسخہ حیات کا یہ صفحہ بالکل صفحہ سادہ بنا ہوا تھا۔ کم از کم اُس کے دوستوں کا یہی قول تھا اور وہ خود بھی اپنے جواب میں یہی بات کہتا۔ اگر اُس سے اسکی بابت استفسار کیا جاتا۔ نیز سوسائٹی میں اسی حیثیت سے اُسکا چرچا ہوتا تھا اور ہر شخص اس بات کے متعلق بالکل متیقن تھا۔ وہ اپنی کتابوں کے انبار کے درمیان "غرق تحقیق" رہتا تھا۔ آہ! کون اسکو ماضی بعید کی یاد دہانی کی دعوت دیتا!

یا میو نیو کتابیں صاف کرتا اور نکالتا جاتا تھا اور اُسکی زبان پر ان الفاظ کی تکرار تھی "خدا کی پناہ! خدا کی پناہ!! کچھ اس گرد کا ٹھکانا ہے"۔ بعدازاں اُس نے پروفیسر سے عرض کیا کہ بہتر ہو تا کہ آپ مجھکو اجازت دیتے کہ میں اس تمام انبار کو زینہ کے نیچے لے جاؤں اور وہاں ان کتابوں کو صاف کروں۔

لیکن پروفیسر نے سختی کے ساتھ اس تجویز کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ کل کار صفائی خود اُسکے دارالمطالعہ میں انجام پائے تاکہ وہ خود ان صاف شدہ کتابوں کو ایک دوسرے بکس میں بحفاظت رکھتا جائے جو اس کام کے لئے اُس نے اپنے پہلو میں رکھوا لیا تھا۔ بیچارہ یا میو نیو نے "مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ" کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ اور کتابوں کو یکے بعد دیگرے نکالتا اور صاف کرتا رہا اور پروفیسر اس کے ہاتھ سے ایک ایک کتاب کو لیکر بنظر غائر نام اور لوح وغیرہ پڑھکر صندوق میں رکھتا جاتا تھا۔

کمرے کی تمام فضا گرد وغبار سے آلودہ ہو گئی۔ اور تمام فرنیچر اور در و دیوار کے سوراخوں تک کو گرد آباد کر دیا۔ اور آقا اور ملازم دونوں کھانسنے اور چھینکنے لگے۔ اسی اثنا میں یا میو نیو نے

ایک بڑے سائز کی جلد (طبلق) نکالی اور کہاکہ دیکھئے اس پر ایک مکڑی کا جالا بنا ہوا ہے۔ یہ کتاب عہد عتیق کی ایک اٹلس (نقشجات) تھی جسکو ایک مشہور ناشر کمپنی نے طبع کرایا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جوں ہی پومپیو نے اس اٹلس کو اٹھاکر اس کی گرد جھاڑنے کیلئے اس پر ایک ضرب لگائی تو اس کے درقوں میں سے ایک مربع شکل کا لفافہ نکلکر فرش پر گرا۔ امتداد زمانہ سے اُسکا رنگ زرد خاکستری ہوگیا تھا۔

"یا اللہ یہ کیا؟" پومپیو بول اٹھا اور یہ کہتے ہوئے اٹلس کی جلد کو زمین پر ڈالکر وہ اسکو اُٹھانیکے لئے فرش پر جھکا۔

لیکن پروفیسر نے سبقت کرکے اسی اثنا میں خود ہی خط کو اٹھالیا تھا اور نیم خمار و غنودگی کے عالم میں اُسکے معائنہ میں مشغول تھا۔ بلاشبہ یہ "خط" تھا اور پھر اُسی کا خط! گوند سے چپکا یا ہوا ٹکٹ لگے ہوئے جو ڈاکخانہ کی مہر سے غیر مضروب اور غیر منقوش تھے۔ اور اُس پر ایک ایسے شخص کے ہاتھ کی بھاری بھرکم تحریر تھی جو بہت سے خطابات و اعزازات کا پیدائشی حامل نظر آیا تھا۔ پتہ نہایت واضح خط میں تھا اور اس بات کا اطمینان دلاتا تھا کہ خط ڈاک میں ڈالدیا جاتا تو ضرور اپنی منزل مقصود کو پہنچتا!

لفافہ کی مکمل تحریر یہ تھی۔

"ایلاجینیل سینورینا میریا لیسا ایلٹیویلا۔ فیرنیز، براہ ڈی شردی نمبر ۲۵ منزل اول"

غیر متوقع طور سے اس نام نے پیش نظر ہوکر پروفیسر کو کامل ۲۰ سال پیچھے پہنچادیا۔ گمشدگی و گمنامی کے تہہ خانہ دل سے ایک حسین و نازک اندام صورت نکلی جسکا سرتاج ایک عجیب و غریب قسم کی مغربی و شیر نیت رکھنے والا چہرہ تھا۔ یہی لڑکی تھی جس نے پروفیسر کی دنیائے دل کو متحرک و متموج کیا تھا۔ صرف اسی کیلئے ایکدن یا کم از کم ایک ساعت اُس نے خلوص و متانت کے ساتھ رشتہ زوجیت ہونیکی تمنا کی تھی! اور پھر!۔

پومپیو جو جذبۂ اشتیاق اور ذوق تجسس سے سوختہ ہو چلا تھا چپکے سے پروفیسر کے نزدیک

آیا اور زیر لب لہجہ میں کہنے لگا "لیکن یہ کیا ماجرا ہے کہ اس خط کو کتاب میں چھپا کر ڈالدیا گیا!"

شہریزی کی توجہ فوراً منعطف ہوئی، "تم کو اس سے کیا واسطہ؟ نکلو کمرے میں سے!"

"کیوں، کیا اس کام کو اب میں جاری نہ رکھوں گا؟"

"جی نہیں، اسوقت نہیں، اسوقت تو بس باہر چلے جائیے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہوگئی؟"

"کچھ نہیں۔ اگر ضرورت ہوگی تو میں گھنٹی بجا کر تمکو بلا لونگا"

پومپونیو بادل ناخواستہ رخصت ہوا۔ وہ بڑی سے بڑی چیز بھی اس راز کے معلوم کرنے کیلئے دیدیتا تھا کہ یہ کس قسم کا خط ہے جس نے اُسکے آقا کو اس طرح تڑپا کر سکتہ میں ڈالدیا۔ جب پومپونیو دفع ہوگیا تو پروفیسر باطمینان تمام اپنی آرام کرسی پر دراز ہوگیا اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اُس لفافہ کی مہر کو توڑا جسکا توڑنا میریالیسا کی نازک انگلیوں کے لئے مقدر نہ تھا۔ پروفیسر کے قلم سے جن الفاظ نے تراوش کی تھی وہ یہ تھے:

پیڈوا۔ ۱۵؍اکتوبر [illegible]ء

کارا سینورینا! ابھی ابھی یہ روح فرسا خبر میرے گوش زد ہوئی اور میں بعجلت تمام اپنی قلبی ہمدردی تمہارے اس صدمہ جانکاہ پر پیش کرتا ہوں۔ گذشتہ جولائی میں جبکہ مجھکو وینس میں تمہارے والد اور خود تمہاری معیت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ میں تمہاری اُس دلداری اور نازبرداری کا شاہد عینی تھا جو تم اُس قابل احترام روح اور گوہر بے بہا کیلئے صرف کرتی تھیں۔

تمہیں یاد ہے (میں تو کبھی نہیں بھول سکتا) اُس صبح کی ساحل بحر کی سیر؟ ہم پہلے سان لزارو دیکھنے گئے تھے جہاں مرحوم نے کس قدر مہربانی اور اعتنا کے ساتھ میری اُس گفتگو اور تشریح کو سنا تھا جو میں نے ایک گرجا کے عجائب خانہ میں رکھی ہوئی مصر قدیم کی ایک "حنوط شدہ" نعش کے متعلق کی تھی۔ پھر ایک کشتی کے ذریعہ سینٹ ایلیزبیتھ کو عبور کر کے

ہم نے آن غسل گاہوں کیطرف مراجعت کی تھی جو حال ہی میں وہاں بنائے گئے تھے۔ ہاں تمہارے والد تو تھک کر ایک ہوٹل میں آرام گزین ہو گئے تھے اور ہم تم اور ایک اور دوست ساحل آب پر مصروف خرام رہے تھے!

دن خاص طور سے ملائم و لطیف و لذیذ تھا۔ شعاع آفتاب نے زیر نقاب سحاب جاکر اپنے کو معتدل کر لیا تھا چنانچہ تم نے اپنی ننھی سرخ ریشمی چھتری بند کر لی تھی۔ اس اسوقت چھوٹی چھوٹی لہروں کا تموج ساحل پر ہماری قدمبوسی کر رہا تھا اور ہمارے نقش ہائے قدم ساحل کی ریت پر منقوش ہوتے تھے۔ ہاں اُس وقت تم نے مجھکو اس حال سے آشنا کیا تھا کہ تمہارے باپ کی صحت سالہا سال سے برابر خراب ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور معالجین نے جنکی خدمات سے یکے بعد دیگرے فائدہ اُٹھایا گیا۔ اسی طریق علاج کو مفید صحت بتایا ہے۔ لیکن پھر بھی مرض کی رفتار پر کوئی گرفت نہ کی جا سکی اور یہ صورت حالات تمہارے دل نازک پر ایک کوہ غم بنکر سوار تھی۔ نیز یہ کہ تمہاری والدہ اپنی شفقت و الفت کے تقاضہ سے اپنی بیماری تم سے مخفی رکھتی تھے! پھر تم نے اپنے گھر کی مبارک و پُر مسرت زندگی کا ذکر کیا تھا اور مجھکو اور بھی محرم راز بنانے کیلئے تم نے بتایا تھا کہ تمہارے اہل خاندان میں باہم کیسا اتفاق و یکجہتی ہے۔ کس طرح سب ہم خیال و ہم جذبات ہیں۔ اور کس طرح سب ایک دوسرے پر فدا ہیں۔ یہ الفت و فدیت اور بھی راسخ اس طرح ہو گئی کہ قریباً سارے ارکان خاندان یکے بعد دیگرے سدھار گئے اور پورے خاندان کی محبتیں اور دلسوزیاں تمہارے اور تمہارے باپ کے باہم جذب ہو کر رہ گئیں کیونکہ اب یہی دو خاندان کی یادگار باقی رہ گئے تھے۔ اور پھر سلسلہ کلام میں تم اپنے جذبات سے اس قدر متاثر ہوئی تھیں کہ تمہاری زبان ساکت ہو گئی تھی میری زبان پر الفاظ کی کیسی کشمکش تھی۔ میں اپنے دل کی ترجمانی سے بہت وحشت زدہ ہوا کرتا ہوں۔ جو میری توجہ کو میرے مشاغل مطالعہ سے ہٹا دے یا میرے معمولات میں خلل انداز ہو۔ لیکن تم کو یاد ہوگا میری سینوریتا! کہ کیسے خلوص قلب کے ساتھ میں نے تمہاری داستان کو سنکر تم سے ہمدردی کی تھی۔ تمکو معلوم ہے کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں طرح حاضر ہوں۔ میری

باہنر خدمات سے جس وقت تم فائدہ اٹھانا چاہو مجھکو طلب کر سکتی ہو۔ تم نے آہستہ سے کہا تھا "شکریہ!" اور اس حالت میں تمہارا دست نازک میرے ہاتھ کی گرفت میں مرتعش تھا۔ اسکے بعد تم نے اظہار کیا تھا کہ اب ہم کو لوٹنا چاہئے اور پاپ کی خبر لینا چاہئے۔

واپسی پر ہم ایک لفظ بھی باہم نہ بولے لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ہماری روحیں ہمکلام ہیں۔ ایک یا دو دن میں تم وینس سے رخصت ہوگئیں اور افسوس کہ خلوت میں تمہارے دیدار کا دوسرا موقع نصیب نہ ہوا۔ اچھا سینورینا! زندگی کا ہولناک ترین سانحہ پہاڑ بنکر تم پر ٹوٹ پڑا ہے اب وقت ہے کہ تم اپنے ایک دوست کی آزمائش کر لو۔

میں خود فلورینس آتا اور یہ میری عین آرزو تھی مگر میں مجبور ہوں کہ چند ساعت کے اندر مجھکو لندن کو روانہ ہونا ہے۔ تاکہ وہاں "موتمر المستشرقین" میں شرکت کروں۔

انگلستان سے فارغ ہو کر ممکن ہے کہ ایک بڑے سفر کو روانہ ہوسکوں اور سارے بر اعظم کی سیاحت کروں۔ لیکن میری نقل وحرکت کی تعیین تم کرو گی۔ تمہارا ایک لفظ براہ راست مجھکو کشاں کشاں ابھی اطالیہ لے آسکتا ہے۔ بہر حال اکتوبر کا سارا مہینہ تو طوعاً و کرہاً مجھکو لندن میں گذارنا ہے۔ اس اثنا میں میں تمہاری خدمت میں یہ چند سطور بذریعہ ڈاک ارسال کرنیکی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ایک عرصہ دراز تک جسکی مدت تمہاری تنہائی و تجرد کے زمانہ سے زیادہ طویل ہے۔ اس طرح اکیلا (ناکتخدا) رہا۔"

ہمیشہ تمہارا

انیطلیو شمرنیری

دو مرتبہ پروفیسر نے پورے خط کے چاروں صفحوں کو پڑھا اور اپنے حافظہ پر زور ڈال ڈالکر وہ دن۔ وہ وقت اور وہ جگہ ذہن میں تازہ کرنی چاہی جبکہ یہ خط معرض تحریر میں آیا اُسکے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ یہ فاش فروگذاشت اس سے کس طرح سرزد ہوئی کہ وہ خط کا ڈاک میں ڈالنا فراموش کر گیا۔ نیز یہ کہ جب میریا لیسا کیطرف سے خط و کتابت کے بارے میں کامل سکوت

اختیار کیا گیا تو کیوں نہ اُس نے دوسرا خط لکھکر ازسرنو سلسلہ جنبانی کرنی چاہی اور اپنے شکوک کی تسکین نہ کی؟ لہٰذا حافظہ کے دفینہ سے جو کچھ حاصل ہوا یہ تھا۔

میریا کیسا کے والد کی خبر وفات اُس کو ایک دن صبح کے وقت ملی تھی جبکہ وہ اپنے سامان سفر کی بندش میں مشغول تھا اور معًا اس کے تخیلات اُس نوجوان دوشیزہ کی ذات سے وابستہ ہوگئے جس کو تین مہینہ قبل اُس نے دیکھا تھا اور جس نے اس کو اسقدر اعتماد سے لبریز کر دیا تھا۔ سارا دن وہ اس حیص بیص میں غلطاں و پیچاں رہا کہ وہ صرف اس لڑکی کو تعزیت کے ایک مختصر خط لکھنے ہی پر اکتفا کرے یا اصل موضوع سخن سے متجاوز ہو کر کچھ اور بھی اظہار خیالات کرے اور اُن تاثرات کا ذکر چھیڑے جنکو میریا نے اُس کے قلب و روح میں القا کر دیا ہے اور جس اثر اندازی میں وہ بالکل مخلص ہے۔ یہ میریا ایسا کوئی معمولی لڑکی نہ تھی۔ ایک فاضل و سائنسداں کی دائمی رفیقہ حیات بننے کے لئے قدرت نے اسکو مخلوق کیا تھا۔ کیا وہ اپنے باپ کی سکرٹری نہ تھی اور کیا وہ ان فرائض کو خود پروفیسر کیلئے ادا نہ کرسکتی تھی؟ وہ دو تین زبانوں پر عبور رکھتی تھی۔ اُس کے لئے وہ یادداشت رکھنے کا کام انجام دیسکتی تھی۔ اُسکے مصنفانہ کام کو مرتب و باضابطہ رکھ سکتی تھی۔ مطبع کے پروف کی تصحیح کرسکتی تھی اور جب کبھی وہ اہل سائنس کی کسی مجلس یا موتمر میں شرکت کے لئے جانیوالا ہو اُس کے ٹرنکوں کو پیک کرتی اور اسٹیشن تک اس کے ہمراہ جاتی۔ یہ بھی ممکن کہ کبھی اس منزل سے آگے بھی اُس کے ہمرکاب ہوتی تاکہ ٹکٹ کے بارے میں سفر کے اندر جو کوفت پیش آتی ہے اُس سے اُسکو بچاتی۔ یا ہوٹل کے مالکوں سے معاملہ طے کرتی یا جہازمیں آسائش سفر اور حمل و نقل اسباب کے متعلق آسانیاں بہم پہنچاتی!۔

اس نقطہ نظر سے وہ شادی کو دیکھتا تو وہ اتنی ہیبت ناک اور تاریک غار مصائب نہ معلوم ہوتی بلکہ ایک ساحل مراد نظر آتی! ایک پرسکون و مامون بندرگاہ جس میں طوفان حیات سے پناہ لیجائے!

اسی دن شام کو اس نے یہ خط لکھا تھا منجملہ متعدد دیگر خطوط کے یہ معما لاحل تھا کہ کیونکر یہ خط

ڈاک میں چھوٹنے سے رہ گیا ۔ یہ چیستان ابھی تک چیستان تھی اور جب وہ ان تمام دلفریبیوں اور ان اور قسم کی خوش نصیبیوں پر غور کرتا جنکا حصول ممکن معلوم ہو رہا تھا تو اسکو ایک خاص قسم کا قلق و حسرت محسوس ہوتی تھی۔

خیر ایک دن پیڈوا میں پھر وہ اپنے اسی چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا ۔ میز پر ایک شمعی لیمپ جل رہا تھا ۔ اس کے سامنے پھیلا ہوا کسی کا اٹلس تھا اور پیش نظر صفحہ مصر عتیق کے ایک تاریخی منظر کو پیش کر رہا تھا ۔ اسکو اپنے دوست یعنی ایڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر مارلین کے ایک علمی استفسار کا جواب دینا تھا اور پروفیسر کو مطلوبہ معلومات بہم پہنچانے سے پہلے وہ اٹلس سے رجوع کر رہا تھا ۔ مارلین کا اصرار یہ تھا کہ وہ اور یہ دونوں بیک وقت قدیم کھنڈرات تھیبیس واقع بالائی مصر کو جا کر دیکھیں اور پروفیسر شرنیری اس مہم کو اختتام موسم تک ملتوی رکھنا چاہتا تھا اور اس اثنا میں ممکن معلومات اور آسانیاں پیدا کرنے کی فکر میں تھا ۔ یہی وقت اور یہی لمحہ تھا کہ گھر کی مالکہ نے دروازہ پر دستک دی کہ گاڑی آگئی ہے اور وہ اس کے سامان کو اس میں رکھ چکی ہے اور اب اسکو بھی بلا تاخیر آنا چاہئیے ۔ اس وقت پروفیسر پر ہیبت سوار ہوگئی تھی ۔ اس نے جلدی جلدی اٹلس کو بند کیا ۔ کتابوں کو علیحدہ کیا اور منتشر کاغذات کو تہ کیا اور ایسی عجلت و بیتابی میں اس نے خطوط کو اپنی جیب میں ڈالا اور آناً فاناً زینہ سے نیچے اترا اور کیبن میں داخل ہوگیا ۔

کون سے عجیب و غریب سوء اتفاق سے سارے خطوط میں سے یہ ایک ہی خط اٹلس کی جلد میں بند ہو کر رہ گیا ۔ کس کورانہ بے پرواہی سے اس نے سارے خطوط کو تو لیا مگر یہی خط چھوڑ دیا ۔ یہی خط جو اہم ترین تھا اور ساری ڈاک کی جان جاں!

یہ ایسا محیر العقول ماجرا تھا جس کے حل کرنے سے پروفیسر کا دماغ عاجز تھا وہ اس بات کی قسم کھانیکے لئے تیار تھا کہ ساری زندگی میں کبھی ایک واحد لمحہ کیلئے بھی اسکو بعید ترین خطرہ نہ گذرا کہ اس نے وہ خط شاید پوسٹ نہیں کیا ۔ پروفیسر اس ادھیڑبن میں کئی روز تک بالکل ساکت و صامت ، حیران و سرگشتہ اور منہمک و مستغرق رہا!

اُس سے یہ اندھا پن کس طرح ظہور میں آیا ؟ کس طرح اُس نے ایک ادنیٰ سی لغزش اور خود فراموشی میں اپنی زندگی کی برکات کے اس گلِ سرسبد کو قربان کر دیا ؟ ! ۔ کس طرح اس نے سارے مستقبل کو ایک کارڈ کے نذر کر دیا ! وہ ایک معزز شخصیت رکھتا تھا ۔ میریا کا جوابی خط اس کے پاس کسی نہ کسی نوع کا آنا چاہیئے تھا ۔ تو کیا ایسا کوئی خط اسکو موصول ہوا ۔ اگر اس کی طرف سے نفی میں بھی جواب آتا تو اس نفی و انکار کی اس نے خود دعوت دی تھی ۔ ہاں اگر میریا نے اُسکی خواہش کو شرف قبول بخشتی تو کوئی طاقت زمین پر ایسی تھی جو اُس کو اسکے ساتھ ہم آغوش ہو جانے سے مانع ہوتی ؟ ۔

استغفراللہ ! کونسا فتور عقل اُس پر مسلط ہو گیا ! لندن کے قیام کے اولین ہفتہ میں جبکہ وہ بارسیلونا ایک رفیق سفر کی معیت میں مصر کی تاریخی سیاحت کے منصوبہ اور اشتیاق میں مصروف تھا تو اسکو ایک قسم کا دغدغہ لاحق حال رہا کرتا تھا اور ڈاک کی تقسیم کے ہر موقعہ پر وہ پریشان حال ہو جاتا تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس چیز سے خائف ہے یا پھر کس شئے کا تمنائی ہے ! بعد ازاں جبکہ وہ موتمر کی کارروائیوں میں تمام و کمال منہمک ہو گیا اور اپنے دو علمی مقالات پیش کر چکا تو پھر خود ہی وہ اپنی موجودہ حالت پر اپنے کو شاکر محسوس کرنے لگا اور اس خیال کیطرف اُسکا دماغ منتقل ہونے لگا کہ چلو اچھا ہوا کہ یہ قصہ خود ہی نذر گمنامی ہو گیا ۔ اور اس طرح ایک نامعلوم طور سے وہ پا بزنجیر نہوتے پایا اور آزادی کی نعمت بے بہا سے محروم نہ بنایا گیا ۔ کانگریس کے اجلاسوں میں وہ آفتاب و ماہتاب بنکر چمکا اور عزت و نمود کی ان جلوہ آرائیوں میں اُس مخلص ، اور مفلس ، اور یتیم لڑکی کا خیال صفحۂ دل سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا ۔ وہ ایک قسم کا اطمینان محسوس کرنے لگا کہ خود میریا نے ایک بے وجہ خاموشی اختیار کر لی اور بغیر انکار کی اہانت کا سامنا کئے یہ معاملہ اس گومگو میں ایک سلامتی کے ساتھ منقطع ہو گیا ! ۔

وہ ہمیشہ اس خیال خام میں مبتلا رہا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا اور اب اگر میری پیشکش پائے حقارت سے ٹھکرا دی گئی تو میرا کیا قصور ؟

مگر اس مغالطہ میں ایک دن آخر کار اسکو جولیس قیصر کی طرح اسی کی ہمنوائی میں اپنی حرماں نصیبی پر قیصری کے الفاظ منہ سے نکالنے پڑے جو معلوم عوام ہیں۔

بہ عظم یوروپ میں مع اپنے رفقائے سفر کے ایک عاجلانہ قطع منازل و مراحل طے کرتا ہوا وہ برنڈزی میں وارد ہوا جہاں سے جہاز میں سوار ہو کر عازم اسکندریہ ہوا۔ ۲ سال کا زمانۂ سیاحت مصر و حبشہ میں بسر ہوا نیز انہی ایام میں اُس نے "آثار الصادیدہ" کے بہیر و علمی "تحریرات کو پڑھا اور یوروپ کے ممتاز رسائل و جرائد میں اشاعت کے لئے اپنے مراسلات و مقالات بھیجے اخبارات۔ رسائل۔ اہل سائنس کیطرف سے خطوط کی کثیر تعداد میں بارش ہونے لگی اور اٹلی، فرانس اور جرمنی کی اکاڈمیوں کی طرف سے انتخاب و ممبری کے دعوت نامے و اطلاعنامے موصول ہوئے۔ نیز میڈوا کی مالکہ مکان کیطرف سے بعض مجنونانہ خطوط بھی ملے۔ لیکن دیار ریار یعنی طورینس سے میریالیا کی جانب سے ایک حرف بھی گوش زد نہیں ہوا! اب جبکہ اُس نے وطن کو رجعت کی تو اُس کی لوح دل میریالیا کے خیال سے بالکل صاف تھی۔ صرف ۲ سال اس انقطاع کو گذرے تھے مگر یہ دو سال اُس کے لئے ۲ صدی کے ہم معنی تھے اور گذشتہ واقعات و معاملات اس کے دماغ میں ایک مبہم تخیل اور ایک عالم ہیولانیت بنکر رہ گئے تھے اور اسکو ایک بعید ذہنی فاصلہ نے اس سے جدا کر دیا تھا۔ اسی کا قدرتی نتیجہ تھا کہ جب اُسکو ایک وقت یہ معلوم ہوا کہ میریالیا نے سسلی کے ایک غیر معروف شخص سے جس کی سکونت بھی ایک گمنام گوشہ میں واقع تھی شادی کر لی تو اُس کے توازن دل و دماغ میں برائے نام متوج بھی نہ پیدا ہوا اور اُس نے اس واقعہ کی خبر کو ایسی ہی آسانی سے برداشت کر لیا جیسی کہ پیش آمدہ صورت حالات میں امید ہو سکتی تھی۔

ہمارا پروفیسر اپنے کن مشاغل میں اسوقت مصروف ہے! سنئے اُس کو وزارت (تعلیم) کے متعدد دعوت ناموں میں سے انتخاب کرنا ہے۔ اُسکو ایڈنبرا ریویو کے لئے "حبشہ کے آثار قدیمہ" پر ایک مقالہ سپرد قلم کرنا ہے اور سب سے آخر میں اُس کو فنش اور کیلٹک زبانوں کے "مصادر" کے متعلق ایک پر مغز فاضلانہ مضمون لکھنا ہے کیونکہ صرف اسی علمی تنقیح کی تحقیق کی خاطر اُس نے اپنے

تنیں لسانیات کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا تھا اور اُسکو مقدم رکھکر ہر دوسری چیز کو پس پشت ڈالدیا تھا! -

غریب میریا لیسا کی ہمارے پروفیسر صاحب کے سامنے کیا ہستی تھی اُس کے ساتھ ازدواجی رشتہ اس کے علم و فضل کی عظمت و جبروت کے لئے ایک کافی اہانت تھی۔ چنانچہ چند ہی روز بعد جب وہ فلورینس میں ایک مسند درس کو قبول ہی کر چکا تھا تو اُسکا یہ ارادہ اُسکی شان سے فروتر سمجھا گیا اور اُس پر ایک احتجاجی مظاہرہ کیا گیا! -

فرض کیجئے کہ اگر اس وقت میریا لیسا کا سامنا پروفیسر سے کسی جگہ ہو جاتا تو کیا ظہور میں آتا! - وہ بمشکل اس کو پہچاننے پر بھی آمادہ ہوتا اور گذشتہ راہ رسم کی بنا پر اس کو مورد الزام اور مرتکب توہین گردانتا!! -

افسوس! پروفیسر کو جملہ شکوک و شبہات سے جلد نجات مل گئی! غریب و مسکین میریا! - یتیم و بیکس میریا! - حرماں نصیب و مجبور میریا! - افلاس کی مجبوری سے ایک دوسرے شخص سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جانیوالی میریا!! قابل رحم ہستی! پھر بھی تیری قسمت میں جینا نہ لکھا تھا! شادی کے صرف - ابھینہ بعد یہ ناشاد و نامراد ہستی سل میں لپیریا بخار کا شکار ہو گئی! -

مر گئی! . . . اسطلو شرینری کی ساری ہستی میں رحم و حسرت سرائت کر گئی - مر گئی!! ایسی جوانامرگ! وہی لڑکی جو میری بیوی ہونیوالی تھی! - تب تو وہ اکیلا ہو گیا اور اب وہ فی الواقع اپنے تخیلات کی شاعرانہ دنیا میں تنہا ہے! اور اُسکے فراق و فرقت میں تباہ و برباد! آہ! اس سے تو ہزار درجہ یہی بہتر تھا کہ میریا نے کبھی اسکو جواب خط نہ لکھا ہوتا اور ہمیشہ پردہ گمنامی میں رہتی۔ اے کاش محبت و عشق کے وہ ریشمی رشتے نہ تنے گئے ہوتے جنکی قسمت میں اس طرح ٹوٹنا تھا! کاش وہ اس محبوب خواہش کا عادی نہ بنا ہوتا کہ ایک عورت اپنی تسکین قلب و روح کے لئے اپنے پہلو میں موجود ہو - اہل حال کہتے ہیں کہ ان ساری باتوں سے لذت چشیدہ

ہو جانے کے بعد اُن سے کشمکش ہونا سخت شاق و دشوار ہوتا ہے!۔

تاہم شرنیری نے اپنے روحانی زخم کے اندمال کے لئے جلد اسباب جمع کر لئے۔ اور پھر امتدادِ وقت نے بھی ایک مزید مرہم کا کام دیا۔ انقضائے زمانہ نے اس سانحہ پر ایک گرانبار پردہ ڈالکر اس کو چھپا دیا۔ اور خود میریالیا کا نام محبوب اور گوشۂ کس مپرسی میں دفن ہو گیا!۔

اٹیلس سے نکلے ہوئے خط نے اسوقت ساری داستانِ پارینہ کو یکبارگی زندہ کر دیا۔ ایک متوسط العمر شخص جو اپنے مطالعہ علمی میں بڑھا ہو گیا ہو اور زنشۂ خودی سے اس کے قلب و روح کی لطافت تعقل و تختی سے بدل گئی ہو اب وہی سر فرتوت اور بے حس و بے درد دل ہے جس کے سامنے جوانی کی تازگی اور شباب کی رنگینی کا ایک پیکر دلفریب تخیل کی خلاقی سے وجود میں آتا ہے! اُس کے ہاتھ میں یہی خوبصورت چھوٹا سا خط تھا کہ اسکی چشمِ تخیل کے سامنے حسین میریالیا کا شیریں چہرہ پھرنے لگا۔ اُسکا تخیلی پیکر پروفیسر سے یہ بازپرس کرتا نظر آتا تھا کہ "تو نے اس حادثۂ فاجعہ میں میری ہمدردی میں ایک لفظ بھی اپنی زبانِ قلم سے نکالا! جن لوگوں سے محض رسمی صاحب سلامت تھی انکو بھی رحم آگیا! تو کہ جس نے اپنے خلوص محبت کا نقش میرے دل پہ ثبت کر دیا تو ہی اس موقعہ پر خاموش اور بے حس رہا!!

میری تربت پہ سب روئے نہ رویا اک وہ سنگین دل قیامت ہے کہ دو آنسو نہ چشمِ یار میں آئے!

ہاں میں نے تجھکو اُس وقت میں صدائے استمداد بھی دی مگر کیا نتیجہ! آہ! ناشاد ہے وہ عورت جو کسی مرد پر اعتماد کرے!"۔ شرنیری بالکل ایسا محسوس کر رہا تھا کہ گویا واقعی میریالیا کی آواز مسموع الفاظ میں اس سے فریاد و فغاں کر رہی ہے!

اور آہ! وہ ایسی حالت میں مری کہ اُس کو پروفیسر کی صفائی سننے کا موقع نہ ملا اور حقیقت واقعہ اُس پر مستور ہو گئی سچ یہ ہے کہ یہی مصیبت بالائے مصیبت ہے جس کی تلافی نا ممکنات میں داخل ہے۔ وہ ایسی غلط کاریوں اور فروگذاشتوں سے عذابِ تنگئی جسکا ارتفاع مشکل ہے اور غلط فہمیوں اور مغالطوں کے ایسے تہ بر تہ پردہ ہائے ظلمات پڑ گئے جنکے اُٹھنے کی کبھی امید نہیں!

ہاں وہ خط جس کو کھلا ہوا پروفیسر اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا۔ صرف اسی بات کی یاد دہانی نہ کر رہا تھا بلکہ یہ تماشا حقیقت بھی اُسکی آنکھوں میں پھر رہی ہے کہ آہ! میری زندگی میں ایک ایسا نادر موقع آیا کہ اسکے لبریز شعریت و محبت ہو جانیکے اسباب فراہم ہو گئے تھے لیکن وا حسرتا! کہ زندگی کا وہ صفحہ غیر رنگین ہی رہگیا! اب وہ مثل ہے کہ۔

کھوئی ہے وہ چیز جسکا پانا ہے محال   آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم!

اب زندگی میں دوسری مرتبہ اُسکا دل کسی نسوانی وجود کی تحریک بخشی سے حرکت میں نہ آئیگا۔ اب دوبارہ اُسکی نوک قلم سے وہ الفاظ تراوش نہ کرینگے جو ہمکو بظاہر خشک و رسمی معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل لو اور لگن کی آگ سے سوزندہ و روشن ہیں۔ اور اب عالم خیالات میں اُس نے اپنے سے سوالات کرنا شروع کئے ؛ "فرض کرو کہ خط ڈاک میں ڈالدیا جاتا۔ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا اور میریالیسا اس طرح جواب دیتی ؛ میں جانتی ہوں کہ جو تیری آرزو ہے قبول ہے اچھا منظور! میں تجھکو دل دیچکی ہوں۔ اور تیری ہو جانا چاہتی ہوں۔ تاکہ

من تو شدم تو من شدی!

ہاں پھر تو میں مصر و حبشہ کی سیاحت میں وقف آوارگی نہوتا! نہ اہرام مصری کے مصور تحریروں کو حل کرتا اور نہ مصر عتیق کے خرابات کی زبان کی تعبیریں کرتا! یہ بھی ممکن تھا کہ آج میرے گرد و پیش میرے لخت جگر ہوتے!!۔ ہاں یہ بھی دائرہ امکان میں تھا کہ خانگی تفکرات میری شہرت میں سنگ راہ بنجاتیں! میری علمی سرگرمیاں جمود و پابستگی سے سرد ہو جاتیں اور اس طرح میرے سر پر علمی اعزازات اور خطابات کے پھولوں کی بارش نہوتی! یہ بھی قرین قیاس تھا کہ قفنش" زبان کے اشتقاقی مادوں کے متعلق میری یادگار تحقیقات اور انکشافات معرض وجود میں نہ آتیں اور شاید ایسا ہوتا کہ میرے بجائے کوئی اور شخصیت جامعہ سپا کے پروفیسر لوئینیشن کے پہلو بہ پہلو منارۂ علمی کی چوٹی پر متمکن ہوتی!! مگر یہ سب کچھ جو وقوع میں آیا بالکل نہ پیش آتا تب بھی پروفیسر شرنیری کے جذبات اسوقت یہی کہہ رہے تھے کہ مؤخر الذکر ہی صورت سعادت و مسرت

حقیقی ضامن تھی! کاش ایسا ہی ہوتا اور آج پروفیسر اپنے زخم جگر کی مرہم بخشی کے لئے اُس موہوم اور تشنہ توجیہہ و معذرت پر اکتفا کرنے کی مصیبت نہ پڑتی جو اسوقت تنہا اس کو میسر تھی! کیا اچھا ہوتا کہ ساری عظمتوں اور شہرتوں کو خیرباد کہا جاتا اور اسکے نعم البدل میں ایک چھوٹی سی محبت کی شان و شکوہ خرید لی جاتی! ؟

پروفیسر شرنیری میں اتنی مخلصانہ جرأت نہ تھی کہ ایسی حالت میں اس خط کو پارہ پارہ بھی کر دیتا اور اسکو اس کی مکتوب الیہا کے ساتھ خاکستر میں تبدیل کر دیتا مگر اس نے خط کو اپنے ڈیسک میں رکھ لیا اور پومپیو نیو کو واپس طلب کیا تاکہ وہ اپنے فرض کو پھر شروع کرے اور یہ تعویق میں آجانے والا کام اختتام کو پہنچائے! ۔ لیکن شام ہوتے ہوتے پروفیسر کے دل میں پھر ایک ناقابل مقابلہ و ضبط خواہش موجزن ہوئی کہ اس ۲۰ سال پرانے خط کو ایک مرتبہ پھر پڑھے اور پھر اُس کے بعد کوئی دن ایسا نہ گزرتا جس میں وہ بے اختیار ہو کر کسی نہ کسی وقت اس نامراد اور بوسیدہ خط کو اس کے لفافہ سے نکالتا ہو اور بار بار اسکو نہ پڑھتا ہو ۔ کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ! پھر وہ لفافے کو دیکھا کرتا ٹکٹ کو دیکھتا جس پر ڈاکخانہ کی کوئی مہر منقوش نہ تھی اور زیر لب کہتا "کاش کہ خط روانہ ہو جاتا"!

نوٹ :- مذکورہ بالا قصہ کا مصنف ،، ایرمکوکیتل نورو ۱ پیدائش ۱۸۳۹ء بمقام فلورینس اٹلی کے مقر قصہ نویسوں "سابقون الاولون" کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ مختلف ادبی حیثیات کا جامع ہے اور شاعروں ڈرامہ نویسوں اور ناول نگاروں کے درمیان ایک برزخی رشتہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسکی ادبیات، عائر مطالعہ، تیز ڈرینگ سیرت، فطرت انسانی کی نباضی، اور ایک پرجوش جذباتی طرز تحریر کی خصوصیت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اسکا یہ قصہ بھی جو زیر عنوان "گمشدہ خط" پیش کیا جاتا ہے اُس کی ادبی محاسن و خصائص کا آئینہ دار ہے۔

شذرات

اس چهشنبہ کی ۲۹ تاریخ جامعہ ملیہ کا یوم التاسیس ہے۔ اب سے چھ سال پہلے اسی دن حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اعلی اللہ مقامہ نے علیگڑھ کالج کی مسجد میں با ہمت نوجوانوں اور ایک اعلیٰ تعلیمی نصب العین کو ملت اسلامی سے لیکر خادمان ملت کے سپرد کیا تھا یہ نصب العین اور یہ نوجوان جامعہ ملیہ کے نام سے موسوم ہیں۔

جامعہ کی چھ سال کی زندگی قوم کے سامنے ہے۔ اسمیں سے پہلے پانچ سال میں جو رفتار اس تعلیمگاہ کی تھی اُسکے بہت لوگ شاکی ہیں اور اُنکے خیال میں صرف سال گذشتہ سے جامعہ نے صحیح راستہ پر چلنا شروع کیا ہے۔ مگران حضرات نے کبھی اس پر غور نہیں کیا ہے کہ کارکنان جامعہ کس حد تک اس معاملہ میں معذور رتھے اور اُنکا طرز عمل جو بظاہر بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے کہاں تک گہرے تمدنی مصالح پر مبنی تھا۔

مسلمانوں میں پچھلے پندرہ برس سے جو بےچینی اپنے تمدن کو حالت نزع میں دیکھکر پیدا ہوگئی تھی اور جس نے فطرتی طور پر سیاسی صورت اختیار کی ۱۹۲۰ء میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی خوش قسمتی سے عام ہندوستانیوں کے ساتھ اور اُن سے زیادہ مسلمانوں نے اس زمانے میں محسوس کیا کہ قوموں کی سیاسی غلامی کا تعلق اُنکی عام ذہنی غلامی سے ہے اور چاہا کہ پہلے اپنے آپ کو اس غلامی سے آزاد کریں۔ یہی خیال آزاد قومی تعلیمگاہوں کی بنا کا محرک تھا جن میں جامعہ ملیہ خاص اہمیت رکھتی ہے۔

اب مشکل یہ پڑ گئی کہ مسلمانوں میں کام کرنے والوں کا قحط ہے۔ چند افراد کو جنمیں سیاسی بیداری پیدا ہوگئی ہے سارے قومی کام کرنا پڑتے ہیں۔ جامعہ ملیہ کے چلانے کا بار گراں بھی انہیں لوگوں کو اٹھانا پڑا جو قوم کے سیاسی رہنما ہیں۔ کچھ اس فضا کے اثر سے جسمیں جامعہ

قائم ہوئی تھی اور کچھ تعلیمی کاموں کی اہلیت رکھنے والے افراد کی کمی سے جامعہ پر یقیناً پانچ برس تک سیاسی رنگ غالب رہا اور اس سے اُس کے تعلیمی مقصد کو نقصان پہنچا۔ ممکن ہے کہ بعض سخت گیر نکتہ چینوں کو جامعہ کے کارکنوں کا قصور نظر آئے لیکن اگر وہ اُنکی مشکلات پر لحاظ کرینگے تو انہیں بڑی حد تک معذور رکھیں گے۔ ان حضرات کی نیک نیتی کا یہ بین ثبوت ہے کہ جب اُنکو کچھ افراد ایسے مل گئے جو تعلیمی کام کرنیکے اہل تھے تو انہوں نے فوراً جامعہ کو تمام سیاسی جماعتوں سے الگ کرکے ان معلموں کے انتظام میں دیدیا۔ اگر آئندہ چل کر کبھی ہمارے سیاسی رہنما جامعہ کے معلموں کو خالص تعلیمی کام سے روکیں اور سیاسی تحریکوں سے متاثر ہونے پر مجبور کریں تو قوم کو اُنکی اصابت رائے اور خلوص میں شبہ کرنے کا حق ہوگا لیکن گذشتہ نقائص پر جو مجبوری کے سبب سے تھے انہیں ملامت کرنا کریم النفسی سے بعید ہے۔

کارکنان جامعہ کیطرف سے "عذر گناہ" کرنیکے بعد جو غالباً موجودہ صورت میں "بدتر از گناہ" نہیں ہے ہم پر اُنکی خدمات کا اعتراف بھی لازم ہے۔ سیاسی شورش میں ڈوبے ہوئے نوجوانوں کو جو ذرا سی غفلت سے تشدد آمیز انقلابی تحریکوں میں شریک ہو جاتے ایک تعلیمی کام میں خواہ وہ سیاست ہی سے متاثر ہی کیوں نہ ہو لگا دینا یقیناً ایک دانشمندانہ فعل تھا۔ جو لوگ "بنگال کی بے چینی" کے نظارے دیکھ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح پرجوش اور ناتجربہ کار نوجوان سیاسی تحریکوں کے اثر سے بم سازی اور قتل و غارت کے مہلک اشغال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یقیناً جامعہ ملیہ کا گذشتہ سیاسی دور بھی اس لحاظ سے بہت غنیمت تھا کہ اُسکے طالب علم ہر قسم کی تشدد آمیز تحریکوں سے بالکل الگ رہے۔ اس ضبط و اعتدال کے لئے یقیناً جامعہ کے کارکن شکریہ کے مستحق ہیں۔

بہرنوع اب سال بھر سے جامعہ سیاست سے قطعاً الگ ہو چکی ہے اور خالص تعلیمی درسگاہ

ہے اسکا موجودہ نصب العین کم وبیش وہ ہے جو ہم اپنے رسالہ کے صفحات میں "جامعہ ملیہ اور مسلمانوں کی تعلیم" کے عنوان سے پیش کر رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب قوم کے تمام اہل الرائے جامعہ پر پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب ملت اسلامی کہاں تک اس تعلیمگاہ کو اپنے مقاصد کے حصول میں مدد دیتی ہے۔

جامعہ ملیہ کا ایک وفد بسرکردگی مولانا خواجہ عبد الحی صاحب استاد تفسیر و ناظم دینیات کاٹھیاواڑ گیا ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ کاٹھیاواڑ کے مسلمان بھی ہمارے وفد کا استقبال اسی گرمجوشی سے کریں گے جو حیدرآباد اور صوبہ متوسط و برار کے لوگوں نے دکھائی تھی۔

(ع۔ح)

ماہ گذشتہ میں میں فصلی بخار میں مبتلا رہا جسکی وجہ سے [illegible] حرف پچھلے رسالہ میں نہ لکھ سکا۔ مجھکو اپنی اس علالت کا نہایت افسوس ہے۔ کیونکہ ماہ گذشتہ میں حجاز کانفرنس کا جو اجتماع لکھنؤ میں ہوا تھا اس پر تبصرہ اسی مہینہ میں ضروری تھا۔ مگر وہ اس مجبوری کی وجہ سے تاخیر میں پڑ گیا اور ناچار اس نمبر میں لکھنا پڑا۔

کانفرنس مذکورہ کی تجاویز پر ملک کے اخبارات نے اسلامی سیاسی زاویہ نگاہ سے بسیط بحثیں کی ہیں اور اکثر ارباب بصیرت و مختلف جماعتوں نے انپر مخالفت کی آوازیں اٹھائی ہیں کیونکہ وہ نہ صرف غیر مفید بلکہ مضر ہیں اور مسلمانوں میں تفرقہ انگیز۔ خاصکر التوائے حج کا ریزولیوشن جو اس کانفرنس نے پاس کیا ہے اس سے بیت اللہ اور دین اسلام کے ایک عظیم الشان رکن یعنی حج کا استخفاف ہوتا ہے۔

حج اسلام کی سیاسی چیز نہیں ہے بلکہ ایک خالص اہم دینی فریضہ ہے۔ جس کی بابت اللہ تعالیٰ نے بانی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ۔

وَاَذِّن فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ اَلآیۃ

یہی حکم اسلام میں بھی قائم رکھا اور فرمایا۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً

اس لیے حج دین کا ایک نا قابلِ ترمیم اور اٹل رکن ہے کسی جماعت کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ شرائط موجود ہوتے ہوئے کسی وجہ سے بھی اسکو روک سکے یا ملتوی کر سکے۔

بیت اللہ قبلہ اسلام مرکز توحید۔ سرچشمہ ہدایت اور برکت والا گھر ہے۔ اللہ واحد پر ایمان رکھنے والوں کو اس کے ساتھ جو شیفتگی اور وارفتگی ہے وہ قلبی۔ اعتقادی اور ایمانی ہے جو سیاسیات کی دسترس سے قطعاً بالاتر ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ابھی حج فرض بھی نہ ہوا تھا کہ مدینہ طیبہ میں آپ اور صحابہ کرام اس مرکز توحید کی زیارت کے لئے بیتاب تھے۔ چنانچہ ایک قافلہ لیکر عمرہ کیلئے روانہ ہوگئے۔ اور جب حدیبیہ میں روکدئے گئے تو مجبوراً مصالحت کرکے واپس تشریف لائے لیکن حسب معاہدہ دوسرے سال جاکر عمرہ کیا۔ حالانکہ مکہ اسوقت ان لوگوں کے قبضہ میں تھا جو اسلام کے لئے اشد اور مسلمانوں کے لئے الد الخصام تھے۔ مگر حضور اکرم اور صحابہ پاک کے دل میں کبھی اس قسم کے بائیکاٹ اور التوائے زیارت کا خیال بھی نہیں آیا جو آج باوجود حج کی فرضیت کے حجاز کانفرنس تجویز کر رہی ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ۳۱۷ھ سے ۳۲۶ھ تقریباً دس سال تک قرامطہ کی شورش رہی جنہوں نے مکہ پر قبضہ کرکے باشندوں کو لوٹ لیا۔ حاجیوں کو ذبح کر ڈالا۔ سیکڑوں لاشیں چاہ زمزم میں پاٹ دیں۔ حجر اسود اکھاڑ لیا۔ غلاف کعبہ پارہ پارہ کر ڈالا۔ انکی دستبرد سے نہ راستے محفوظ تھے نہ خود حرم مامون تھا مگر باوجود اسکے عالم اسلامی سے کہیں سے التوائے حج کی صدا نہ اٹھی۔ اور جو مومنین مخلص تھے وہ اس پرشور زمانہ میں بھی دور دراز سے آکر اس فریضہ کو ادا کرتے رہے۔

آج کل ہندوستان کے متعدد رسالوں میں جو مسلمانوں کے قلم سے نکلتے ہیں یہ بحث بارہا نظر سے گذری کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت جیسا کہ مسلمانوں کا خیال ہے بن باپ کے نہیں ہوئی تھی، بلکہ وہ بھی عام طریقہ کے مطابق والدین سے پیدا ہوئے تھے۔ اگر یہ دعویٰ محض عقلیت کی زبان سے کیا جاتا تو بھی خیریت تھی لیکن غضب تو یہ ہے کہ یہ مدعیان خود قرآن کریم سے اسکو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جس تاویل سے بھی ممکن ہو آیات کو اپنے مقصد کے موافق بنانے میں انکی معنوی تحریف میں کوئی دریغ نہیں کرتے۔

حضرت مسیح کے بن باپ کی پیدائش سے انکار پر۔ انکے آیۃ اللہ ہونے کا انکار۔ مثیل آدم ہونے کا انکار۔ کلام فی المھد کا انکار۔ غرض انکار کا ایک سلسلہ نکل آتا ہے جسکا کم سے کم وہ قرآن تو ہرگز بھی متحمل نہیں ہو سکتا جو عربی مبین میں نازل ہوا ہے اور جس کو اسی طرح سمجھنا چاہئے جس طرح عربی مبین بولنے والوں کا کلام سمجھا جاتا ہے۔

آج سے ایک تہائی صدی پیشتر جبکہ سرسید احمد خاں اور انکے بعض رفقا نے جو جدید سائنس سے۔ (جس سے خود انکو بہت کم واقفیت تھی) مرعوب ہو کر اسلام کو مصلحت کے لئے اس کے پاؤں پر ڈال رہے تھے اس قسم کی لایعنی اور دور از کار تاویلات کا دروازہ قرآن میں کھولنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ہر ایک خرق عادت یا معجزہ کی جو قرآن میں آگیا ہے سائنس کے عدم تسلیم کے شبہ کے خوف سے صورت مسخ کر دیتے تھے۔ اس بارگاہ اصلاح میں کیسی کیسی ذہنی جولانیاں دکھائی جاتی تھیں۔ خود اسی کے ایک معتبر گوئندہ کی زباں سے انکا ایک نمونہ سننے کے قابل ہے۔

صدر محفل ہوا اپنے یاران خاص کے۔ بیٹھے تھے زیر بحث حضرت یونسؑ کے قصہ کی یہ آیت تھی "فَلَوْلَآ اَنَّہٗ کَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ الآیہ"
سوال یہ تھا کہ تسبیح میں یہ طاقت کہاں کہ مچھلی کے منہ سے کسی کو نکال سکے۔ ایک

تیز طبع رفیق بولا کہ مسجین سباحت سے مشتق ہو سکتا ہے جس کے معنی تیرنے کے ہیں یہ تاویل سنکر پیر پرم کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور آنکھوں سے سرور نمایاں ہوا کہ اس خلاف عقل بات کا ایک لطیف حل نکل آیا۔ قریب تھا کہ یہ جدید انکشاف تفسیر میں درج کردیا جائے۔ لیکن راوی کا بیان یہ ہے کہ وہاں ایک کونہ میں ایک شخص ایسا بھی بیٹھا ہوا تھا جو کسی قدر عربیت اور قرآن سے آشنا تھا! اس نے سمجھایا کہ مسجین کے معنی عربی زبان میں کہیں یہ نہیں آئے ہیں۔ علاوہ بریں خود قرآن ہی نے دوسرے مقام پر اس کی تفسیر کردی ہے کہ

وَنَادیٰ فِی الظُّلُمَاتِ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ الالہ

اس لئے یہ تاویل اہل علم کبھی تسلیم نہ کرینگے بلکہ اس پر ہنسینگے۔

اس تقریر کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے بصد حسرت یہ نکتہ لطیف چھوڑ دیا گیا اور قلمبند ہونے سے رہگیا۔

اللہ۔ اللہ۔ ولو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السموات والارض ومن فیھن۔

دراصل اسی کی صدائے بازگشت ہے جس کو آجکل ہم ان اڈیٹروں سے سن رہے ہیں لیکن مجھے حیرت اور تعجب مولانا احمد الدین صاحب امرتسری پر ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں وہ ایک اچھے قرآن فہم اور دیدہ ور آدمی ہیں۔ وہ کیسے اس دہوکہ میں آگئے۔ لکھتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ نے سچ مچ بغیر خاوند کے حضرت مریم کو بیٹا دینے کی خوشخبری دی ہوتی تو ظاہر ہے کہ ایسی خوشخبری چھپانے کیلئے بلکہ اپنی تہمت کے مواقع پیدا کرنے کیلئے نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں قطعاً ضروری تھا کہ حضرت مریم پکار کر لوگوں سے کہدیتیں کہ مجھے خارق عادت طور پر بغیر خاوند کے بیٹا ہونے والا ہے تم دائیوں سے میرا امتحان کرالو۔ اور مجھے ہر طرح حفاظت میں رکھلو پھر دیکھو کہ

پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے ۔ (رسالہ طلوع امرتسر بابت ستمبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۲۷)
بندہ نواز! عذرا بتول حضرت مریم معمولی عورت نہ تھیں اللہ تعالیٰ نے انکو دنیا کی عورتوں پر فضیلت دی ہے انکا ایمان اور توکل اس سے کہیں زیادہ تھا جتنا آپنے سمجھ رکھا ہے ۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ جس اللہ نے مجھے اس کڑی آزمایش میں ڈالا ہے اور حتمی فیصلہ کر دیا ہے کہ میرے بغیر خاوند کے بیٹا ہو وہ ضرور اسکا بھی سامان کر دیگا کہ میری عزت اور ناموس محفوظ رہے دائیوں اور ڈاکٹروں کے معائنہ سے اُنکی ذات مقدس بے نیاز تھی ۔

چنانچہ جب آں معصومہ دور نکل گئیں ۔ اور کھجور کے درخت کے پاس انکے شکم سے بچہ پیدا ہوگیا اور ابھی تک کوئی حجت اپنی برائت کی نہ پائی تو ہر چند کہ اپنے ضمیر اور اپنے اللہ کے نزدیک وہ بالکل پاک تھیں لیکن لوگوں کو کس دلیل سے قائل کر سکتیں اس وجہ سے تہمت خلق کے خوف اور اپنی ذات اور خانداں کے ناموس وحرمت کے خیال سے بے قرار ہو کر کہنے لگیں ۔

یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ہٰذَا وَکُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا

اب رحمت الٰہی تائید کیلئے آجاتی ہے اور نوزائیدہ مولود بولنے لگتا ہے

فَنَادٰىہَا مِنْ تَحْتِہَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ ۔ (تین آیات تک)

اس سے اسکی عصمت تاب مگر رنج وغم سے بیتاب ماں کو اپنی پاکدامنی کی ناقابل تردید اور واجب التسلیم دلیل ملجاتی ہے، اور وہ اطمینان سے اس بچہ کو گود میں لیکر اپنی قوم میں آتی ہے ۔ قوم وہی کہتی ہے جو ایسے موقع پر اسکو کہنا چاہئے تھا ۔

یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا (دو آیت تک)

وہ اس بچہ کی طرف اشارہ کر دیتی ہے جو اپنی نبوت اور برکت کے اعلان سے اپنی ماں کی برائت کا ثبوت دیدیتا ہے ۔

یہی رمز ہے جسکی طرف اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔
وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَعَلٰی وَالِدَتِکَ اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَہْدِ
یعنی حضرت عیسٰی کا کلام فی المہد نہ صرف انکے لئے نعمت الٰہی تھا بلکہ انکی والدہ ماجدہ کیلئے بھی تھا۔ کیونکہ اس انتہائی رنج و غم میں جبکہ وہ اپنی اور اپنے آبائی ناموس وحرمت کے لئے لرز رہی تھیں یہ کلام انکی پاکدامانی کے ثبوت کیلئے آسمانی رحمت اور اعجازی حجت تھا۔

قرآن نے بے شک نصًا یہ نہیں کہا کہ حضرت مسیح بن باپ کے پیدا ہوئے کیونکہ اسوقت یہ بحث ہی نہ تھی۔ اور غیر اختلافی امور میں اسکا قاعدہ نہیں کہ فیصلہ کرتا چلے۔ تاہم اہل نظر کے لئے اس نے ایسے شواہد اور دلائل رکھے ہیں جو تصریح سے کم نہیں۔

(۱) حضرت مریم کا یہ کہنا کہ لم یمسسنی بشر۔ اور اسپر اللہ تعالیٰ کا یہ جواب کہ کذالک۔ یہی لفظ حضرت زکریا علیہ السلام کے قصہ میں بھی ہے۔ وہاں اُسی کمزور ہڈیوں اور سفید بالوں والے بڈھے اور اسکی بڑھیا بیوی سے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پیدا کیا۔ یہ نہیں ہوا کہ پھر انکے بال سیاہ ہوئے یا انکا بڑاپا جوانی سے بدلدیا گیا ہاں انکی بیوی کا عقر دور کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ فرمایا۔ وَاَصْلَحْنَا لَہٗ زَوْجَہٗ۔

بعینہ اسی طرح حضرت مریم سے بھی بلامس بشر کے بچہ پیدا ہوا۔ یہ نہیں ہوا کہ انکو شوہر دیا گیا۔ اور انکی شادی کر دی گئی۔ ورنہ کذالک کا کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

(۲) انکا کلام فی المہد جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں حضرت مریم کے لئے بھی نعمت قرار دیا گیا۔ کیونکہ وہ انکی برائت کا ثبوت تھا۔ ورنہ انکے لئے نعمت ہونے کے کیا معنی۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی بن باپ کی ولادت کے استعجاب کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام کی مثال پیش کی۔

(۴) حضرت عیسیٰ کے دشمن یہودیوں کا بہتان جسکو قرآن نے انکی فرد قرارداد جرم کی فہرست

میں داخل کیا ہے۔ وَقَولِہِم عَلٰی مَریَمَ بُہتَاناً عَظِیماً۔
کیونکہ دوسری صورت میں تہمت کا کوئی موقع نہیں تھا۔

قرآن ہدیٰ للناس ہے لیکن انہیں لوگوں کیلئے جو متقی ہیں جیسا کہ اس نے شروع ہی میں تصریح کر دی ہے۔ مومنین قانتین کا یہ فرض ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اسپر ایمان لائیں نہ یہ کہ اس کو محرف کر کے اپنی خواہش نفسانی کے مطابق بنا کر مانیں ؎

وکم من عائبٍ قولاً صحیحاً　　　وآفتہ من الفہم السقیم

قادیانی جماعت جو مرزا غلام احمد کو لاہوری پارٹی کیطرح ظلی مجازی۔ اکتسابی یا بروزی نبی نہیں بلکہ حقیقی نبی مانتی ہے اس کے تبلیغی رسالہ ریویو آف ریلیجنز اکتوبر نمبر ۱۹۳۶ء میں ایک صاحب عبدالرحمن نامی نے ختم نبوت کے خلاف ایک مضمون شائع کرایا ہے جس میں قرآن و حدیث سے ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ نبوت کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جاری ہے۔

ایک خاص دلیل جو انہوں نے قرآن سے لکھی ہے اور جو نہ صرف انکے مضمون میں بلکہ اکثر قادیانیوں کے بیانوں اور تحریروں میں ہم نے دیکھی ہے اور جس کی نسبت[1] ہمارا گمان یہ ہے کہ وہ انکے "استاد ازل" کی تراشی ہوئی ہے جسکو یہ "طوطی صفت" عام مسلمانوں کے مقابلہ میں اکثر دہراتے ہیں۔ اسکی حقیقت کی توضیح ہم ضروری سمجھتے ہیں تاکہ لوگ دہوکا نہ کھائیں۔

وہ دلیل یہ ہے۔ یَا بَنِی آدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُم رُسُلٌ مِّنکُم الآیہ

---

[1] قادیانی لٹریچر کے ماہر خصوصی مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب سے ہم کو امید ہے کہ وہ ہمارے اس گمان کی سند دے کر ممنون فرمائیں گے۔

اس آیت میں اِمَّا اور یَاْتِیَنَّ کے نون تاکید ثقیلہ کی صرفی بحث اور اسپر کتاب الصرف کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں۔

اب دیکھئے اِمَّا یَاْتِیَنَّ میں باقی مضارع کے بعد نون تاکید اور اسکے پہلے اِمَّا بھی آیا ہے پس اس کے معنی تاکید مع خصوصیت زمانہ مستقبل کے ہوئے یعنی البتہ ضرور آئیں گے پس ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول آتے رہیں گے

فافہموا وتدبروا ایہا الغافلون (ریویو آف ریلیجنز اکتوبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۲۴)

مگر خالی نون تاکید مثقل کی بحث اور زمانہ مستقبل کی خصوصیت کے ثبوت سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی رسول آتے رہیں گے جس پر فخر و ناز کے ساتھ یہ ارشاد ہوا ہے۔ فافہموا وتدبروا ایہا الغافلون۔

عجب ترا نیکہ بر من منت بسیار ہم دارد ۔۔۔ رہ دانی خود کردہ است ہمدم کار من ضائع

پہلے یہ تو بتایئے کہ اس آیت میں مخاطب کون لوگ ہیں؟ اور یہ خطاب کس وقت ہوا ہے؟۔

سنئے ان دونوں سوالوں کے جواب خود قرآن پاک میں موجود ہیں تخلیق آدم کے بعد اللہ تعالےٰ نے ذریتِ آدم سے جو عہد الست لیا تھا اُسکی تذکیر اور یاددہانی کے لئے ضروری تھا کہ دنیا میں ہدایت اور ہادی بھیجے چنانچہ اس نے ہبوط آدم کے وقت ہی یہ بتلا دیا کہ ہم خود تمہیں میں سے تمہارے لئے راہبر اور اپنی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجیں گے۔

یہ مضمون قرآن کریم میں تین جگہ ہے اور تینوں جگہ آدم و ابلیس کے قصہ کے بعد بیان کیا گیا ہے۔

سورہ بقرہ۔ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

سورہ طٰہٰ۔ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ۔

سورہ اعراف۔ يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

ان تینوں آیتوں کا ایک ہی مقصد اور مفہوم ہے۔ فرق صرف لفظی ہے یعنی بقرہ اور طٰہٰ کی آیتوں

میں "ہدیٰ" کا لفظ ہے اور اعراف میں "رسل" کا جسکی وجہ یہ ہے کہ اعراف میں نبوت اور رسالت کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اور آدم سے لیکر نبی امی تک اللہ تعالیٰ نے اسکو پہنچایا ... کو پہنچائی اور ہر مکان کے لئے عام کر دیا۔ اور فرمایا۔

قُل یَااَیُّہَا النَّاسُ اِنِّی رَسُولُ اللہِ اِلَیکُم جَمِیعًا

... اس سورۃ میں بجائے ہدیٰ کے "رسل" کا لفظ آیا۔

اب ان تینوں آیتوں کے ملانے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ

(۱) یہ جو ہدایت یا رسولوں کے آنے کا اعلان ہے ہبوط آدم کے وقت کا ہے۔

ان آیات میں خطاب ذریت آدم سے ہے نہ کہ خاص امت محمدیہ سے۔

چنانچہ حضرت آدم کے ہبوط کے وقت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہزاروں پیغمبر آئے اور البتہ ضرور آئے اور اس اعلان کے زمانہ مستقبل میں آئے مگر اس سے یہ کیونکر ثابت ہوتا ہے کہ امت محمدیہ جو سب سے افضل رسول کو مانتی ہے۔ بلکہ جو تمام سابقہ رسولوں پر بھی ایمان رکھتی ہے اس میں رسول آئیں گے۔

اس دلیل کے علاوہ انہوں نے اور جو دلیلیں کتاب وسنت سے لکھے ہیں انکے متعلق کچھ لکھنا فضول ہے۔ بلکہ اس آیت پر عمل کرنا چاہئے۔

وَاِذَا مَرُّوا بِاللَّغوِ مَرُّوا کِرَامًا (ا۔ ج)

جامعہ

جلد | ماہ جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ مطابق نومبر ۱۹۲۶ء | نمبر ۵

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ

(خاتمہ)

[illegible] مضمون میں ہم جامعہ کے چوتھے مقصد سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے ہم نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا " قوم کے نوجوانوں کو کسب معاش کے لئے تیار کرنا"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جامعہ اور اس کے ماتحت مدارس صرف قوائے ذہنی کی عام تربیت [illegible] دیتے ہیں اور اگر کسی مخصوص فن کی تعلیم بہ حیثیت پیشہ کے دیتے بھی ہیں تو محض علمی تحقیق کی۔ طالب علموں کو دوسرے پیشوں کے لائق بنانا ان کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ایک گروہ کہتا ہے کہ ابتدا سے انتہا تک عام تعلیم کے ساتھ ساتھ کسی مخصوص پیشہ کی تعلیم بھی ہونی چاہیے اور اس پر دوسری چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔

ہماری رائے ہے کہ اس معاملہ میں تعلیم کی مختلف منازل پر الگ الگ حکم لگانا چاہیے۔

غرض ابتدائی اور ثانوی میں تعلیم کی غرض صرف بچوں کی عام ذہنی قوتوں کو جلا دینے، ابھارنے اور تیز بنانے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ انکے قوائے ذہنی میں معاشی قوت بھی شامل ہے اور اس کا بیدار کرنا بھی ضروری ہے لیکن دوسری قوتوں کے ساتھ اور ان کے ماتحت۔ اگر ابتدا سے بچے کے ذہن میں معاشی عنصر پر زیادہ زور دیا گیا تو وہ فوراً ساری ذہنی زندگی پر چھا جائے گا۔ اور بجائے انسان بننے کے کمانے اور خرچ کرنے کی مشین بن کر رہ جائے گا۔ بچپن اور عنفوانِ شباب کا زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ روحِ انسانی زیادہ تر عالمِ تخیل کی سیر کرتی اور عالمِ عینی کی بلندیوں پر پرواز کرتی ہو۔ بیشک عالمِ واقعی یعنی روزمرہ کی زندگی سے بھی اس عمر میں بے خبر نہیں ہونا چاہئے لیکن اس کے مطالعہ کا زمانہ اصل میں اس وقت آتا ہے جب انسان بلوغ کی منزل سے گذر چکتا ہے اور اسے وسعتِ نظر اور تخیل کی بلندی حاصل ہو چکتی ہے۔ اب انسان دنیا کی جس چیز کو دیکھتا ہے مادہ کا ٹکڑا سمجھ کر نہیں بلکہ قصرِ تہذیب و تمدن کا مسالہ سمجھ کر دیکھتا ہے اور جس پیشہ کو اختیار کرتا ہے اسے محض نفس پروری کا آلہ نہیں بلکہ روحانی ارتقا کا ذریعہ جان کر اختیار کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر پیشہ کی تعلیم کو تمدنی مقاصد کے ماتحت رکھنا مقصود ہے تو اس کے لئے ذہنی اور اخلاقی پختگی کی ضرورت ہے جو منزلِ ابتدائی اور ثانوی کے طالب علموں میں نہیں ہوتی اس لئے مدرسہ کی تعلیم میں پیشہ کی تعلیم مقصود بالذات کی حیثیت سے داخل نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اتنا ممکن ہے کہ اجمالی حیثیت سے صنعت اور دستکاری کا مذاق پیدا کر کے ریاضی اور سیاق و سباق سکھا کر اور محنت، صفائی اور کفایت شعاری کی عادت ڈال کر بچے کی ایسی عام تربیت کی جائے جو ہر پیشہ کے اختیار کرنے میں کام آئے اور منفی حیثیت سے بچے کی طبیعت سے جھوٹی عزت کا خیال، لا ابالی پن آرام طلبی وغیرہ دور کر کے وہ رجحانات دبائے جائیں جو ان کو کسی پیشہ کے قابل نہیں رہنے دیتے۔

اعلیٰ تعلیم میں صورت حال کسی قدر مختلف ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے طالب علم ذہنی تربیت اور تجربے کے اعتبار سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ پیشہ اور صنعت کو تمدن اور زندگی سے متعلق کر

سمجھ سکے اور ان میں امتزاج پیدا کر سکے۔ اب وہ ایک دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے جہاں ایک راہ تو اسے مزید غور و فکر، مزید تربیت اور تمرین اور زندگی کے گہرے تر مطالعہ یعنی اعلیٰ تعلیم کی طرف اور دوسری عملی زندگی اور عملی ضروریات کی بلا واسطہ تیاری کی طرف جاتی ہے۔ اپنے شوق، اپنی ذہنی استعداد اور اکثر محض خارجی حالات کے لحاظ سے وہ ان میں سے ایک راستہ اختیار کرتا ہے۔

اب اگر وہ اعلیٰ تعلیم کو اختیار کرے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ معاش یا پیشہ کی فکر کو ترک کر دے یا نہیں اور اگر نہ ترک کرے تو کس حیثیت سے اور کس حد تک اس فکر میں مبتلا رہے۔ دوسرے پہلو سے یہ سوال اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ جامعہ جو اس طالب علم کو اعلیٰ تعلیم دینے کی ذمہ دار ہے پیشہ کی تعلیم سے بالکل بے تعلق رہے یا نہیں اور اگر نہ رہے تو کس عنوان سے اور کہاں تک پیشہ کی تعلیم کو اپنے نصاب کا جز قرار دے۔

یہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ جامعہ کی اعلیٰ تعلیم خالص علمی ہے اور اس کا اصل مقصد اپنے طلبہ میں احقاقِ حق کی خواہش اور صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ لیکن ضمنی حیثیت سے وہ بالواسطہ طلبہ کو کچھ پیشوں کے لئے بھی تیار کرتی ہے۔ یہ ایسے پیشے ہیں جن میں گہری علمی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جامعہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے یہاں ان تمام علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام کرے جو تمدنی زندگی میں علمی قدر رکھتے ہوں تاکہ ہر طالب علم اپنے شوق، استعداد اور ضرورت کے لحاظ سے مفید مضامین کی تحصیل کر سکے۔ اعلیٰ تعلیم کے ختم ہونے کے بعد طالب علم کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ یا تو بلا مزید تعلیم کے ملازمت وغیرہ کے ذریعہ سے کسبِ معاش کر سکے یا علمی پیشوں مثلاً طبابت انجینیری وغیرہ کی مخصوص تعلیم حاصل کر سکے۔ ان پیشوں کی تعلیم جامعہ کے عام نصاب میں داخل نہیں ہو سکتی ان کے لئے مستقل تعلیم گاہیں جامعہ کے اندر یا باہر ہونا چاہئیں۔

لیکن اگر کوئی طالب علم ثانوی تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے ذہن میں اعلیٰ تعلیم کی صلاحیت نہیں پاتا یا خارجی حالات کے سبب سے اس کے ترک کرنے پر مجبور ہے اور کوئی ایسا پیشہ سیکھنا چاہتا ہو جس میں ثانوی مدرسہ کی عام تعلیم کافی ہو تو اس کی تعلیم کے لئے بھی مستقل پیشہ آموز تعلیم گاہیں ہونی

ضرورت ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہ اوسط یا اعلیٰ درجہ کی پیشہ آموز تعلیمگاہیں جامعہ کے باہر اور اس سے بے تعلق ہوں یا اس کے اندر اور اس کے متعلق۔ ایک لحاظ سے تو پہلی صورت بہتر ہے اس لئے کہ جامعہ کی فضا خالص علمی فضا ہے اور اس میں کسی پیشہ کی تعلیم کا پنپنا آسان نہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں پیشہ آموز تعلیمگاہوں کے جامعہ کے اندر رہنے میں ایک فائدہ یہ ہے کہ طالب علموں کو زیادہ دن تک علمی فضا میں رہنے اور علمی ذوق کی پرداخت کا موقع ملیگا اور ان کے نصب العین حیات میں تنگی نہ پیدا ہونے پائے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ تعلیمگاہیں جو صنعتی و حرفتی پیشوں کی تعلیم دیتی ہیں۔ سائنس کی جدید ترین تحقیقات سے مستفید ہوتی رہیں گی۔ علاوہ اس کے ہمارے ملک میں ایسے ماہران تعلیم کی بہت کمی ہے جو تعلیمگاہوں کے اعلیٰ انتظام کا کام کر سکیں اس لئے ہم عملاً ہر قسم کی تعلیم کو ایک مرکز پر رکھنے کیلئے مجبور ہیں۔ تاکہ کم آدمیوں سے زیادہ کام لے سکیں۔

بہر حال اس کی شدید ضرورت ہے کہ جو بے پروائی ہماری تعلیمی زندگی میں پیشہ کی تعلیم اور پیشہ کے صحیح انتخاب کی طرف برتی جاتی ہے وہ جلد سے جلد دور ہو۔ پیشہ کی اہمیت اگر محض معاشی پہلو تک محدود ہو تو بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ علم و حکمت اور تصوف و معرفت کی بلندیوں سے ہمیں کسب معاش کا درجہ بہت پست نظر آتا ہو لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ سیڑھی کے پست ترین زینے ایک اعتبار سے اہم ترین ہوتے ہیں کیونکہ بغیر ان کے وجود کے سیڑھی قائم نہیں رہ سکتی انسان کی تمام ذہنی اور روحانی ترقیوں کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ قانون فطرت اور قانون تمدن کے ماتحت اپنے نفس کی بقا کے لئے سارا ضروری سامان مہیا کرے۔ اسی کا نام کسب معاش ہے اور اسے حقیر سمجھنا یا اس کی طرف سے غفلت کرنا شدید اخلاقی جرم ہے۔ لیکن پیشہ صرف کسب معاش کا ذریعہ نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم چیز ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جو ہر فرد کو اپنی قوم کی تمدنی زندگی میں ملتا ہے اور جس پر ان کی انفرادی زندگی کی تشکیل منحصر ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی عمر کا

غالب حصہ ان کاموں کے کرنے میں گزرتا ہے جو اس کے پیشہ کے متعلق ہیں اس لئے ایک طرف تو وہ زیادہ تر اپنے پیشہ کے ذریعہ سے اپنے انفرادی اور اجتماعی نصب العین کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے اور دوسری طرف پیشہ اس کے خیالات و تصورات اور جذبات و محسوسات پر یا بہ حیثیت مجموعی اس کی سیرت پر بہت اثر ڈالتا ہے۔ اگر کسی نے پیشہ کے انتخاب میں غلطی کی ہے تو وہ اپنے تمدنی ماحول سے صحیح تعلقات نہیں قائم رکھ سکتا اس لئے اسے اطمینان خاطر اور سچی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔

پیشہ کا انتخاب تین باتوں کے لحاظ سے ہو سکتا ہے۔

(۱) طبیعت کی مناسبت اور استعداد۔

(۲) مالی فائدہ

(۳) ظاہری عزت

انتخاب میں تینوں باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ لیکن ترجیح پہلی بات کو اور اس کے بعد دوسری بات کو حاصل ہو۔ محض ظاہری عزت کو معیار قرار دینا انتہا درجہ کے اوچھے پن کی دلیل ہے کسی پیشہ میں بنفسہٖ عزت یا ذلت نہیں ہے بلکہ اس پر منحصر ہے کہ پیشہ کے ذریعہ سے انسان زندگی کی کن قدروں کو کہاں تک حاصل کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم مسلمان سب سے زیادہ زور اسی ظاہری عزت پر دیتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ عزت کا حامل صرف سرکاری نوکری کو سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد ہم لوگوں کے نزدیک مالی فائدہ کا درجہ ہے۔ رہی مناسبت اور استعداد اس کی طرف کوئی بھول کر بھی توجہ نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بہترین افراد کو بھی زندگی میں اطمینان اور یکسوئی حاصل نہیں اور ان سے قوم کی اتنی خدمت نہیں ہو سکتی جتنی وہ کرنا چاہتے ہیں یا کر سکتے ہیں اور عوام تو ایسے نکبت اور افلاس میں مبتلا ہیں جس کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

جامعہ ملیہ کا ایک نہایت اہم مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو پیشہ کے مسئلہ پر اعلیٰ تمدنی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی دعوت دے اور ان میں کسبِ معاش کے متعلق صحیح خیالات پیدا کرے۔ اس کا

بہترین طریقہ یہ ہے کہ جامعہ اپنے طلبہ کے لئے مختلف قسم کی پیشہ آموز تعلیم گاہیں قائم کرے تاکہ وہ کسب معاش کے نئے راستے ڈھونڈیں اور دوسروں کے لئے قابل تقلید نمونہ پیش کریں۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ درجہ کی پیشہ آموز تعلیم گاہیں قائم کرنے کے لئے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ فی الحال جامعہ فراہم نہیں کرسکتی۔ البتہ اوسط درجہ کی تجارتی، صنعتی، زراعتی ادارے کا قائم کرنا ممکن اور ضروری ہے۔ بعض علمی پیشے مثلاً تصنیف وتالیف، معلمی و صحافت وغیرہ ایسے ہیں جن کے لئے بڑے ساز وسامان کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف قابل اساتذہ اور تجربہ کار منتظمین کے یکجا ہوجانے سے ان چیزوں کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر ہوسکتی ہے۔

اس طرح اگر جامعہ ملیہ قوم کے نوجوانوں کو بہترین اخلاقی اور ذہنی تعلیم دینے کے بعد انھیں ان کے مذاق اور صلاحیت کے لحاظ سے مختلف پیشوں کے لئے بھی تیار کرسکے تو اتنا بڑا کام کرے گی جس کی مثال قوموں کی تمدنی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔

***

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں مسلمانوں کے لئے ایک تعلیمی نصب العین کا خاکہ پیش کیا ہے ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہ خاکہ نامکمل ہے اور اس میں اصلاح کی بہت گنجائش ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی قوم کے ارباب فکر میں تعلیمی مسائل کو وسیع تمدنی نظر سے دیکھنے کی تحریک پیدا کریں۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کے ارباب حل وعقد ہماری معروضات پر غور فرمائیں اور ہماری تعلیم گاہ کے لئے جو عملاً صحیح راستہ پر جارہی ہے ایک مکمل وسیع اور ترقی پذیر نظام ترتیب دیں تاکہ قوم کے بہترین دماغوں کو اس پر غور کرنے کا موقع ملے۔

آخر میں ہم اختصار کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم نے اپنے مضمون میں صرف جامعہ ملیہ سے کیوں خطاب کیا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم سرکاری یا نیم سرکاری تعلیم گاہوں سے جو ایک ملک گیر مرکزی نظام کی پابند ہیں یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ انقلاب انگیز اصلاحی تجاویز پر عمل تو درکنار غور بھی کرنے کی

زحمت گوارا کریں گی۔ اس کی امید اگر ہو سکتی ہے تو جامعہ ملیہ کی سی درسگاہ سے جو کسی قدامت پسند شاہنشاہی یا سامراجی نظام کی پابند نہیں ہے بلکہ تجدید و ترقی کے ولولے دل میں لئے ہوئے عالم وجود میں آئی ہے اور جسے ایک معمولی سی اصلاح کرنے کے لئے عرضداشت کمیشن، بورڈ، مسودہ قانون، منظوری حاکم اور گزٹ کا ہفت خواں طے نہیں کرنا پڑتا بلکہ صرف تمدنی مصالح اور عقلِ سلیم سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تعلیم کو اسلامی اور قومی نقطہ نظر سے دیکھنے کے لئے ایسے لوگ چاہئیں جو اپنے تمدنی معاملات کو غیروں کی سیاسی اغراض کا پابند نہیں بناتے اور ظاہری قوت و سطوت کی وجہ سے مسلوب الحواس ہو کر اپنی زندگی کے مسائل پر غور کرنے کے لئے دوسروں سے عقل و فہم مستعار نہیں مانگتے۔ گمان غالب یہ ہے کہ ایسے لوگ جامعہ ملیہ کے کارکنوں میں ہوں۔ دوسری تعلیم گاہوں میں تو شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ تعلیمی نصب العین کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے ضرورت ہے کہ ان لوگوں میں جو مشرقی تمدن کے محرم ہیں اور ان لوگوں میں جو مغربی تہذیب سے واقف ہیں اتحادِ عمل ہو اور خلوص نیت، بے تعصبی، وسعت نظر اور آزادیِ فکر کے ساتھ دونوں تمدنوں کا مطالعہ کیا جائے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اس کا موقعہ سوائے جامعہ ملیہ کے مسلمانوں کی کسی تعلیم گاہ میں حاصل نہیں ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ عموماً ہندوستانی اور خصوصاً مسلمان اس قدر مفلس ہیں کہ ان کے بہت سے کام محض سرمایہ کی کمی کے سبب سے نہیں چل سکتے۔ مجوزہ تعلیمی اصلاحات کو جاری کرنے میں اگر انتہائی کفایت شعاری سے کام نہ لیا گیا تو اس قدر مصارف کی ضرورت پڑے گی جو ہماری غریب قوم کے مقدور سے باہر ہوں گے۔ اس لئے صرف وہی تعلیم گاہ ہماری تجاویز پر عمل کر سکتی ہے جس کی فضا میں انتہائی سادگی اور کفایت شعاری ہو۔ جہاں استاد کم معاوضہ پر کام کرتے ہوں طلبہ کم خرچ میں گذر کرتے ہوں اور دونوں سازو سامان کی ظاہری چمک دمک سے

سے بے نیاز ہوں۔

یہ شرف مسلمانوں کی تمام اعلیٰ تعلیم گاہوں میں صرف جامعہ ملیہ پورے کرتی ہے۔ یہاں کے اساتذہ کی اوسط تنخواہ دوسرے مدارس کی تنخواہوں کے مقابلہ میں نصف سے کم اور طلبہ کا خرچ دوسرے طلبہ کے مصارف کے مقابلہ میں دو ثلث کے قریب ہے۔ دوسرے مدارس میں خواہ وہ سرکاری ہوں یا نیم سرکاری طلبہ کا خرچ ۳۰ اور ۳۵ روپیہ ماہوار کے درمیان ہے اس کے مقابلہ میں جامعہ کے طلبہ ۲۰ اور ۲۵ کے درمیان خرچ کرتے ہیں۔ اگر دوسری جگہ کے ایک طالب علم کا اوسط خرچ ۳۲½ روپیہ ماہوار مان لیں تو چودہ برس کی اسکول و کالج کی تعلیم میں کل ۵۴۶۰ ؍ خرچ ہے اور جامعہ کے طالب علم کا اوسط خرچ اگر ۲۲½ ماہوار قرار دیا جائے تو چودہ برس میں کل ۳۷۸۰ روپیہ کا خرچ ہے۔ اس طرح سے گویا جامعہ کی پوری تعلیم میں قوم کا ہر طالب علم ۱۶۸۰ روپیہ دوسرے مدرسہ کے طالب علم کے مقابلہ میں کم خرچ کرتا ہے۔ صرف اس تعلیم گاہ سے جس میں ایسے اساتذہ اور ایسے طلبہ ہوں ہم امید کر سکتے ہیں کہ وہ ہماری مفلس قوم پر غیر ضروری بار ڈالے بغیر ہماری مجوزہ تعلیمی اصلاحات کو عمل میں لا سکیں گے۔

نادرشاہ اور اتحاد فرقہائے اسلام

• ہرچند کہ نادرشاہ اپنی سفاکیوں کی بدولت چنگیز۔ ہلاکو اور تیمور وغیرہ کی فہرست میں مندرج ہے لیکن باوجود ان ہولناک خونریزیوں کے بھی اس کے دل میں ملت اسلام کا درد تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اسلامی فرقوں میں باہم اتحاد پیدا ہوجائے۔

ایران میں شاہان صفویہ نے اپنے اغراض کے لئے خلفا ثلاثہ اور صحابہ کرام کا سب وشتم رائج کردیا تھا۔ نادر کو یہ دیکھکر سخت رنج ہوتا تھا کہ اس قبیح فعل کیوجہ سے ایرانی تمام عالم اسلامی کی دشمنی مول لے رہے ہیں اور ان میں اور دیگر اسلامی سلطنتوں مثلاً ہندوستان و افغانستان اور خاصکر عثمانیوں میں عداوت کی خلیج زیادہ وسیع ہوتی جارہی ہے جس کی بدولت ہر وقت مصادمت کا خطرہ ہے۔

چنانچہ اعدا کو مقہور۔ دشمنوں کو مغلوب اور ممالک کو مفتوح کرنیکے بعد ۱۱۴۸ھ میں صحرائے مغان میں جہاں امرائے ایران کا عظیم الشان اجتماع اس لئے ہوا تھا کہ اس کے سر پر ایران کا تاج شاہی رکھا جائے اس نے کہا۔

> شاہ طہاسپ وشاہ عباس در عہد وسریر موجود اند۔ ایشاں را یا ہرکس را کہ برازندہ افسر سروری دانند بریاست وسلطنت بردارند۔ ما انچہ حق کوشش بود دریں چند سال بجا آوردیم و ولایات ایشاں را با اسرائے ایشاں از دست افغان و روس ورومی خلاص کردیم (تاریخ جہاں کشائے نادری صفحہ ۲۹۶ مطبوعہ بمبئی)

سب لوگوں نے بالاتفاق کہا کہ اب ایران کا ایک بچہ بھی بجز تمہارے کسی کی بادشاہی پر رضامند نہیں ہے۔ لیکن وہ برابر انکار کرتا رہا۔ اس انکار و اصرار میں تقریباً ایک مہینہ کا عرصہ گذر گیا۔ اور جب لوگوں نے اسکا دامن نہ چھوڑنا چاہا تو اس نے کہا۔

> کہ از زمان رحلت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چہار خلیفہ بعد از یکدگر متکفل امر خلافت

شدہ اند کہ ہند و روم و ترکستان ہمگی بخلافت ایشاں قائل اند۔ و در ایران ہم سابقاً ہمیں مذہب رائج و متداول بود۔ شاہ اسمٰعیل صفوی در مبادی حال بنابر صلاح دولت خود ایں مذہب را متروک و مذہب تشیع را سلوک داشتہ بعلاوہ آں سب و رفض را کہ فعل بیہودہ و مایۂ مفاسدات در السنہ و افواہ عوام و اوباش دائر و جاری کردہ شرر شرارت بحقاق زدہ و برہم زنی انگیخت و خاک ایران را بخون فتنہ و فساد آمیخت۔ و مادام کہ ایں فعل مذموم انتشار داشتہ باشد ایں مفسدہ از میان اہل اسلام رفع نخواہد شد۔

ہرگاہ اہالی ایران سلطنت ما راغب و آسایش خود را طالب باشند باید ایں ملت را کہ مخالف مذہب اسلاف کرام ماست تارک و بمذہب اہل سنت و جماعت سالک شوند۔ لیکن چوں حضرت امام جعفر صادق ذریہ رسول اکرم و ممدوح امم ہستند و طریقہ اہل ایران بمذہب آنحضرت آشنا ست او را سر مذہب خود ساختہ در فروعات مقلد طریقہ و اجتہاد آنحضرت باشند (تاریخ جہاں کشائے صفحہ ۱۹۷)

ایرانیوں نے اسکی بات قبول کر لی اور محضر لکھکر سب نے اس پر مہر لگائی۔ تب نادر نے ایران کی شہنشاہی قبول[1] کی اور کہا کہ چونکہ بادشاہ روم (عثمانی) خادم حرمین شریفین (خلیفہ اسلام) ہے اس لئے میں یہ تمام سرگزشت لکھکر اسکے دربار میں ایلچی بھیجتا ہوں۔ تاکہ باہم مصالحت اور دوستی قائم ہوجائے اور اختلافات رفع ہوجائیں۔ نیز میں اس سے پانچ امور کی درخواست بھی کرونگا۔

(۱) چونکہ اہل ایران اپنے سابقہ عقائد سے جو موجب عداوت تھا تائب ہوگئے اس لئے اب خلیفہ علماء و قضاۃ عثمانیہ سے درخواست ہے کہ وہ مذہب جعفری کو ایک پانچواں مذہب شمار کرکے اسکی صحت تسلیم کرلیں۔

---

[1] اس کی تخت نشینی کی تاریخ کہی گئی الخیر فی ما وقع۔ ایک ظریف نے اسمیں صرف ایک حرف بدل دیا اور کہا لا خیر فی ما وقع

(۲) کعبہ میں جہاں چار مصلے قائم ہیں وہاں ایک مصلیٰ جعفری مذہب کا بھی قائم کر دیا جائے تاکہ ہمارے ملک کے لوگ اس مصلے پر اپنے امام کے پیچھے نماز ادا کر سکیں۔

(۳) ایرانی قافلہ حجاج کسی ایرانی ہی میر حاج کے قیادت میں ہر سال مکہ جایا کرے اور عثمانی امراء اسکے ساتھ بھی وہی مراعات برتیں جو دوسرے ممالک مثلاً مصر یا شام کے قافلہ حجاج کے ساتھ مرعی رکھتے ہیں۔

(۴) دونوں دولتوں میں سے ہر ایک دولت کے پاس دوسرے کے جو قیدیان جنگ ہوں وہ آزاد رکھے جائیں۔ غلام نہ بنائے جائیں۔

(۵) دونوں سلطنتوں کی طرف سے قنصل ایک دوسرے کے پایۂ تخت میں رہا کریں تاکہ باہمی معاملات آسانی سے طے ہو جایا کریں۔

نادر نے تخت نشین ہونے کے بعد بار بار اپنے ایلچی عثمانی دربار میں بھیجے۔ لیکن وہاں سے اس کے موافق جواب نہ ملا ۱۱۵۶ھ میں جب اس نے تیسری بار بغداد پر یورش کی تو وہاں کے والی احمد پاشا کے پاس بھی برابر اپنے سفیر بھیجتا رہا کہ اسکے مطالبات تسلیم کر لئے جائیں اس درمیان میں اس نے کرکوک وغیرہ کے متعدد قلعے فتح کر لئے لیکن بغداد کو نہ لے سکا۔ آخر اس کے محاصرہ کیلئے ایک کثیر فوج چھوڑ کر خود نجف اشرف کی زیارت کے لئے گیا۔ وہاں اس نے ایک عرصہ تک مع اپنے لشکر و درگاہ و خیمہ و خرگاہ کے قیام رکھا۔

چونکہ صحرائے مغان کے عہد کی پوری تعمیل نہ ہوئی تھی۔ اور ہند و افغانستان و ترکستان و ایران کے مختلف العناصر مسلمان ابتک ایک دوسرے کی تکفیر میں مبتلا تھے۔ اس لئے تمام قلمرو میں اس نے فرمان بھیجا کہ مفتیان و علماء و امراء و رؤساء ہر طبقہ کے اس کے دربار میں آکر جمع ہوں جب ملک کے ہر چہار سمت سے یہ لوگ آ گئے تو اس نے ان سب سے پھر صحرائے مغان کے عہد کی تجدید چاہی اور ہر فرقہ کے علماء سے کہا کہ تم آپس کے تفرقے مٹا ڈالو۔ میں یہ کسی طرح جائز نہیں رکھتا کہ میری سلطنت کے مسلمان ایک دوسرے کو کافر کہیں۔

اس نے احمد پاشا والی بغداد کے پاس بھی ایلچی بھیجا کہ وہاں کے کسی ایسے لایق اور معتبر عالم کو بھیجدے کہ ہمارے دربار میں علماء کا جو اجتماع ہوا ہے انکو ایک مرکز پر متحد کر سکے - اور انکے اختلافات کو مٹا کر معاہدہ میں بطور حکم عادل کے شاہد رہے -

احمد پاشا نے علامہ عبداللہ سویدی[1] کو جو اس زمانہ میں بغداد کے سب سے نامور عالم تھے اس کام کے لئے منتخب کیا اور بھیجا -

علامہ موصوف نے وہ باتیں جو اس مرحلہ میں پیش آئیں یا جو بحثیں انکو کرنی پڑیں خود قلمبند کی تھیں - مصر کے ایک مطبع نے اس رسالہ کو شائع کیا ہے - ہم اسکا خلاصہ درج کرتے ہیں -

اسلم

* * * *

۲۱ شوال سنہ ۱۱۵۶ھ یکشنبہ کے دن مغرب سے قبل میں اپنے گھر بیٹھا تھا کہ احمد پاشا کا ایک آدمی میرے بلانے کیلئے آیا - میں نماز مغرب پڑھکر امیر موصوف کے دربار میں گیا - وہاں انکا ندیم احمد آغا ملا - اس نے مجھسے پوچھا کہ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پاشا نے آپ کو کیوں طلب کیا ہے میں نے جواب دیا کہ نہیں - اس نے کہا کہ پاشا آپ کو نادرشاہ کے حسب طلب اس کے دربار میں بھیجنا چاہتا ہے جہاں ہر طرف سے علمائے عجم آکر جمع ہوئے ہیں - آپکو انکے ساتھ مذہب تشیع کے متعلق بحث کرنی ہوگی - اگر وہ غالب آگئے تو پھر پانچویں مذہب یعنی جعفری کی صحت کو تسلیم کرلینا پڑے گا -

میں نے یہ بات جو سنی تو میرا بدن کانپ اٹھا اور رونگٹے کھڑے ہوگئے - اور کہا کہ احمد آغا تم کو تو خوب معلوم ہے کہ نادر سخت جابر اور ہولناک سفاک ہے - اس کے دربار میں علماء عجم کے ساتھ جو اسکے ہم مذہب ہیں میں کس طرح بحث کر سکوں گا - اور کیسے انکے عقائد کے ابطال پر دلائل قائم کرنیکی جرات کروں گا - کیونکہ وہ نہ ہماری کسی حدیث کو مانتے ہیں نہ قرآن کی تاویل کو - پھر جب اصول متعارفہ اور علوم موضوعہ ہمارے انکے ایک نہیں تو کس بنیاد پر بحث ہوگی -

---

[1] بغداد کا ایک مشہور علمی خاندان جسمیں بہت سے نامور علماء پیدا ہوئے -

مثلاً فرض کرو کہ میں مسح علی الخفین کے جواز پر یہ دلیل پیش کروں کہ اس کو ۶۰ صحابہ نے روایت کیا ہے جن میں سے علیؓ بھی ہیں۔ وہ کہیں گے کہ عدم جواز کی روایتیں ہمارے یہاں سو صحابیوں سے مروی ہیں جن میں سے ابوبکرؓ بھی ہیں۔ علی ہذا میں ایک آیت کا کوئی معنی انکے سامنے بیان کروں گا اس پر روایات کی سند دوں گا تو وہ اسکے خلاف اس کی تاویل کرکے اپنی روایتوں سے اسکی سند دینگے۔ لہٰذا جس طرح تم سے ممکن ہو احمد پاشا سے کہو کہ مجھکو اس کام کے لئے نہ بھیجیں بلکہ حنفی یا شافعی مفتیوں میں سے کسی ایک کو روانہ کریں۔

آغا نے کہا کہ یہ ناممکن ہے اور بہتر یہی ہو کہ اس امر میں آپ مطلق لب کشائی نہ کریں۔ کیونکہ پاشا نے آپکے بھیجنے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ سنکر میں دم بخود رہگیا۔

اس کے بعد خود احمد پاشا آیا۔ اس نے سارا حال سنا کر مجھے جانے کا حکم دیا۔ اور کہا کہ اللہ تعالیٰ سے مجھے امید ہے کہ وہ تمہاری حجت کو قوی کریگا۔ اور تمکو غلبہ عطا فرمائیگا۔ میں نے کہا لیکن نادر شاہ کی حالت کو تو آپ اچھی طرح سن چکے ہیں۔ پاشا نے کہا کہ ہاں۔ میں تم کو اس بارے میں آزاد چھوڑتا ہوں کہ موقع دیکھنا تو مناظرہ کرنا ورنہ باز رہنا۔ لیکن گریز بالکلیہ نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ مناسب طریقہ سے انکا ابطال کرنا۔ ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان سے مغلوب ہو کر انکے مذہب کی صحت تسلیم کرلو۔

پھر کہا کہ کل دوشنبہ ہے۔ چہارشنبہ کی صبح کو آپ کو شاہ کے پاس موجود ہونا چاہیئے۔ وہ اسوقت نجف میں ہے۔ اسلئے کل ہی صبح سویرے روانہ ہوجائیے۔

اسکے بعد میرے لئے ایک شاہی خلعت کا حکم دیا۔ اور سواری وخدام وغیرہ کا بندوبست کردیا۔ دوسرے دن میں ان عجمیوں کے ساتھ جو شاہ کے یہاں سے آئے تھے روانہ ہوا۔

راستہ بھر میں اسی خیال میں غرق رہا۔ دلائل سوچتا تھا۔ اور انکے جواب پھر جواب الجواب یہانتک کہ ہجوم افکار سے میرا سر چکرانے لگا۔ اور پریشانی کی وجہ سے شام کو جو مجھے پیشاب آیا تو خالص خون۔

اب ہم علیا بن مزید میں پہنچے - یہ آبادی اسوقت ایرانی قبضہ میں آچکی ہے۔ یہاں چند اہل سنت وجماعت سے ملاقات ہوئی جنکی زبانی یہ معلوم ہوا کہ شاہ نے ، مفتی ایران کے جمع کئے ہیں جو سب کے سب شیعہ ہیں - وہ مذہب جعفری کی صحت پر دلائل پیش کرینگے ۔

یہ کلام سنتے ہی مجھے اور پریشانی ہوئی - پھر میں نے سوچا کہ میں تو مختار ہوں بحث نہ کرونگا لیکن میں نے دیکھا کہ میرا دل ترک بحث پر مطلقاً راضی نہیں ہوتا - اب میں سوچنے لگا کہ صاف صاف کہوں گا کہ اگر بحث منظور ہے تو کسی ایسے ثالث کے سامنے ہو جو نہ سنی ہو نہ شیعہ - پھر اسکے بعد مناظرہ کروں گا خواہ اسمیں میرے قتل ہی تک نوبت کیوں نہ پہنچے ۔

وہاں سے چلکر ہم شہر ذی الکفل میں پہنچے - اور آبادی سے باہر ہی ٹھہر کر کچھ دیر آرام لیا - رات کے پچھلے پہر کو پھر روانہ ہوگئے - اور بئر دندان میں پہنچکر فجر کی نماز پڑھی - فارغ ہوتے ہی شاہ نادر کا ایک قاصد دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ جلدی چلئے آپکا انتظار ہے ۔

اس مقام سے شاہ کا خیمہ دو فرسخ تھا - میں نے کہا کہ کیا شاہ کا یہی دستور ہے کہ جب کوئی آتا ہے تو اس کے استقبال کیلئے قاصد دوڑتا ہے یا صرف اس موقع پر اس نے ایسا کیا ہے ؟
اس نے جواب دیا کہ کبھی نہیں بلکہ لوگ آتے بھی ہیں تو عرصہ تک انکی رسائی نہیں ہوتی - راستہ سے آجتک بجز آپکے اس نے کسی اور کو نہیں بلایا ۔

اب میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس عجلت سے صرف اسی غرض سے بلایا ہوگا کہ مجھکو مذہب جعفری کی تسلیم پر مجبور کرے پہلے ممکن ہے کہ دنیا کا لالچ دلائے اگر میں نے اسکو نہ قبول کیا تو پھر سختی اور تعزیر سے کام لے گا ۔

بہت کچھ استغفار - توبہ - لاحول وغیرہ پڑھنے کے بعد آخر میں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ حق کا دامن نہ چھوڑونگا - دین اسلام پہلی بار اسوقت رک گیا تھا جب رسول کریم کی وفات کے بعد ارتداد کے معاملہ میں صحابہ نے ابوبکرؓ کو تنہا چھوڑ دیا تھا - اللہ تعالی نے انہیں کی بدولت اس کو چلا دیا - پھر دوسری بار اسوقت رکا جب مامون نے علماء کو خلق قرآن کے اقرار پر مجبور

کیا۔ اسوقت احمد بن حنبل جیسا امام کھڑا ہو گیا جس نے اسکو آگے بڑھایا۔ آج اگر میں بھی انہیں شاہان کے پیروی کروں تو کیا عجب ہے کہ حق قائم رہجاتے ورنہ میرے ساتھ لاکھوں مسلمان گمراہ ہو جائیں گے نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

آخر میں موت کے لئے ہر طرح پر تیار ہو کر کلمۂ توحید و شہادت پڑھتا ہوا روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد دو اونچے اونچے جھنڈے نظر آنے لگے۔ معلوم ہوا کہ یہی شاہی معسکر ہے۔ وہاں پہنچکر دیکھا کہ بڑے بڑے سات ستونوں پر شاہی خیمہ کھڑا ہے۔ راستہ پر کشک خانہ ہے جسمیں پندرہ پندرہ خیمے بالمقابل کھڑے کئے گئے ہیں۔ شاہی خیمہ کے متصل ایک رواق (شامیانہ) ہے۔ دائیں سمت میں چار ہزار سپاہی مسلح حفاظت کے لئے رہتے ہیں اور بائیں جانب خالی خرگاہیں ہیں جن میں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔

جب میں کشک خانہ کے متصل گیا تو وہاں ایک درباری میرے استقبال کیلئے نکلا۔ اس نے بغداد کے امراء و رؤساء اور احمد پاشا اور اسکے متعلقین کے نام بنام حالات پوچھنے شروع کئے میں اسکی واقفیت سے حیران رہگیا۔ اس نے میرے تعجب کو دیکھکر کہا کہ شاید آپ مجھے نہیں پہچانتے۔ میرا نام عبدالکریم بیگ ہے اور میں مدتوں بغداد میں احمد پاشا کے پاس رہا ہوں۔ آج کل دولت عثمانیہ کی طرف سے شاہ کے پاس ایلچی بناکر بھیجا گیا ہوں۔ اسی گفتگو کے اثنا میں تو اشخاص ہماری طرف آتے ہوئے دکھائی دئے۔ عبدالکریم بیگ انکی تعظیم کیلئے کھڑا ہو گیا۔ ان لوگوں نے آکر مجھے سلام کیا میں نے جواب دیا لیکن بوجہ عدم واقفیت کے بیٹھا رہا۔ عبدالکریم بیگ نے ان سب سے مجھکو ملایا۔ اور ایکے بعد دیگرے انکا تعارف کرانا شروع کیا۔ کہ یہ حسن خاں معیار الممالک ہیں۔ یہ مصطفی خاں۔ یہ نظر علیخاں اور یہ میرزا زکی اور یہ مرزا کافی۔

معیار الممالک جو کرجی الاصل اور شاہ حسین کے موالی میں سے ہے نادر شاہ کا وزیر ہے سرسری ملاقات کے بعد یہ لوگ مجھے شاہ کی ملاقات کیلئے لیچلے۔

شامیانہ کے دروازے کے پاس پہنچے۔ پردہ اٹھایا گیا۔ ان لوگوں نے مجھسے کہا کہ جب ہم

چلیں تو آپ بھی چلیں اور جہاں ہم ٹھہر جائیں وہاں آپ بھی ٹھہر جائیں۔ شامیانے سے گزر گئے تو ایک طرف بڑی کشادہ جگہ تھی جس میں حرم کے خیمے تھے اور سامنے ایک شاندار خیمے میں نادر کرسی پر بیٹھا ہوا الاصل نظر آیا۔ جب اسکی نگاہ مجھ پر پڑی تو بلند آواز سے خوش آمدید عبداللہ آفندی کہا۔ پھر قریب آنے کا حکم دیا۔ خوانین میرے دائیں طرف تھے اور عبدالکریم بائیں طرف۔ ہم سب دس قدم چلکر رک گئے۔ پھر اس نے کہا اور آگے آؤ۔ الغرض اسی طرح ہم سب چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چلتے اور رکتے اس کے قریب پہنچ گئے۔ اور پانچ ہاتھ کا جب فاصلہ رہگیا تو ٹھہرے شاہ کا قد بلند ہے۔ چہرے سے بڑھاپا ٹپکتا ہے۔ آگے کے چند دانت بھی گرے ہوئے ہیں اور عمر تقریباً ۸۰ سال کی معلوم ہوتی ہے۔ داڑھی خنا اور وسمہ سے رنگی ہوئی ہے۔ دونو ابرو کمان کی طرح کشیدہ ہیں اور آنکھوں میں زردی عیاں ہے۔ ایک سفید چوگوشہ کلاہ بھی سر پر ہے جس پر ایک عمامہ ہے جو موتی۔ یاقوت۔ الماس اور ہر قسم کے نفیس جواہر سے مزین ہے اسکے گلے میں بھی موتی کے ہار ہیں اور قبا کے دونوں مونڈھوں پر جواہرات ٹکے ہوئے ہیں۔

الغرض وہ اپنی شکل ولباس کے باعث پرتمکین اور باجلال معلوم ہوتا تھا جب میری نگاہ اس پر پڑی تو وہ تمام رعب جو اسکا میرے دل پر بیٹھا ہوا تھا بالکل جاتا رہا۔ اس نے ترکی زبان میں میرے ساتھ گفتگو شروع کی۔ پہلے احمد خاں (پاشا) کی خیریت دریافت کی۔ پھر کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری سلطنت میں ترکستان اور افغانستان بھی ہیں۔ وہاں کے لوگ یعنی ترک و افغان ایرانیوں کو کافر کہتے ہیں اور ایرانی ان دونوں کو کفار سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی امت کے ہیں۔ اور ایک ہی دین کی پیروی کے دعویدار۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ میری سلطنت میں ایسے مسلمان رہیں جو ایک دوسرے کو کافر بنائیں۔ لہذا میں نے آپکو طلب کیا ہے کہ آپ میری طرف سے وکیل بنکر انکے باہمی تکفرات کو رفع کر دیجئے اور ہر ہر فرقہ کو پابند کر دیجئے کہ وہ ان امور سے جن سے کفر عاید ہوتا ہے باز آجائے تاکہ کوئی انکو کافر نہ بنائے اور جو کچھ آپ دیکھیں اور سنیں اسکو مجھ سے بھی آکر کہئے اور بغداد پہنچنے پر احمد پاشا کو بھی

شناسے۔

اس کے بعد ہم کو وہاں سے واپسی کی اجازت ملی اور میری میزبانی کیلئے اعتمادالدولہ نامزد کیے گئے۔

میں وہاں سے نہایت خوش ہو کر نکلا۔ کیونکہ میرا جو کچھ خیال تھا اس کے برخلاف شاہ نے سارے مذہبی اختیارات میرے حوالہ کر دئے۔ اب ہم اعتمادالدولہ کے پاس چلے۔ نظر علیخاں، عبدالکریم بیگ اور ابوذر بیگ جو تینوں میری خدمت کے لئے مامور تھے۔ ساتھ ساتھ تھے اعتمادالدولہ خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسکو سلام کیا اس نے جواب دیا لیکن بدستور بیٹھا رہا۔ میرے دل میں اس سے سخت انفعال اور غصہ پیدا ہوا کہ اس شخص نے اپنی رعونت سے علم اور اہل علم کی اہانت کی۔ اور میں سوچنے لگا کہ اب جبکہ نادرشاہ نے تمام تکفیرات کے اٹھانے کا مجھے وکیل مطلق کر دیا ہے، میں اس سے اسکی شکایت ضرور کروں گا اور یہ کفر جو شان اسلامی کے بالکل خلاف ہے سب سے پہلے مٹا دوں گا۔ اور اسکو قتل کرا کر چھوڑ دوں گا۔ لیکن جوں ہی کہ میں بیٹھ چکا۔ اعتمادالدولہ کھڑا ہوا۔ اس نے ادب سے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور پھر میری طرف جھکتا ہوا مرحبا کہکر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ایرانیوں کا تعظیمی دستور یہی ہے۔ لہذا اب اسکی طرف سے مجھے کوئی شکوہ نہ رہا۔

اعتمادالدولہ بہت دراز قامت۔ سفید رو۔ اور کشادہ چشم ہے۔ داڑھی پر حنا اور وسمہ کا خضاب کرتا ہے۔ نہایت عاقل۔ نرم خو اور خلیق ہے۔

جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو حکم آیا کہ میں ملا باشی (درباری علامہ ملا علی اکبر) سے ملوں۔ میں سوار ہوا۔ عہدداروں کی جماعت بھی میرے ساتھ تھی۔ راستہ میں ایک شخص افغانی لباس میں مجھکو ملا۔ اس نے سلام کیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ بولا کہ میں ملا حمزہ قلنجانی افغانستان کا مفتی ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ شاہ نے مجھکو وکیل مطلق بنا دیا ہے کہ میں ایرانیوں سے ہر قسم کے تکفیرات اٹھا دوں۔ تم چونکہ سنی ہو اس لئے میں تم سے یہ امید رکھتا ہوں کہ اگر

وہ کوئی بات اس قسم کی کرتے ہوں جو منجر بکفر ہو اور مجھ سے اسکو چھپائیں تو مجھے مطلع کرنا کیونکہ میں انکے حالات وعبادات و معتقدات سے اسقدر واقف نہیں جسقدر کہ تم لوگ۔

ملا حمزہ نے کہا کہ آپ شاہ کی باتوں سے دہوکہ میں نہ آجائیں درحقیقت اس نے آپ کو ملا باشی کے پاس اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ مناظرہ کرے۔ تمام علماء ایران اسکا ساتھ دینگے لہذا آپ ہوشیار رہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے بحث کی پرواہ نہیں لیکن ڈر یہی ہے کہ وہ ناانصافی نہ کریں۔ یا میں جو کچھ مجلس مناظرہ میں کہوں اسکے برخلاف شاہ سے جاکر کہیں۔ اس نے کہا کہ اس سے آپ بے خطر رہیں۔ اس مجلس میں شاہ کے مخبر ہیں۔ پھر ان مخبروں پر مخبر ہیں۔ پھر خاص جاسوس ہیں یہ ناممکن ہے کہ ایک لفظ بھی خلاف واقع شاہ کے سامنے کوئی بیان کرسکے۔

اب میں ملا باشی کے خیمہ کے قریب پہنچ گیا وہ منتظر ہی تھا۔ استقبال کیلئے نکلا گندم گوں اور میانہ قد آدمی ہے مجھکو لیجاکر صدر پر بٹھایا اور خود شاگردوں کی طرح ادب سے میرے سامنے بیٹھ گیا مجمع کثیر تھا۔ اور ہر طرف کے علما جمع تھے۔ پہلے اس نے مجھ سے چند رسمی باتیں کیں۔ اس کے بعد افغانی مفتی کو مخاطب کرکے کہا کہ تم نے ہادی خواجہ (قاضی بخارا) کو بھی دیکھا۔؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں۔ ملا باشی نے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ اس نے اپنا لقب بحر العلم کیوں رکھا ہے۔ اسکو تو علم سے کوئی مس نہیں بخدا اگر میں حضرت علی رض کی خلافت کے متعلق دو دلیلیں بیان کردوں تو وہ قطعاً انکا جواب نہ دے سکیگا اور وہ کیا اہل سنت کے علماء فحول سے بھی ان کا جواب بن نہ پڑے گا۔

اس آخری جملہ کو اس نے تین بار دہرایا۔ اسلئے اب لازم آگیا کہ میں ان دونوں دلیلوں کو اس سے پوچھوں اور انکے جوابات جو مجھ سے ہوسکتے ہوں پیش کردوں۔

میں۔ جناب ذرا میں بھی سنوں کہ حضرت علی رض کی خلافت کے اثبات میں آپکی وہ کونسی دو دلیلیں ہیں جنکا جواب آپکے زعم میں کسی بڑے سے بڑے سنی عالم سے بھی نہیں ہوسکتا۔

ملا باشی۔ میں آپ سے پہلے یہ پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ آنحضرت کا یہ قول حضرت علی کے متعلق آپکے

یہاں مسلم ہے یا نہیں کہ انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی۔

میں۔ ہاں یہ حدیث مشہور ہے۔

ملا باشی۔ ٹھیک تو کیا اس حدیث کا منطوق و مفہوم صریحاً اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ خلیفہ برحق علی بن ابی طالب ہیں؟۔

میں۔ دلیل کی صورت معرض بیان میں لائیے۔

ملا باشی۔ جب آنحضرتؐ نے ہارونؑ کے تمام منازل و مراتب حضرت علی کیلئے فرما دئے اور ان میں سے کوئی چیز بجز نبوت کے مستثنیٰ نہ فرمائی تو ثابت ہوگیا کہ خلیفہ برحق حضرت علی ہیں۔ کیونکہ ہارون کا اولین مرتبہ تو خلافت ہی تھا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور حضرت موسیٰ کے بعد انکے خلیفہ ہوتے۔

میں۔ آپ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس قضیہ کو موجبہ کلیہ سمجھتے ہیں لہذا یہ بتائیے کہ اس ایجاب کلی پر کون لفظ دلالت کرتا ہے کہ تمام منازل ہارون کے حضرت علی کو حاصل ہیں۔

ملا باشی۔ اس لئے کہ منزلۃ ہارون میں جو اضافت ہے وہ بقرینہ استثنا استغراقی ہے۔

میں۔ سنئے۔ یہ حدیث اولاً تو نص جلی نہیں ہے اور آپ کے یہاں امامت یا خلافت کے ثبوت کیلئے نص جلی درکار ہے۔ ثانیاً محدثین نے اس کے متعلق اختلافات کئے ہیں کسی نے اسکو صحیح کہا ہے تو کسی نے حسن اور کسی نے ضعیف۔ یہاں تک کہ ابن جوزی جو نقد حدیث کا ایک بہت بڑا امام ہے۔ اس کو قطعاً موضوع قرار دیتا ہے۔

ملا باشی۔ نص جلی ہمارے یہاں شرط ہے نہ کہ آپ کے یہاں۔ سوم حضرت علی کی خلافت کے لئے وہ دوسری حدیثیں پیش کرتے ہیں جو نص صریح ہیں۔ لیکن چونکہ اہل سنت کے نزدیک وہ نامقبول ہیں اس لئے آپ کے سامنے یہ حدیث استدلال میں لاتے ہیں۔

میں۔ یہ حدیث مختلف وجوہ سے دلیل نہیں بن سکتی۔ اولاً یہ کہ استغراق کا دعوےٰ جو آپنے کیا ہے وہ ممنوع ہے۔ کیونکہ ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ نبی تھے۔ اور حضرت علی میں یہ

بات نہ تھی۔ حالانکہ استثنا تو نبوت بعد از وفات کا ہے۔ علاوہ بریں ہارون ؑ حضرت موسیٰ ؑ کے ماں جائی بھائی تھے۔ اور حضرت علی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ رشتہ نہ رکھتے تھے۔ لہذا استغراق کا دعوٰی تو قطعاً باطل ہوا۔ اب اسکی دلالت ظنی رہگئی جو اصولاً صرف ایک منزلت پر ہوگی جیسا کہ منزلۃ کی تائے وحدت سے ظاہر ہے۔ اس لئے یہ اضافت عہد ہے نہ کہ استغراق۔ اور مقصود اسکا صرف یہ ہے کہ علی رض خلافت جنگ تبوک میں میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ ؑ کے ساتھ اسوقت تھی جب انہوں نے حکم دیا تھا کہ (اخلفنی فی قومی)

ملا باشی۔ تو پھر کیا اس استخلاف سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ صحابہ میں افضل تھے اور نبی ؑ کے بعد انکی جانشینی کے مستحق؟

میں۔ نہیں۔ کیونکہ حضرت ﷺ کے علاوہ اور صحابہ کو بھی آپنے اپنی جانشینی کا بارہا شرف بخشا ہے مثلاً ابن ام مکتوم وغیرہ پھر وہ بھی بعد وفات کے خلافت کے مستحق ہونگے۔ علاوہ بریں اگر یہ استخلاف کوئی فضیلت ہوتی تو حضرت علی اس پر اپنی ناراضی کا اظہار نہ کرتے جیسا کہ انہوں نے کہا کہ آپ مجھکو کمزوروں۔ بچوں اور بڑھیوں کے ساتھ چھوڑتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اسی کبیدگی کے دفعیہ کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ (انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ) فرمایا تھا۔

ملا باشی۔ لیکن لحاظ عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔

میں۔ جناب خصوص سبب کو میں نے دلیل نہیں گردانا ہے بلکہ اسکو قرینہ بتلایا ہے کہ یہاں ایک منزلۃ جو مراد ہے اس سے صرف وہی خلافت مخصوصہ جنگ تبوک میں ہے نہ کہ اور۔

اسکے بعد ملا باشی خاموش رہگیا۔ اور اس کے کثیر طرفدار علما میں سے بھی جو اس کی حمایت کے لئے پس پشت بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ اب اس نے اپنی دوسری دلیل شروع کی۔

ملا باشی۔ دوسری دلیل میری ایسی ہے جس میں قطعاً کسی تاویل کی گنجایش نہیں۔

میں۔ اسکو بھی بیان فرماتے۔

ملا باشی۔ وہ آیت مباہلہ ہے (قل تعالوندع ابنائنا وابنائکم ونسائنا ونسائکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتہل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین)

میں۔ استدلال کی شکل ارشاد ہو۔

ملا باشی۔ جب نجران کے نصاریٰ مباہلہ کیلئے آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گود میں حضرت حسین کو اٹھایا۔ اور حسن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پیچھے سے فاطمہ تھیں اور انکے پیچھے علی رضی اللہ عنہم۔ ظاہر ہے کہ دعا کے لیۓ وہی لوگ منتخب ہو سکتے ہیں جو سب سے افضل ہوں۔

میں۔ یہ منقبت ہوئی نہ کہ فضیلت۔ اکثر صحابہ بعض خصوصیات سے مختص ہیں جو دوسروں میں نہیں ہیں اور یہ باتیں ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہیں جنہوں نے تاریخ وسیر کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر یہ خصوصیات فضیلت کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتیں فرض کرو کہ دو قبائل میں جنگ ہو۔ ان دونوں کے رؤسا اپنے خاص خاص متعلقین کو لیکر مبارزہ کریں اور کسی غیر کو ساتھ نہ لیں تو یہ دلیل اس امر کی نہیں ہو سکتی کہ ان قبائل میں ان رؤسا کے خاص عزیزوں سے زیادہ کوئی بہادر ہی نہ تھا۔

اور چونکہ یہ دعا کا موقع تھا جس میں خاص متعلقین کی موجودگی سے خشوع زیادہ بڑھ جاتا ہے اس لیۓ مقتضائے مقام یہی تھا کہ آنحضرتؐ انہیں حضرات کو اپنے ساتھ لیجاتے۔

ملا باشی۔ ہاں تو خشوع نتیجہ ہے فرط محبت کا۔ اور یہی تو ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو یہ حضرات سب سے زیادہ محبوب تھے۔

میں۔ یہ طبعی اور جبلی محبت ہے نہ کہ اختیاری جس سے کوئی فضیلت ثابت ہو سکے۔ انسان یہ یقین رکھتے ہوئے کہ اس کے بیٹے یا خاص عزیزوں سے دوسرے لوگ ہر لحاظ سے افضل ہیں پھر بھی طبعاً انکی محبت پر مجبور ہے۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ اس کو سب جانتے ہیں۔ کوئی مشکل ہی سے اپنے بیٹے کو اس وجہ سے عزیز رکھتا ہو گا کہ وہ دنیا بھر سے افضل ہے۔

ملا باشی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک خاص نکتہ ہے جس کی وجہ سے ہم حضرت علیؓ کی افضلیت

کی دلیل اسکو سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ابنا ئنا سے مراد تو بن حسنؑ و حسینؑ۔ اور نسائنا سے فاطمہؑ اور انفسنا سے آنحضرت اور علی رضؓ اس لئے حضرت علی نفس نبی ہوئے۔ اور یہی انتہائی فضیلت ہے۔

میں۔ یہ تو میں پہلے سمجھ گیا تھا کہ تم اصول سے ناواقف ہو۔ لیکن اب یہ معلوم ہوا کہ زبان عربی سے بھی تم آشنا ہو۔ سنو! انفس جمع قلت ہے جو انا جمع کیطرف مضاف ہے۔ اور جمع جب جمع کی طرف مضاف ہوتی ہے۔ تو تقسیم احاد کی مقتضی ہوتی ہے۔ مثلاً رکب القوام دوابہم یعنی ہر ہر شخص اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ قاعدہ متعارف و متداول ہے۔ اور کتب نحو میں بتصریح مذکور۔ یہ سنکر وہ خاموش ہوگیا۔ اور کوئی جواب اس سے بن نہ پڑا کہنے لگا کہ میرے پاس ایک اور بھی دلیل ہے۔

میں۔ اسے بھی پیش کیجئے۔

ملاباشی۔ اللہ تعالے نے فرمایا ہے۔ انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلاۃ ویؤتون الزکاۃ وہم راکعون۔ تمام اہل تفسیر متفق ہیں کہ یہ آیت حضرت علی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ اور آیت میں حصر کا لفظ انما موجود ہے جس سے انکا افضل امت ہونا ظاہر ہے۔

میں۔ اس دلیل کے متعدد جوابات ہیں۔

میں اسی قدر کہنے پایا تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے فارسی زبان میں آہستہ کہا کہ یہ بحث چھوڑ دو کیونکہ یہ شخص تمہاری ہر دلیل کو توڑتا جائیگا۔ اور لوگوں کی نگاہ سے تم اسی قدر گرتے چلے جاؤ گے۔ یہ سنکر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا کہ آپ فاضل شخص ہیں میری ہر دلیل کا جواب دیسکتے ہیں۔ لیکن میرا روئے سخن تو دراصل بحرالعلم کی طرف تھا۔ میں نے کہا کہ آغاز سخن میں آپ نے یہ فرمایا تھا کہ فحول علماء اہل سنت بھی میری دلیلوں کا جواب نہیں دیسکتے۔ اس بنا پر میں نے گفتگو کی۔ ورنہ مجھے کوئی بحث نہ تھی۔

ملاباشی۔ میں عجمی شخص ہوں عربی بولنے میں کبھی مقصود کے خلاف بھی الفاظ میری زبان نکلجاتے ہیں۔

میں۔ اچھا اب میں دو سوال کرتا ہوں جس کی بابت مجھکو یقین ہے کہ تمام علمائے شیعہ میں سے

کوئی بھی انکا جواب نہ دے سکیگا۔

ملا باشی۔ وہ کیا ہیں؟

میں نے کہا تمہارے یہاں یہ حدیث مسلم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد تمام صحابہ (بوجہ حضرت علی کی خلافت پر بیعت نہ کرنے کے) مرتد ہوگئے۔ بجز پانچ کے علی۔ مقداد۔ ابوذر۔ سلمان فارسی اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم۔

ملا باشی۔ ہاں مسلم ہے۔

میں۔ اگر معاملہ یہ تھا تو پھر کیوں حضرت علی نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر کے ساتھ کیا۔

ملا باشی۔ مجبور ہوکر اور دباؤ سے۔

میں۔ بخدا تم نے حضرت علی کی ایسی منقصت پر عقیدہ رکھا ہے جسکو ادنیٰ سے ادنیٰ عرب بلکہ اجلاف بازاری بھی اپنے لئے جائز نہ رکھینگے۔ اگر جبراً کسی کی بیٹی کوئی بیاہ لے تو لیا اسکی زندگی بغیرتی کی زندگی نہیں ہے؟ پھر کیسے تم دعوے کرسکتے ہو کہ حضرت علی اسد اللہ شیر خدا شاہ مردان اور شجاع دوران تھے۔

ملا باشی۔ یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر کے یہاں بجائے ام کلثوم کے کوئی چڑیل یا جنی رخصت کی گئی ہو۔

میں۔ یہ اس سے بھی عجیب تر ہے۔ اگر اس احتمال کا دروازہ کھولیں تو شریعت کا کوئی نقطہ اپنی جگہ پر باقی نہیں رہ سکتا۔ مثلاً ایک شخص اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ممکن ہے کہ تم میرے شوہر نہ ہو بلکہ کوئی جن ہو۔ وہ دو مرد شہادت میں لائے تو پھر وہ کہہ سکتی ہے کہ ممکن ہے یہ انسان نہ ہوں بلکہ غول بیابانی ہوں۔ علی ہذا ایک قاتل عدالت میں پیش کیا جائے وہ بیان کرے کہ میں نے نہیں قتل کیا ممکن ہے کوئی جن میرا ہم شکل بنگیا ہو۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ مذہب جعفری جسکو تم حق سمجھتے ہو ممکن ہے کہ امام جعفر سے نہ مروی ہو بلکہ کسی جن سے ہو جس نے ان کی شکل اختیار کرلی ہو۔ الغرض وہ اسکی بھی ساکت ہوا اور ایک حرف آگے نہ چل سکا۔

اب میں نے دوسرا سوال پیش کیا۔ اور پوچھا کہ ظالم خلیفہ کے افعال کی بابت تمہارا کیا عقیدہ ہے
ملاباشی۔ غیر نافذ ہیں۔ شرعاً رد یا تھا۔
میں۔ یہ بتائیے کہ حضرت علی کے بیٹے محمد بن الحنفیہ کی والدہ کس قبیلہ کی تھیں؟ اور کس نے انکو مال غنیمت میں حاصل کیا تھا۔
ملاباشی۔ میں نہیں جانتا (میرے خیال میں اس نے یہ صحیح نہیں کہا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا) لیکن علمائے شیعہ میں سے ایک شخص نے کہا کہ وہ بنی حنیفہ میں سے تھیں اور حضرت ابو بکر کے عہد میں انہیں کے حکم سے بنی حنیفہ سے جنگ ہوئی تھی جس میں گرفتار ہو کر قیدیوں کے ساتھ آئی تھیں۔
میں۔ پھر حضرت علی نے یہ کیسے جائز سمجھا کہ خلیفہ جائر کے مال غنیمت میں سے لونڈی لیکر اس سے اولاد پیدا کریں اس معاملہ میں تو احتیاط نہایت ضروری ہے۔
ملاباشی ہو سکتا ہے کہ حضرت علی نے اسکو خود بنی حنیفہ سے بطور ہبہ کے مانگ لیا ہو۔
میں۔ اسکی کوئی دلیل؟

اس پر ہر طرف سے خاموشی تھی۔
میں۔ میں نے قصداً احتیاط کی کہ کوئی حدیث یا کوئی آیت آپکے سامنے نہ پیش کروں۔ اس لئے کہ ممکن ہے کہ ہم دونوں اس کی صحت یا تاویل میں متفق نہ ہوں۔ اور استدلال صرف انہیں باتوں سے ہو سکتا ہے جو فریقین کے نزدیک مسلم ہوں۔ میرے یہ دونوں سوالات عقل و عرف کی بنا پر تھے۔

اس مناظرہ کی نقط بنقط صحیح صحیح خبریں شاہ تک پہنچ گئیں اس نے حکم دیا کہ ایران۔ افغانستان اور ماوراء النہر کے تمام علماء جمع ہو کر مکفرات کو اٹھا دیں اور ایک دوسرے کی تکفیر سے دستبردار ہو جائیں اور میں انکا نگراں اور حکم رہوں اس لئے ہم سب ملا باشی کے خیمہ سے نکلکر اس مجمع کی طرف چلے جو ضریح علی رض کے متصل اسی غرض کے لئے جمع ہوا تھا۔
علماء ایران کی تعداد ستر تھی جنمیں سے صرف ایک شخص مفتی اردلان سنی تھا اور باقی سب

شیعہ علماء میں سے ممتاز حضرات کے نام میں نے اُسی وقت لکھ لئے۔
۱۔ ملا باشی علی اکبر۔ ۲۔ مفتی رکاب آقا حسین۔ ۳۔ ملا محمد امام لاہجان۔ ۴۔ آقا شریف مفتی مشہد رضا۔ ۵۔ میرزا برہان قاضی خسروان۔ ۶۔ شیخ حسین مفتی ارومیہ۔ ۷۔ میرزا ابوالفضل مفتی قم۔ ۸۔ حاجی صادق مفتی جام۔ ۹۔ سید محمد مہدی امام اصفہان۔ ۱۰۔ حاجی محمد زکی کرمانشاہ۔ ۱۱۔ حاجی محمد تمامی مفتی شیراز۔ ۱۲۔ میرزا اسداللہ مفتی تبریز۔ ۱۳۔ ملا طالب مفتی مازندران۔ ۱۴۔ ملا محمد مہدی نائب صدر مشہد۔ ۱۵۔ ملا محمد صادق مفتی خلخال۔ ۱۶۔ محمد مومن مفتی استراباد۔ ۱۷۔ سید محمد تقی مفتی قزوین ۱۸۔ ملا محمد حسین مفتی سبزوار۔ ۱۹۔ سید بہاء الدین مفتی کرمان۔ ۲۰۔ سید احمد مفتی اردلان شافعی۔

افغانستان کے علماء جو سب کے سب حنفی تھے حسب ذیل تھے۔
۱۔ شیخ فاضل ملا حمزہ قلنجانی مفتی افغانستان۔ ۲۔ ملا امین قلنجانی قاضی افغانستان۔ ۳۔ ملا دنیا قلقی۔ ۴۔ ملا طہ افغانی مدرس مدرسہ نادر آباد۔ ۵۔ ملا نور محمد قلنجانی۔ ۶۔ ملا عبدالرزاق قلنجانی۔ ۷۔ ملا ادریس ابدالی۔

اسکے تھوڑے عرصہ کے بعد علماء ترکستان آئے جنکی تعداد سات تھی۔ انکے آگے آگے ایک شیخ تھا جس کے چہرہ سے رعب اور وقار برستا تھا۔ ایک بڑا سا عمامہ سر پر۔ دیکھنے والے کو یہ خیال گذرتا تھا کہ امام اعظم کے شاگرد رشید امام ابو یوسف چلے آرہے ہیں۔

ایرانیوں نے اس خیال سے کہ میں ان سے کوئی بات نہ کرسکوں مجھسے پندرہ آدمیوں کے فاصلہ پر بائیں طرف انکو بٹھایا۔ اسی طرح افغانی علماء کو بھی دائیں طرف مجھسے دور جگہ دی۔

ترکستانی علماء کے نام یہ ہیں۔
۱۔ علامہ ہادی خواجہ بحرالعلم قاضی بخارا حنفی ۲۔ میر عبداللہ صدر بخارا حنفی۔ ۳۔ قلندر خواجہ بخاری حنفی۔ ۴۔ ملا امید صدور بخاری حنفی۔ ۵۔ بادشاہ میر خواجہ بخاری حنفی۔ ۶۔ میرزا خواجہ بخاری حنفی۔ ۷۔ ابراہیم بخاری حنفی۔

جب مجلس بیٹھ چکی ملا باشی نے بحرالعلم کو مخاطب کیا اور کہا کہ آپ اس شخص کو (میری طرف اشارہ

کرکے پہچانتے ہیں ؟

بحرالعلم۔ نہیں۔

ملاباشی: یہ فضلاء اہل سنت میں سے ہیں شیخ عبداللہ آفندی۔ احمد پاشا والی بغداد نے انکو شاہ کے حسب طلب بھیجا ہے تاکہ اس مجلس میں ہمارے نگراں اور شاہد رہیں اور شاہ نے انکو اپنا وکیل بنا دیا ہے۔ جن امور پر ہمارا اتفاق ہوتا جائیگا یہ شاہد رہیں گے۔ لہذا اب آپ وہ تمام امور بیان کریں جنکی بنا پر ہم شیعوں کی تکفیر کرتے ہیں تاکہ اگر وہ واقعی موجب کفر ہوں تو ہم باز آجائیں۔ درحقیقت میں تو ہم کافر ہیں نہیں۔ خود امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی۔ چنانچہ جامع الاصول میں ہے کہ اسلام کے پانچ مذاہب ہیں جنمیں سے ایک مذہب جعفری ہے۔ اسی طرح صاحب مواقف نے بھی امامیہ کو اسلام کا ایک فرقہ تسلیم کیا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کا قول فقہ اکبر میں ہے کہ ہم اہل قبلہ کو کافر نہیں سمجھتے۔ شرح ہدایہ میں یہ تصریح موجود ہے کہ صحیح یہ ہے کہ امامیہ اسلام ہی کا ایک فرقہ ہے۔ لیکن باوجود متقدمین کی ان تصریحات کے بھی متاخرین نے غلو اور تعصب سے کام لیکر ہم کو کافر بنانا شروع کیا جس طرح ہمارے فرقہ کے لوگوں نے آخر میں سنیوں کی تکفیر شروع کر دی حالانکہ نہ ہم کافر ہیں نہ تم۔

بہرصورت جو کفر کی باتیں ہمارے اندر آپکے خیال میں ہوں وہ ظاہر کیجیے۔

بحرالعلم۔ سب شیخین

ملاباشی۔ ہم نے اسکو چھوڑ دیا۔

بحرالعلم۔ تم صحابہ کرام کو کفار۔ مرتد اور گمراہ کہتے ہو

ملاباشی۔ سارے صحابہ عدول ہیں رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

بحرالعلم۔ متعہ کو حلال سمجھتے ہو۔

ملاباشی۔ متعہ حرام ہے جو اسکی حلت کا قائل ہو وہ سفیہ ہے۔

بحرالعلم۔ تم علی رض کو ابوبکر رض پر فضیلت دیتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہی خلیفہ برحق تھے۔

ملا باشی - نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابو بکر - پھر عمر پھر عثمان پھر علی رضی اللہ عنہم - اور انکی خلافتیں بھی اسی ترتیب سے مقبول ہیں -

بحر العلم - تمہارا اصول اور عقیدہ کیا ہے - ؟

ملا باشی - ہم ابو الحسن اشعری کے عقیدہ پر ہیں -

بحر العلم - یہ شرط ہے کہ دین کی حلال چیز کو حرام یا حرام کو حلال نہ بناؤ -

ملا باشی - یہ شرط منظور ہے -

بحر العلم نے اس کے بعد کچھ اور بھی شرطیں پیش کیں جنکو کفر سے کوئی علاقہ نہ تھا - ملا باشی نے اُن سب کو قبول کیا پھر کہا کہ جب ہم ان سب امور کے پابند ہوگئے تو اب تم کو ہمارے مسلمان شمار کرنے کرنے میں کیا عذر ہے ؟

بحر العلم - شیخین پر تبرا کفر ہے -

ملا باشی - ہم نے تو اسکو چھوڑا - اور انکو افضل صحابہ سمجھتے ہیں - اصولاً اشعری ہیں کسی حلال متفق علیہ کو حرام یا حرام کو حلال نہیں سمجھتے - متعہ کی حلت کے قائل نہیں ہیں پھر بھی آپ ہم کو مسلمان سمجھیں گے یا ابتک ہم کافر ہی ہیں - ؟

بحر العلم - (کچھ دیر سکوت کے بعد) لیکن شیخین کو برا کہنا تو کفر ہے -

ملا باشی - جناب ! ہم نے تو اسکو چھوڑ دیا - اور انکو افضل صحابہ مانتے ہیں - آخری شرط تک اس پر بھی آپ ہم کو کفار ہی کہتے رہیں گے -

بحر العلم - بہر صورت سب شیخین تو کفر ہے -

مراد بحر العلم کی یہ تھی کہ سب شیخین چونکہ کفر ہے[1] - اور جس سے یہ کفر صادر ہو مذہب حنفی کے مطابق اس کی توبہ قبول نہیں - پھر میں کیسے انکے مسلمان ہونے کا اقرار کرلوں

---

[1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ سب شیخین کفر ہے نہ ناقابل توبہ - یہ گناہ سے جن لوگوں نے دئے ہیں انکے حالات پڑھنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ خاص خاص اسباب سے شیعوں سے ذاتی تعصب رکھتے تھے - حدیثوں میں تصریح ہے کہ - سباب المومن فسوق جس سے ہر وقت توبہ ہوسکتی ہے - اسلم

جبکہ یہ کفران سے سرزد ہو چکا ہے۔ آخر ملا علی نقیان نے ملا حمزہ سے کہا کہ
ہادی خواجہ! کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا شہادت موجود ہے کہ ان سے سب شیخین یا العیاذ باللہ سرزد ہوا ہے جو تم ان کی
توبہ قبول نہیں کرتے۔ بحر العلم نے کہا نہیں۔ ملا حمزہ نے کہا کہ جب وہ حتمی وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ ہم تبرا نہ کریں گے
تو پھر ان کی توبہ قبول کرنے میں کونسی قباحت ہے۔ اس پر بحر العلم نے کہا اچھا یہ لوگ بھی مسلمان ہیں اور ہمارے حقوق ان کے حقوق۔

جب یہ باتیں طے ہو گئیں تو شیعہ حنفی شافعی تینوں فرقوں کے علماء، امراء اور عوام کھڑے ہو گئے اور باہم مصافحہ اور معانقہ کرنے لگے۔ اور ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح جوش محبت کے ساتھ بغلگیر ہو گئے۔

اسوقت ہمارے پس پشت اردگرد بھی امراء اور تماشائیوں کا ہجوم دس ہزار سے کم نہ تھا۔ جو سب کے سب فرط مسرت اور جوش سرور سے آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔

یہ مجلس بحسن و خوبی چہارشنبہ کے روز مغرب کے قبل ختم ہو گئی۔ رات کو دس بجے سے پہلے شاہ کی طرف سے ایک آدمی آیا جس نے مجھ سے کہا کہ شہنشاہ آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپکے مساعی جمیلہ کے شکرگزار ہیں۔ اور توقع رکھتے ہیں کہ کل جو مجلس ہوگی جسمیں آج کی تمام باتوں کا عہد و پیمان ہوگا اور ہر فریق محضر پر دستخط کریگا۔ اسمیں آپ بطور شاہد و ناظر اور میرے وکیل کے موجود رہینگے۔ اور اسکی پیشانی پر خود اپنے قلم سے اپنی شہادت تحریر کرینگے اور مہر لگائینگے۔
میں نے کہا کہ بسر و چشم۔ میں اس حکم کی تعمیل کروں گا۔

دوسرے دن یعنی پنجشنبہ ۲۵ شوال کو ضریح علی ہذ کے سامنے دوپہر سے پہلے اجتماع ہوا ہم سب لوگ وہاں پہنچے۔ حاضرین کی تعداد کم سے کم ساٹھ ہزار تھی۔ محضر نامہ سات بالشت کے کاغذ پر فارسی زبان میں لکھا گیا تھا۔ ملا باشی نے مفتی رکاب آقا حسین کو جو جہوری الصوت آدمی تھا۔ اس کے سنانے کا حکم دیا۔ اس نے مجمع عام میں پڑھا مختصراً اسکا مضمون یہ تھا۔
اللہ جل شانہ اس دنیا میں سلسلہ وار رسول بھیجتا رہا۔ سب کے بعد آخر میں محمد مصطفے

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے اپنا رسول بنا کر بھیجا جن پر رسالت ختم کر دی انکی
وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بالاتفاق ابوبکر صدیق بن ابی قحافہ
کو اپنا جانشین بنایا۔ اور انکے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی حضرت علی نے
بھی بطیب خاطر بلا جبر و اکراہ بیعت فرمائی۔ اور باجماع صحابہ جنکی مدح میں اللہ تعالےٰ
نے فرمایا ہے (السابقون الاولون من المہاجرین والانصار) اور دوسری
آیات بھی ہیں وہ اس امت کے امیر اور خلیفہ ہو گئے۔ پھر انہوں نے بذریعہ
عہد کے عمر بن خطاب کو اپنا جانشین کیا۔ اسپر بھی جملہ اصحاب نے معہ حضرت
علی کے خوشی سے بیعت کی انہوں نے اپنے بعد خلافت کو چھ امیدواروں
میں بطور شورے کے چھوڑ دیا جنمیں سے ایک علی بن ابی طالب رضہ بھی تھے
کثرت رائے سے حضرت عثمان خلیفہ ہو گئے۔ جب وہ اپنے گھر میں باغیوں
کے ہاتھ سے شہادت پا گئے اور امت بلا خلیفہ کے رہ گئی اسوقت صحابہ نے
حضرت علی کو خلیفہ بنایا اور انکے ہاتھ پر بیعت کی۔

یہ چاروں خلفاء ایک زمانہ میں تھے۔ انمیں کبھی باہم نزاع یا جھگڑا نہیں ہوا
بلکہ ہر ایک دوسرے سے محبت رکھتا اور اسکی تعریف کرتا تھا۔ یہانتک کہ
جب علی سے شیخین کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ دونوں امام
عادل اور برحق تھے۔ اور اسی پر مرے۔ اسی طرح جب حضرت ابوبکر رضہ
کے ہاتھ پر لوگ بیعت کرنے لگے تو انہوں نے فرمایا کہ تم میں علی رضہ موجود
ہیں پھر بھی تم میرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہو۔

ایرانیو! تم کو یقین رکھنا چاہئے کہ انکی فضلیت اور خلافت اسی ترتیب پر ہے
جس طرح بیان کی گئی۔ سو جو شخص انکی تحقیر یا انکی بابت کوئی ناشائستہ کلمہ
زبان سے نکالنا روا رکھے گا اسکا مال۔ اولاد۔ عیال اور خون سب شہنشاہ

سکے لئے حلال ہے اور اس کے اوپر اللہ۔ ملائکہ اور تمام بنی نوع انسان کی لعنت ہوگی۔

میں نے صحرائے مغان میں تخت نشینی کے وقت یہی عہد لیا تھا۔ اب جو کوئی صحابہ کو برا یا شیخین پر تبرا کہے گا اسکو اس کے اہل وعیال سمیت قید کروں گا اور مال وجائداد ضبط کرلوں گا۔ یہ بدعت ایران میں کبھی نہ تھی۔ اسکا ظہور اسمٰعیل شاہ صفوی کے عہد سے سنہ ۹۰۶ھ سے ہوا جواب تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔

یہ حصہ شاہ کی طرف سے تھا۔ اس کے نیچے چند سطریں تھیں جن میں باشندگان ایران کی طرف سے عہد تھا کہ۔

ہم صحابہ کو برا نہ کہینگے۔ اور تبرے سے دست بردار ہوئے خلفاء اربعہ کی فضیلت اور خلافت کے اسی ترتیب کے ساتھ ہم قائل ہیں جو مندرج کی گئی ہے۔ جو اس کے خلاف کرے اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام آدمیوں کی لعنت ہو اور شاہ کے لئے اسکا مال و عیال، وخون حلال ہے۔

اسکے نیچے علماء وعمائدین ایران کے دستخط ہوئے اور انکی مہریں لگائی گئیں۔

پھر اس کے بعد چند سطروں میں یہی مضمون کربلا۔ نجف۔ حلہ اور خوارزم کے باشندوں کی طرف سے تھا۔ اس پر انکی مہریں ثبت ہوئیں۔ مہر لگانے والوں میں سید نصر اللہ ابن قطہ اور شیخ جواد نجفی وغیرہ ممتاز اشخاص تھے۔

پھر اسکے تحت میں چند سطریں علماء افغانستان کی طرف سے تھیں کہ ایرانی جب ان باتوں کی پابندی کرینگے جو اس محضر میں مندرج ہیں تو ہم انکو کافر نہیں سمجھینگے بلکہ انکو اپنے بھائی مسلمانوں کا ایک فرقہ تسلیم کرینگے۔ اس کے نیچے انکے دستخط اور مہریں لگائی گئیں۔

بعینہٖ یہی مضمون ترکستانی علماء کی طرف سے بھی تھا اور انہوں نے بھی اس پر اپنی مہریں ثبت کیں۔

عنوان پر میں نے اپنی شہادت لکھکر دستخط کی اور مہر لگائی۔

جب یہ تمام کارروائی ختم ہو گئی تو مجمع سے ایک خوشی کا نعرہ بلند ہوا۔ سنی اور شیعہ سب کے سب فرحناک تھے۔ اور نہایت گرم جوشی سے باہم گلے مل رہے تھے۔

اسکے بعد شاہ کی طرف سے چاندی کی صینیوں میں خدام حلوے اور مٹھائیاں لیکر آئے۔ اور خالص سونے کے جڑاؤ عطردان جو عنبر و مشک سے بھرے ہوئے تھے۔ اس سے مجمع کی خاطر تواضع کی گئی۔

پھر شاہ نے مجھکو بلایا۔ اور کہا کہ میں آپ کا اور ساتھ ہی احمد خاں (پاشا) کا شکر گزار ہوں کہ مسلمانوں کو باہمی تکفیر اور خونریزی سے بچانے میں سعی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آل عثمان کی عزت و رفعت میں ترقی عطا کرے۔

میں از راہ شکر نہ کہ از روئے فخر یہ کہتا ہوں کہ اس کام کو اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ سے کرایا (صحابہ کرام پر تبرا کرنے سے لوگ تائب ہو گئے۔ ورنہ سلاطین عثمانیہ نے کسقدر خونریز جنگیں کیں اور بار ہا لشکر لیکر چڑھائی اور لڑائی کرتے رہے لیکن یہ سعادت انکے حصہ میں نہ تھی اور میں نے بلا ایک قطرہ خون بہائے شاہان صفویہ کی اس بدعت قبیح پر جو تمام ملک پر چھائی ہوئی تھی فتح حاصل کر لی۔

میں نے کہا کہ انشاء اللہ سارا ایران جیسے پہلے سنی تھا اب پھر ہو جائیگا۔ شاہ نے کہا کہ رفتہ رفتہ۔ اس کے بعد سر اٹھا کر بولا کہ میں اگر فخر کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ میری ذات اسوقت مجموعہ ہے چار عظیم الشان سلاطین کا یعنی ہند و افغانستان و توران و ایران کیونکہ ان چاروں ممالک کی زمام حکومت میرے ہاتھ میں ہے۔ لیکن رفع تبرا کسی سلطان کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ تائید الہی سے یہ امر حاصل ہوا ہے۔ اور چونکہ میں ذریعہ ہوں اس لئے تمام عالم اسلامی کی یہ خدمت مجھسے ہوئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ صحابہ کرام میرے اس فعل سے خوش ہونگے۔ اور آخرت میں میری شفاعت کرینگے۔

اس کے بعد مجھسے کہا کہ تم ابھی ٹہر جاؤ کل جمعہ ہے اور میں نے حکم دیا ہے کہ جامع کوفہ میں

جملہ پڑھا جائے۔ اور منبر پر حسب ترتیب خلفاء کا نام لیا جائے۔ آخر میں خلیفہ عثمانی کے لئے دعا کیجائے۔ اسکے بعد میرے لئے کیونکہ میں انکو اپنا بڑا اور بزرگ بھائی سمجھتا ہوں۔ انکے باپ دادا اپنے پشت ہا پشت سے اسلام کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں اور تم جانتے ہو کہ میں جب دنیا میں آیا تو میرا باپ سلطان نہ تھا۔

میں دربار سے واپس آیا دیکھا کہ ہر ہر خیمہ میں ایرانی بیٹھے ہوئے اسی میثاق کا تذکرہ کر رہیں اور ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے فضائل آیات واحادیث سے نکالتے اور شاہان صفویہ کی رسم تبرا پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔

دوسرے دن اعتماد الدولہ ظہر کے وقت میرے پاس بلانے کیلئے آیا کہ میں چلکر جمعہ کی شرکت کروں۔ میں نے کہا کہ جامع کوفہ میں حنفیہ کے نزدیک بھی جمعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ آبادی نہیں ہے اور شافعیہ کے نزدیک بھی کیونکہ باشندوں کی تعداد چالیس تک نہیں پہنچتی۔ اس نے کہا کہ آپ جمعہ نہ پڑھیں وہاں تو صرف آپکی موجودگی درکار ہے۔ چنانچہ میں گیا۔ جماعت میں امراء خوانین علماء اور عوام تقریباً پانچ ہزار تھے۔ منبر پر شاہی امام تھا۔ اس نے خطبہ میں خلفاء کو حسب ترتیب ذکر کیا اور انکی مدح کی۔ پھر خلیفہ عثمانی اسکے بعد نادر شاہ کیلئے دعا مانگی اور حسب قاعدہ امامیہ نماز ادا کی۔

نماز سے فارغ ہونیکے بعد میں نے ملا باشی سے کہا کہ یہ نماز مذہب جعفری کے مطابق نہیں ہے۔ اس نے بحث کی لیکن آخر میں ساکت ہو گیا[۱]۔

شام کو شاہ نے مجھے واپسی کی اجازت دی اور میں بغداد کو روانہ ہو گیا۔

صاحب جہانکشائی نادری نے لکھا ہے کہ نادر شاہ نے مرزا محمد علی نائب وزیر کو روانہ کیا کہ وہ تمام ایران میں دورہ کر کے خطبوں میں خلفاء اربعہ کا نام داخل کریں اور ملک میں اس محضر کی اشاعت کر کے تعمیل کرائیں۔

---

[۱] یہ بحث مختصر رسالہ میں درج ہے لیکن اس موقع کیلئے غیر ضروری سمجھکر میں نے چھوڑ دیا۔ اسلم۔

اور باب عالی میں بھی یہ ساری کیفیت لکھکر درخواست کی کہ اب خلیفہ کو اس کے پانچوں مطالبے منظور کر لینے چاہئیں۔ ایک مدت تک سفراء کی آمد و رفت ہوتی رہی۔ لیکن ترکی کے شیخ الاسلام اور سلطان محمود خاں نے اس کی دو باتوں سے انکار کر دیا۔ یعنی نہ مذہب جعفری کی صحت تسلیم کی نہ کعبہ میں پانچواں مصلا منظور کیا۔ باقی تین مطالبے تسلیم کر لئے۔

نادر شاہ بھی مصلحت وقت دیکھکر ان دو امور کے مطالبہ سے دست بردار ہو گیا۔ بالآخر محرم سنہ ۱۱۶۰ھ میں فریقین میں عہد مصالحت لکھا گیا جس پر سلطان کی طرف سے لطیف آفندی سفیر عثمانی دستخط کئے فقط۔

اسلم۔ جیراجپوری

ہندوستان میں علوم مشرقیہ کا مطالعہ

اس کا آغاز اور مستقبل

اورینٹل کانفرس میں جسکا چوتھا اجلاس ابھی حال میں الٰہ آباد میں منعقد ہوا تھا، شمس العلماء، ڈاکٹر جیون جی جمشید جی مودی صاحب نے جو خطبہ صدارت پڑھا ہے وہ بعض حیثیتوں سے ایک حد تک دلچسپ اور مفید ہے لہذا ہم اس کا ترجمہ اسکے بعض غیر ضروری حصوں کے حذف کرنے کے بعد عنوان بالا کے تحت ناظرین " جامعہ ،، کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ مقبول ہوگا۔

جسوقت ہم علوم مشرقیہ کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو اسمیں دو سعید شخصیتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں جنہوں نے اس طریقہ کار کو رواج دیا جسے علوم مشرقیہ کے مطالعہ کا جدید مغربی طریقہ کہتے ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں میں سے ایک فرانسیسی سیاح اینکوٹیل دوپیرون اور دوسرے ولیم جونس کی ہے ان ہر دو اشخاص میں سے اول الذکر کے متعلق سر رام کرشن بھنڈارکر نے پہلی اورینٹل کانفرنس کے خطبہ میں ایرانی علوم کے سلسلہ میں ذکر کیا تھا۔ ولیم جونس کا نام زیادہ تر ہندوستانی علوم کیساتھ وابستہ ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اینکوٹیل کے ساتھ کما حقہٗ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ ہمارے ہندوستانی اہل علم جب علوم مشرقیہ کے اس جدید احیاء پر نظر کرتے ہیں تو سب سے پہلے انکے خیالات ولیم جونس ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ۱۷۸۳ء میں کلکتہ تشریف لائے اور ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا سنگ بنیاد رکھا اگرچہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی بنیاد ڈالنے اور اس طرح گویا علوم مشرقیہ کو دوبارہ زندہ کرنے کی بنا پر اسکا سہرہ سر ولیم جونس ہی کے سر ہے لیکن ہم کو بس انہی پر اکتفا نہ کرلینا چاہئے۔ میں

سمجھتا ہوں کہ انکویتل دو پیرون کا بھی ہم پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے نہ صرف ایرانی علوم کا چرچا پھیلایا بلکہ ہندوستانی علوم کو بھی یورپ میں رواج دیا۔ ہندوستانی علوم و ادب پر انکویتل دو پیرون کا اثر براہ راست اور بالواسطہ دونو طریقوں سے ہے۔ زنداویستا پر جو انہوں نے تین جلدیں لکھیں اور فرانس کے علمی رسائل میں جو انکے مضامین نکلتے رہے ان سے مغربی فضلا کی توجہ ہندوستانی اور ایرانی علوم کی طرف بہت کچھ مبذول ہوئی۔

میرا خیال ہے کہ یہ انکویتل دو پیرون ہی تھے جنہوں نے ایک طرح سے ولیم جونس کو بھی ہندوستان اور ہندوستانی زبانوں کیطرف متوجہ کیا۔ ولیم جونس (جو ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے) جب ہیرو(؟) میں تھے اور اسکے بعد جب آکسفورڈ میں آئے، تو اسی وقت سے انکو علوم مشرقیہ کا شوق پیدا ہوگیا۔ لیکن اس زمانہ کا مشرقی مذاق زیادہ تر فارسی، عربی اور عبرانی علوم کے متعلق تھا۔ ۱۷۷۱ء میں جس وقت انکویتل نے اپنی زنداویستا شائع کی ہے، اسوقت جونس ۲۵ سال کے ایک نوجوان تھے۔ انکویتل نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں کہیں آکسفورڈ کے بعض فضلا پر چوٹ کردی تھی۔ اسپر بقول ایک فرانسیسی عالم کے نوجوان ولیم جونس کو "اس حقارت آمیز لب و لہجہ سے سخت تکلیف پہونچی جو انکویتل نے ہائیڈ اور بعض دوسرے فضلا کے متعلق استعمال کیا تھا"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جونس نے فرانسیسی زبان میں ایک نہایت سخت خط لکھا جس میں اس نے نہ صرف انکویتل ہی کو برا بھلا کہا بلکہ انکی تصنیف زنداویستا کو بھی نہ چھوڑا جسکی وجہ سے بقول پروفیسر ڈارمیسٹیٹر "مصنف[۱] کی غلطی سے زنداویستا کو گویا انکویتل کے بدلہ زور دار ضرر کو نقصان اٹھانا پڑا"۔ اسمیں شبہ نہیں کہ اوستا کا جو ترجمہ انکویتل نے کیا تھا وہ زیادہ تر پہلوی زبان سے کیا تھا جو بہت بعد کی چیز ہے اور وہ بہت معمولی بھی تھا۔ یہ ترجمہ جیسا کہ بیان کیا جاتا تھا[۲] "ایک اجنبی لباس" میں تھا۔ ولیم جونس کا خیال تھا کہ انکویتل کو سورت کے بعض پارسی

---

[۱] دیکھو پروفیسر مذکور کی کتاب ایس۔ بی۔ ای جلد [illegible] مقدمہ اول پہلا اڈیشن صفحہ ۱۰۔

[۲] ایضاً صفحہ ۱۲۔

پروہتوں نے دہوکہ دیا اور یاسکو ایسی کتابیں دیں جو زوراسٹر جیسے بڑے رشی کی ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس مسئلہ پر یورپین فضلا دو گروہوں میں منقسم ہو گئے جن میں سے ایک ولیم جونس کا طرفدار بنگیا اور دوسرا انکیوتیل کی حمایت کرنے لگا۔ اول الذکر گروہ میں ایک جرمن عالم تھا جسکا نام مائی نرز تھا۔ اس نے اپنے اعتراض میں ایک اور راگ چھیڑ دیا اس نے کہا کہ انکیوتیل کی کتاب میں بعض خیالات ایسے ملتے ہیں جو ایک طرف تو برہمنوں کے خیالات سے مشابہ ہیں اور دوسری جانب وہ مسلمانوں کے خیالات سے ملتے جلتے ہیں۔ اول الذکر یعنی اپنشد اور ویدوں کے خیالات میں مشابہت پائے جانے کے متعلق آج بہت سے ہندو فضلا واقف ہیں۔ مائی نرز کو اس مشابہت میں یہ ثبوت ہاتھ آیا کہ پارسی مذہب برہمنوں اور مسلمانوں کے قصوں کا باہمی اختلاط کا نتیجہ ہے ۵ مائی نرز نے اپنے اس خیال کو پیش تو کر دیا لیکن اسکی مزید تشریح و توضیح کرنا دوسرے فضلا کا کام تھا۔ جیسا کہ پروفیسر ڈارمسٹے ٹر نے لکھا ہے کہ "موجودہ علمی تحقیق و تفتیش کا شوق ایک نقطہ سے شروع ہوا لیکن دو نتیجوں پر پہنچا ایک یہ کہ پارسی مذہب ان دو اجزا میں سے ایک ہے، جن سے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنا مذہب شروع کیا اور دوسری بات یہ کہ ہندوستان اور ایران کے جتنے قدیم مذاہب تھے ان سب کا ایک ہی منبع تھا۔"

بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ زنداویستا کے متعلق انکیوتیل دو پیرن کے کام نے تمام فضلاء یورپ کو ہندوستانی زبانوں اور ہندوستانی علوم کی طرف متوجہ کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ شئے تھی جسنے ولیم جونس کو بھی ہندوستان کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے سوچا کہ ہندوستان میں چلکر مزید معلومات نہ صرف اپنی مخصوص لائن فارسی و عربی میں حاصل کرنی چاہئیں بلکہ ہندوستانی علوم اور زبانوں پر بھی دسترس حاصل کرنا چاہئے۔ یہ بات کہ ولیم جونس کے ہندوستان میں آنیکی غرض تحصیل علم تھی، اس امر سے بھی ثابت ہوتی ہو کہ کلکتہ میں قدم رکھتے

---

۵ ایضاً صفحہ ۱۷

۵ ایضاً

ہی انہوں نے سب سے پہلے ایک علمی سوسائٹی کے قائم کرنے کا سوال اٹھایا۔

یہ تو انکوئیتل دو پیرون کا ہندوستان کی تحقیقات علمی پر بالواسطہ اثر تھا لیکن براہ راست اثر کے متعلق انکی زنداویستا کی پہلی جلد کا ذکر کافی ہے۔ یہ ضخامت میں ۸۰۰ صفحوں سے زیادہ ہوگی اور اسمیں[1] ایران اور ایرانیوں سے زیادہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے متعلق ذکر ہے۔ مجھے اتفاق سے اسکی تینوں جلدیں کولمبو میں ہاتھ آگئیں جو خود انکوئیتل کے خاص اپنے کتب خانہ کی تھیں اور جنمیں انہوں نے حاشیہ پر مزید تعلیقات کا اضافہ کیا ہے اور بعض خطوط بھی اسکے ساتھ منسلک کردیئے ہیں۔ جو مستشرقین یورپ نے انکے پاس لکھے تھے ان تعلیقات اور خطوط کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انکی تصانیف نے کسقدر تمام فضلائے یورپ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

علاوہ اس کے دیگر تصانیف مثلاً (Legislation Orientale) مطبوعہ ۱۷۷۸ء اور (Recherches Historiques et Geographiques sur L'Inde) مطبوعہ ۱۷۸۶ء نے بھی مغربی فضلا کو ہندوستان کی طرف متوجہ کیا تھا لیکن انکا سب سے بڑا علمی کارنامہ اپنیشد (Oupnekhat) ہے۔ انکوئیتل نے اپنشد کا مطالعہ اصل سے نہیں کیا تھا بلکہ فارسی ترجمہ سے کیا تھا۔ اپنشد ان سنسکرت تصانیف میں سے ہیں جو سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں فارسی میں ترجمہ ہوگئیں تھیں۔ ۱۸۰۱ء میں انہوں نے اس فارسی ترجمہ سے ایک لاطینی ترجمہ شائع کیا۔ یہ ترجمہ اس جرمن فلسفی شوپن ہار (۱۷۸۸ء۔ ۱۸۶۰ء) کے لئے بہت مفید ثابت ہوا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اسکی تعلیمات سے بہت متاثر تھا۔ اسکا بیان ہے کہ "دنیا میں کسی کتاب کا مطالعہ اسقدر مفید اور دلچسپ نہیں جتنا اپنشد کا ہے۔ یہ ہمیشہ میری زندگی کی مونس رہی ہے اور یہی میری موت کی بھی مونس رہیگی"[2]۔ انکوئیتل نے اپنا مقدمہ ایسے الفاظ پر ختم کیا جن سے ہندوستان کے فضلا کی توجہ بھی اسطرف مبذول ہوئی وہ لکھتا ہے "ہندوستان ایک ایسا زرخیز ملک ہے کہ جہاں ایک حقیقی فاضل اور ایک معمولی جویائے علم دونوں کے تلاش و تحقیق کے لئے ہمیشہ اتنا

[1] ملاحظہ ہو رسالہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۲۲ ص ۲۱۳

[2] ملاحظہ ہو "ہندو اور عیسائی مذہب میں مطابقت کا طریقہ" اردو ۔۔۔ ص ۵

کافی مواد مل سکتا ہے جو مفید بھی ہوتا ہے اور دلچسپ بھی۔ اس طرح اینکوئیتل دو پیرون نے اپنے قول اور اپنے فعل دونوں سے مغربی فضلا کی توجہ ہندوستان کیطرف مبذول کی اور اس طرح گویا اس نے ہندوستانی علوم کے دوبارہ احیا میں ایک بہت بڑا حصہ لیا۔ بہرحال اینکوئیتل دو پیرون اور ولیم جونس دونو ہماری قدر و منزلت کے برابر مستحق ہیں۔

ان دو فضلا کے محققانہ کاموں کے بعد جنمیں سے ایک انگریز تھا اور دوسرا فرانسیسی، یورپ میں مشرقی علوم و ادب کا باقاعدہ مطالعہ ہونے لگا انگلستان اور فرانس کے ساتھ جرمنی نے بھی شرکت کی اور وہاں ایک نئی طرز کی تحریک شروع ہوئی جسے "مشرقی تحریک" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں میں ہندوستانی فضلا کی توجہ ڈاکٹر ایف جی۔ ریمی[۱] کی ایک نہایت دلچسپ اور مفید کتاب کیطرف مبذول کرانی چاہتا ہوں جسکا نام ہے "ہندوستان اور ایران کا اثر جرمنی کی شاعری پر"۔ جیسا کہ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے، اس تحریک مشرقی کا رُخ ایرانی اور ہندوستانی دونو ادبیات کیطرف تھا۔ اسی زمانہ میں شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان اور حافظ شیرازی کے کلام کو یورپ میں مقبولیت حاصل ہوئی اسی طرح سنسکرت میں "اپنیشد" اور "بھگوت گیتا" پر بھی توجہ کیجانے لگی۔ ان تمام شعرا میں سے جنہوں نے مشرقی علوم و ادب کے بعض جواہرات کو یورپ سے آشنا کیا، ہم پارسیوں کو گوئٹے کے ساتھ ایک خاص دلچسپی ہے جو بجا طور پر جرمن زبان کا حافظ کہا جاتا ہے۔ اس دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے دیوان میں جو "مغربی مشرقی دیوان" کے نام سے موسوم ہے اور جو اس نے حافظ شیرازی کے طرز پر لکھا ہے، اسمیں اس نے ایک خاص حصہ "پارسی نامہ" کے نام سے رکھا[۲] کہا جاتا ہے کہ فریڈرک شلیگل اور آگسٹ ولہم شلیگل کا زمانہ جو دونوں آپسمیں بھائی تھے،

۱ "کولمبیا یونیورسٹی جرمینک اسٹڈیز" جلد اول نمبر ۲ (سنہ ۱۹۱۰ع)

۲ دیکھو میرا مضمون "گوئٹے کا پارسی نامہ" (رسالہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۱۴ صفحہ ۹۵-۱۰۶) دیکھو میری تصنیف حصہ دوم صفحہ ۱۲۰-۱۱۹ - دیکھو میرا مضمون "حافظ اور گوئٹے" جو دوسری اورینٹل کانفرنس کی کارروائیوں میں صفحہ ۶۰۶-۶۰۱ پر ملیگا۔

یہی زمانہ ہے جبکہ جرمنی میں سنسکرت فلسفہ کی ابتدا ہوئی انگریزوں کے تدبر و سیاست نے ہندوستان کو مادی حیثیت سے فتح کیا لیکن جرمنی کی علمی تحقیق و تلاش نے اس ملک پر روحانی اعتبار سے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا"[1] فریڈرک شلیگل کی کتاب "عقل ہندی" کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کے ذریعہ مہابھارت، رامائن اور منو کے بعض مقالات کو جرمن زبان بولنے والوں میں معروف کرایا۔ جرمنی کے بعد ڈنمارک اور پھر دوسرے ممالک نے بھی یکے بعد دیگرے اس تحریک میں حصہ لیا۔

ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی مشرق یونہی مغرب کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہیگا۔ لیکن ملکی فتوحات کی خاطر نہیں، جیسا کہ اس نے پچھلے زمانہ میں کیا ہے۔ بلکہ باہم دماغی اور روحانی مفاد کی غرض سے۔ اس سلسلہ میں مجھے پیرس کی "انجمن ایشیا" (Societe Asiatique) کی کارروائی یاد آگئی جسنے اپنی صدسالہ سالگرہ ابھی چار سال قبل منائی ہے۔ اسمیں مجھے دو مغربی فضلا کے یہ خیالات پڑھکر بیحد خوشی ہوئی جو انہوں نے ہمارے ملک کے متعلق یہاں کی سیر و سیاحت کرنیکے بعد ظاہر کئے ہیں۔ پروفیسر لانین جو امریکہ کے ایک فاضل ہیں فرماتے ہیں کہ مشرق نے جو باتیں مغرب کو سکھائی ہیں وہ یہ ہیں (ا) سادہ زندگی بسر کرنا (ب) خواہشات میں اعتدال قائم رکھنا (ج) دماغی سکون پیدا کرنا (د) اور سب سے بڑھکر تلاش حق اور ہر شے میں خدا کا جلوہ دیکھنے کا شوق پیدا کرنا۔ ڈاکٹر ایف ڈبلو ٹامس نے جو انگلستان کے ایک فاضل ہیں یہ بیان کیا کہ[2] "ایشیا میں اہل یورپ کے لئے بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے ماضی کے رازہائے سربستہ کو پاسکیں . . . انسانوں کے گذر جانے کے بعد بھی جو نقش قدم باقی رہ جاتے ہیں، وہ ایسے ہی پختہ ہوتے ہیں جیسے قوانین قدرت کے اثرات اٹل ہوتے ہیں" خدا کرے یہ ایسا ہی ہو اور اس قسم کے جذبات و خیالات مشرق و مغرب کو باہم اور زیادہ متحد کرتے رہیں۔

---

[1] دیکھو ڈاکٹر رمی کی کتاب "ہندوستان اور ایران کا اثر جرمن شاعری پر" صفحہ ۳۰

[2] ایضاً صفحہ ۱۹ و ۲۰

علوم مشرقیہ کے مطالعہ کے ماضی پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد آیئے ذرا اسکے مستقبل پر ایک نظر ڈالنے چلیں ہمیں تو اسکا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے۔ گذشتہ چند سال کے عرصہ میں بھارت یعنی پونہ میں "بھنڈارکر اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ"، بمبئی میں "کے۔ آر کاما اورینٹل انسٹی ٹیوٹ"، پٹنہ میں "بہار واڑیسہ ریسرچ سوسائٹی"، اور بنگلور میں "متھیک سوسائٹی" قایم ہوئی ہے۔ ان انجمنوں اور انکے علاوہ دوسری جماعتوں[1] کے کام علوم مشرقیہ کی آئندہ ترقی و بقا کے لئے کافی ضمانت ہیں جس طرح کہ زمانہ حال کا دارومدار ماضی پر ہوتا ہے اسی طرح مستقبل کا انحصار بھی حال پر ہوتا ہے آیئے مستقبل کو ڈھونڈیں اور نہ صرف وہی جو ہم نے ماضی سے پایا ہے بلکہ اسمیں اور اضافہ بھی کریں۔

اس سلسلہ میں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ چند باتیں مہابھارت کے اس کام کے متعلق بھی عرض کردوں جسے پونہ کے بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۱۰ء سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ مہابھارت کے کام کا ذمہ لینا حقیقت میں ایک بڑے اہم کام کا بیڑہ اٹھانا ہے۔ پروفیسر میکس میولر نے ایکبار کہا تھا کہ "مجھے امید ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جبکہ ہر تعلیمیافتہ ہندوستانی اپنی مہابھارت اور رامائن پر اسی طرح فخر کریگا جس طرح جرمن لوگ اپنی کتاب "نیبے لنگے" پر اور یونانی حتی کہ موجودہ اہل یونان بھی اپنے ہومر پر کرتے ہیں"۔ میکس میولر کے اس سلسلہ میں ہومر کا ذکر کردینے سے مجھے ایک بات اور یاد آگئی اور وہ یہ کہ مہابھارت کو مغربی دنیا پہلی صدی عیسوی کے بعد ہی سے جانتی ہے۔ ڈیوکریسٹوموس جو پہلی صدی عیسوی میں (تقریباً ۵۰ء سے لیکر ۱۱۷ء تک) ایک مصنف گذرا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے مہابھارت کا ذکر اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے[2]، "کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں میں بھی ہومر کی نظمیں پڑھی جاتی ہیں جنکو انہوں نے اپنی بول چال

[1] افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے ان علمی انجمنوں کا تفصیل سے ذکر نہیں کیا، جو اسلامی علوم وادبیات کی تحقیق و تفتیش کا کام کر رہی ہیں۔ ان میں دائرۃ المعارف حیدر آباد، دار المصنفین اعظم گڑھ اور انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کسی طرح مذکورۃ الصدر انجمنوں سے کم حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ مترجم

[2] ڈاکٹر جے آگیلنگ کا مضمون سنسکرت پر (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲۱ صفحہ ۲۰۱ ایڈیشن نہم)

میں ترجمہ کر لیا ہے۔ وہ آگے چلکر لکھتا ہے کہ "ہندوستانی ہومر کے مصائب، اینڈرو میکے اور ہیکوبا کے نالۂ و فریاد اور اچلیس اور ہیکڑ کی شجاعت و بہادری سے خوب واقف تھے" علاوہ اس کے فیلاسٹریٹس جو ایک بہت بڑا یونانی منطقی گزرا ہے (سن پیدائش سنہء یا سنہء) اور جس نے تیانا کے اپولونیس کی سوانحعمری بھی لکھی ہے اسکے متعلق مشہور ہے کہ اس نے کہیں یہ لکھا ہے کہ آیار کسس نامی ہندوستانی ہو (غالبًا ویاس سے مراد ہوگی) ہومر کی تصانیف سے واقف تھا۔ یہ اپولونیس گویا ایک یونانی جوگی تھا جسے شراب اور گوشت سے بہت پرہیز تھا اور وہ معمولی سادے کپڑے پہنتا، ننگے پاؤں چلتا سر پر لمبے لمبے بال رکھتا اور کھری زمین پر بغیر بستر کے سوتا تھا کہا جاتا ہے کہ اس نے ایران اور ہندوستان کی خوب سیر کی تھی

پونہ میں جس طرح کا علمی ادارت (اڈیٹوریل بورڈ) بنایا گیا ہے اسی طرح کا ایک علمی ادارت آج سے تین سو برس پیشتر شہنشاہ اکبر نے بھی مہابھارت کی تالیف و ترجمہ کے لئے قائم کیا تھا۔ اس دور اندیش بادشاہ کا خیال کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا میکس میولر نے ظاہر کیا ہے یعنی یہ کہ تمام ہندوستانیوں کو مہابھارت پر فخر کرنا چاہیئے اور اسکے متعلق ہر شخص کو کچھ نہ کچھ واقفیت رکھنی چاہیئے۔ چنانچہ اس کی کوشش یہ تھی کہ مہابھارت کے مضامین تمام فارسی بولنے والے لوگوں تک پہنچ جائیں۔ ابوالفضل اور بدایونی نہایت تفصیل کیسا تھ اکبر کے اس شوق کا ذکر کرتے ہیں جو اسے ہندوؤں کی اس اہم کتاب کے متعلق تھا اور جسکا نام اس نے "رزم نامہ" رکھا تھا۔ ابوالفضل نے ہندوستان کے علوم و فنون کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے انہوں نے یہاں کے فلسفہ کے نوؤں مذاہب کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے۔ غرض ہم کو ابوالفضل کی "آئین اکبری" اور بدایونی کی کتاب "منتخب التواریخ" سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کرنے کیلئے ایک علمی ادارت تیار کیا تھا جس میں یہ اشخاص شریک تھے:۔ نقیب خاں، مولانا عبدالقادر بدایونی، شیخ

سلطان تھانیسری، ملا شیری، اور شیخ فیضی ۔ ترجمہ کا پورا کام ان اشخاص میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام خود یہ بیدار مغز بادشاہ انجام دیتا تھا ۔ ان میں سے ایک کے سوا کوئی بھی ایسا نہ تھا جو کبھی طرح سنسکرت جانتا ہو ۔ لہذا انکی امداد کے لئے انھیں لائق پنڈت دیئے گئے ۔ یہ پنڈت سنسکرت کی عبارت کو سمجھاتے جاتے اور یہ اسکا ترجمہ کرتے جاتے تھے بعض وقت اکبر خود بول اٹھتا اور بتاتا کہ ان پنڈتوں کے مفہوم کو فارسی میں بہتر طریقہ پر کس طرح ادا کرنا چاہیئے ۔ وہ اس اہم کام میں کم سے کم چار سال برابر لگے رہے جس کے متعلق ان ارکان میں سے ایک کا بیان ہے کہ ،، حرف وہ ہزار سالہ را بزبان حال موافق میسازم ،،

شہنشاہ اکبر کی اس کوشش کے متعلق میں نے یہاں اسقدر تفصیل کے ساتھ اس وجہ سے ذکر کیا ہے، تاکہ میں اس بڑے کام کے لئے جسے اکبر اور میکس میولر جیسی دو بڑی شخصیتوں نے اسقدر سراہا ہے آپ سے بھی اپیل کروں ایرانی فضلا بھی مہا بھارت سے بہت کچھ دلچسپی رکھتے ہیں اسوجہ سے کہ اسکے بعض واقعات شاہنامہ سے ملتے جلتے ہیں ۔ انکی شاہنامہ گویا ایران کی مہابھارت ہے کہا جاتا ہے کہ اکبر کی توجہ مہابھارت کی طرف اسوقت سے منعطف ہوئی جبکہ وہ جاننے والوں سے شاہنامہ سنا کرتے تھے ۔

مہابھارت کے لئے آپ سے اپیل کرنے کے بعد میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ایک عام مسئلہ کی طرف توجہ دلاؤں جو آئندہ چلکر اس سے زیادہ توجہ کا متقاضی ہوگا ۔ میں یہ گزارش کرنی چاہتا ہوں کہ ہم کو اپنے تمام علمی کاموں میں اس بات کا خاص لحاظ رکھنا چاہیئے جسے ،، فراخ نظری ،، کہہ سکتے ہیں ۔ آج کل ہم علوم مشرقیہ میں خاص مضامین، خاص لائنیں اور خاص شعبوں کا ذکر کرتے ہیں ۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمکو اپنے خاص شعبوں پر مختلف سمتوں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ میں جانتا ہوں کہ بعض اہل علم کسی حد تک ایسا کرتے رہے ہیں لیکن ہمکو ایسا زیادہ سے زیادہ کرنیکی کوشش کرنی چاہیئے کسی نے بہت خوب کہا ہے کہ ،، جو شخص صرف اپنے مذہب سے واقفیت رکھتا ہے، وہ اس سے

اچھی طرح واقف نہیں۔ جو شخص صرف اپنے ملک سے واقفیت رکھتا ہے، وہ اس سے اچھی طرح واقف نہیں۔ یہ اسی طرح ایک مخصوص مضمون سے اچھی طرح واقفیت رکھنے کے لئے ضرورت ہے کہ ایک شخص فراخ نظر رکھے اور دوسرے ذرائع سے بھی اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرے۔ اسے صرف علوم مشرقیہ کی قریبی شاخوں سے اس پر نظر نہ ڈالنی چاہئے بلکہ اسے دوسرے علوم وفنون کا علم بھی ضرور حاصل کرنا چاہئے۔

مثال کے لئے میں آپ کی توجہ ہندوستان میں ایرانیوں کے مسئلہ کی طرف مبذول کرانی چاہتا ہوں۔ ہم ہندوستانی تصانیف کے ذریعہ یہ جانتے ہیں اور میرے ہندو بھائی مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ ہندوستان ایران سے ایک زمانہ دراز سے واقف ہے۔ دوسری طرف ہمیں ایرانی کتابوں بالخصوص اوستا کے ذریعہ بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران ہندوستان کو ایک قدیم زمانہ سے جانتا ہے۔ یہ بخوبی معلوم ہے کہ دارائے اعظم کے زمانہ سے جس کی بارہ ریاستوں میں تین ہندوستان۔ اور اس کی سرحدوں سے تعلق رکھتی تھیں، قدیم ایرانیوں کو ہندوستان کے ساتھ ایک گہرا تعلق تھا۔ بعض مشہور اسلامی مورخین جنہیں فرشتہ سے ہم سب زیادہ واقف ہیں اور جس نے سب سے زیادہ ہندوستان کے حالات لکھے ہیں، وہ اس تعلق کو دارا سے پہلے کا بھی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایرانیوں کو ہندوستان سے پیش دادی اور کیانی خاندانوں تک کے زمانہ سے سابقہ رہا ہے۔ اس زمانہ کو لیجئے تو ہمیں ڈاکٹر اسپونر سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں اور جو اپنے پاٹلی پتر کی تحقیقات کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ ایران کا بہت قدیم زمانہ سے ہندوستان کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ انکی بعض رایوں کو لوگوں نے بہت ہی عجیب وغریب اور ضرورت سے زیادہ سمجھا لیکن آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ہندوستانی فضلا ان سے بھی بازی لیجانا چاہتے ہیں میرا خیال ہے کہ پورے مسئلہ پر اب بھی مزید تحقیق وتفتیش کی ضرورت ہے۔

اوپر میں نے بتایا ہے کہ مغرب کو کچھ نہ کچھ علم مہابھارت کا قدیم زمانہ یعنی پہلی صدی عیسوی سے رہا ہے۔ لیکن ہندوستان سے اسے کس چیز نے واقف کیا؟ یہ ایران تھا جو مغرب اور ہندوستان

سکے درمیان ایک واسطہ تھا خود ایران کی ادبیات میں بعض واقعات ایسے ہیں جو مہابھارت اور رامائن سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً مہابھارت میں جو دھشٹر کے تخت و تاج سے دست بردار ہونے کا واقعہ بالکل شاہنامہ میں کیخسرو کے عزل سلطنت کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے۔ یہ دونوں واقعات پزارک بونانی کے واقعہ دست برداری سے مشابہ نظر آتے ہیں جنکا ذکر عبرانی مصنفین نے کیا ہے۔ علاوہ اس کے جیسا کہ بیلونجی پی ڈیسائی نے بتایا ہے کہ سیتا اور راون کا جو قصہ رامائن میں ہے وہ بالکل شاہنامہ کے ہومائی، بہ آفرید اور ارجاسپ کے قصہ سے مشابہ ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ایران کو ہندوستان کے ساتھ بہت گہرے تعلقات رہے ہیں لہذا ہندوستانی طلبہ کو ایرانی علوم و ادبیات اور فلسفہ و مذہب کا مطالعہ اور وسیع پیمانہ پر کرنا چاہیئے۔ مذہب کے معاملہ میں میں اپنے ہندو بھائیوں کی توجہ ایک پارسی عالم مسٹر شاپورجی کاوس جی ہودی والا کی تصنیف "ہندی ایرانی مذہب" کی طرف مبذول کراؤں گا جس پر آنریبل مسٹر سچیانند سنہا نے ایک مقدمہ لکھا ہے اگر بعض فضلا قدیم پارسیوں کی تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو میں انکو ایک نہایت لائق پارسی فاضل کی تصنیف کیطرف توجہ دلاؤں گا جو سنسکرت زبان نہایت اچھی طرح جانتے تھے، یہ ارد اوشر یارجی دادابھائی بھروچہ آنجہانی ہیں۔ انہوں نے بمبئی کی پارسی پنچایت نامی ایک مجلس کی ماتحتی میں جس کی خدمت کا فخر مجھے گزشتہ ساڑھے تینتیس سال سے حاصل ہے، سات جلدوں میں ایک سلسلہ تیار کیا ہے جسکا نام "پارسیوں کی سنسکرت تصانیف" ہے۔ ان میں سے پانچ جلدیں تو چھپ چکی ہیں اور دو چھپنے کو باقی ہیں۔ اس سلسلہ سے ہمارے ہندوستانی فضلا کو اپنے ایرانی بھائیوں کے مذہب و ادبیات کا کسی قدر علم ہو سکے گا۔

ایرانیوں کے مسئلہ کے بعد ہندوستان میں جن قوم کا مسئلہ ہے میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ پر اور زیادہ توجہ کرنیکی ضرورت ہے اس لئے کہ اس سے ہندوستان کی قدیم تاریخ پر بہت کچھ روشنی

سلہ دیکھو پروفیسر ڈارمسٹےٹر کا مضمون "مہابھارت اور شاہنامہ میں مشابہت"، مطبوعہ جرنل ایشیاٹک ۱۸۸۷ء
دیکھو میرا مضمون "گزشتہ سو سال کے اندر بنگال رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کام پر نظر ایک پارسی نقطہ نگاہ سے" مطبوعہ رسالہ سوسائٹی مذکور صد سالہ جلد صفحہ ۹۹-۹۷

چڑھنے کی توقع ہے۔ یہ ہن لوگ ایک عرصہ تک ایران اور ہندوستان دونوں کے دشمن رہے ہم جانتے ہیں کہ وشنو پران[۵۱] میں انکا دو بار اور کالیداس کے رگھوونش[۵۲] میں ایکبار ذکر آیا ہے۔ تاریخ میں انکا جو ذکر آتا ہے وہ سب سے پہلے سکند گپتا کے "ستون فتح" پر ملتا ہے جو ضلع غازی پور کے موضع بھیتری میں ہے۔ اور بالواسطہ انکا ذکر ان کتبات کے آخری حصہ میں آتا ہے جو گرنار کی خوبصورت پہاڑیوں میں ایک بہت بڑی چٹان پر کھدے ہوئے ہیں ہندوستان کی قدیم ادبیات کے بعد کے کتبوں میں انکا ذکر آنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں انکا ہندوستان کے مختلف حصوں پر نہایت گہرا تسلط رہا ہے دوسرے ذرائع سے ہم یہ جانتے ہیں کہ ایک زمانہ میں وہ حدود چین سے لیکر مغرب میں فرانس کی سرحد تک پھیلے ہوئے تھے۔ تقریباً دو ہزار برس تک انکی سلطنت نہایت شان کے ساتھ رہی ہے مختلف زمانوں میں وہ نہ صرف چین، ہندوستان اور ایران تک پہنچے ہیں بلکہ انہوں نے اٹلی اور فرانس کے بھی دروازے کھٹکھٹائے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ وہ کون بادشاہ تھا جسنے ہن لوگوں کو شکست دی اور ہندوستان سے بھگایا؟ آیا یہ سکند گپت تھا یا یشو دہرم؟ ہر دو جانب بڑے بڑے فضلا اپنے دلائل و براہین پیش کرتے ہیں مثلاً منوہن چکرورتی ایک طرف ہے اور دوسری طرف پروفیسر پھاٹک اور ڈاکٹر ہورنلے وغیرہ ہیں اور دونو فریق ایرانی تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں ہن کی قدیم تاریخ پر میں نے جو مضمون لکھا ہے اسمیں میں نے اس مسئلہ پر بہ تفصیل اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ یہ یشو دہرم تھا جس نے ہن لوگوں کو بھگایا۔ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ پر کس طرح ایک اور جانب سے روشنی پڑ سکتی ہے۔ انکی تاریخ کے علاوہ انکا مذہب

---

۵۱ وشنو پران مترجمہ ایچ۔ ایچ ولسن مطبوعہ ۱۸۴۰ء صفحہ ۱۹۴ و ۱۷۷

۵۲ "رگھوونش" مولفہ کاشی ناتھ پانڈورنگ پربا طبع دوم مطبوعہ ۱۸۹۲ء صفحہ ۸۹ نیز "رگھوونش" مترجمہ پی ڈی لیسی جانسن مطبوعہ ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۸ - ۱۶۹، ۳۴، ۱۱

۵۳ ایضاً

بھی قابل مطالعہ ہے۔ میرے خیال کے مطابق ہن لوگ زیادہ تر مازندیقی فرقے سے تعلق رکھتے تھے انکا مذہب اور قدیم پارسیوں کا مذہب بالکل یکساں تھا اس سے اس مسئلہ کا حل بھی مل جاتا ہے جو کشمیری راجا ترنگنی میں مذکور ہے اور وہ یہ کہ مہرکل جیسے بیتھو و مہرم نے ہندوستان سے بھگایا اس نے کشمیری برہمنوں کو اس وجہ سے ناراض کر دیا تھا کہ وہ اپنے ہمراہ مغرب سے کچھ برہمن لایا تھا۔ یہ برہمن زرد اشتری مذہب رکھتے تھے اور انہی کے وہ ہن بھی مقلد تھے۔

جس چیز نے مجھے ہندوستان میں ہن لوگوں کے مسئلہ کیطرف متوجہ کیا وہ یہ بات ہے کہ بعض لوگ اب یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ ایک قوم جو راجپوتانہ میں رہتی ہے اور جسے میر (بہ یائے مجہول) کہتے ہیں وہ ان قدیم ہن لوگوں کی نسل سے ہے جنہوں نے پانچویں صدی میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ میں آپکی توجہ کرنل جان ہاسکن کے ایک نہایت دلچسپ مضمون کیطرف مبذول کرانی چاہتا ہوں، جو "انڈین اینٹی کویری" کے جون ۱۹۲۲ء میں چھپا ہے۔ ہاسکن صاحب میرواڑہ کے ان میر (بہ یائے مجہول) لوگوں کو "راجپوتانہ کے کوہستانی علاقہ کے باشندے" بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "وہ صوبہ کے وسطی پہاڑی علاقہ کے ایک تنگ حصہ میں رہتے تھے انہوں نے اپنے گرد و پیش کی تمام راجپوت ریاستوں کے حملے سے اپنی آزادی کو ہمیشہ محفوظ رکھا ہے۔ انمیں ہمیشہ سے ایک آزادانہ اور بہادرانہ جرات و ہمت رہی ہے اور یہی چیز انہیں ہمیشہ اپنے قرب و جوار کے قبائل سے ممتاز رکھتی تھی جو دوسروں کے غلام اور زمین کے جوتنے والے رہے ہیں۔ انگریزوں کے آنے سے صدیوں پہلے یہ لوگ اراوتی کی پہاڑیوں میں نہ صرف دشمنوں کے حملوں کی مدافعت کرتے رہے بلکہ ان دشمنوں پر خود بھی حملے کیا کرتے تھے جو انکو محکوم بنانے کی کوشش کرتے۔" اس کے بعد کرنل ہاسکن انکے ہندوستان میں آنیکا ذکر کرتے ہیں جو انکے خیال کے مطابق پانچویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے جبکہ ایران کی ساسانی سلطنت پر سفید ہن لوگوں یا ایتھلائٹ نے حملہ کیا تھا اور ان وسط ایشیا کی قوموں میں ایک اضطراب و بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔" اس کے بعد بقول انکے "ایران کے شمالی خطوں میں ایک ہیجان پیدا ہوا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کا ایک عظیم الشان سیلاب مشرق و جنوب کیجانب ہندوستان کے سرحد کی

طرف بڑھا ۔ میرا خیال ہے کہ مغربی ایران کی طرف سے یہ سیلاب خاص ایرانیوں کا نہ تھا بلکہ ایرانی جن لوگوں کا تھا جو کبھی سلاطین ایران کے حلقہ بگوش تھے ۔ اور کبھی انکے ساتھ حلیف یا حریف ہو کر بھی رہے ۔ انہوں نے ان پروہتوں کے متعلق جو مغربی ایرانیوں کے ہمراہ آئے اور جنہیں ماگھ کہتے ہیں یہ بتایا ہے کہ " ان پر مہر کل کی خاص نظر عنایت تھی " جس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یقیناً جن تھے ۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں جن قوم کا مسئلہ بھی بہت زیادہ مطالعہ و توجہ کے قابل ہے ۔

انکے علاوہ بعض اور بہت سے معاشرتی مسایل بھی ہیں ۔ جنہیں ہم خالص ہندوستانی یا مقامی زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں ۔ ان پر بھی ایک وسیع نقطہ خیال سے نظر ڈالی جا سکتی ہے ۔ مثال کے طور پر (۱) ستی (۲) ممانعت شادی بیوگان یا (۳) باہم شادی بیاہ کا مسئلہ لیجئے ان مسائل پر محدود نقطہ خیال یا صرف مقامی ذرائع معلومات سے نظر و بحث نہ کرنی چاہئے بلکہ ان معاملات میں ذرا اور وسعت نظر سے کام لینا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ آریائی قوم کی اور دوسری شاخوں میں کیا رسوم جاری تھیں ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی اور ایرانی آریائی مرکز کی دو بڑی شاخیں ہیں ۔ بہت ممکن ہے کہ ان شاخوں کے مذہبی ادبیات اور رسوم و عادات سے ہندوستان کی معاشرتی عادات و رسوم پر روشنی پڑتی ہو ۔ مثلاً جرمنی ، آریائی یا ہندی یورپی مرکز سے تعلق رکھنے کی بنا پر بقول گبن کے ایرانیوں اور ہندوستانیوں سے اسی طرح ایک " خانگی تعلق " رکھتا ہے جس طرح اہل برطانیہ سے ۔ گبن صاحب لکھتے ہیں کہ " یورپ جدید کی تمام مہذب ترین قومیں جرمنی کے جنگلوں سے نکلی ہیں اور ان نیم متمدن لوگوں کی غیر ترقی یافتہ اداره گاہوں میں اب بھی ہم اپنے قوانین و رسوم کی اصل اصول تلاش کر سکتے ہیں " ۔ اسی طرح ڈاکٹر جان ایکن صاحب فرماتے ہیں کہ " دنیا کے متمدن ترین حصوں کے رسوم و قوانین اور نظم و نسق حکومت کی ابتدا جرمنی کے جنگلوں اور بیابانوں سے ہوئی ہے "

اگر گبن کے قول کے مطابق قدیم جرمنوں کی معاشرتی زندگی کے مطالعہ سے موجودہ یورپ

سکے رسوم و عادات پر روشنی پڑ سکتی ہے یا بخیال ڈاکٹر ایکن دنیا[1] کے متمدن ترین حصوں سکے آئین و قوانین حکومت کا پتہ چل سکتا ہے تو بلا شبہ اسکا مطالعہ ہم ہندی آریوں کے معاشرتی مسائل پر بھی کچھ نہ کچھ روشنی ڈال سکتا ہے، جن کے آبا و اجداد ایک ہی تھے اور جو کبھی ایک ہی جگہ رہا سہا کرتے تھے ہم جانتے ہیں کہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن سے ہندی آریوں کا تعلق جرمن لوگوں سے ثابت ہو سکتا ہے مثلاً (۱) انکی قدیم زبان ہماری آریائی زبانوں کے مرکز سے تعلق رکھتی ہے (ب) انکے قبیلہ یا جماعت کا نظام ہمارے قدیم ہندی آریائی نظام سے ملتا جلتا ہے (ج) انکے قبائل کا باہمی معاملہ بہت کچھ ہمارے گاؤں کی پنچایت سے مشابہ ہے (د) اگرچہ انکی تاریخ کا ایران یا ہندوستان سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے پھر بھی ہم جانتے ہیں کہ وہ رومی و ایرانی جنگوں میں رومیوں کے ساتھ ہو کر لڑے (ہ) انہیں بھی انہی ہن لوگوں سے سابقہ پڑا اور انکے ہاتھوں مصیبتیں اٹھانی پڑیں جنہوں نے ایران و ہندوستان پر حملے کئے تھے۔ ایسی حالتیں قدیم جرمن لوگوں کی معاشرتی زندگی کے مطالعہ ہندوستان کے مذکورۃ الصدر مسائل پر روشنی پڑنی لازمی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم جرمن لوگوں میں (۱) شادی بیوگان کا دستور نہ تھا۔ عورتیں صرف ایک خاوند کرتی تھیں اور وہی گویا "ایک قالب اور ایک[2] جان" ہوتا تھا (۲) اکثر بیوائیں اپنے کو ستی بھی کر ڈالتی[3] تھیں اور وہ اپنے شوہروں کی لاش پر خود کو زندہ جلا ڈالتی تھیں (۳) انہیں باہم شادی بیاہ کرنے کیلئے کچھ پابندیاں عاید تھیں۔ ٹیسی ٹس لکھتا ہے کہ "میں ان لوگوں کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جرمنوں نے کبھی دوسری قوموں سے شادی بیاہ نہیں کی بلکہ ایک خالص اور غیر مخلوط نسل رہے جنکا ہمیشہ ایک ممتاز کیرکٹر[4] قایم رہا"، صرف غیر قوموں ہی کے ساتھ شادی بیاہ

---

[1] "جرمنی کے باشندے اور وہاں کے عادات و رسوم" مصنفہ کارنیلیس ٹیسی ٹس (ترجمہ جان ایکن) کا مقدمہ صفحہ ۹ مطبوعہ [illegible]

[2] ایضاً صفحہ ۵۲ [3] ایضاً

[4] مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو میرا مضمون "جرمنی کے قدیم باشندے" ص ۲۰۸۔ جون [illegible] کو بمبئی کی اینتھراپولوجیکل سوسائٹی میں پڑھا گیا۔

منع تھا یا مختلف مذاہب کے لوگوں میں باہم شادی بیاہ نہیں ہوتا تھا۔

محققین اس مسئلہ پر برابر بحث کرتے رہے ہیں کہ آیا یہ رسم قدیم ہے یا بعد کی بدعت ہے۔ ہندوستانی محققین کا خیال ہے کہ یہ ایک پرانی رسم ہے لیکن ڈاکٹر ایگلنگ نے برہمنوں کے مذہب پر جو مضمون لکھا ہے اسمیں وہ لکھتے ہیں کہ یہ رسم "معلوم ہوتا ہے کہ کشتریوں کی ایک مقامی رسم سے پیدا ہوئی" اور اسکے بعد "برہمنوں نے اس پر اپنی مہرتصدیق لگا دی" وہ فرماتے ہیں کہ "ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں اس کے ذکر کا حوالہ دینا دراصل رگ وید کی اگر عملاً تحریف نہیں تو تمامتر ایک غلط عبارت پر مبنی ہے"۱؎ اب نہ صرف قدیم جرمن لوگوں کی بلکہ دوسرے ملکوں کی ادبیات وتاریخ کے وسیع مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ یہ رسم نہ صرف ہندوستان ہی میں جاری تھی بلکہ آریائی نسل کی بعض دوسری شاخوں میں پائی جاتی ہے۔ ڈیوڈورس سیکولس جیسے قدیم مصنفین کی تحریروں سے جو پہلی صدی عیسوی میں تھے اور جنہوں نے ایشیا وغیرہ کا سفر بھی کیا ہے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ رسم ہندوستان میں سن عیسوی سے قبل بھی موجود تھی۔ یہ اس وقت بھی پائی جاتی ہے جب اسکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ ہیروڈوٹس (یونانی مورخ ہے) کے لکھنے کے مطابق یہ قدیم تھریس کے لوگوں میں بھی جاری تھی اینگلو سیکسن (انگلستان کے قدیم باشندے جو نارمن لوگوں سے پہلے تھے) لوگوں میں اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ مغرب میں یہ ناروے اور سویڈن تک میں، مشرق میں چین میں اور جنوب میں مصر میں بھی یہ رسم پائی جاتی ہے۔ دوسری قوموں کی ادبیات وتاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلاشبہ ہندوستان کی ایک قدیم رسم ہے۲؎۔ پروفیسر ہارس نے جو ابھی حال میں انگلستان کے اندر جدید انکشافات کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ میں یہ رسم انگلستان میں بھی عام تھی۔ اس بنا پر ایک مصنف لکھتا ہے کہ اس سے رومی مورخ ٹیسی ٹس

۱؎ مزید معلومات کے لئے دیکھو میرا مضمون "قدیم زمانہ میں ستی کی رسم"
۲؎ "ٹائمز آف انڈیا" مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۳۲ء

کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ سیکسن لوگ جو مسیحیت پر ایمان نہیں لائے تھے ان کی بیویاں اس وقت اپنے آپ کو قتل کر ڈالتی تھیں جب ان کے شوہروں کا انتقال ہو جاتا تھا۔

آخر چند گزارشات کے بعد میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

ستی کے مسئلہ میں فاضل موصوف نے برہمن ذرائع معلومات کی طرف جو توجہ دلائی ہے اس کے متعلق ہم یہاں پر یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ انشاء اللہ آئندہ پرچہ میں ہم ستی کے مسئلہ پر ایک نہایت محققانہ مضمون شائع کریں گے جو زیادہ تر جرمن ذرائع معلومات پر مبنی ہوگا۔

"مترجم"

بندوبست دوامی

ہم اگست کی اشاعت "جامعہ" میں بتا چکے ہیں کہ عطاء دیوانی کے بعد بنگال و بہار کے علاقوں میں کمپنی بہادر نے کس بیدردی کے ساتھ قدیم زمینداروں کے حقوق کو محض اس لئے تلف کر دیا کہ یہ اضافۂ مالگذاری کی راہ میں حائل ہوئے تھے۔ ان کی بجائے ایسے لوگ مالگذاری جمع کرنے کے کام پر لگائے گئے جنہیں کوئی مستقل تعلق زمین یا اس کے کاشتکاروں سے نہ تھا اور جو محض تجارتی سلسلے کے طور پر نیلاموں میں بولیاں بول بول کر بڑے بڑے علاقوں کی مالگذاری کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے تھے۔ اس نیلام اور اجارہ داری کے طریقے سے جب مطالبہ مالگذاری اس حد تک پہونچ گیا کہ اس سے آگے اس کا بڑھانا کسی طور ممکن نہ تھا تو فکر اس بات کی ہوئی کہ یہ مطالبہ پابندی سے وقت پر وصول ہو جایا کرے۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ جن لوگوں سے مالگذاری وصول کرانے کا کام لیا جائے انھیں زمین سے مستقل تعلق ہو۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے؛ ضرورت مند کمپنی کے مزاج داں ملازموں نے اس کی ترکیبیں شروع کیں کہ جن بنیوں، ساہوکاروں، وکیلوں یا سٹہ بازوں کو پرانے زمینداروں کی جگہ دی گئی ہو انھیں مستقل طور پر زمین سے وابستہ کر دیا جائے۔

۲۸ مارچ ۱۷۷۶ء کو بارول نے یہ تجویز پیش کی کہ ان "زمینداروں" سے بطور الطاف خسروی ایک یا دو نسلوں کے لئے بندوبست کر لیا جائے۔ فرانسس نے (جو تاریخ ہند میں وارن ہیسٹنگز کی مخالفت کے باعث مشہور ہو چکا ہے) ۱۷۷۶ء میں ان "زمینداروں" سے بوجہ حق "دائمی بندوبست" کرنے کی سفارش کی۔ الغرض ہر گوشے سے اب یہ تجویزیں ہو رہی تھیں اور معاملہ تقریباً طے سا ہو چکا تھا لیکن ابھی یہ خیال باقی تھا کہ دائمی بندوبست کرنے سے پہلے مالگذاری اگر اور بڑھا لی جائے تو کیا برا ہے۔ چنانچہ ۱۷۷۷ء میں جب پنج سالہ بندوبست کی میعاد ختم ہوئی تو ۱۷۸۱ء تک صرف سال سال بھر کے لئے بندوبست کئے گئے۔ ۱۷۸۱ء میں تین سال کے لئے بندوبست ہوا اور مطالبہ مالگذاری میں حسب معمول ۲ لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ کا اضافہ ہو گیا۔ اس کے بعد پھر سال سال بھر کے لئے بندوبست ہوتے

اور مطالبہ مالگذاری برابر بڑھتا گیا۔

لیکن جس زمیندار کے لئے یہ لازم ہو گیا تھا کہ اتنی بڑی رقم ادا کرے اب اس کے مالک ہونے کے لئے ہر قسم کی شہادتیں فراہم کی جا رہی تھیں۔ کاشتکار کے حق ملکیت کے واضح ثبوت موجود تھے ان سے چشم پوشی کی جاتی تھی۔ کاشتکار زمیندار سے سب کچھ پوچھے بغیر اپنے کھیت بیچتا تھا بیچا کرتے خود زمیندار کو جب کسی قطعہ آراضی کی ضرورت ہوتی تھی اور وہ اُسے کاشتکاروں سے خریدا کرتا تھا غریبا کیسے کمپنی بہادر کی مالیات کا اس وقت یہ تقاضا تھا کہ زمیندار زمین کا مالک قرار دیدیا جائے چنانچہ دے دیا گیا اور یہ سب کچھ غیر ملکی پردیسی کمپنی کی ناواقفیت نہ تھی۔ بھلا جس کمپنی نے خود اپنی ملک گیری کی داستان چند مہینوں میں زمینداری حقوق حاصل کرکے کی ہو اور جسے اس ارادہ پر کہ لگان میں کچھ اضافہ کر دیا جائے مغل صوبہ دار نے ان حقوق کے تلف ہو جانے کی دھمکی دی ہو اس سے زیادہ کون جانتا تھا کہ زمیندار زمین کے مالک نہیں ہوتے۔ لیکن مالی احتیاج حافظہ کو خراب کرنے والی چیز ہے اس کمپنی کے اعلیٰ عہدہ داروں نے اور ان میں سب سے موثر طریقہ سے ان کے قابل فخر ملازم سرجان نے اب یہ اعلان کر دیا کہ "مالگذاری ملک کی ہے۔ زمین زمیندار کی"

شور اور اس کے ہم خیال عہدہ داروں کا گمان تھا کہ بس اضافہ مالگذاری کی حد آ چکی۔ اب زیادہ اضافہ سے پریشانیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے بہتر ہے کہ کافی طویل زمانہ کے لئے اس مطالبہ کو مقرر کر دو تاکہ رقم پابندی سے ادا ہوتی رہے۔

لیکن کمپنی کا ایک ممتاز عہدہ دار گرانٹ ایسا تھا جس نے زمینداروں کے حق ملکیت کا انکار کیا اور اس حق کو غلط ثابت کرنے کی بہت کوشش کی۔ گرانٹ نے جس قطعیت کے ساتھ زمینداروں کے حق ملکیت کا انکار کیا ہے وہ حدود جائز سے بہت متجاوز ہے کیونکہ ہندوستان کی معاشی تاریخ کا ہر جاننے والا واقف ہے کہ تمام ہندوستانی کاموں میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ امتداد زمانہ سے موروثی بن جاتے ہیں۔ زمیندار ہر چند پہلے محض مالگذاری جمع کرنے والا عہدہ دار ہی کیوں نہ ہو یہ بھی رفتہ رفتہ موروثی ہو جاتا تھا اور پھر اگر اسے اس عہدہ سے علیحدہ کیا جاتا تو اس کا معاوضہ ملتا جسے "مشاہرہ" یا "مالکانہ"

[illegible] تھے۔ مثلاً مرشد قلی خاں کے زمانہ میں اگرچہ زمینداروں کی حالت بہت خراب تھی تاہم [illegible] (یعنی ۱۷۲۲ء میں) ایک دستاویز موجود ہے جس میں زمیندار کا یہ حق صاف طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔[1] البتہ گرانٹ کی موافقت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس وقت اس نے زمینداروں کے حق ملکیت کی مخالفت کی ہے اس وقت وہ پرانے زمیندار جو ہندوستانی رسم کے مطابق مالک تھا موروثی ہو چکا ہوں تقریباً سب کے سب تباہ ہو چکے تھے اور ان کی جگہ کمپنی کے آوردوں نے لے لی تھی۔

گرانٹ کی موافقت اور مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا محض مسئلہ کی خود اپنی نوعیت کے لحاظ سے لکھا گیا لیکن غالباً گرانٹ نے اپنی اس علمی تحقیق کو دنیا کے سامنے محض علمی تحقیق کے طور پر پیش نہیں کیا تھا بلکہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں بھی کمپنی کے اغراض کی پاسداری اس وفاشعار ملازم کے پیش نظر تھی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جب گرانٹ نے اس مسئلہ پر اپنی مشہور تحریریں شائع کی ہیں[2] تو اس بات کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ "زمینداروں" سے بندوبست کیا جائے۔ پھر ۱۷۸۶ء میں خود "سر رشتہ دار" کے عہدہ پر بھی مقرر ہو چکا تھا اور اس کا اہم فرض اسی بندوبست کو کامیاب بنانا تھا اس لئے گمان ہوتا ہے کہ زمیندار کے مالک زمین نہ ہونے پر گرانٹ کا یہ اصرار اس لئے تھا کہ اگر کمپنی ایسے لوگوں کو جو زمین کے مالک نہیں اپنی مہربانی سے مالک بنائے دیتی ہے تو وہ ان سے کم از کم اس مہربانی کی قیمت تو اچھی طرح وصول کرے۔ اس بدگمانی کو اس بات سے اور تقویت پہونچتی ہے کہ زمیندار کے حق ملکیت سے انکار کے ساتھ ساتھ گرانٹ نے اس بات کے ثابت کرنے کی بھی بہت کوشش کی ہے کہ بنگال و بہار کا مطالبہ مالگذاری بہت کم ہے اور اس میں اضافہ کی

۱۔ دیکھئے Ascoli Early Revenue History of Bengal. ص ۳۳

۲۔ Political Survey of the Northern Circars, 1784, Analysis of the Finance of Bengal, 1786, The Historical and Comparative View of the Revenue of Bengal 1788

کی بست پر گنجائش ہے۔ اضافہ مالگذاری کی اس درد انگیز داستان کے بعد جو ہم بعض کتابوں میں بیان کر چکے ہیں۔ گورنمنٹ کی اس ستم ظریفی کا مقصد صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے قائم رہنے کے لئے اس امر کی کوشش کرے کہ بندوبست کے طویل زمانہ کے لئے متعین ہو جانے سے پہلے کسی طرح مالگذاری اور بڑھ جائے۔

یہاں یہ بحث مباحثے ہو ہی رہے تھے کہ "معاملات ایسٹ انڈیا کمپنی کے بہتر انتظام و انصرام کے لئے انگریزی پارلیمنٹ میں ایک قانون ۱۷۸۴ء میں پاس ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندی راجوں، زمینداروں، تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور دوسرے دیسی مالکان اراضی کے خراج، مالگذاری اور خدمات کے تعین کے لئے مستقل قواعد بنا دئے جائیں"۔ اسی قانون کو نافذ کرنے کے لئے ۱۷۸۶ء میں لارڈ کارنوالس ہندوستان بھیجے گئے۔ چنانچہ جب لارڈ کارنوالس ہندوستان آئے تو انھیں کمپنی کے ڈائرکٹروں کی طرف سے صاف ہدایات مل چکی تھیں کہ سابقہ حالات کا مطالعہ کر کے ایک مستقل بندوبست کا کام انجام دیں۔ ۱۷۹۰ء میں دس سال کے لئے بندوبست کیا گیا اور ڈائرکٹر صاحبان نے جب کوئی وجہ نہ دیکھی کہ "لارڈ کارنوالس کیوں اس مسرت سے محروم رہیں کہ برطانیہ کی لاکھوں ایشیائی رعایا کے لئے ایک نئے دستور اساسی کا اعلان کر سکیں"۔ تو ۱۷۹۳ء میں یہ دہ سالہ بندوبست دوامی قرار دیا گیا اور ۱۷۹۳ء کے قانون نمبر ۱ کی رو سے مالگذاری ادا کرنے والے زمین کے مالک مقرر کئے گئے اور قرار پایا کہ زمینداروں اور تعلقہ داروں پر جو مطالبہ مالگذاری ہے اس میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا اور یہ اور ان کے بعد ان کے ورثا اور جانشین اسی مطالبہ کو ادا کرتے رہیں گے۔ یہ بندوبست بندوبستِ دوامی کہلاتا ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ کارنوالس نے ہندوستان میں بالارادہ انگلستان کے سے طبقہ امراء کے بنیاد ڈالنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے مورخوں نے ان کے اس فعل کی دل کھول کر داد بھی دی ہے اور خود ہندوستانی قوم پرستوں نے اس احسان کی شکرگذاری میں نہایت فراخدلی سے کام لیا ہے۔ خود لارڈ کارنوالس کی تحریریں ان نیک امیدوں کے تذکرہ سے پر ہیں جو

وہ بہت اس منصوبۂ عمل سے رکھتے تھے۔ لیکن شخصی احساس احسانمندی سے ذرا علیحدہ ہوکر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بندوبست بس اس لئے کیا گیا کہ کمپنی کے لئے یہی بہترین مالی حل تھا اور اس کے سوا سے کمپنی کے فائدے کے جو فوائد ہندوستان کے لئے ممکن سمجھے جاتے تھے اور جن پر یقین کہ خود لارڈ کارنوالس کو یقین ہو وہ محض دھوکا تھے۔ نفس کا وہ دھوکا جو آدمی خود اپنے کو دے لیتا ہے تاکہ اپنے مقصد کے حصول میں اپنی اخلاقی قوت کو بڑھا سکے۔

جب کمپنی پر برابر قرضہ کا بار بڑھ رہا ہو، کاروبار مندا پڑا ہو، جنوبی ہندوستان میں فوجی اخراجات آپڑے ہوں، اور ملک میں روز افزوں پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو کمپنی کا کوئی عقلمند حاکم اس کی مالگذاری کو اجارہ داروں کے خانہ بدوش طبقہ پر کیسے چھوڑ دے اور پھر مالگذاری بھی وہ جس کا مطالبہ مختلف طریقوں سے اس بیجا حد تک پہونچا دیا گیا ہو کہ ادائگی میں ہزار جھگڑے ہوں۔ ابھی انگریزی انتظام ملکی اتنی ترقی نہ کرچکا تھا کہ کاشتکاروں سے براہ راست تعلقات پیدا کئے جاسکتے اور ان سے جسقدر وصول ہوسکتا وصول کیا جاتا اس لئے بس یہی ایک طریقہ تھا کہ زمیندار کو مالک زمین تسلیم کرکے انھیں زمین سے وابستہ کردو اور ان سے بیناواجب مطالبہ مالگذاری وصول کرو۔

رہا طبقۂ امرا کا قائم کرنا تو یہ تو منجملہ ان مغالطوں کے ہے جس سے بس وہی لوگ بیخبر رہتے ہیں جنہوں نے ارادۃً بیخبری کی دنیا کو اپنے لئے امن بنا رکھا ہو ورنہ طبقۂ امرا یوں قائم نہیں ہوتا کہ کل لگان میں سے جو زمیندار وصول کرے ۹/۱۰ حکومت وقت کو دیدے۔ وہ طبقۂ امرا ملک کے تہذیب و تمدن کو ترقی نہیں دے سکتا جو ایک آنہ کے بقایا مالگذاری ہونے پر فقراء کے طبقے میں آجائیں۔ لیکن بقایا مالگذاری پر جائدادوں کے بک جانے کا حکم یہ طبقۂ امرا اپنے یوم ولادت سے اپنے ساتھ لایا تھا اور یہ حکم محض ضابطہ کے لئے نہ تھا۔ اس پر عمل کی ضرورت پڑی اور شد و مد سے عمل شروع ہوا کیونکہ کمپنی کی مالگذاری لارڈ کارنوالس کے طبقۂ امرا سے زیادہ اہم چیز تھی!

۱۷۹۹ء میں ڈھاکہ کے ضلع میں ساڑھے آٹھ لاکھ روپیہ سے زیادہ سالانہ مالگذاری کی جائدادیں

... کی ... مالگذاری کے عوض اس طرح نکال دئے گئے۔ دوامی بندوبست کے کل
عمل تقریباً ۸ لاکھ روپیہ سالانہ مالگذاری کی جائدادیں یعنی کل مالگذاری کا ... فیصدی کے قریب
بک گئے۔ ایک سال بعد کل مالگذاری میں سے ۹ فیصدی کی جائدادیں بقایا مالگذاری کے باعث
بکی گئیں لیکن خریدنے والوں نے جو قیمت دی اس سے بقایا بھی پورا وصول نہ ہو سکا۔ یعنی جائداد
کی قیمت ایک سال کی مالگذاری کے برابر بھی قرار نہ پائی۔ ۱۷۹۳ء سے ۱۸۰۳ء تک دس سال میں
وہ علاقہ بندوبست کے علاقہ میں جو جائدادیں بقایا کی وجہ سے لارڈ کارنوالس کے بنائے ہوئے
امرا اور ان زمینوں کے مالکوں سے چھین کر بیچ دی گئیں۔ ان کی مجموعی مالگذاری تقریباً سوا کروڑ روپیہ
تھی اور ان کو بیچ کر جو رقم وصول ہوئی وہ اس سے کوئی ۲۰ لاکھ کم تھی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ان جدید
امرا کی جائدادوں کو بیچنے آدمی ان کو وہ اطمینان و مرفہ الحالی حاصل کہ یہ تمدن جدید کی ترقی کے حامل ہو سکتے
خریدنے والے نہ ملتے تھے۔ ڈھاکہ کے ضلع کی اطلاع ہے کہ ۱۷۹۹ء میں متعدد جائدادیں نیلام کی گئیں
لیکن کسی نے خریدنے کی حامی نہ بھری۔

اب اگر بندوبست دوامی کا مقصد طبقہ امرا کا پیدا کرنا ہی تھا اور اس میں ملکی ترقی ہی پیش نظر تھی تو ان حالات کے نمودار ہونے کے بعد پہلا نتیجہ یہ نکالنا چاہئے تھا کہ مطالبہ مالگذاری ناواجب ہے اور اس میں تخفیف کیجائے۔ لیکن کمپنی کو تو یہ ناممکن مطالبہ کسی نہ کسی طرح وصول کرنا تھا۔ چنانچہ کاشتکاروں کے حقوق کو بالکل پامال کر کے کوشش کی گئی کہ ان نیلامی جائدادوں کے نئے خریدار

---

(۱) ص 69 Ascoli. Early Revenue History of Bengal.

(۲) مسٹر ٹسٹورٹ رکن مجلس عالیہ بنگال کا بیان جسے India or Facts submitted to illustrate the Character and Constitution of the Native Inhabitants etc. مطبوعہ لندن ۱۸۲۲ء جلد اول کے صفحہ ۱۸۵ پر نقل کیا گیا ہے

(۳) ص 74 Ascoli: Early Revenue History of Bengal.

[illegible] اس پر الی حقوق کی عملی صورت حسب ذیل ہے
بندوبست دوامی یعنی زمینداروں کے حق ملکیت کے تسلیم ہونے سے پہلے زمیندار
بنگال کے تعلقات اور مطالبہ لگان رسم و رواج پر مبنی تھے۔ اب جو زمیندار مالک تسلیم کئے
گئے انہیں یہ بھی حق دیا گیا کہ وہ اپنی رعیت یا کسانوں کے حقوق کا تعین کریں اور انہیں یہ
کہ ان کسانوں کے حقوق تحریری پٹوں کی صورت میں آجائیں۔ ان پٹوں میں ایسی شرائط
درج ہونے کے لئے کسانوں نے اپنی محنت کے باوجود جو [illegible] قرار پائیں [illegible] ہوں گی ان کا
اندازہ [illegible] خوب کر سکتے ہیں جو مثال کے طور پر اس کے تعلقوں میں تنزل کی رسم سے واقف
ہیں۔ ادھر کسان نے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی دیکر جو پٹے لکھائے تھے ان کی اساری
بھی قانون نہ جانتی تھی کیونکہ انہوں نے اپنی مالگذاری کی خاطر یہ حکم چلا کہ جب لگان کی وجہ سے جائداد
نیلام ہو تو نیا خریدار بالکل آزاد ہے۔ اس پر ان شرائط کی پابندی کسی طرح لازم نہیں جو پچھلے
زمینداروں نے کئے ہوں۔ کسانوں کے ساتھ یہ بدعہدی کوئی سو پچاس آدمیوں تک محدود نہ تھی۔
اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دوامی بندوبست کے پہلے ۲۲ سال کے اندر اندر
ایک تہائی سے زیادہ بلکہ نصف جائدادیں اپنے پہلے مالکوں سے لیکر دوسروں کے ہاتھ نیلام
ہو چکی تھیں اور ایک ربع صدی کے اندر لارڈ کارنوالس کے طبقہ امراء کا بڑا حصہ ملکیت اراضی
سے قطعاً باہر کیا جا چکا تھا۱

جب اس سے بھی کام نہ چلا تو ۱۷۹۹ء کے قانون ہفتم کی رو سے زمینداروں یا ان
کے مختاروں کو اجازت دی گئی کہ معمولی لگان کی صورت میں بلا کسی عدالت یا حاکم کو اطلاع
دیئے ہوئے کسانوں کی فصل، پیداوار زمین، غلہ، مویشی اسباب خانہ داری غیر منقولہ املاک پر قبضہ کر لیں
چاہے یہ چیزیں خود اس کسان کے مکان میں ہوں یا اور کہیں [illegible] میں رکھی ہوں

۱ Minute of Mr. Rocke, the Acting President in 1815, in Bengal Revenue [illegible] I. p. [illegible]

تھیں۔ یا تو فوراً مطلوبہ لگان دے یا ایک معاہدہ لکھے کہ پندرہ دن کے اندر اندر معاملہ کسی دیوانی عدالت کے سامنے بغرض تحقیق پیش کرے گا اور عدالت جو لگان مقرر کرے گی وہ [illegible] بعد میں سود کے ادا کرے گا۔ اگر کسان اپنی املاک جو قبضہ میں زمیندار کو دے سکے تو یہ جرم تھا اور وہ اس کو گرفتار کر کے اپنے ہاں محبوس رکھیں۔ اس روک ٹوک کی سزا یہ تھی کہ املاک سے دوچند قیمت ادا کرنی ہوتی تھی اور اگر عدالت نے کسان کی شکایت کو مسترد کر دیا تو پورا پورا ہرجانہ دینا ہوتا تھا۔ جہاں املاک سے لگان وصول نہ ہو سکتا وہاں اجازت تھی کہ کسان کو قید کر لیا جائے یا اس کا حق کاشت بالکل تلف کر دیا جائے۔ زمینداروں کو اختیار تھا کہ بلا کسی عدالت کو اطلاع دیے کسانوں کو خارج کر دیں۔

۱۸۱۸ء میں بورڈ آف کمشنرز نے اس قانون کے نتائج کے متعلق یہ رپورٹ کی کہ "اس قانون نے زمینداروں کے ہاتھ میں ظلم و ستم کا ایک ایسا آلہ دے دیا ہے جو اسی قدر بے پناہ ہے جیسے کہ ان کے سابقہ اختیارات غیر موثر تھے۔ بے بنیاد شکایت پر جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں انھوں نے کسانوں کو شکایت کرنے سے بالکل روک دیا ہے۔ اسے ایک قوی اور مالدار مقابل کے خلاف طویل مقدمہ بازی کے نتیجہ پر بھی بھروسہ نہیں اور اس میں اس سے اور بھی اضافہ ہوگیا کہ اگر ناکامی ہوئی تو مصیبت موجود ہی ہے۔ چنانچہ ہر طرح کی بے انصافی کو صبر کے ساتھ سہتا ہے اور ایسی داد رسی سے باز رہتا ہے جس میں اول تو اس کاروبار کا بند کرنا لازمی ہو جس پر اس کے خاندان کا دارومدار ہے اور پھر ختم پر کامل تباہی کا اندیشہ۔"[1]

ظلم کرنے کا حق جب کافی نہ ہوا تو ظالموں کی تعداد میں اضافہ کی تدبیر سوچی گئی۔ ۱۸۱۲ء سے پہلے زمینداروں کو یہ اختیار نہ تھا کہ کسی کو اپنی جائداد میں دس سال سے زیادہ کے پٹے دیں۔ غالباً بندوبست دوامی کے موجد شاید یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بنائے ہوئے امرا اپنے حقوق کو کہیں حاصل ہونے کے ساتھ ہی تھوڑا بہت منافع لیکر دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالیں لیکن

---

[1] C.D. Field: Landholding & Relation of Landlords & Tenants p. 33

ان کی مخصوص حیثیت ۱۸۱۲ء میں بس ختم ہو گئی اور قانون پٹنی نے زمینداروں کو حق دے دیا کہ جسے چاہیں جتنی مدت کے لئے چاہیں یکمشت معاوضہ وصول کر کے اپنے حقوق منتقل کر دیں ۔ یہ لوگ جنہیں زمیندار اپنا حق دیتا تھا پٹنی دار کہلواتے اور اسی طرح سہ پٹنی و چہار پٹنی دار ۔ چنانچہ بنگال میں آج ایسے علاقے موجود ہیں جہاں اصل زمیندار جو سرکار کو مالگذاری دیتا ہے اور کسان کے درمیان ایک درجن پٹنی دار ہیں ۔ بنگال میں لگان وصول کرنے والی آبادی کا اضافہ ابھی جاری ہے ۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رو سے بنگال میں ۱۳ لاکھ ۱۹ ہزار تین سو دو شخص لگان وصول کرتے تھے ۔ یعنی کل آبادی کا ۲۲.۰۷ فی صد ۔ ذیل کے اعداد سے اس طبقہ کی تعداد میں زمانہ حال میں جو اضافہ ہو رہا ہے اس کا اندازہ ہو سکے گا ۔

سال	تعداد وصول کنندگان لگان	تعداد کاشتکاران فیصد وصول کنندگان لگان
۱۹۰۱ء	۹۷۸,۰۱۶	۲۸۰۷
۱۹۱۱ء	۱,۲۰۵,۲۹۹	۲۴۱۰
۱۹۲۱ء	۱۳۱۹۳۰۲	۲۲۱۵

تخمینہ کیا گیا ہے کہ کل لگان جو یہ لوگ وصول کرتے ہیں ۱۳½ کروڑ روپیہ سالانہ ہے ۔ یعنی ایک لگان وصول کرنے والے خاندان کو جس میں اوسطاً ۶ شخص مانے جا سکتے ہیں ۶۲۰ روپیہ سال یعنی کوئی ۵۰ روپیہ ماہوار ملتے ہیں اس میں سے آجکل کوئی ۱۰ فیصدی سرکاری مالگذاری میں چلا جاتا ہے ۔ اور لارڈ کارنوالس کا یہ طبقہ امراء کچھ بہت امیر نہیں ! اور یہ کرشمہ ہے ۱۸۱۲ء کے قانون پٹنی کا ۔ کیا تعجب ہے کہ بنگال کے کسان آجتک "ہپتم" اور "پنجم" کا ذکر خوف اور دہشت سے کرتے ہیں اور انھیں کو بجا طور پر اپنی تباہی کا سبب جانتے ہیں ۔ اور اگر طبقہ امرا کو صرف برائے نام امارت پر فخر نہ ہو تو یہ بھی اخلاقاً کچھ بہت شکر گذاری پر مجبور نہیں !

۱۸۲۲ء اور ۱۸۴۱ء میں اور قوانین نافذ ہوئے کہ بقایا مالگذاری کی وجہ سے نیلام ہونے والی

تعلقہ داروں کے خریداروں پر سے پہلے مالکوں کے جملہ معاہدوں کی پابندی اٹھا دی جائے۔ کاشتکاروں کا حق جس کا اب زمیندار کی خوشنودی پر منحصر تھا جب تک چاہا اسے رکھا اور جب چاہا بے دخل کر دیا۔ لگان کا تعین نہ اب رسم سے ہوتا تھا نہ ایسے معاہدے سے جو کچھ دن تو چلتا اور کچھ یہ نہیں کہ کمپنی اس صورتِ حال سے ناواقف ہو۔ ۱۸۱۹ء میں ڈائرکٹران کمپنی نے کسانوں کی بے بسی اور زمینداروں کی مطلق العنانی پر اظہار افسوس کیا تھا[1] لیکن اس کے علاج نے ۱۸۵۹ء اور ۱۸۸۵ء کے قانون نافذ کرا ہی دیے۔

مختصر یہ کہ اس بندوبست دوامی نے کسانوں کے تمام حقوق کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور اس کے عوض جو طبقہ امرا قائم کیا وہ ایسا کہ اسے ۵۰ سال کے اندر نیلام جائداد کے ذریعہ کم و بیش تین چوتھائی جگہ دوسروں کے لئے چھوڑنی پڑی اور جو آج اوسطاً ۵۰ روپیہ ماہوار آمدنی والے خاندانوں پر مشتمل ہے۔ یہ غریبوں کو فقیر اور اپنے بنائے ہوئے امیروں کو غریب کر دینے والا انتظام یک کرشمہ دو کار والی انگریزی حکمت عملی کا بہترین نمونہ ہے اور لطف یہ کہ جب تک کسانوں کے حقوق پامال کئے گئے تھے امرا کی مرفہ الحالی رہی اور جب اس کی حد آگئی تو ۱۸۵۹ء سے ایسے قوانین نافذ ہونے لگے جو تباہ شدہ کاشتکاروں کے حقوق کے محافظ بتائے جا سکیں اور اس طرح ان کی ہمدردیاں حاصل کی گئیں۔ لیکن باقی نہ کسانوں کے حقوق ہی رہے نہ طبقہ امرا کی امارت۔

---

[1] The Field Landholding etc

تنقید و تبصرہ

چمن

یہ اردو کے چند مشہور و معروف شعراء کے منتخب کلام کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جو نہایت خوشنما چھوٹی تقطیع پر الیاس احمد صاحب مجیبی ناظم شرکت ادبیہ نے شائع کیا ہے۔ شروع میں اردو شاعری کے عناصر اربعہ یعنی میر، مصحفی، غالب اور امیر مینائی کی بعض عمدہ غزلوں کا انتخاب ہے اور اخیر میں اردو کی جدید قومی و اصلاحی شاعری کے علمبرداران یعنی حالی، شبلی، اکبر و اقبال کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ مجموعہ عید کی تقریب میں شائع کیا گیا تھا اس لئے بیچ میں ایک خوشنما رنگین عیدی کارڈ بھی رکھا ہوا ہے۔ جہاں تک خیال کا تعلق ہے یہ اپنی نوعیت کا ایک اچھوتا خیال ہے اور اس بنا پر یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ احباب بجائے بازاری عید کارڈوں کے آپس میں اس کو بطور عیدی تحفہ کے تقسیم کیا کریں لیکن زیادہ بہتر ہو کہ ناظم صاحب شرکت ادبیہ خواہ اس مجموعہ کے دوسرے اڈیشن میں یا اس سلسلہ کے دوسرے نمبروں میں کلام کے انتخاب میں ذرا محنت و کاوش اور ترتیب و تہذیب سے کام لیں اور کتاب کے اندر کی لکھائی اور چھپائی بھی ویسی ہی دیدہ زیب اور خوبصورت رکھیں جیسی باہر سرورق کی ہے۔ اس مجموعہ کی قیمت باختلاف قسم ۸؍ اور ۶؍ ہے اور یہ ناظم شرکت ادبیہ قرولباغ دہلی سے مل سکتا ہے۔

نقشہ

یہ مقامات مقدسہ و عالم اسلام کا ایک روغنی رنگین اور نہایت صاف چھپا ہوا نقشہ ہے جو دبیز چکنے کاغذ پر تقریباً ۳۰ × ۴۰ انچ کے سائز پر عبد الرحمن ابن ابراہیم صاحب فیتہ والے نے ترتیب دیکر شائع کیا ہے۔ نقشہ کا پیمانہ ۹۶ میل مساوی ایک انچ کے حساب سے ہے۔ در اصل یہ نقشہ جزیرہ نمائے عرب، ایشیائے کوچک، ایران، افغانستان اور ترکستان کے پورے

علاقہ دکھایا ہے اور اس کے داہنے اور بائیں جانب تقریباً نصف نصف ہندوستان اور افریقہ کا حصہ بھی آگیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ حصے جہاں مسلمان آباد ہیں اور کثرت سے آباد ہیں مثلاً جاوا اور سماٹرا وغیرہ کے جزائر کا اس میں کہیں ذکر نہیں اور نہ چین اور روس کا شمالی حصہ اس میں شامل ہے اس حیثیت سے اسے عالم اسلام کا مکمل نقشہ کہنا زیادہ صحیح نہ ہوگا۔ مقامات مقدسہ کے دکھانے میں بھی کسی خاص خصوصیت سے تفصیلات کا اظہار نہیں کیا گیا ہے جس سے یہ اسلام کے تمام اماکن مقدسہ کا نقشہ کہا جا سکے۔ نیز بحیثیت نقشہ کے بھی اس میں ابھی بہت کچھ اضافہ کی ضرورت ہے۔ انگریزی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے نقشہ کو بھی اٹھا لیجئے اور دیکھئے اس میں مقامات اور دیگر جغرافیائی اشیاء کا کس قدر تفصیل سے ذکر ہوتا ہے۔ اس میں بھی ضرورت تھی کہ جدید ترکی شام، فلسطین اور حجاز وغیرہ میں جس سے آجکل مسلمانوں کو کافی دلچسپی ہو گئی ہے شہروں اور جگہوں کے نام اور کثرت سے دکھائے جاتے اور ان کا ملنا اور دکھانا کوئی دشوار کام نہ تھا۔ بہرحال نقشہ بہ حالت موجودہ نہایت بہتر ہے اور اردو کے لئے باغنیمت ہے۔ پورا نقشہ چوڑائی کی دو تہ میں اور لمبائی کی آٹھ تہ میں ہو کر ۱۵ × ۱۰ انچ کی کتابی صورت میں آجاتا ہے۔ قیمت ۸ر ہے اور بمبئی کے بھنڈی بازار نمبر ۹ کے مکتبوں سے مل سکتا ہے۔

خیابان

آج کل اردو رسائل کی اسقدر بھرمار ہو رہی ہے کہ دیکھئے اردو غریب اس کی کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے۔ رسائل پر رسائل نکلتے چلے آرہے ہیں لیکن ضرورت پھر بھی باقی رہ جاتی ہے۔ ہر رسالہ ایک نئے مقصد کو لے کر نکلتا ہے لیکن زیادہ عرصہ گزرنے نہیں پاتا کہ خود اس مقصد کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ رسالہ اردو زبان کے دامن کو علوم مشرقیہ و مغربیہ کے جواہر سے بھرنے اور اس کے مدفون خزانہ کو جوہر شناس نظروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے شہنشاہ حسین صاحب رضوی (علیگ) کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلا ہے۔ دیکھئے اس مقصد عظیم میں یہ کب تک اور کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ شروع میں جس جوش و خروش کے ساتھ اہل قلم نے خیر مقدم کیا ہے اور یہ پرچہ

دیکھنے سے قبل جن خوش آیند خیالات کا اظہار فرمایا ہے، دیکھئے یہ سرگرمی اور جوش آخر تک باقی بھی رہتا ہے۔ مرتب نے شروع میں ناظرین کے اطمینان کے لئے ہر موضوع کے ساتھ ہندوستان کے بہترین لکھنے والوں کی ایک فہرست "خیابان کی بزم تحقیق" کے نام سے دیدی ہے۔ اگر اس کا عشر عشیر بھی پورا ہوتا ہے تو غنیمت سمجھئے۔ بہرحال پہلا نمبر اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے لحاظ سے بہت کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ اس میں عبداللہ یوسف علی اور پروفیسر محمد حبیب کے جیسے دو ایک مضامین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شروع میں حاجی سید محمد رضا طباطبائی یزدی مؤلف "بزم ایران" کا ایک فوٹو بھی ہے۔ پرچہ کی ایک بڑی خصوصیت اور ہے اور وہ یہ کہ اس کا ہر مضمون "باقی دارد" ہے جو بہ خیال مرتب ایک محققانہ رسالہ کے لئے ناگزیر تھا لیکن سوال یہ ہے کہ مضامین کی تعداد بڑھانا کب ضرور ہے؟ رسالہ کی تقطیع ۲۰×۲۶ صفحے ۱۴۴ اور قیمت ۸ ہے۔ ملنے کا پتہ

دارالاشاعت، وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

تحفہ

یہ رسالہ مانڈلے (برما) سے محمد عبدالغفار خاں متوطن اعظم گڑھ نے جاری کیا ہے۔ مضامین اور کلام کے اعتبار سے اگرچہ یہ پرچہ کوئی بلند معیار کا نہیں ہے لیکن جس صوبہ سے یہ نکلنا شروع ہوا ہے اس کے اعتبار سے ہر طرح پر ہمت افزائی اور امداد و اعانت کا مستحق ہے۔ رسالہ کا حجم کسی قدر چھوٹی تقطیع پر ۴۴ صفحے کا ہے اور قیمت للعہ ہے۔

س-ا

شرح قصیدہ بانت سعاد

حضرت کعب بن زہیر نے جو قصیدہ حضور نبوی میں پڑھا تھا اور جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بردۂ مبارک ان کو صلہ میں عطا فرمایا تھا اور جو اب تک اہل ادب میں مقبول چلا آتا ہے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے اردو میں کسی نے اس کی شرح نہیں لکھی تھی اب مولوی ابو المغازی علی الاعلیٰ فاروقی جونپوری نے اس کی اردو شرح لکھ کر شائع کر دی ہے۔

ہر چند کہ یہ شرح مختصر ہے لیکن مفید ہے اور اس نوجوان شارح نے جس کے اجداد (مصنفین) کی ہم کو خبر نہیں مگر ان کے آثار سے واقف ہیں مولوی طلبہ پر احسان کیا ہے ہم کو امید ہے کہ وہ علوم عربیہ کی کوئی اور بڑی علمی خدمت کریں گے۔ کیونکہ اس شرح کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کام کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

جونپور کسی زمانہ میں مشرقی ہند کا علمی مرکز تھا۔ جہاں مشہور ہے کہ بارہ سو علما صاحب درس کی پالکیاں انتظار کرتی تھیں۔ لیکن اب وہ علم و فن کے ایک گورستان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا غنیمت ہے کہ خطۂ قضیانہ کے بعض افراد کی بدولت اس گورستان میں ابھی تک ایک شمع روشن ہے اس شرح کی قیمت ۸ر ہے اور دائرہ مطبوعات ملیہ قضیانہ جونپور سے مل سکتی ہے۔ اسح

پاشا

جس زمانہ میں وہ جوان تر حسین تر، اور اس کی آواز پختہ تر تھی، ایک دن اُسکا شیدائی ہولے پیٹرووچ کولیاکوف اُس کے تفریحی بنگلے کے باہر کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ شدت کی گرمی اور حبس تھا۔ کولیاکوف کھانا کھاکر اور معمولی شراب کی ایک پوری بوتل پی کر فارغ ہوا تھا۔ دونوں کسل مند تھے اور انتظار کر رہے تھے، کہ گرمی فسرد ہو تو ہواخوری کے لئے نکلیں۔

یکایک دروازے میں گھنٹی بجی، کولیاکوف، جو کوٹ اتارے سلیپر پہنے بیٹھا تھا، اچھل پڑا اور پاشا پر مستفسرانہ نگاہ ڈالی۔

"ڈاکیہ ہوگا یا لڑکیوں میں سے کوئی ہوگی"

کولیاکوف کو اسکی پروانہ تھی، کہ ڈاکیہ یا پاشا کی سہیلیاں اُسے وہاں دیکھیں۔ تاہم احتیاطاً اس نے اپنے کپڑے اٹھائے اور پاس کے کمرے میں چلا گیا۔ پاشا دروازہ کھولنے دوڑی۔ وہ یہ دیکھکر حیران ہوئی، کہ دروازے میں نہ ڈاکیہ تھا، نہ کوئی سہیلی، بلکہ ایک نامعلوم جوان اور حسین عورت جو شریفانہ لباس پہنے ہوئے تھی اور وضع قطع سے کوئی شریف خاتون معلوم ہوتی تھی۔

نووارد کا رنگ زرد اور سانس پھولا ہوا تھا۔ جیسے کسی ٹیڑھے زینے پر تیزی سے چڑھی ہو۔

"کیا ہے؟"

خاتون نے جواب فوراً نہیں دیا۔ ایک قدم آگے ڈالا، اطمینان سے کمرے کا جائزہ لیا اور اس انداز سے بیٹھ گئی، گویا تکان یا شاید بیماری کیوجہ سے کھڑی نہیں رہ سکتی۔ پھر دیر تک بولنے کی ناکام کوشش میں اُس کے زرد ہونٹ کپکپاتے رہے

آخر اُس نے پاشا کی طرف اپنی بڑی بڑی سرخ اشک آلود آنکھیں اٹھاکر پوچھا

"میرا شوہر یہاں ہے؟"

"شوہر؟" پاشا نے آہستہ سے کہا اور یکایک ایسی خوف زدہ ہوئی، کہ ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ اور کانپتے ہوئے دُہرایا، "کیا شوہر؟"

"میرا شوہر۔ نکولائے پیٹرووچ کو لیا کوف۔"

"ن نہیں، بیگم ... میں ... میں کسی شوہر کو نہیں جانتی۔"

ایک لمحہ خاموشی میں گزرا۔ اجنبی خاتون نے کئی دفعہ اپنے زرد ہونٹوں پر رومال پھیرا اور اختلاجِ قلب دبانے کیلئے سانس روکے رکھا۔ پاشا اس کے سامنے بت کی طرح ساکت کھڑی حیرت اور دہشت سے اُسکا منہ تک رہی تھی۔

"تو تم کہتی ہو وہ یہاں نہیں ہے؟" خاتون نے سخت آواز سے ایک خاص طرح مسکرا کر دریافت کیا۔

"میں .. میں نہیں جانتی آپ کسے پوچھ رہی ہیں۔"

"تم مکروہ، حقیر، ذلیل ہو" اجنبی نے پاشا پر نفرت اور حقارت سے نظر ڈال کر منہ ہی منہ میں، کہا۔ "ہاں، ہاں .. تم مکروہ ہو۔ مجھے نہایت خوشی ہے کہ آخر تم سے یہ کہنے کا موقعہ ملا۔"

یہ محسوس کرکے، کہ اس آتش بار، سفید نازک انگلیوں والی سیہ پوش خاتون کو میں مکروہ اور ناشائستہ نظر آتی ہوں، پاشا کو اپنے بھرے بھرے رخساروں، ناک کے داغ، اور پیشانی پر بکھری ہوئی لٹوں پر جو کنگھی سے بھی قابو میں نہیں آتی تھیں، شرم آنے لگی، اُسے خیال ہوا، کہ اگر میں نازک اندام ہوتی اور میرے چہرہ پر غازہ اور پیشانی پر بالوں کی جھالر نہ ہوتی، تو یہ بات چھپ جاتی، کہ میں "شریف" نہیں ہوں، اور اس گمنام، پُراسرار خاتون کے سامنے میں اتنی خائف اور مجحوب نہ ہوتی۔

خاتون کہے گئی، "میرا شوہر کہاں ہے؟ وہ یہاں ہو نہ ہو، میری بلا سے مگر میں

تمہیں بتانا چاہتی ہوں، کہ غبن کا حال کھل گیا اور اُسکی تلاش ہو رہی ہے پولیس اُسے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ یہ سب تمہاری کارستانی ہے!"

خاتون اُٹھی اور گھبراہٹ کے مارے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پاشا اُسے تک رہی تھی اور اسقدر ہراساں تھی کہ اُسکی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"اُسکا سراغ لگ جائیگا اور وہ آج گرفتار ہو جائیگا،" خاتون نے ہچکی لیکر جس سے غم و غصہ ٹپکتا تھا، کہا۔ "میں خوب جانتی ہوں یہ کس کے لچھن ہیں! کمینی، مکروہ مخلوق! کریہہ، زرپرست بیسوا!" خاتون کے ہونٹوں میں تشنج تھا اور اُسکی ناک حقارت سے چڑھی ہوئی تھی۔ "میں بے بس ہوں، بے حیا عورت ہنستی ہے؟ ... میں بے بس ہوں، تم مجھ سے زیادہ قوی ہو، مگر میری اور بچوں کی حفاظت کرنے والا وہ ہے! خدا سب کچھ دیکھتا ہے! وہ منصف ہے! جو آنسو میں نے بہائے ہیں، جو راتیں میں نے جاگ جاگ کر کاٹی ہیں وہ ان سب کا بدلا تم سے لیگا! وقت آئیگا کہ تم مجھے یاد کروگی!"

پھر سکوت ہو گیا خاتون کمرے میں ٹہل ٹہل کے ہاتھ مل رہی تھی، پاشا حیرت سے اُسکا منہ دیکھ رہی تھی۔ اُسکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا اور وہ کسی دہشتناک بات کی منتظر تھی۔

"بیگم! مجھے کچھ نہیں معلوم،" یہ کہتے وقت اسکی آنکھ سے آنسو جاری ہوگئے۔

خاتون نے چیخ کر جواب دیا "تم جھوٹ بولتی ہو!" اُسکی آنکھیں پاشا پر شرارے برسا رہی تھیں۔ "مجھے سب معلوم ہے! میں تمہیں بہت دنوں سے جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے، وہ مہینہ بھر سے روزانہ تمہارے ہاں آتا جاتا ہے۔"

"اچھا یوں ہی سہی۔ پھر فرمائیے؟ میرے ہاں بہت سے ملاقاتی آتے ہیں۔ مگر میں کسی کو مجبور نہیں کرتی۔ وہ بھی اپنی مرضی کا مختار ہے۔"

میں کہتی ہوں غبن کا پتہ چل گیا! اُس نے دفتر میں غبن کیا تم جیسی مخلوق کے تمہارے کارن اُس نے یہ جرم کیا!" یک لخت ٹھہر کر، عزم کارطریقے سے خاتون نے کہا۔ "سنو تم اصولاً

سے عاری ہو، تمہارا کام محض آفت ڈھانا ہے، مگر میں یہ نہیں سمجھتی کہ تم اس قدر ذلیل اور پست ہو گئی ہو کہ تم میں مطلق انسانیت نہیں رہی! وہ بیوی بچوں والا ہے۔۔۔ اگر وہ سزایاب ہو گیا اور جلا وطن کر دیا گیا تو ہم بھوکے مریں گے، بچے اور میں۔۔۔ یہ سمجھ لو! ابھی موقع ہے کہ تم اُسے اور ہمیں بے سروسامانی اور ذلت سے بچاؤ۔ اگر انہیں نو سو روبل دیدیے گئے، تو وہ اُسکا پیچھا چھوڑ دیں گے۔ صرف نو سو روبل!"

پاشا نے نرمی سے پوچھا "کیسے نو سو روبل؟ میں نہیں جانتی۔۔ میں نے نہیں لئے"

"میں تم سے نو سو روبل نہیں مانگتی۔ نہ تمہارے پاس روپیہ ہے، نہ مجھے تمہارے روپیہ کی ضرورت۔ میں تم سے کچھ اور مانگتی ہوں۔۔۔ مرد عموماً تم جیسی عورتوں کو تحفے تحائف دیتے ہیں۔ مجھے صرف وہ چیزیں دیدو جو میرے شوہر نے تمہیں دی ہیں"

بیگم، اُس نے مجھے کبھی کچھ نہیں دیا!" رفتہ رفتہ خاتون کا مطلب تاڑ کر پاشا نے واویلا کرنا شروع کیا۔

"آخر روپیہ گیا کہاں؟ اُس نے اپنا اور میرا اور دوسروں کا روپیہ لٹایا۔۔۔ وہ سب کیا ہوا؟ سنو، میں درخواست کرتی ہوں! میں نے غصے سے بے قابو ہو کر تمہیں بہت سخت سست کہا، اُسکی معافی مانگتی ہوں۔ میں جانتی ہوں، تمہیں مجھ سے نفرت ہو گی، لیکن اگر تم میں شمہ برابر ہمدردی ہے تو میری حالت کا اندازہ کرو! میں التجا کرتی ہوں، سب چیزیں مجھے واپس دے دو"

کچھ سوچ کر پاشا نے شانے ہلائے "میں خوشی سے دے دیتی مگر خدا گواہ ہے اُس نے مجھے کبھی کچھ نہیں دیا۔ قسم کھا کے کہتی ہوں، میرا یقین مانئے۔ بے شک آپ سچ فرماتی ہیں، مجھے ابھی خیال آیا" گانے والی نے گھبرا کر کہا "اُس نے مجھے دو ہلکی چیزیں دی تھیں گہنے، تو وہ دے دوں؟"

پاشا نے سنگار میز کا ایک خانہ کھولا اور اس میں سے ایک کھوکھلی سونے کی چوڑی

اور ایک ہلکی یاقوتی انگوٹھی نکالی۔

"یہ لیجئے، بیگم!"

خاتون کا چہرہ تمتما اٹھا اور غصے سے کانپنے لگا۔

"کیا دے رہی ہو؟ میں خیرات نہیں مانگتی، وہ چیزیں مانگتی ہوں جو تمہاری نہیں ہیں۔ جو تم نے میرے کمزور، ناشاد شوہر کو بے وقوف بنا کر تھیائی ہیں۔ جمعرات کو میں نے تمہیں سال پر اسکے ساتھ دیکھا تھا، تو تم قیمتی بروش اور چوڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ معصوم بننے سے کوئی فائدہ نہیں! آخری مرتبہ پوچھتی ہوں۔ "چیزیں دوگی یا نہیں؟"

پاشا نے آشفتہ ہو کر کہا "آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ میں یقین دلاتی ہوں، اس چوڑی اور انگوٹھی کے علاوہ میں نے آپ کے نکولائے پیٹرووچ کی کسی چیز کی شکل نہیں دیکھی، میرے لئے وہ صرف میٹھے کیک لایا کرتا ہے۔"

اجنبی ہنسی "میٹھے کیک! گھر پر بچوں کے لئے کھانے کو نہیں، اور یہاں آپ کیلئے میٹھے کیک لائے جاتے ہیں۔ تو چیزیں واپس کرنے سے انکار کرتی ہو؟"

جواب نہ پا کر خاتون بیٹھ گئی اور ہوا میں نظر گاڑ کر سوچنے لگی۔

"اب کیا کیا جائے؟ اگر نو سو روبل نہ ملے، تو وہ برباد ہو جائیگا اور بچے اور میں بھی برباد ہو جاؤں گی۔ اس ذلیل عورت کو مار ڈالوں یا اسکے آگے گھٹنوں کے بل جھک جاؤں؟"

خاتون نے رومال منہ پر رکھا اور ہچکیاں لینے لگی۔

"میں التجا کرتی ہوں!" وہ ہچکیاں لے لے کر کہہ رہی تھی "تم نے میرے شوہر کو لوٹا، برباد کیا، اب اُسے بچاؤ۔ اُسکا خیال نہیں کرتیں۔ تو بچے ... بچے ... بچوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

پاشا کی نظروں میں بھوک سے بیتاب، سڑک پر کھڑے ہوئے بچوں کی تصویر پھر گئی، اور اُس کے بھی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"بیگم ہتلائے میں کیا کروں؟ آپ کہتی ہیں، تو ذلیل ہے، تو نے پیرزدوچ کو برباد کیا، مگر میں یقین دلاتی ہوں .. خدا کی قسم، مجھے اُس سے کبھی کچھ نہیں ملا ... ہمارے طائفے میں صرف ایک لڑکی ہے جسکا چاہنے والا مالدار ہے، باقی سب روٹی اور آش جو بمشکل گذارہ کرتی ہیں۔ نکولائے پیرزدوچ نہایت تعلیمیافتہ اور شائستہ آدمی ہیں، اسلئے میں نے اُنکی آؤبھگت کی۔ شریف آدمیوں کی آؤبھگت کرنا ہمارا فرض ہے۔"

"میں چیزیں مانگتی ہوں! چیزیں میرے حوالے کردو! میں رو رہی ہوں۔ اپنے تیئں حقیر کر رہی ہوں .. کہو تو گھٹنوں کے بل جھک جاؤں! اگر تم چاہو!"

پاشا نے ہول کھاکے چیخ ماری اور ہاتھ ملائے اُسے خیال ہوا کہ یہ زرد رنگ حسین خاتون جوایسے محتشم انداز سے باتیں کر رہی ہے، گویا اسٹیج پر ہے، واقعی محض از راہ تمکنت شان دکھانے اپنے تئیں سربلند کرنے، طائفے کی لڑکی کو ذلیل کرنے کے لئے اُس کے آگے گھٹنوں کے بل جھک جائیگی۔

پاشا نے آنکھیں پونچھکر کہا، بہت اچھا، چیزیں دئے دیتی ہوں! شوق سے لیجئے۔ مگر یہ نکولائے پیرزوچ کی دی ہوئی نہیں ہیں ... اور صاحبوں نے دی تھیں۔ جیسا آپ فرمائیں ..

پھر دراز کا بالائی خانہ کھولا، ایک ہیرے کا بروش، ایک مرجان کا ہار، کچھ انگوٹھیاں اور چوڑیاں نکالیں، اور سب خاتون کے حوالے کردیں۔

"جی چاہے تو انہیں لے لیجئے، مگر آپکے شوہر نے مجھے کبھی کچھ نہیں دیا، انہیں لے کر امیر بن جائیے، گھٹنوں کے بل جھکنے کی دھمکی سے کبیدہ خاطر ہوکر پاشا کہتی رہی" اگر آپ واقعی کوئی شریف خاتون ... اُسکی بیاہتا ہیں، تو اُسے اپنے پاس رکھئے۔ میں نے اُسے نہیں بلایا وہ خود آیا۔"

آنسوؤں میں سے خاتون سب چیزوں کا جائزہ لے کر بولی۔
"یہ کافی نہیں ہیں ... انکے تو پانسو روبل بھی نہیں ملیں گے۔"

پاشا نے جوش میں آکر دراز میں سے ایک سونے کی گھڑی، ایک سگار کیس اور ہاتھ کے بٹن نکال کے پھینکدیے اور پھر ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اب میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ چاہیے تلاشی لے لیجئے!"

خاتون نے آہ کھینچی، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سب چیزیں ایک رومال میں باندھیں اور چپ چاپ اُٹھ کر چلی گئی، اجازت تک نہ لی۔

پاس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور کولیا کوف داخل ہوا۔ اُسکا چہرہ اترا ہوا تھا اور سر اضطراری طور سے ہل رہا تھا، جیسے اُس نے کوئی کڑوی چیز پی ہو، آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

پاشا نے اُس پر جھپٹ کر پوچھا "تم نے مجھ کو نسے تحفے دئیے؟ کب دئیے؟ میں پوچھنا چاہتی ہوں؟"

کولیا کوف نے سر ہلا کر جواب دیا "تحفے... انکا کیا ذکر ہے! اللہ اللہ وہ تمہارے آگے روئی، اپنے تئیں ذلیل کیا..."

پاشا نے پھر چیخ کر پوچھا "میں پوچھتی ہوں تم نے مجھے کیا تحفے دئیے؟"

"غضب خدا کا، وہ ایک شریف خاتون، ایسی خود دار، ایسی نیک، وہ اس چڑیل کے کے آگے گھٹنوں کے بل جھکنے پر آمادہ تھی! اور یہ سب میرے کرتوت ہیں! اُسکا یہ درجہ میں نے کیا!"

اپنا سر ہاتھ میں لیکر وہ کراہنے لگا

"اپنا یہ قصور کبھی نہیں بھولوں گا! اپنی یہ خطا کبھی معاف نہیں کروں گا! میرے پاس سے دور ہو۔ ذلیل مخلوق!" اُس نے نفرت آمیز طریقے سے، پاشا کے پاس سے ہٹ کر، اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے دھکا دے کر کہا "غضب خدا کا وہ گھٹنوں کے بل جھکنے کو تھی، اور... اور اسکے آگے!"

اُس نے جلدی سے کپڑے پہنے، اور حقارت سے پاشا کو ڈھکیل کر دروازے کیطرف بڑھا اور باہر نکل گیا۔

پاشا لیٹ گئی اور زور زور سے گریہ وزاری کرنے لگی اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے جوش میں آکر اپنی چیزیں کیوں دیدیں، اور اُسکے احساسات مجروح تھے اُسے خیال آیا کہ کس طرح تین سال ہوئے ایک تاجر نے مجھے بلاوجہ مارا تھا، اور وہ اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جامعہ کی چھٹی سالگرہ

(از لسان القوم مولانا علی نقی صاحب صفیؔ لکھنوی)

یوم تاسیس جامعہ ہے آج | نطق مہمانِ سامعہ ہے آج
جامعہ درسگاہِ اسلامی | دل کش شاہراہ اسلامی
قابل قدر ادارہ ملّی | زیبِ آغوشِ خطۂ دلی
چارہ گر جس کے بلکہ روح رواں | فخرِ ملت حکیم اجمل خاں
لے مسیح زماں مسیح الملک | علم کے قدرداں مسیح الملک
تم سے سرسبز باغ دہلی ہے | تم سے روشن چراغ دہلی ہے
قوم کے ساتھ وہ کیا ایثار | معترف جس کے ہیں صغار و کبار
طب کا کھولا وہ بے بہا کالج | اک زمانہ ہی جس سے مستعلج
وہ یہی ذات ہے ستودہ سیر | طب و ویدک کو ناز ہے جس پر
ویدک و طب کو کیا سمویا ہے | میل ملت کا بیج بویا ہے
قوم خوابیدہ ہو اگر بیدار | جامعہ کو ہی اک مکاں درکار
کردے سرمایہ جمع ان کے پاس | ابھی بنجائے قصر محکم اساس
ہو نقش و نگارِ آزادی | دیکھیں رنگ بہارِ آزادی
اپنی تعلیم پھر نصاب اپنا | کیوں نہ مکتب ہو کامیاب اپنا
جامعہ کی بنا پڑے جلدی | آئیں پھر ہم قیصر باغ صفیؔ
حشر تک میکدے کا نام چلے | جام گردش میں آئے کام چلے

یوں ہی جب تک کہ بادہ نوش جئیں
ہاتھ سے شیخ جامعہ کے پئیں

انسان کے قبضہ میں سب کچھ ہے اگر دل بس ہے

چلئے مگر آہستہ یہ عشق کی منزل ہے
ہر جادہ رگِ جاں ہے ہر ذرہ میں اک دل ہے

اس خاک کے پتلے کی اللہ رے خود بینی
جس رخ نظر اٹھتی ہے آئینہ مقابل ہے

سب شعبدہ بازی تھی اے چشمِ فلک تیری
لیلیٰ ہے نہ مجنوں ہے ناقہ ہے نہ محمل ہے

ہستی و عدم ان میں ہے فرق مگر اتنا
ہلکا سا ہے اک پردہ جو بیچ میں حائل ہے

دل غرقِ تفکر ہیں محو آنکھ تحیر میں
لنگر ہے تہِ دریا کشتی سرِ ساحل ہے

اک شہرِ خموشاں ہے غفلت کدۂ ہستی
کس کس کو جگائیں ہم سوتی ہوئی محفل ہے

گزرے ہوئے پانی سے چلتی نہیں پن چکّی
جب وقت نکل جائے کیا سعی سے حاصل ہے

انسان مصیبت میں ہمت نہ اگر ہارے
آساں سے وہ آساں ہے مشکل ہے جو مشکل ہے

اس دفترِ حکمت کو پڑھ کر تو ذرا دیکھو
اسلام کی گردن میں قرآن حمائل ہے

مذہب وہی مذہب ہے جو تابعِ فطرت ہو
فطرت کے مخالف ہے جو چیز وہ باطل ہے

اخلاق کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے جسنے
وہ فلسفیِ امّی کیا رہبرِ کامل ہے

جکڑا ہے قبائل کو زنجیرِ اخوت میں
دیکھا کہ تمدن خود محتاجِ وسائل ہے

اعجاز کی قوت سے پھر یہ بھی کیا ثابت
عرفان کا سرچشمہ مافوقِ دلائل ہے

افلاک بھی کانپ اٹھے جس بار کی ہیبت سے
یہ حیز وِ ضعیف انساں اس بار کا حامل ہے

وہ نور ودیعت ہے اس خاک کے پتلے میں
جو کینۂ ہستی میں اک جوہرِ قابل ہے

اس شمع حقیقت سے ہے کون و مکاں روشن
روح القدس ایک اس کا پروانۂ محفل ہے

کعبہ ہے اسی دل میں بتخانہ اسی دل میں
ہر وضع میں شاطر ہے ہر رنگ میں شامل ہے

گہ عرش کا ہمپایہ گہ فرش کا ہمسایہ
پستی سے بلندی تک اک گاہِ منازل ہے

محکوم بھی حاکم بھی مخدوم بھی خادم بھی
گر کیسۂ منعم ہو گر کاسۂ سائل ہے

میدان تجسس میں ہر قید سے وارستہ
زندان تعلق میں پابند سلاسل ہے

کہتے ہیں جسے دوزخ اک آگ کا شعلہ ہے
کہتے ہیں جسے جنت اس باغ کا حاصل ہے

دنیا کی ترقی ہے اس راز سے وابستہ
انسان کے قبضہ میں سب کچھ ہے اگر دل ہے

کیا دیکھتے ہو اپنے پہلو میں صفیؔ آخر؟
دل جس کو سمجھتے ہو وہ آبلۂ دل ہے

شذرات

یوم تاسیس کا جلسہ خیر وخوبی سے انجام کو پہونچا۔ حاضرین کی تعداد بہت معقول تھی شہر دہلی کے اکثر معزز تجار، رؤسا اور دوسرے سربرآوردہ لوگ موجود تھے۔

امیر جامعہ حکیم اجمل خاں صاحب مدظلہ العالی نے پہلی بار مجمع عام میں جامعہ کی خالص تعلیمی پالیسی اور سیاست سے بے تعلقی کا اظہار فرمایا۔ شیخ الجامعہ نے اپنی رپورٹ پڑھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ سال گزشتہ کے مقابلہ میں ہر طرح ترقی ہوئی ہے۔ خصوصاً طلباء واساتذہ کی تعداد اور نصاب وطرز تعلیم کے اعتبار سے معتمد جامعہ جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ جامعہ حقیقی معنی میں قومی تعلیم گاہ ہے۔ اور تمام فرقہ وارانہ تحریکوں سے الگ ہے۔

نومبر کے پہلے ہفتہ میں دو اہم جلسے ایک ہی تاریخوں میں منعقد ہوئے۔ کانپور میں ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ اور الہ آباد میں اورنٹیل کانفرنس کا دو سالہ اجلاس۔ جامعہ کی طرف سے ندوہ کے جلسہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور الحاج مولانا محمد سورتی صاحب اور اورنٹیل کانفرنس میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب تشریف لے گئے تھے۔

ندوہ سے جامعہ کے جو برادرانہ اور ہمدردانہ تعلقات تھے وہ اس طرح اور مستحکم ہو گئے کہ امیر جامعہ اس سال ندوہ کے جلسہ کے صدر تھے۔ جناب موصوف کا خطبۂ صدارت سچی دینداری حقیقی حب وطن، گہرے تدبر اور اخلاقی جرأت کی بہترین مثال ہے۔ غالباً یہ پہلا موقعہ ہے کہ علمائے دین کے مجمع میں مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل مثلاً تکفیر۔ پردہ۔ سود وغیرہ کے متعلق روشن خیالی اور اصلاح کا مطالبہ اس بلند آہنگی اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ

کیا گیا۔ خدا ہمارے علما کو توفیق دے کہ وہ اس مطالبہ کو پورا کریں۔

اس کانفرنس کے صدر مشہور پارسی فاضل شمس العلما جے جے مودی صاحب تھے آپ کا فاضلانہ خطبۂ صدارت تقریباً پورا "ہندوستان اور علوم مشرقی" کے عنوان سے جامعہ کے موجودہ نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ اس میں موصوف نے اس تحریک کے مختصر حالات بیان کئے ہیں جو علوم مشرق کے مطالعہ کی تاریخ میں دورِ جدید کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے بعد آپ نے ان مسائل کی تحقیق کی طرف توجہ دلائی ہے جن کے حل ہونے پر ہندوستان کی تمدنی تاریخ کا مکمل ہونا منحصر ہے۔

اس خطبہ میں ہمیں ایک بہت بڑی کمی نظر آتی ہے۔ جناب صدر نے قابل ذکر اور قابل تحقیق صرف ہند قدیم کے تمدن کو سمجھا ہے اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان سے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ موصوف قرون وسطیٰ اور عہد جدید کے متعلق ساری تحقیقات کو مؤخر اور ہند قدیم کی تمدنی تاریخ کے مکمل کرنے کو مقدم سمجھتے ہیں۔ مگر یہ طریقہ علمی تحقیقات کی فطرتی ارتقا کے بالکل برعکس ہے۔ اس لئے قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ موصوف اس کے قائل ہیں معلوم یہ ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم پر زیادہ توجہ اور قرون وسطیٰ اور عہد جدید سے بے توجہی کی صرف یہ وجہ ہے کہ موصوف کا خاص فن علم الانسان اور علم آثار قدیمہ ہے اور اسی کا رنگ آپ کے خطبہ پر غالب ہا بہر حال اگر خطبہ کے اس پہلو کا اثر ان کے کاموں پر نہ پڑے جو کانفرنس کے ماتحت کئے جاتے ہیں تو ہمیں زیادہ شکایت کی کوئی وجہ نہیں۔

کانفرنس میں مختلف مضامین پر علمی مقالات بھی پڑھے گئے۔ اور ان پر بحث ہوئی۔ زبان کے لحاظ سے ساری کارروائی چار شعبوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ سنسکرت، عربی و فارسی، اردو، ہندی

ان میں سے صرف سنسکرت کے شعبہ میں قابل قدر کام ہوا۔ اور اب تک ہوتا رہا ہے۔ بقیہ تینوں شعبے محض خانہ پری کے لئے معلوم ہوتے تھے۔ اس کا ثبوت تو یہی ہے کہ سنسکرت کا شعبہ مقالات کی کثرت کے سبب سے اور بحث میں ترتیب و تنظیم پیدا کرنے کے لئے پانچ چھوٹے شعبوں میں منقسم تھا۔ ادب۔ فلسفہ۔ تاریخ اور آثار قدیمہ، لسانیات اور علم الانسان۔ ہندی کے شعبے نے صرف ادبی بحثوں پر قناعت کی۔ لیکن اردو فارسی عربی کے شعبہ جات میں ایک ہی جلسہ میں جس کے شرکا پندرہ بیس سے زیادہ نہ تھے۔ لسانیات، ادب، قانون، تاریخ، نفسیات سب پر بحثیں ہو گئیں اور بحثیں بھی عموماً اس معیار کی جیسی کالجوں کے مباحثہ گاہوں میں ہوتی ہیں۔ بلکہ بعض ان سے پست تر۔ کانفرنس کا آئندہ اجلاس دو سال کے بعد غالباً لاہور میں ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ تمام ہندوستان کے فضلا جو عربی فارسی اردو یا ہندی سے ذوق رکھتے ہیں شریک ہو کر اور اعلیٰ درجہ کے علمی مقالات سے مستفید فرما کر کانفرنس کے ان تینوں شعبوں میں جان ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

ہم خوشی کے ساتھ اس خبر کو درج کرتے ہیں کہ تاریخ الامت کا سلسلہ جو مولانا محمد اسلم جیراجپوری نے مدارس جامعہ کے لئے لکھا ہے اور ہمارے شعبہ تصنیف و تالیف کی طرف سے شائع ہوا ہے صوبہ متوسط میں بحکم ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم تمام مدرسوں اور کتب خانوں کے لئے خرید لیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دوسرے صوبے بھی اس طرف توجہ کریں گے۔

یہ پرچہ کاتب کی علالت کے سبب سے چار پانچ دن دیر سے شائع ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام معاف فرمائیں گے۔

ع ۔ ح

چینی مسلمان چین عالم اسلامی سے ہمیشہ کچھ اس طرح الگ رہے ہیں کہ ان کے حالات سے دنیا کے مسلمان بے خبر ہیں۔ ہر چند ان میں تجارت۔ دولت۔ حکومت کے عہدے اور ریاست سب کچھ ہے اور وہ دیگر چینی آبادی سے اپنی صفات و خصوصیات میں ممتاز بھی ہیں لیکن عربی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اسلام اور اسلامی علوم کا نہ ذوق پیدا ہوا نہ مسلمانوں سے ان کو رابطہ کا وسیلہ ملا۔ اب شنگھائی سے "چینا مسلم" نامی ایک ماہوار رسالہ وہاں کی مسلم لٹریری سوسائٹی کی طرف سے چینی زبان میں شائع ہونا شروع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چین کے مسلمان بھی اپنے دوسرے ممالک کے مسلمان بھائیوں کے حالات کے شائق ہیں۔ چنانچہ اس رسالہ نے تمام مسلمانوں کو دعوت دی ہے کہ اس رسالہ میں مضامین جس زبان میں چاہیں لکھ کر بھیجا کریں۔

یہ سوسائٹی چینی زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ اور رسول پاک اور خلفاء کے حالات بھی شائع کرنے کی فکر میں ہے۔

جامعہ کے پچھلے نمبر میں جو شذرہ ولادت عیسیٰ کے متعلق ہم نے لکھا تھا۔ اس کو امرتسر کے ایک ماہوار رسالہ الفیض نے "امرتسری محرف قرآن" کے عنوان سے ہمارے نام سے لیکن بلا حوالہ رسالہ جامعہ شائع کیا ہے۔ ہمارا مقصود اس تحریر سے صرف اصلاح خیال تھا نہ کہ دل آزاری۔ لیکن رسالہ مذکور نے اس کو جس نوعیت سے قطع برید کر کے شائع کیا ہے اس سے دل آزاری کی بو آتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہم شہری ہونے کی وجہ سے یا اختلاف عقائد کی بنیاد پر اس کے اڈیٹر کو مولوی احمد الدین صاحب سے کچھ تعصب و عناد ہے کیونکہ ہم نے لکھا تھا کہ

"مجھے حیرت اور تعجب مولانا احمد الدین صاحب امرتسری پر ہے کیونکہ میرے خیال میں وہ ایک اچھے قرآن فہم اور دیدہ ور آدمی ہیں"

الفیض کے اڈیٹر صاحب نے ان سب کو حذف کر کے صرف یہ لکھا کہ

"مجھے تعجب احمد الدین امرتسری پر ہے"

کیا یہ بھی ثبوت تعصب کا نہیں ہو ؟ - اور اس ترجمہ سے اڈیٹر صاحب الفیض نے میری اہمیت کا احساس بھی تحریف نہیں فرمائی ؛

مجھے اس پر بھی شکایت نہ ہوتی اگر انھوں نے اس نقل پر رسالہ جامعہ کا حوالہ دیا ہوتا تاکہ مولانا اصل کی طرف مراجعت کر سکتے ۔

بہر حال آیندہ میں اپنے ہم عصروں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ جب کچھ ہمارے رسالے سے نقل کریں تو حوالہ ضرور دے دیا کریں ورنہ بلا حوالہ تغیر و تبدل کرکے نقل کرنے سے مجھے اندیشہ ہے کہ غلط فہمیاں واقع ہو جائیں گی

جامعہ مصریہ جو مصر کی ایک نہایت مفید یونیورسٹی تھی اس کے ارباب حل و عقد نے اب یہ تجویز قرار دی ہے کہ آیندہ سال سے اس کی تعلیمی زبان فرانسیسی ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں مغربی تعلیم یافتہ جماعت جس کو اقتدار حاصل ہے کس قدر مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی ضرورتوں سے غافل اور اپنے ملکی فلاح و صلاح کے ذرائع سے بے خبر ہے۔

ادھر جامع ازہر جو نہ صرف مصر کی بلکہ اسلام کی سب سے قدیم اور بڑی یونیورسٹی ہے اور جس کے اساتذہ کی تعداد پانچ اور چھ سو کے درمیان ہے جنمیں سے ایک بھی پچیس سے کم تنخواہ نہیں پاتا اور زیادہ کا تو حال یہ ہے کہ شیخ جامع ازہر یورپ کی بڑی سے بڑی سلطنت کے وزرا سے زائد تنخواہ پاتا ہو۔ وہ اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے بے کار ہے اور عالم اسلامی کو زیادہ فائدہ نہیں پہونچا رہی ہے ۔ اب جامعہ مصریہ اپنی جدت پسندی سے بے کار ہوا چاہتی ہے۔ وہاں اگر تفریط ہو تو یہاں افراط ۔ کیونکہ ارباب علم و عقل نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ہر ملک کی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونی لازمی ہے ۔ اسی طرح یہ بھی مسلم ہو چکا ہے کہ قدیم تعلیم اور طرز تعلیم اسی زمانہ کے مناسب حال تھی ۔ موجودہ عہد میں اس میں ترمیم نہایت ضروری ہو کیونکہ علوم کہیں سے کہیں پہونچ گئے ہیں اور بعض قدیمی علوم تو آج بالکل بے کار ہیں ۔

ہندوستان کے عربی مدارس میں بھی بالعموم یہی جمود ہے۔ ترمیم نصاب پر نہ ان کے اساتذہ راضی ہوتے ہیں نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روز بروز عربی تعلیم کو زوال ہو رہا ہے اور ملک میں اس کی مقبولیت کم ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ زمانہ کی ضروریات کے موزوں علما نہیں پیدا ہوتے۔ حامیان تعلیم کو اس کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی ضرورت ہے۔ ا۔ ج

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی، ایچ، ڈی

نمبر ۶	دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء	جلد

فہرست مضامین

[redacted]

جامعہ

جلد | ماہ جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۶ء | نمبر ۶

ڈراما

تمام فنون لطیفہ ان جذبات کے جو زندگی ہم میں پیدا کرتی ہے ادا کرنے کے الگ الگ طریقے ہیں۔ کچھ ان میں سے ایسے ہیں جن میں ہمارا مطلب پورا ادا ہو جاتا ہے کچھ ایسے ہیں جن میں اور فنون کی مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ڈراما مختلف فنوں کا مجموعہ ہے۔ شاعری نقل اور مصوری۔ شاعر آپ بیتی اور جگ بیتی سناتا ہے ایکٹر اس کہانی کی زندہ تصویر بناتا ہے اور مصور کا یہ کام ہے کہ اس زندہ تصویر کو اصلیت کا رنگ و روپ دے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس فن کی کیا اہمیت ہوگی خالص شاعری کا تعلق صرف چند جذبات سے ہے رسم و رواج نے اس پر قیدیں مقرر کی ہیں۔ مصوری بھی اسی طرح محدود ہے محض نقل کرنا کوئی اعلیٰ فن نہیں لیکن ڈراما چونکہ وہ ان فنون کا مجموعہ ہے صرف ایک قسم کے یا ایک شخص کے جذبات سے تعلق نہیں رکھتا وہ ایک آئینہ ہے جس میں ہم پوری دنیا اور ساری زندگی کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس فن کے موجد یونانی تھے جن کیلئے اپنی فطرت پر غور کرنا انسانیت کا

[illegible] یونان کی [illegible] [illegible] اپنی اصلیت کی تلاش میں نکلے تھے اور بہت دور تک پہنچ گئے [illegible] [illegible] جو اس سے انکا [illegible] حصول ہو۔ کہ اگر ہم اپنے آپ کو سمجھنا چاہتے ہیں [illegible] [illegible] خواہش ہے کہ زندہ رہیں اور وہ بھی کوئی خاص طریقہ [illegible] تو ہم کو بھی اپنی اصلیت کو [illegible] [illegible]

میرا ارادہ ہے کہ اس مضمون میں یونانیوں کے زمانے سے اس وقت تک ڈراما کی مختصر سی تاریخ اور اس فن میں جو اصولی تبدیلیاں کی گئی ہیں بیان کروں۔ میرے خیال میں اگر ہم ڈراما کو اور اس کو [illegible] حصوں میں تقسیم کر لیں اور ان پر الگ الگ غور کریں تو اس کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

ڈراما کا مضمون شاعر طے کرتا ہے، یعنی زندگی کے ان پہلوؤں اور مسئلوں کو جو ان کے نزدیک اہمیت رکھتے ہیں وہ دیکھنے اور پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

یونانی ڈراما نویسوں ایس کلیس، سوفوکلیس، یوریپڈیس نے زیادہ تر انسان اور اس کی فطرت کی طرف توجہ کی ہے۔ انہوں نے ان جذبات کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے جو زندگی کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ جو ایک طرح سے ہماری زندگی کی بنیاد ہیں۔ ان کے مضمون وہ روایات اور کہانیاں ہوا کرتی ہیں جنہیں ان کے زمانہ کا ہر شخص جانتا تھا۔ لیکن باوجود یکہ یہ زیادہ تر دیوتاؤں کا کھیل اور مذاق معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈراما نویس کا اصل مقصد کہانیوں میں جو انسان شامل ہیں ان کے جذبات بیان کرنا ہے۔ بعض ڈراموں میں (مثلاً سوفوکلیس کا "اگامنان") مضمون کا مرکز صرف انسان کا جذبہ ہوتا ہے جس میں دیوتاؤں کا کوئی دخل نہیں۔

یوریپڈیس کا ڈراما Iphegenaia in Taurus ایک لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے باپ اور وطن سے دور ایک بیگانہ دریا کے مندر میں قید ہے [illegible]

[illegible] گئے ہیں۔ اور ان کی بیویوں کی تصویر سے کلیجہ پھٹا جاتا ہے" ایفی گینیا"
[illegible] عجیب سنسناہٹ پیدا کرتا ہے، جی چاہتا ہے کہ اوسی وطن کو واپس چلے جائیں جہاں کی
[illegible] "ایفی گینیا" کی تصویر ابھی تک تڑپتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

یونانی ڈراموں میں فطرت سے بالا قوتوں کا بہت دخل ہے، ہمارے زمانے کے لوگ جو خدا کی قدرت کے بغیر ثبوت کے قائل نہیں ہوتے اور زندگی کے معمولی واقعات سے اپنے تصور کو محدود کرنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے ڈراما نہیں لکھتے، اور اس کو ایک طرح سے بیکار سمجھتے ہیں۔ اس مسئلہ پر بحث بعد کو ہوگی یہاں پر یہ کہنا کافی ہے کہ یونانی ڈراما میں فطرت سے جو بالا حصہ ہے، اوس کی وجہ سے اس کے اصل مقصد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور جن جذبات کا ذکر ہوتا ہے وہ مصنوعی یا ناممکن نہیں بن جاتے۔ افی گینیا کو اُس کا باپ قربان کرنا چاہتا تھا، کہ ہوا کا رُخ بدلے اور یونانی جہاز فوج کو لیکر سمندر پار کر سکیں اوس کو 'ارتیمس' دیوی چھری کے نیچے سے نکال لے گئی اور یونان سے دور 'طارس' کے ایک مندر میں اپنی پوجا کرنے کے لئے اوس کو مقرر کر دیا۔ لیکن اگر ہم کو یہ معلوم بھی ہو کہ افی گینیا اُس عجیب ڈھنگ سے طارس پہونچی ہے، پھر بھی اوس کے غم کا اثر ہم پر اتنا ہی ہوتا ہے، بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خداؤں اور انسانوں، فطرت اور فطرت سے بالا قوتوں میں جو بے تکلفی یونانی ڈراماؤں میں دکھائی جاتی ہے، وہ ایک لحاظ سے آجکل کے یوروپین ڈراما سے زیادہ اصلیت سے قریب ہے خاص طور سے اون لوگوں کے لئے جو اپنی عقل اور اپنی سمجھ کو زندگی کے تمام مسئلوں کو طے کرنے کے لئے کافی نہیں پاتے۔ یونانی ڈراما اوسی انسان کی تصویر بناتے ہیں جو تقدیر یا فطرت سے بالا قوتوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا سا ہے جسکی تدبیروں اور تمناؤں کا پورا ہونا ہمیشہ اوس کی طاقت سے باہر رہتا ہے، یعنی اونہوں نے اپنی زندگی کی تصویر کو وہ زمین دی ہے جو چاہے سائنس کے لحاظ سے غلط ہو۔ لیکن ہمارے ذاتی تجربے سے صحیح ہے۔

یونانی تمدن کی تباہی کے بعد یورپ کے لئے ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب آدمی کو اطمینان ہوتا حاصل نصیب نہیں ہوتا، اور تمام فنون لطیفہ غائب ہو جاتے ہیں۔ ادبی پنرجنم (نشاۃ ثانیہ) تک یورپ کی قومیں اس قابل نہیں ہوتیں کہ فن ڈراما کی طرف توجہ کریں لیکن جب پنرجنم کی تحریک چل چکی ہے اور تعلیم ایک حد تک عام ہو جاتی ہے تو ڈراما بھی فنون میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور شروع ہی میں ہم کو ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے جس نے ابھی تک ساری دنیا کو حیرت میں رکھا ہے۔

شیکسپیر میں وہ خاصیت پائی جاتی ہے۔ جو جینیس کی خاص پہچان ہے۔ اگر وہ صرف شاعر یا صرف ڈراما نویس یا صرف نفسی ہوتا تو ہماری نگاہوں میں اوس کی کچھ زیادہ وقعت نہ ہوتی، لیکن وہ ایسا ہمہ گیر تھا اور ایک فن کی کمزوری دوسرے فن کے ذریعے سے اس طرح پوری کر سکتا تھا کہ اوس کو genius سے کم سمجھنا بے انصافی ہے۔ اگر آپ King Lear سے چند تقریریں نکال دیں تو اس ڈراما کی کوئی حیثیت نہیں رہتی یا محض نفسیات کے نقطۂ نظر سے وہ بناوٹ اور مبالغہ ہے، اوس کا تخیل کچھ زیادہ بلند نہیں۔ لیکن اگر پورے ڈراما پر نظر ڈالو تو یہ کہنا ناممکن ہے کہ یہ ڈراما دنیا کے بڑے ادبی کارناموں میں نہیں۔

پھر بھی ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یونانی ڈراما سے آگے شیکسپیر نے بہت کم قدم بڑھایا ہے۔ اوس نے انسان کی فطرت کے کوئی اور بھید نہیں دریافت کئے۔ زندگی کے مسئلہ کو اوس نے حل نہیں کیا جو کچھ فضیلت اوسے یونانیوں پر ہے وہ تکنیک فن اور شاعری کے لحاظ سے ہے، اور شاعری کے اس پہلو کو نہ ڈراما سے کوئی خاص تعلق ہے۔ اور نہ شیکسپیر نے پیدا کیا ہے۔ یونانی ڈراماؤں میں ایک قصہ ہوتا تھا جو ایک انتہا پر پہونچکر اچانک ختم ہو جاتا تھا۔ شیکسپیر نے خاص پلاٹ کے علاوہ ایک یا دو ضمنی پلاٹ بھی قصہ میں شامل کر دئے اسی سے دلچسپی بھی بڑھ گئی۔ اور زندگی سے ڈراما کا جو رشتہ ہے۔ وہ بھی زیادہ گہرا ہو گیا۔ موجودہ زمانے کے ڈراما نویس قصہ کہانی سے گھبرا گئے ہیں (Positivism) کے سلسلہ میں یہ بھی طے کر لیا ہے کہ زندگی کے سمجھنے کے لئے علاوہ واقعات کے کسی اور

تخیل پر پہرا بٹھا دینا غلط ہے۔ فلسفیانہ خیال آرائی ایک قسم کا گناہ ہو گیا ہے، ایک حد تک یہ نظریہ ٹھیک ہو کہ اصلیت سے چھوڑ کر ایک طلسم ہوشربا میں پناہ لینا ہمت مردانہ کے خلاف ہو، اور ایک تخیلی دنیا کی خوشی اس دنیا کے آنسو نہیں پونچھ سکتی۔ لیکن موجودہ ڈراما نویسوں نے سوائے ہمت دکھلانے کے اور کچھ نہیں کیا، اور وہ واقعات اور اصلیت جس کے پیچھے وہ دوڑے تھے آ گیا بیتال کی طرح اگرچہ نظر سے کبھی غائب نہ ہوئی۔ لیکن اون کی پہونچ سے باہر رہی۔

شیکسپیر پر برنارڈ شا کا جو اعتراض ہے اور جو اعتراض موجودہ یوروپین لال بجھکڑوں کا ہے کہ اوس کے مضمون ہماری عام زندگی کے لحاظ سے گرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل بالکل غلط ہے، جیسے جغرافیہ داں کو اجازت ہے کہ وہ زمین کو پہاڑوں پر سے اور سطح پر سے دیکھے اور جانچے ویسے ہی شاعر کو اس کا حق ہے کہ وہ زندگی کو ہماری پستی اور اپنی بلندی سے دیکھے۔ دراصل جو اعتراض نتیجہ پر کرنا چاہئے وہ لوگ طرز عمل پر کرتے ہیں۔ شیکسپیر کا اگر یہ مقصد تھا کہ وہ انسان کی فطرت ہمارے سامنے کھول کر رکھے اور اوس کی خاصیتیں یا بھید سمجھائے۔ جیسے بیوپاری اپنے مال کی تو وہ بہت کچھ بتانا بھول گیا Othello میں رشک بھرے مزاج کی تصویر ہے، Lear میں ایک "طوفانی" طبیعت کی Macbeth میں ایک مجرم کی فطرت کی عجیب و غریب تحلیل ہے، لیکن ایسے لوگ کم ہیں ان کی طرف توجہ کرنے کا حق شاعر کو اوسی وقت ہے، جب وہ زندگی کے زیادہ اہم مسئلوں پر غور کر چکا ہو، شیکسپیر کے کسی ڈراما میں اون جذبات کا ذکر نہیں جو دنیا کو تمام سمجھدار لوگوں کو پریشان کرتے رہے ہیں۔ یعنی مذہبی جذبات۔ زمانہ کی چلتی چکی سب کچھ پیس رہی ہے، ہم کو شانتی اگر کسی طرح مل سکتی ہے تو مذہبی خواہشوں کو پورا کرنے سے، اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ عقیدے کا فیصلہ ہو جائے یا کوئی دین مقرر کر لیا جائے۔ یہ سب تو انہیں لوگوں کے لئے ہیں۔ جو شیطان سے ڈرتے ہیں، یا ہمسایوں سے لڑنے کے لئے ڈھونڈا چاہتے ہیں۔ مذہبی خواہشوں کے پورا ہونے سے میرا مطلب یہ ہے کہ انسان

اپنی زندگی کا ایک تصور دیتا ہے جس کے وہ لائق ہو اور جس کی اہمیت کا وہ معترف ہو، ان کی طرفداری ہو رہا ہے جو ان کی بے ترتیبی اور بے پروائی کا تصور کرکے بھی قائل رہے، اس دنیا کی زندگی میں شیکسپیئر ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔ بلکہ اور ہم کو ہماری اصلیت سے ہٹاتا ہے، زندگی کی وسعت اوس سے غلط بیانی وہ محض چند جذبوں کی جولانگاہ نہیں، ہماری فطرت کو بھی وہ غلط سمجھا جن جذبات میں ہم مجبور رہتے ہیں اور جن کی اہمیت کا ہم کو اقرار کرنا ہوتا ہے، اون کو وہ مخاطب کیے دیتا ہے۔ اور جن زنجیروں کو ہم توڑنا چاہتے ہیں اون کو وہ اور جکڑ دیتا ہے، اور آسمان پہ بجائے قدرت کے نور کے ہم کو آتشبازی دکھاتا ہے۔

لیکن جہاں شیکسپیئر ہمیں دھوکا دیتا ہے وہاں موجودہ زمانہ کے ڈراما نویس کچھ زیادہ سچ نہیں بولتے، میں نے عرض کیا تھا کہ واقعیت کی تحریک اس زمانہ کی ادبی زندگی پہ راج کر رہی ہے، مگر واقعات کا بیان کرنا اور اون کا سمجھنا ایک ہی چیز نہیں گھر بیٹھے اخلاقی اصول بنا لینا تو ضرور غلط ہے۔ لیکن واقعات جمع کرکے اگر ہم نے اخلاقی اصول تیار نہ کیے، یا اگر واقعات کی تلاش کے بعد ہم کسی ایسے نتیجہ پر نہ پہونچے جو اون کے معنی سمجھا سکے تو ہماری دوڑ دھوپ بالکل بیکار رہی، ابسن کے زمانے سے اب تک مغربی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ہوگا جس کو کسی نہ کسی نے ڈراما کی صورت میں نہ پیش کیا ہو، لیکن صرف اس وجہ سے کہ مذہب اور روحانیت سمجھ اور خاص اخلاقی طاقت جو مذہب ہم کو دیتا ہے ادبی زندگی سے نکال دئے گئے ہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یورپ کی قوموں نے اپنی زندگی کے کسی مسئلہ پہ پوری طرح سے غور نہیں کیا۔ ..

Realism کی تحریک کا بانی ابسن ہے، موجودہ ڈراما نویس اس پہ فخر کرتے ہیں کہ وہ ابسن کے مرید ہیں اور اوس کے دین کو پھیلاتے ہیں۔ مگر اون کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ابسن نے جو انقلاب ادبی دنیا میں پیدا کیا وہ بالکل دوسرا تھا اگر اوس نے اپنے ڈراماؤں کے ذریعے سے اون ڈراما نویسوں کی کمزوری دکھلائی ہے۔ تو وہ یہ نہیں کہ اونھوں نے واقعات کی طرف کافی توجہ نہیں کی بلکہ یہ کہ اون کی اخلاقی تعلیم ناکافی تھی یا اوس کا زندگی سے کوئی تعلق تھا۔

شیکسپیر کی عورتیں تو بالکل معمولی ہیں یا ایک خاص قسم کا مزاج رکھتی ہیں جو زندگی میں بہت کم نظر آتی ہے اور جس کی طرف توجہ کرنا بیکار سا ہے یا اوس سے بہ لالی صورتوں پر جنسے لوگ وا قف تھے۔ نمایندگی ہو جاتی ہے۔ اوس کی Comedies کی جتنی عورتیں ہیں وہ عاشق ہیں۔ شادی کرنے کی فکر میں ہیں لیکن کچھ ایسی پیچیدگیاں بیچ میں حائل ہو جاتی ہیں کہ شادی فوراً نہیں ہو سکتی اور اسکی وجہ سے شاعر کے لئے ڈرامہ لکھنا ممکن ہو جاتا ہے۔ شیکسپیر کے بعد تمام Comedies کا اصل مقصود یہی ہے۔ شیکسپیر کی Tragedies میں جو عورتیں ہیں اون کی اہمیت کو میں ابھی تک نہیں سمجھا ہوں، لیکن اون کی تعریف بہت سنی ہے، میں ایک کیریکٹر کا ذکر نہیں کر سکتا، یہ کہہ دینا میرے خیال میں کافی ہے کہ شیکسپیر نے عورت کی فطرت پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی۔ صدیوں کے دوست اور دشمن اور وہ بھی اوچھے قسم کے جو صدیوں سے بیان کرتے چلے آتے تھے اوسی کو اوس نے ایک ایسے طریقہ سے بیان کر دیا ہے کہ ہم اوس کے طرز بیان سے متاثر ہو کر اوس کے مضمون کی کمزوری کو بھول جاتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں ابسن کی "Lady of the Sea" کو دیکھئے ایک لڑکی ایک ملاح پر عاشق ہو جاتی ہے، ملاح شہر سے چلا جاتا ہے، اور کئی سال تک لڑکی کو اوس کی خبر نہیں ملتی، اور بعد میں اوس لڑکی کی شادی بھی ہو جاتی ہے، لیکن اوس ملاح کی خیالی تصویر اوس کے دل میں موجود رہتی ہے اور سوا اس امید کے کسی دن وہ آکر اوسے اپنے ساتھ لیجائے گا، اوسے زندگی میں کوئی اور دلچسپی نہیں رہتی، کئی سال بعد وہ واقعی پھر اوس شہر میں آتا ہے، اور اس کے گھر والے سے بلانے کے لئے بھی پہونچتا ہے۔ لیکن جب کچھ جھگڑے کے بعد اوس کا شوہر جو ہمیشہ اوس کے ساتھ سختی سے پیش آتا تھا اوسے گھر چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت دیدیتا ہے۔ تو اوس کی طبیعت پلٹ جاتی ہے، وہ ملاح جس کو اوس نے ایک کامل معشوق بنا رکھا تھا اب اوس کی نظروں میں ایک معمولی ملاح بن جاتا ہے اور اس کی محبت بالکل دل سے غائب ہو جاتی ہے، یہ صرف ایک خاص عورت کی طبیعت کی نہیں بلکہ انسان کی فطرت کی ایک سچی تصویر ہے، ہم سب کی یہ خاصیت ہے،

کرخیالی معشوقوں کے پیچھے دوڑیں اور زندگی پر اس کا الزام لگائیں کہ وہ ہم کو نہیں ملتے، اور ہماری آنکھیں اوسی وقت کھلتی ہیں۔ جب ہم کو وہ اپنی اصلی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔

"گڑیا کا گھر" Doll's House میں ابسن عورتوں کی جو حیثیت خاندانی یعنی اپنے مکانوں میں ہوتی ہے، اوس کا ذکر کیا ہے۔ اور کچھ بھی کہئے اوس کا یہ خیال کہ عورتیں ایک قسم کی زندہ گڑیاں ہیں۔ جن کے ساتھ ہم کھیلتے ہیں صحیح ہے، فرق صرف اتنا ہی کہ اس کے ذمہ دار صرف ہم نہیں بلکہ عورتیں خود بھی ہیں، اور یہی ابسن نے اپنے ڈراما میں دکھایا بھی ہے۔ ہم نے عورتوں کو گڑیاں بنایا لیکن اون کی خطا یہ ہے کہ اونہوں نے اس کی نہ کوئی شکایت کی اور نہ اس تہمت کے دور کرنے کی کوشش۔

عورتوں کی ان تصویروں کا شیکسپیر کی کسی ہیروین سے مقابلہ کر لیجئے، اور اب یہ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اخلاقی لحاظ سے کس کی اہمیت زیادہ ہی، اور اس لئے آرٹ کے نقطۂ نظر سے بھی۔ شیکسپیر اور ابسن میں ایک اور بڑا فرق یہ ہی کہ جہاں شیکسپیر نے انسانی فطرت کی تصویر شوخ رنگوں میں تماشے کے لئے کھینچی ہے وہاں ابسن نے ہماری فطرت کے ا‍ ‍خفی پہلوؤں پر غور کیا۔ جن کا زندگی پر زیادہ اثر رہتا ہے، اور زندگی کی ا‍ ‍خفی شکلوں پر جو عام طور سے ہیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ ان تمام فرقوں کی بنیاد در اصل یہ ہے کہ شیکسپیر نے معمولی زندگی کی اہمیت کا کوئی اقرار نہیں کیا اور ابسن پہلا شخص ہی، جس نے اس کی اہمیت دکھلائی

لیکن جتنا فرق ابسن اور شیکسپیر میں ہے اوتنا ہی ابسن میں اور آجکل کے ڈراما نویسوں میں ہے، ابسن کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ انسان کامل کی تصویر موجود رہی ہے۔ اور زندگی پر جو اعتراضات اوس نے کئے ہیں اون کی بنیاد اسی تخیل پر ہے۔ موجودہ ڈراما نویس زندگی کے واقعات تو ضرور بیان کرتے ہیں۔ لیکن ایک نئی دنیا بنانے کی اون میں نہ خواہش ہے نہ جرأت۔

یہاں تک جو میں نے بیان کیا ہے اس کو ایک لحاظ سے ڈراما کا یونانی نظریہ کہا جا سکتا ہی۔

اس کے بالکل برخلاف روسی نظریہ ہے، یہ دونوں مختلف نظریوں کی صورت میں کہیں اور کبھی نہیں مل سکتے گئے، لیکن روسی اور دوسرے ڈراما نویسوں میں ایسے اصولی اختلاف ہیں کہ ان کو ایک سمجھنا میرے نزدیک غلط ہے۔ یونانی ڈراما زندگی کو ہمارے جذبات کا ایک مجموعہ تصور کرتا ہے۔ برعکس ڈراما ہم کو اور ہمارے جذبات کو زندگی کے عظیم الشان سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہریں، یونانی ڈراما میں انسان زندگی کو بگاڑتا اور بناتا ہے۔ روسی ڈراما میں زندگی انسان کو۔ ان دونوں نظریوں میں سے یہ کہنا مشکل ہے کہ کون زیادہ صحیح ہے یا کون ہماری رہبری زیادہ کامیابی سے کر سکے گا اس معاملہ میں سوائے اپنی اپنی پسند کے کوئی اور معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

روسی ڈراما نویس چونکہ ساری زندگی کی تصویر دکھانا چاہتے تھے اسلئے اونہوں نے تماشہ اور تماشہ گاہ کے فنی پہلو کی طرف خاص توجہ کی اور اس کو کمال پر پہونچا دیا۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لئے ہم کو پھر خاص یونانی ڈراما تک واپس جانا پڑے گا۔

یونانی تھیٹر بہت بڑے ہوتے تھے۔ اور ہمیشہ کھلے میدان میں۔ تماشہ گاہ بیچ میں ہوتا تھا اور چاروں طرف نشست گاہ اون کے تماشے چند لوگوں کے لئے نہیں بلکہ پورے شہر کے لئے ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے ایکٹر پیروں میں اونچی کھڑاؤں پہنتے تھے اور بڑے بڑے چہرے لگا لیتے تھے Staging اوس زمانے میں بالکل نہیں تھی، اوس کی بجائے بڑے ایکٹروں کے چاروں طرف ایک کورس کھڑا رہتا تھا۔ جو کبھی اون کی باتیں دوہراتا تھا کبھی اون پر اپنی رائے ظاہر کرتا تھا۔ یعنی وہ جذبات جن کو موجودہ زمانہ میں تماشاگاہ پر مختلف منظروں وغیرہ سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اون کے یہاں کورس کرتا تھا۔

مضمون کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سادہ سامان یونانی ڈراما نویسوں کی ضرورت کے لئے بالکل کافی تھا، زیادہ تر جن جذبات کی وہ تصویر بنانا چاہتے تھے وہ سادے ہوتے تھے اون میں یکرنگی، جوش و خروش اس قدر ہوتا تھا کہ وہ آسانی سے دکھائے جا سکتے تھے، یونانی فطرت اثر پذیر ضرور تھی۔ لیکن جو پیچیدگیاں ہماری فطرت میں زمانہ نے پیدا کر دی ہیں وہ اون میں

نہیں ہونی چاہئیں۔

شیکسپیر کے وقت تک اسٹیج چھوٹا ہو گیا تھا۔ اور تھیٹر بھی صرف چند لوگوں کے لئے مخصوص ہو تا تھا کورس غائب ہو جاتا ہے۔ اوس کی بجائے بڑے ایکٹر کے لئے اسٹیج سے سامعین و تماشبین کی طرف کو ایک چھوٹا سا چبوترا جس پر وہ آکر اپنی تقریریں بڑے اہتمام سے سنایا کرتے تھے۔ اسی لئے شیکسپیر کے ڈراموں میں اس قدر تقریریں ہیں اور اسی لئے اوس نے اون کی طرف شاعرانہ توجہ بھی بہت کی ہے۔ لیکن جگہ وقت وغیرہ دکھانے کے لئے کوئی ترکیب نہ تھی عام طور سے تماشہ گاہ کی تینوں طرف پردے ہوتے تھے، اور سامنے ایک بورڈ لگا ہوتا تھا جس پر وقت اور جگہ کا بیان لکھا ہوتا تھا۔

اگر ہمارے سامنے آجکل یونانی یا شیکسپیر کے طریقے پر تماشا کیا جائے۔ تو ہمیں اوس میں بہت کچھ غلط اور ناکافی اور مصنوعی معلوم ہوگا۔ غلط اور ناکافی اس وجہ سے کہ یونانی ڈراما کے جذبات جیسا ہیں نے عرض کیا ہے۔ یک رنگ تھے، اور یہ ایک رنگ بہت شوخ ہوتا تھا۔ اور شیکسپیر کے ڈراما اگرچہ اس قدر یک رنگ نہیں لیکن پھر بھی اوس کے جذبات میں مبالغہ بہت ہے۔ اس مبالغہ کی ایک خاص وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ staging کی کمزوری اگر لفظوں نہ پوری کی جاتی تو ڈراما کا اثر کافی نہ ہوتا۔ جس زمانے میں انسان کی فطرت سادہ تھی یہ سب کھپ جاتا تھا۔ لیکن ہماری طبیعت بہت بدلی ہے اور ہم میں یہ خواہش بھی پیدا ہو گئی ہے کہ ہر چیز کو اوس کی اصلی صورت میں دیکھیں عام طور سے ہم اس قدر مبالغہ اور چلا کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے جیسا کہ ہم کو اسٹیج پر دکھایا جاتا ہے۔

مبالغہ سے زیادہ ہم کو یونانی اور شیکسپیر کے ڈراما کی بناوٹ پر اعتراض ہوتا ہے۔ یورپ میں کوئی ۵۰ سال سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ جیسے ڈراما میں زندگی کی تصویر ہوتی ہے ویسے ہی اسٹیج بھی دنیا کی تصویر ہو اور جیسے ڈراما میں مبالغہ سے بچنا چاہئے۔ ویسے ہی اسٹیج پر ہم کو ہر چیز کو اوس کی اصلی شکل میں دکھانا چاہئے۔ اور ہر بات کو معمولی لہجہ میں کہنا۔ اسنگ جو ناقد کی حیثیت سے بہت مشہور رہا staging کے تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اوس نے یہ کوشش کی کہ اس فن میں جو خواہ مخواہ کا ٹھاٹھ شامل ہو گیا تھا اوسے دور کرے، اور جہاں تک ممکن ہو وہ ارد گرد کی چیزیں

جو شاعرانہ پاٹ ڈراما کے لئے مخصوص کی ہوں انہیں اصلی شکل میں دکھلائے اور ہر چیز پر بھڑکیلی کی تہہ چڑھا دے۔ اگر آپ کو ٹھاٹھ اور بناوٹ اسٹیج پر دیکھنا ہو تو کسی ہندوستانی تھیٹر میں چلے جائیے۔ Acting اور staging کا ڈراما کے مضمون سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ان کا اظہار شیکسپیئر بھا ہی اوس کا ذکر میں کر چکا ہوں لسنگ کی Realism کی تحریک کے ساتھ ہی acting میں ایک انقلاب ہوتا ہے۔ لوگ بیکار ادھر ادھر ہاتھ پیر نہیں پھینکتے اپنی حالت کا اظہار عجیب عجیب شکلیں بنا کر نہیں کرتے، اگرچہ اس زمانہ میں بھی ایکٹروں کے اشاروں اور gestures بھاؤ وغیرہ میں بہت بناوٹ پائی جاتی ہے، لیکن یورپ کے بہتر ناقد اور تماشہ دیکھنے والے اسے پسند نہیں کرتے۔

حقیقت کی نقل اور فطرت کی مطابقت میں ان چیزوں کا اگر کافی خیال رکھا جائے تو یونانی اسکول کے ڈراما کی staging اور acting کافی کامیابی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اس میں جو تبدیلی روسی تھیٹروں نے پیدا کی ہے اوس کی وجہ اور تھی۔

میں نے اوپر بیان کیا تھا کہ روسی آرٹسٹ ڈراما میں اپنا الگ نظریہ رکھتے ہیں، اونہوں نے اپنے نظریہ کو عملی صورت موسکو آرٹ تھیٹر میں دی ہے۔ اور ان کے ڈراما نویس استرووسکی اور چیخوف ہیں۔

استرووسکی اور چیخوف کے لئے واقعات کی کوئی خاص وقعت نہیں، زندگی کے عام مسئلوں کی طرف بھی وہ کوئی توجہ نہیں کرتے۔ اون کے نزدیک انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا اور زندگی سے اوس کا جو رشتہ ہے اوس پر غور کرے، اوس کی فطرت اور اس کے جذبات اسی قدر قابل ذکر ہیں جس حد تک اُن کا اس معاملہ میں دخل ہے۔ staging اور acting پر جو اثر اس کا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بجائے نقل کرنے کے اور دوسرے کی کھینچی ہوئی تصویر تماشائیوں کو دکھانے کے وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ تماشا دیکھنے والے پر اپنے جذبات اور خیالات اور زندگی جس شکل میں اون کو نظر آئی ہو اوس کا اثر ڈالیں۔ بجائے اس خیال کے لوگ اپنے آپ کو عام طور سے Idealists کہتے ہیں۔

... اندھیٹروں میں یہ قاعدہ ہو کہ جب وہ کوئی ڈراما دکھانا چاہتے ہیں تو جو ہدایتیں ڈراما نویس نے [illegible] تک کے معاملہ میں دی ہوں وہ حرف بحرف پوری کی جائیں۔ مختلف [illegible] یا [illegible] کے لئے جو ایکٹروں کے نزدیک مناسب ہوتے ہیں وہ اون کو دے دیتے ہیں اور چند آزمایشی کھیلوں کے بعد ڈراما پبلک کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔ Idealist اسکول کے مسلک کے بالکل منافی ہے وہ پہلے تو خود ڈراما دکھانا چاہتے ہیں اوس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اوس کا اون پر جو خاص اثر ہوتا ہے اوس کو پوری طرح سے سمجھ لیتے ہیں اور اس کو ظاہر کرنے کے لئے [illegible] وغیرہ میں بھی اگر ضروری ہو تو تبدیلیاں کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ایکٹر سب جمع ہو کر آپس میں حصے تقسیم کر لیتے ہیں۔ اور محض یاد نہیں کرتے بلکہ آپس کی زندگی میں ایک دوسرے سے اوسی طرح پیش آتے ہیں جیسے وہ کیرکٹر جن کو وہ اسٹیج پر دکھانا چاہتے ہیں۔ آزمایشی کھیل میں ایک یا دو مشیر بھی ہوتے ہیں۔ جو تماشہ دیکھنے والوں اور آرٹسٹ دونوں کی نظر سے اون کی acting میں اصلاح دیتے ہیں۔

یہ طریقہ اوسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب ایکٹر ایک مستقل حلقہ سا بنا لیں۔ اور اپنی زندگی کا خود انتظام کر سکیں اندریو یا استانیسلاوسکی ذو تھیٹر کا بانی ہے۔ اوس کے گرد چند ہم خیال لوگ جمع کئے۔ اور Idealist نظریہ کے مطابق اونہوں نے ڈراما دکھلانا شروع کیا۔ چند سال کے بعد اون کو چیخوف جیسا ڈراما نویس بھی مل گیا۔ اور تھیٹروں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایکٹر ڈراما کے مضمون اور تماشائی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنا پارٹ یاد کیا ہے۔ اور اب کھڑا منتظر ہے۔ موسکو آرٹ تھیٹر میں یہ کشاکش نہیں ہوتی، کیونکہ تھیٹر کے باہر بھی ایکٹر سب ساتھ رہتے ہیں، اور چونکہ acting میں صرف دوسرے کے جذبات ظاہر کرنا شرط نہیں۔ بلکہ اون جذبات کو بڑی حد تک ایکٹر کو اپنانا بھی ہوتا ہے۔ اس لئے الفاظ اور حرکتوں کے معاملے میں بھی کافی آزادی ہوتی ہے۔

Staging' Acting اور مضمون میں اس جماعت نے ایک حیرت انگیز تال میل پیدا کی ہے۔

اور اس وقت اگر کوئی تھیٹر دنیا میں ہے تو وہ موسکو آرٹ تھیٹر ہے۔

ڈراما کی یہ ایک مختصر سی تاریخ ہے۔ اس میں بہت کچھ رہ گیا ہے، فن ڈراما نویسی کی کئی عظیم الشان شخصیتوں کا نام بھی نہیں لیا گیا۔ اس وقت جو نئی تحریکیں شروع ہوئی ہیں expressionist اور impressionist وغیرہ جنہوں نے ڈراما کو بالکل بدلنا چاہا ہے۔ اون کا بھی کچھ ذکر نہیں ہوا۔ لیکن ایک مضمون میں یہ سب شامل کرنا مشکل تھا، اور میرا مطلب صرف ایک سلسلہ کو شروع کرنا تھا، بعد کو یہ سب ہوتا رہے گا۔ اگر آپ حضرات نے اس میں کافی دلچسپی لی۔

ڈراما اور عام طور سے فنون لطیفہ کی اہمیت کا اقرار تو سب کو ہے۔ لیکن اون کی طرف توجہ کوئی نہیں کرتا، یہ کام خاص طور سے آپ لوگوں کا ہے کہ ان میں آپ محو ہو جائیں۔ اور دوسروں کو بھی محو کریں۔ اور قوم کو جو ان سے روحانی اور اخلاقی فائدہ پہونچنا چاہیے وہ پہونچائیں ؞

ستی

"ستی" کے لفظی معنیٰ ہیں "پچی" لیکن جس طرح بعض الفاظ کے مجازی معنیٰ ان کے اصلی مطلب کو بھلا دیتے ہیں، اسی طرح لفظ ستی بھی ایک خاص رسم کے ساتھ مخصوص ہوگیا ہے اس کا مراد وہ قربانی ہے، جو نیک استریاں اپنے پتی کی موت پر کرتی ہیں، یہ ان کے جذبۂ صادق کی صحیح تصویر، ان کی محبت کا روشن آئینہ، ان کے ایثار کا علمی ثبوت، اور ان کی وفاداری کا نمونہ ہے، کیا ہندوستانی شاعری ستی کے واقعات میں اپنے لئے کچھ نہیں پاتی جو اسے لیلیٰ و مجنوں، شیریں، و فرہاد کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے، بہرصورت اس وقت ہمارا موضوع تاریخی ہے، اور اسلئے ہمیں ستی کی رسم کو تاریخی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ اس رسم کی نمایت کیا تھی ستی کی اصل وجہ سمجھنے کے لئے ہمیں عورت کے درجہ کو جو اسے ہندوستاں میں پرانے زمانے میں حاصل تھا معلوم کرنا چاہیئے عورت کا وجود محض نسل انسانی کی بقا کے لئے ضروری سمجھا گیا۔ اس کے لئے یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ عمر بھر ایک ہی شخص کے دامن سے وابستہ رہے۔ یہ بندھن مذہبی ہے جو کسی طرح دنیاوی معاہدوں کی طرح توڑا نہیں جا سکتا۔ مرد عورت کا ظاہری دیوتا ہے۔ اس کی خدمت کا خیال نیک ترین جذبہ ہے۔ مرد ہی عورت کے لئے پشت پناہ ہے، ان تخیلات کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ عورت مرد کے ساتھ فنا ہو جائے اور اس کی صورت ہمیں ستی میں نظر آتی ہے۔

پھر ایثار نفس بہترین عبادت سمجھا جاتا تھا۔ مرد طرح طرح سے جان دیتے تھے، اور انکی عزت کی جاتی تھی، قوم کے شہیدوں میں ان کو درجہ ملتا تھا۔ عورت کے لئے ہیروئن بننے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو شوہر کے ساتھ جلا کر خاک کر دے۔ ہمیں یہ رسم بہادر قوموں میں زیادہ نظر آتی ہے، مثلاً ہندوستان میں راجپوت سب سے بہادر سمجھے جاتے تھے

ان میں بکثرت اس کا رواج تھا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ستی ہمارے ملک کی چہار دیواری کے باہر نظر نہیں آتی۔ یا اسے برہمنیت سے کوئی خاص تعلق ہے۔ اور اس مذہب کے ساتھ ساتھ ستی کی رسم بھی پیدا ہوئی۔ اس کا خیال دراصل پہلے سے موجود تھا البتہ برہمنیت نے اسے اور فروغ دیا۔

ستی نہ تو ہندو دھرم کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ ہندوستان تک محدود، یہ انسان کے قدیم ترین تخیلات مذہبی میں موجود ہے، تمام قدیم اقوام میں خواہ وہ متمدن ہوں یا غیر متمدن اس عقیدہ کا پتہ چلتا ہے کہ یہ زندگی دراصل بڑی زندگی کا صرف ایک حصہ ہے، اور انسان کی روح موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ موت کے بعد انسان آنکھ سے چھپ جاتا ہے "لیکن فنا نہیں ہوتا" اور جب روح کی زندگی ہے تو یہ بھی ماننا چاہئے کہ اسے اس دنیا میں جو چیزیں مرغوب تھیں وہی اس عالم میں بھی ہوں گی۔ چنانچہ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً تمام اقوام میں مردہ کے ساتھ اس کی تمام محبوب چیزیں جلائی جاتی یا دفن کی جاتی تھیں۔ رئیس قبیلہ کے ساتھ بیوی اور اس کے غلام بھی مار ڈالے جاتے تھے۔ یہاں پر مثالاً بعض قوموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جزیرۂ سالومن میں جب کوئی سردار مارا جاتا تو اس کی بیویاں بھی قتل کر دی جاتی تھیں۔ جزائر فجی میں کوئی بڑا آدمی مرتا تو اس کی بیویاں، غلام اور دوست گلا گھونٹ کر مار ڈالے جاتے تھے، اسی طرح بسوطو قوم میں مرد کو دفن کرتے وقت اس کی بیوہ کو قبر پر قتل کر دیا جاتا تھا، چینی عورتیں بیوہ ہونے پر پھانسی پر چڑھ کر خودکشی کر لیتی تھیں، اور ان کی بہت عزت و توقیر ہوتی تھی۔

اس رسم کا پتہ یونان میں بھی ملتا ہے، چنانچہ اچلیز کی قبر پر پولیسرین کو قتل کیا گیا مشہور یونانی مورخ ہیرودوٹس کے قول کے مطابق سیتھین قوم میں بادشاہ کے مرنے پر اس کی بیوی ساقی، باورچی اور مہتمم اصطبل کا گلا گھونٹ دیا جاتا تھا، سلافی اقوام میں بھی قتل بیوہ کا ثبوت ملتا ہے اور اسکنڈینیویا کے گرمانی قبائل میں بھی پچھلے زمانے میں عرصہ تک یہ رسم رہی ہے کہ بیوہ اپنے شوہر کے ساتھ اپنی جان دے دیتی تھی، لیکن اس کے ساتھ یہ رسم بھی معلوم ہوتی ہے کہ بعض اوقات

مرنے والا اپنی زوجہ کو کسی دوست کے حوالے کر جاتا تھا۔

انہی قبائل کی طرح انڈو آرین قوم میں بھی ستی کی رسم تھی لیکن اسے کسی طرح عام نہیں کہا جا سکتا۔ بسا اوقات صرف بڑوں کا شرف رہا ہے ہر عورت اپنے شوہر کے ساتھ نہیں جلتی تھی، اکثر عورتیں دوسری شادی کر لیتی تھیں، یہ ضرور ہے کہ بعد میں ازدواج بیوہ کو برا سمجھا گیا لیکن کیا قدیم زمانہ میں بھی اس قسم کا کوئی خیال تھا، ایک ایسا سوال ہے جس کا آسانی سے جواب نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اس کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ قدیم ترین زمانہ میں بھی کبھی کبھی ستی کے واقعات پیش آ جایا کرتے تھے۔

بعض مقامات پر ستی کی نقل بھی کی جاتی تھی، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیوہ بس اب جلا چاہتی ہے، لیکن درحقیقت وہ محض ایک ڈھکوسلا ہوتا تھا اور اس کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی تھی مثلاً نیلگری کے وحشی قبائل میں آج بھی یہ رسم ہے کہ عورت اپنے کو تابوت پر لٹاتی ہے لیکن جوں ہی آگ روشن ہوتی ہے اسے لوگ کھینچ لیتے ہیں اور اس کا دوپٹہ یا کوئی اور کپڑا جلا دیا جاتا ہے[1]، بعض اور ہندوستانی وحشی قبائل میں یہ رسم ہے کہ عورت تابوت پر جا لیٹتی ہے تاکہ آگ اس کے جسم کو لگنے ہی والی ہوتی ہے کہ وہ اٹھ آتی ہے، اور اس کی ستی پوری ہو جاتی ہے۔

اب ہمیں اپنے اصلی موضوع کی طرف آنا چاہئے، اور اس بات کا پتہ چلانا چاہئے کہ ہندوستان میں یہ رسم کب سے جاری ہوئی، اس کی اصل غایت کیا تھی اور اسے کیونکر ادا کیا جاتا تھا، اور کس طرح یہ اختتام کو پہونچی۔

ہندوستان کی قدیم تاریخ جن جن تصنیفوں، کتبوں اور آثار میں پوشیدہ ہے۔ ہمیں انہی میں کاوش کر کے ستی کی تاریخ معلوم کرنا چاہئے، اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی وید ہیں جنہیں گو تاریخ نہیں کہا جا سکتا پھر بھی قدیم ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر وہ کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے ہمیں انہی کی طرف دیکھنا چاہئے۔

---

[1] مسٹر ڈی۔ کے۔ راس کنگ نے لندن کی انتھروپالوجیکل سوسائٹی میں ایک لکچر کے دوران میں بیان کیا۔

ویدوں کی رسم پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالتے ان میں نہ کہیں صاف اجازت ہے اور نہ ممانعت۔ جہاں مُردوں کی شان میں گیت ہیں وہاں بھی ستی کا کوئی ذکر نہیں، اور جہاں مُردوں کی تجہیز و تکفین کی رسوم و عقائد بتائے گئے ہیں وہاں بھی اس کے متعلق وید خاموش ہیں۔ صرف ایک جگہ اس کی طرف اشارہ ہے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ویدی مذہب بیوں کے جلانے سے واقف تو ضرور تھا لیکن اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ چنانچہ ایک واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ تابوت لاکر رکھا گیا اور بیوہ اس پر بٹھائی گئی، تو پجاری نے آکر کہا "اے میت یہ عورت اپنے شوہر کی دنیا کو پسند کر کے اپنے آپ کو تیرے پاس قدیم رسم کے مطابق ڈالتی ہے۔ تو اسے اس دنیا میں اولاد اور دولت دے"۔ اس کے بعد مرنے والے کا بھائی یا کوئی دوست آجاتا ہے اور اس کی قائم مقامی کرتے ہوئے بیوہ کو ان الفاظ میں مخاطب کرتا ہے: "اے خاتون، اٹھ اور زندوں کی دنیا میں آ، تو یہاں ایک مُردے کے پاس پڑی ہے، آ تو اس دنیا میں اس شوہر کی بیوی ہے جو تیری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اور تیری آرزو کرتا ہے"

اس سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے، کہ یہ رسم پہلے سے موجود تو تھی مگر ویدی مذہب اسے پسند نہیں کرتا تھا، اس کے علاوہ اس کا رواج بہت ہی کم تھا، چنانچہ جس قدر ہم قدیم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اسی قدر کم شواہد نظر آتے ہیں، مہابھارت اور رامائن کے قدیم حصوں میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

مہابھارت کے گیارہویں گیت میں سورماؤں کی تجہیز و تکفین کا بیان ہے، وہاں بھی میت کے ساتھ صرف اس کے قیمتی کپڑے، رتھ اور ہتھیار ہیں۔ قدیم برہمنی کتب فقہ (دھرم شاستر اور دھرم ستر) میں بھی اس رسم کا کہیں ذکر نہیں، بلکہ تصریح کے ساتھ بیوہ کا حق وراثت تسلیم کیا گیا ہے، جس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ شوہر کی زندگی ختم ہونے پر بھی بیوی کو زندہ رہنے کا حق ہے، منو کے دھرم شاستر[1] میں بیوہ کے فرائض کا بیان ہے کہ اسے کیسے زندگی بسر کرنی چاہیئے، اسے عفت و عصمت سے زندگی

---

[1] پانچواں باب آیات نمبر ۱۵۷ تا ۱۶۶ بحوالہ السٹن، تاریخ ہند صفحہ ۲ مطبوعہ لندن ۱۹۱۶ء

کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہو، لیکن ستی کا نہ کہیں ذکر ہے اور نہ اس کی تعلیم دی گئی ہے۔

البتہ ہندو فقہ کی کتابوں میں ستی کا ذکر پایا جاتا ہے۔ عورت کو مرد کے ساتھ مر جانے کی تلقین کی جاتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انسانی کمزوریوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا اور عورت کو اس کی اجازت دی جاتی ہے کہ وہ دو باتوں میں سے ایک انتخاب کرے۔ یا تو مرد کے ساتھ ستی ہو جائے یا عمر کی آئندہ منزلیں پاکدامنی کے ساتھ طے کرے" پراسر اسمرتی " میں جو بعد کی کتب فقہ میں سب سے پرانی تصنیف ہے ازدواج بیوہ تک کی اجازت ہے، ہاں ستی کی بہت کچھ تعریف ہے۔ اگر ایک طرف باعفت بیوہ کے لئے اجر کا وعدہ ہے تو دوسری طرف یہ ہے کہ وہ عورت جو اپنے شوہر کے ساتھ ستی ہو جاتی ہے، اتنے سال تک جنت میں رہے گی جتنے انسانی جسم پر بال ہوتے ہیں اور بالوں کا تخمینہ ساڑھے تین کروڑ کیا گیا ہے! [redacted]

قدیم ہندو فقہ کی کتابوں سے جو اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ بھی یہ ہے کہ ستی کی رسم ہندوستان میں بہت بعد میں زور پکڑا ہے۔ قدیم الایام میں اگر یہ رسم موجود بھی تھی تو اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی اب ہمیں اس وقت کی سنسکرت کی قدیم مستند (Classical) شاعری میں جستجو کی نگاہ ڈالنی چاہئے، جہاں تک بہت ہی قدیم شاعری کا تعلق ہے، ہمیں اس رسم کا شاذونادر ہی ذکر ملتا ہے، بلکہ یہ کہنا اغلب ہے کہ قدیم شاعری بھی ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ اس زمانہ میں ستی کا رواج نہ تھا، البتہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے شعرا بھی اسی قدر کثرت کے ساتھ ستی کا حوالہ دیتے ہیں۔

کالیداس اپنے مشہور ڈرامہ کمار سمبھوا کے چوتھے گیت میں ایک نقشہ اس طرح کھینچتا ہے

. . رتی کے شوہر کو جو محبت کا دیوتا ہے، شیو اپنی آتشیں نگاہ سے جلا کر خاک کر دیتا ہے تو رتی ستی کا ارادہ کرتی ہے اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:" چاند کے ساتھ رات کی روشنی رخصت ہو جاتی ہے اور ابر کے ساتھ شعلہ برق بھی غائب ہو جاتا ہے۔ اسپات نے تو بے جان چیزیں تک واقف ہیں کہ عورت کو مرد کی راستہ پر پیچھے پیچھے جانا چاہئے" یہ کہہ کر آگ میں کودتی ہے لیکن

عجیب سنے آواز آئی ہو کہ "تیرے شوہر کو زندگی کا نیا خلعت عطا ہوا ہے۔ اور اس لئے رانی بھی شراب موت کا جام پینے سے احتراز کر لی ہے۔

کالیداس کے علاوہ اور مشہور شعرا کے ہاں بھی اس کا بیان ہے۔ چنانچہ شدرکا کے ڈرامہ "مرچھ کٹک" میں اس طرح کا ایک واقعہ ہے کہ چرودت کے متعلق جب یہ مشہور ہوتا ہے کہ وہ قتل کر دیا گیا تو اس کی بیوی ستی کا مصمم ارادہ کر لیتی ہے اور آگ میں کودنا چاہتی ہے لیکن ابھی اس کا بیٹا روہا سینا اور ایک برہمن بھتر پالے سے روک رہی ہے کہ اتنے میں چرودت بذات خود آ جاتا ہے، اور ستی کی نوبت نہیں آتی (لیکن یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ تمام قلمی نسخوں میں یہ سین نہیں ملتا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعد کا اضافہ ہے)۔

شاعر دنڈین جس کا زمانہ تقریباً چھٹی صدی عیسوی ہے اپنے ایک فسانے "داس کمار چرتر" کے تیسرے باب میں ستی کی تعریف کرتا ہے، اس کے نزدیک عورت کے لئے شوہر کی موت کے بعد بس ایک راستہ ہے، تمام نیک بیبیاں اسی راستہ پر پڑ جاتی ہیں اور وہ راستہ وہی ہے جس کا نام ستی ہے، یہ ایک لمحہ میں مسافر کو منزل مقصود تک پہونچا دیتا ہے۔

بانا جو دنڈین کے تقریباً سو سال بعد ہوا ہے، کی تصنیف ہرشا درہن کے پانچویں باب میں بھی ستی کا بہت تفصیل کے ساتھ ذکر ہے، ہرشا وردھن اس کا ہیرو ہے۔ ہرشا وردھن کا باپ سخت بیمار ہے، اس کا طبیب جس کا نام رسائنا ہے، بادشاہ سے بہت محبت رکھتا ہے لیکن جب وہ علاج سے لاچار آ جاتا ہے اور اسے بادشاہ کی زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہتی تو خود بھی جان دے دیتا ہے اور ملکہ یسو وتی جب ستی کرنے لگتی ہے تو اس کا بیٹا آتا ہے، قدموں میں گر کر گڑگڑاتا ہے اور طرح طرح سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کسی طرح اپنے ارادہ سے باز آ گئے لیکن اس تمام منت و زاری کے جواب میں رانی کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ اسکے جذبات کی صحیح تصویر ہیں۔

"اے میرے سپوت، میں بیوہ ہونے سے پہلے زندگی کو خیرباد کہنا چاہتی ہوں، میں

یہ نہیں پسند کرتی کہ رتی کی طرح شوہر کی موت کے بعد واویلا کروں میری تمنا ہے کہ تیرے باپ کے قدموں کی گرد کی طرح اس سے آگے آگے جاؤں اور اس کی آمد کی خبر دوں تاکہ ان دیویوں کی نظر میں جو سورماؤں کو عزیز رکھتی ہیں محبت و وقعت حاصل کروں۔ میرے لئے موت زندگی کی نسبت کہیں سہل ہے۔ آتش فراق کے مقابلہ میں آتش تابوت برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہے۔ اے میرے فرزند میں اس دنیا میں اس جسم کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی، میری زندگی اس شہرت میں ہے، جو صرف وفادار بیویوں کو نصیب ہوتی ہے"۔ بالآخر دریا کے کنارے آگ جلائی جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کے نذر کر دیتی ہے، بارشا روتا ہوا باپ کے پاس آتا ہے۔ باپ کچھ الوداعی کلمات کہتا ہے، اور اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر لیتا ہے۔

اس ڈرامہ سے آگے ایک طرف ہمیں ستی کے وجود کا پتہ لگتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تمام بیوہ عورتیں اپنے آپ کو ستی نہیں کر لیتی تھیں۔ کیونکہ اسی ڈرامہ کے دوسرے مواقع ایسے ہیں جن سے بیواؤں کا زندہ رہنا ثابت ہے، چنانچہ بارشا باپ کی موت کے وقت کہتا ہے۔ "اے دھرتی تیرے لئے وقت ہے کہ بیواؤں کا سفید لباس پہن لے" (یہ ایک عام عقیدہ ہے کہ زمین بادشاہ کی بیوی ہوتی ہے)۔ پس معلوم ہوا کہ ہر بیوی اپنے شوہر کے ساتھ نہیں مر جاتی تھی بلکہ یہ امتیاز چند کو حاصل ہوتا تھا۔ اور باقی بیوہ رہ کر زندگی گذارتی تھیں۔

یہ بات کہ بانا اس رسم کا مخالف تھا۔ اسکے دوسرے ڈرامہ "کادمبری" سے ظاہر ہے، جہاں وہ اپنے ایک ہیرو کی زبان سے بہت بڑی تقریر میں ستی کی پرزور مخالفت کرتا ہے۔ اس میں وہ عہد ماضی کے لطیفہ عظیم کی یاد تازہ کرتا ہے اور کہتا ہے "پانڈو کی موت کے ساتھ کنتی نے جان نہیں دی، ابھی مینو کے ساتھ اترا نہیں مری، اور دوسلیا جیدرتھ کے مر جانے کے بعد بھی زندہ رہی"۔ بانا چونکہ غالباً سیوا اسکول کا حامی تھی اس لئے اسکی مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ سیوائی مذہب اس کا بہت مخالف ہے، اس مذہب کی ایک کتاب "مہا نروان تنترا" میں ہے کہ "جو عورت بدحواس ہو کر اپنے شوہر کے تابوت کے ساتھ جل جاتی ہے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گی" (ہندوستان بعہد یونان تفاوت!)

سوم دیو جو سنہ ۱۰۸۰ء میں گذرا ہے، اس کی ایک مشہور کتاب "کتھا سرت ساگر" ہے۔ اس میں وہ کئی مرتبہ ستی کا ذکر کرتا ہے۔ اسی طرح قصوں کی دوسری مشہور کتابوں مثلاً ہتوپدیش، پنچتنترا اور دکرما چرتا میں بکثرت اس رسم کا حوالہ آتا ہے۔

تاریخی کتب میں بھی قصہ اور ادب کی طرح اس کا ذکر ملتا ہے۔ کلہانا مشہور کشمیری مورخ اپنی تصنیف راج ترنگنی میں (جو ۱۱۴۸ء میں ختم کو پہونچی) ستی کے بہت سے واقعات گناتا ہے۔ اکثر واقعات ایسے ہیں جو صرف بادشاہوں اور وزرا کی بیگمات سے متعلق ہیں لیکن بعض واقعات ایسے بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسم صرف اعلیٰ ذاتوں میں مروج نہ تھی بلکہ نیچ اقوام میں بھی رواج پا چکی تھی۔ چنانچہ کوستکھا جو ایک زمیندار تھا جب کہیں سے زخمی ہو کر مکان پہونچا ہے تو بیوی نے اپنے کو ستی کر ڈالا۔ ایک اور واقعہ اس تاریخ میں ملتا ہے جس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے۔ تنکا جو دراصل ایک چرواہا تھا، نندا کی مہربانی سے وزارت کے عہدہ پر سرفراز ہوا، اور جب سنہ ۱۰۲۰ء میں قتل کیا گیا تو اس کی بیوہ وطن کو چلی گئی اور بہو نے اپنے آپ کو اس کے ساتھ جلا ڈالا۔

اب تک جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شوہر کی موت کے بعد بیوی یا بہو وغیرہ ستی کر لیتی ہیں لیکن اسی کتاب سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ماں اپنے بیٹے کے ساتھ بھی جان دے دیتی ہے۔ چنانچہ شاہ ہارشا (۱۰۸۹ تا ۱۱۰۱ء) کا وزیر آنند نامی جب مارا گیا تو اس کی ماں اس کے ساتھ جل کر مر گئی۔

تاریخ ہند کا بہت بیش بہا سرمایہ وہ کتبے ہیں جو زمانہ حال میں بڑی جد و جہد سے معلوم کئے گئے ہیں یہ کتبے بھی ستی کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں سب سے پرانا کتبہ جس میں ستی کی طرف اشارہ ہے ۵۱۰ء کا ہے۔ جو ساگر (صوبہ متوسط) میں ایک پتھر کے ستون پر کندہ ہے، یہ راجہ گوپال کی یادگار ہے، جو جنگ میں مارا جاتا ہے، اس کی بیوی زمانہ کے رواج کے مطابق شوہر کا ساتھ نہیں چھوڑتی اور اسی جلتی چتا کی نذر ہوتی ہے، جو اس کے مالک نے اختیار کیا ہے۔ کتبہ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ راجہ اور رانی کی تصویر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ اسی

دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ بشنسہ کا ایک بیان کتبہ بھی دستیاب ہوا ہے جس میں یہ جتایا گیا ہے کہ شوہر کی موت پر بیوی ستی کا ارادہ کر لی ہو مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

جزیرہ جاوا جہاں ہندوستانی تہذیب آج سے دو ہزار سال پہلے پورا اثر کر چکی تھی۔ ہمیں دو کتبے ملتے ہیں جن میں ستی کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک شتری اور دوسرا شودر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک اور کتبہ [illegible] جس [illegible] سے جو [illegible] ہے [illegible] کہ اس میں شودر عورت کی ستی کا ذکر ہے اور اسی طرح ہر کشمیری عورت [illegible] میں ہے کہ کتبہ شتری کا ہے [illegible] جو شودر تھا [illegible] کی ستی کی [illegible] نصب کرایا ہے۔ اس کا شودر ہونا تو ثابت ہے مگر [illegible] تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب مالدار تھی کیونکہ ہی کتبہ میں بعض ایسے [illegible] اپنے تیمواکے [illegible] گئے ہیں۔

دسویں صدی کے بعد کی ممالک متوسط میں بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں جن سے ستی کا ثبوت ملتا ہے۔ [illegible] سے مرہٹا کے [illegible] ہر ایک میل کے گرد میں کئی سو کتبے معلوم کئے ہیں جن پر عموماً کسی نہ کسی قسم کی شکل بنی ہوتی ہے۔ مثلاً سورج، چاند یا ستارہ اور اسکے علاوہ مرد اور عورت کی تصویر ہوتی ہے۔ جو ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔[۱]

مشہور مستشرق بیولرنے بھی بیان کیا ہے کہ اس نے ایک ایک تالاب کے گرد کئی کئی سو کتبے جو کھتری عورتوں کی ستی سے متعلق ہیں دیکھے ہیں۔ شاذ و نادر شودر عورت کی ستی بھی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی موچی کی عورت نے ستی کی ہے۔

ان تاریخی شواہد کے علاوہ ہندوستان کے قدیم سفرناموں میں بھی اس رسم کا ذکر ہے۔ ان سیاحوں کی ابتدا سکندر اعظم (چوتھی صدی قبل مسیح) کے وقت سے ہوتی ہے ان میں سے دیودرس اور اسٹرابو قابل ذکر ہیں۔ دیودرس کے بیان کے مطابق یہ رسم راوی کر

F. Kittel: Epigraphia Indica, VI pp. 268-19. ۱؎
J. R. A. S., 1887, Pt. I., p. 191 ۲؎

کیا ہے پر پالی جاتی ہیں عورتیں، جو شوہر کے ساتھ جل کر خاک ہو جاتی ہیں لیکن ستی کی جو وجہ دیودرس نے بتائی ہے وہ سب سے نرالی ہے یعنی یہ کہ ہندوستان میں عورتیں شوہروں کو زہر دیدیتی تھیں اور اس کے انسداد کی خاطر مردوں نے ستی کی وحشتناک رسم ایجاد کی۔ اسٹرابو بھی دیودرس کی تائید میں روایت بیان کرتا ہے لیکن اس وجہ سے مطمئن نہیں۔ وہ کہتا ہے "یہ قانون اور وجہ دونوں کی دونوں قابل یقین نہیں معلوم ہوتیں"۔ استوبوس جو سکندر کا ہم عصر تھا اس کے حوالہ سے ستی کا ذکر کرتا ہے۔ انسی کریٹس بھی اس کا ذکر کرتا ہے۔ مگر اس کے خیال میں یہ رسم کٹھیوں تک محدود ہے۔

دیودرس ایشیائے کوچک کے حالات بیان کرتے ہوئے ستی کے ایک واقعہ کا اس طرح ذکر کرتا ہے کہ یومینس کی لڑائی (۳۱۶ قبل مسیح) میں جب ایک ہندوستانی افسر کیٹیس جو یومانیوں کی طرف سے لڑ رہا تھا مارا گیا اور لاش جلائی جانے لگی تو اس کی دونوں بیویوں میں جھگڑا ہوا۔ ان میں سے ہر ایک پہلے تو ستی ہونے کی آرزو رکھتی تھی لیکن آخرکار چھوٹی بیوی کو یہ فخر حاصل ہوا چونکہ بڑی بیوی کے ستی ہونے سے دو بچوں کے جانے کا احتمال تھا۔

دیودرس کے بعد کی تصانیف میں اسی کے حوالے سے یورپ کے مورخین اس رسم کا ذکر کرتے ہیں۔ دیودرس نے ستی کے اصل سبب کے متعلق جو نظریہ قائم کیا ہے وہ عرصہ تک یورپ کے مورخین پر بہت بڑا اثر ڈالتا رہا۔

زمانہ حال کے سفرناموں میں کثرت کے ساتھ ستی کا ذکر ہے، ہم چند پر اکتفا کریں گے۔

عرب سیاح البیرونی جس نے ۱۰۳۰ء میں ہندوستان کا سفر کیا اپنے سفرنامہ میں یوں رقمطراز ہے۔ ہندوستان میں بیوہ دوبارہ شادی نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے صرف دو راستے ہیں یا تو عمر بھر بدسلوکی اور طعن و تشنیع کی آگ میں جلتی رہے یا ایک مرتبہ اپنے آپ کو رفیق عمر کے تابوت پر نثار کر دے۔ بادشاہوں کی بیویوں کو مجبوراً ستی ہونا پڑتا ہے، خواہ وہ راضی ہوں

The Cambridge History of India, Vol I, p 415.

یا نہ ہوں! مبادا کہیں وہ ایسی زندگی بسر کریں جس سے ان کے شوہر کے ناموس کو دھبہ لگے۔ البتہ اس سے معمر اور بچوں والی بیوائیں مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ بیٹا ماں کو پناہ دینے کا ذمہ دار ہے[1]

البیرونی کے بعد دوسرا مشہور سیاح مارکوپولو ۱۲۹۳ء میں ہندوستان آیا۔ وہ ملا بار کے متعلق بیان کرتا ہے کہ وہاں کثرت سے ستی ہوتی ہے اور ان عورتوں کی بہت عزت ہوتی ہے۔ مارکوپولو کے سفرنامہ کا مترجم کتاب کے مقدمہ میں ایک جگہ تحریر کرتا ہے کہ ابوزید نے دسویں صدی کی ترمیع میں ستی کے بعض واقعات کی خبر دی ہے اور مسعودی (متوفی ۹۵۶ء) کے حوالہ سے بیان کرتا ہے کہ ہندوستان میں جب بادشاہ مرتا تھا تو اس کے وفادار دوست خوشی خوشی جل کر جان دیتے تھے۔ چنانچہ جب راجہ اجیت سنگھ مارواڑی فوت ہوا تو اس کی ۶۴ بیویاں اور متعدد دوست بھی اس کے ساتھ ستی ہو گئے۔[2]

دوستوں کی ستی کی مثال ہمیں ایک اور واقعہ میں بھی ملتی ہے۔ جب سکھوں کے گرو ہرگوبند سنگھ اس جہان سے گزر رہے ہیں اس وقت بھی بعض دوستوں نے اپنی جانیں نثار کر دی تھیں۔

پندرہویں صدی سے لیکر اٹھارویں صدی تک جتنے سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ ان میں ستی کا بکثرت ذکر ہے۔ لیکن ان سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ستی عموماً اونچی ذاتوں کے لئے مخصوص تھی۔ البتہ نیچ ذاتیں بھی بعض اوقات اس کی نقل کرتی تھیں۔ ان سفرناموں سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اگرچہ مختلف اقطاع ملک میں یہ رسم جاری تھی لیکن شمالی ہند میں جنوبی ہند کی نسبت زیادہ رائج تھی۔

اسکے ساتھ ہی یہ بات بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہر جگہ اور ہر وقت میں ستی کے طریقے بدلتے رہے ہیں۔ پھر بھی ہمیں بعض چیزیں ایسی ملتی ہیں جو سب میں مشترک ہیں۔ مثلاً کوئی بیوہ جب ستی کا ارادہ کرلی تو اس وقت سے اس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی اور پیشتر اسکے کہ وہ جلائی جائے چند روز کا

---

[1] کتاب الہند مترجمہ زاخو مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء جلد ۲ صفحہ ۱۵۵
[2] سفرنامہ مارکوپولو مترجمہ یول جلد ۲ صفحہ ۳۳۱

وقفہ ہوتا تھا۔ ان دنوں میں خوب زور شور سے باجا وغیرہ بجایا جاتا تھا۔ اور جب ستی ہونیوالی ہوتی تو بیوہ کا جلوس نکالا جاتا۔ پجاری آگے آگے ہوتا اور بیوہ اور مجمع اسکے پیچھے۔ بیوہ کے ایک ہاتھ میں لیموں اور دوسرے ہاتھ میں آئینہ ہوتا۔ وہ تین دفعہ یا سات مرتبہ تابوت کا طواف کرتی اور بالآخر اسپر جا لیٹتی۔ بعض مقاموں میں بیوہ کے جسم پر لاش آڑی آڑی رکھ دی جاتی اور کسی جگہ وہ خود میت کے سرہانے بیٹھ جاتی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ایک ایسا چھوٹا سا مکان بنایا جاتا جو ستونوں پر کھڑا ہوتا۔ اس میں بیوہ کو بٹھا دیا جاتا تھا اور آگ لگا کر ستون نکال لئے جاتے تھے۔ آگ اکثر پجاری ہی دیتے تھے لیکن کہیں کہیں بیوہ خود تابوت میں آگ لگا کر جل ہو جاتی تھی جلنے کے بعد راکھ جمع کرکے دریا میں بہا دی جاتی اور ستی کی یادگار میں ایک پتھر نصب کر دیا جاتا جسپر سیندور اور تیل لگا ہوتا تھا۔ اس پتھر کو مقامی حیثیت سے بڑی مقدس چیز سمجھا جانے لگتا تھا۔ اڑیسہ اور ساحل کارومنڈل پر اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ بیوہ کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ گجرات میں بیوہ کو افیون[1] دیکر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔

پیشتر اس کے کہ ہم ستی کے انسداد کی تفصیل بیان کریں۔ مناسب ہوگا کہ مختصراً ان نتائج کو بیان کر دیں۔ جو مندرجہ بالا سطروں سے نکلتے ہیں۔

یہ رسم خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی یا آرین رسم نہیں ہے، بلکہ دنیا کے اکثر حصوں میں اس کا وجود ثابت ہے۔ اسکی اصل یہی ہے کہ عورت کو محض نسل کے بڑھانے کا ذریعہ سمجھا گیا اور اسکے لئے یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ جس شخص کے ساتھ اس دنیا میں زندگی گذار رہی ہو اسی کے ساتھ اس دنیا میں بھی متحد رہے۔ اسی خیال نے ہندوستان میں بھی ستی کی رسم کو شروع کیا۔ بدھ مذہب سے پہلے اس کا رواج بہت کم تھا۔ البتہ جب برہمنیت نے دوبارہ بدھ مذہب پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ اس وقت سے اس کا بھی زور ہوا لیکن یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ ستی تمام ہندوستان میں رائج تھی۔ یا ہر عورت اپنے شوہر کے ساتھ جان دیدیتی تھی۔ البتہ دسویں صدی عیسوی کے بعد سے ستی

---

[1] Elphinstone. History of India, 1916, p 207

کے واقعات بہ کثرت ہونے لگے۔

یہ بھی نہ سمجھنا چاہئے کہ تمام ہندوستان میں اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ پرانے زمانے سے ایسی جماعت بھی تھی جو اس کی مخالف تھی، سیوامت، بدھ مت اور جین مت اس کی مذمت کرتے ہیں۔ بہت سے اس قسم کے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اس کی علانیہ مخالفت کی۔ سولہویں صدی میں یہ مخالفت بہت بڑھ گئی تھی جسکا ثبوت ایک پرتگیز سیاح کے سفرنامہ میں ملتا ہے جو سترہویں صدی کے شروع میں ہندوستان کی سیاحت کو آیا۔

پرتگیز جنرل الفانسو البقرق نے ۱۵۱۰ء میں جزیرہ گوا فتح کرنے کے بعد ستی کے پہلے قانونی طور پر ستی کو ممنوع قرار دیا۔ اس کے بعد سولہویں صدی سے مسلمان بادشاہوں نے بھی اس رسم کو دبانے کی بہت کوشش کی۔ چنانچہ خود اکبر نے ایک مرتبہ ایک بیوہ کو جلنے سے بچا لیا۔ اور قانون نافذ کیا کہ ستی صرف اس وقت جائز ہے جب آزادی کے ساتھ بیوہ اپنی مرضی سے اس کی خواہش کرے۔ اور دوسرے مقامی حاکم سے اجازت حاصل کرے۔ اور مسلمان بادشاہ بھی ستی صورت میں ستی کی اجازت دیتے رہے۔ لیکن بعض اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر ہندو رشوت دیکر افسروں سے ستی کی اجازت حاصل کرتے تھے۔

انگریز بھی مسلمان بادشاہوں کے طریقہ پر عمل کرتے رہے۔ لیکن تو اجازت دینے میں سختی سے کام لیتے تھے، بہرصورت ایک مدت تک ستی کو بالکل ممنوع نہیں قرار دیا۔ کیونکہ انگریز اس کا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی تہذیب، تمدن اور مذہب میں دخل نہیں دینا چاہتے۔ وہ تو محض تجارتی (اور سیاسی) تفوق کے خواہاں ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کرتے۔ ان کا رویہ رواداری پر مبنی ہے۔ ان دعووں کے ہوتے ہوئے انگریز ستی کا انسداد کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔

۱۸۱۸ء میں راجہ رام موہن رائے نے جو سنسکرت کا عالم ہونے کے علاوہ علوم مغربی سے بھی اچھی طرح بہرہ اندوز تھا، ستی کی مخالفت میں قلم اٹھایا اور اس کے بعد عرصہ تک تقریر و تحریر

میں مخالفت کرتا رہا۔ اور اکثر تعلیم یافتہ اشخاص اس سے متفق ہو گئے۔

۱۸۲۸ء میں لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل مقرر ہو کر ہندوستان آیا، وہ راجہ رام موہن رائے سے متفق تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ستی کو جلد از جلد بند کر دے کیونکہ اس کے خیال میں بلا وجہ ہر روز چند قربانیوں کا اضافہ ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت جو انگریز ہندو مذہب اور ہندوستانی قوم سے زیادہ واقف تھے وہ اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ مثلاً مسٹر ہ۔ ہ۔ ولسن اور مسٹر ہ۔ ج۔ کو بروک کا خیال تھا کہ اگر ستی کی مخالفت کا کوئی قانون نافذ کیا گیا تو فوراً انقلاب ہو جائیگا۔ ہندوستانی کہیں گے کہ "کیا یہ ہمارے مذہب، ہماری قدیم روایات اور ہماری رسوم میں دخل اندازی نہیں ہے" ؟ اور وہ اسے ہرگز گوارا نہیں کریں گے۔

یہ حضرات کہتے تھے کہ گو یہ طے نہیں کہ ستی ہندو دھرم کا جزو ہے۔ لیکن یہ تو مسلم ہے کہ تمام ہندو آبادی کا اس پر متفق ہونا کہ ستی کو ہندو دھرم سے کوئی تعلق نہیں بالکل ناممکن ہے۔ ہندوؤں کے اکثر طبقے ستی کو مذہبی حیثیت دیتے ہیں۔ تو کیا اس کے انسداد کے وقت وہ خاموش رہیں گے اور یہ نہ کہیں گے کہ "جب تک انگریز کمزور تھے اور ہندوستان پر پورا پورا قابو نہیں تھا تو ہماری دلآسائی کے لئے ہر قسم کے وعدہ وعید کر لیتے تھے اور جبکہ انہیں غلبہ حاصل ہو گیا ہے وہ اپنی طاقت کے نشہ میں ہماری مذہبی آزادی کو فنا کر دینے کی فکر میں ہیں"

لیکن لارڈ ولیم بنٹنک کو کامل اعتماد تھا کہ کسی قسم کا شور و شغب نہیں ہوگا اور اس کی آرزو تھی کہ جس طرح ممکن ہو جلد سے جلد حکومت برطانیہ پر ستی کی وجہ سے جو بدنما دھبہ لگا تھا اسے دھو دے چنانچہ ۴ دسمبر ۱۸۲۹ء کو اس نے ہند کی مجلس وضع قوانین میں ستی کی ممانعت کا قانون پاس کرا لیا۔

قانون کے نفاذ کے بعد یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ شاید ہندو اس کے لئے ہرگز تیار نہ ہوں گے۔ لیکن تجربہ نے اس کے خلاف بتایا کسی قسم کا شور و شغب نہیں ہوا۔ البتہ ہندوؤں کی طرف سے ایک عرضی پارلیمنٹ کو بھیجی گئی۔ کہ قانون واپس لے لیا جائے۔ انگریزی پارلیمنٹ نے شکایت نامہ کو واپس

Ramsay Muir - The Making of Br. India pp. 293-4 [1]

کر دیا۔ اور والیسی قانون کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ اس کے بعد پبلک نے بھی خاموشی اختیار کی۔ کبھی کبھی ایسا ضرور ہوا کہ بعض عورتوں نے چھپ چھپا کر ستی کی کوشش کی۔ صرف ایک واقعہ ایسا ہے جس میں علی الاعلان ستی کی رسم ادا کی گئی۔ بمبئی میں ۱۸۲۵ء میں کسی راجہ کی موت پر اس کی چار بیویوں کو زبردستی آگ میں جھونک دیا گیا اور پولیس اسے نہ روک سکی لیکن عام طور پر قانون کی پابندی کرائی گئی، اور اس طرح پر وہ آگ جو کئی ہزار برس کی عمر میں نہ معلوم کتنوں کو خاک کر چکی تھی۔ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈی کر دی گئی۔ لیکن بیوہ کے ساتھ بدسلوکی، نفرت و حقارت کے برتاؤ کی وہ آگ جس کے مقابلہ میں تابوت کی آگ پھولوں کی سیج تھی اس کے سرد کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ سعی وبیہم کی ضرورت ہے ؛

جاحظ اور تاریخ طبعی

جاحظ کا قول ہے کہ متکلمین نے چاہا کہ انہیں ہر چیز کا علم ہو جائے نہیں حالانکہ یہ مقدور نہ تھا۔[1] یہ رائے بہت حد تک صحیح ہے۔ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں یونانی علوم اور علمی خیالات کی عام اشاعت نے مذہبی مسائل پر غور کرنے والوں کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ اپنی توجہ بعض ایسے مباحث کی طرف بھی مبذول کریں جو درحقیقت ان کے حدود سے باہر تھے۔ علم موجودات اور مابعد الطبیعات کے مختلف مسائل مسلمانوں کے دماغوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ علماء جو طبیعیوں[2] کے نام سے موسوم تھے اور جو اپنی ساری ذہنی قوتوں کو صرف مطالعہ فطرت یا عجائبات عالم پر غور کرنے میں صرف کرتے تھے ان شبہات کے ازالہ سے قاصر تھے جو خود انہیں کے اکتشافات یا بیرونی خیالات کی وجہ سے بعض مذہبی عقائد کے متعلق پیدا ہو گئے تھے۔ اب کچھ مذہب کی حمایت میں اور کچھ حقیقت کی تلاش میں بعض ایسے متکلمین کو بھی سائنس کے میدان میں قدم رکھنا پڑا جن کا کام اب تک صرف مسائل مذہبی پر غور کرنا تھا۔ جاحظ ایسے علما کی صف اولی میں جگہ پاتا ہے۔ وہ طبیعیوں کے خیالات کی بہت شدت سے حمایت کرتا ہے۔ ان کے بہت سے اصول خود اس نے اس فرقے[3] کے عقائد میں داخل کر دیئے ہیں جس کا وہ بانی ہے اور انہیں مسائل پر اس نے ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے جس کا نام "کتاب الطبائع" ہے۔ اس کی فکر اور ذاتی قابلیت اس کی روادار نہ ہو سکی کہ دوسروں کے واسطہ سے علم حاصل کرے اس لیے وہ خود فطرت کے رازہائے سربستہ کے انکشاف میں لگ گیا اور حیوانات، نباتات، جمادات اور عام عجائبات قدرت کا مطالعہ شروع کر دیا۔ بحیثیت ایک طبیعی اور محقق ابتدائی کے جاحظ بہت اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ وہ کامل نمونہ ہے علماء کے اس طبقہ کا جس نے اپنی تمام کوششیں دیرینہ مذہبی عقائد اور جدید سائنٹفک خیالات کی تطابق

---

[1] کتاب الحیوان جلد ۳ صفحہ ۱۰۲ [2] ملاحظہ ہو ابن القفطی صفحہ ۵۰۔

[3] شہرستانی صفحہ ۵۲-۵۳۔

میں صرف کردیں۔ اس کے اکتشافات کی نوعیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں متکلمین کے نزدیک سائنٹفک خیالات کا کیا درجہ تھا۔

جاحظ کی کثیر التعداد تصانیف میں سے چار تاریخ طبعی بحث کرتی ہیں۔ عام عجائبات فطرت پر اپنے جس تصنیف میں بحث کی ہے اس کا نام "کتاب العبر والاعتبار" ہے۔ اس کا ایک نسخہ متحف برطانیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے[1]۔ یہ کتاب یمن کے جھونڈے اور شکستہ خط نسخ میں لکھے ہوئے اہم اجزا پر مشتمل ہے۔ اور اس پر سہ شنبہ، شعبان ۱۲۵۹ھ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ بہلو (Rescher) کا بیان ہے کہ جاحظ کی تصانیف کے سلسلہ میں کسی ایسی کتاب کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن یاقوت کی "ارشاد الاریب"[2] میں جو اس بیان کے بعد شائع ہوئی ہے اس کتاب کا نام "کتاب التفکر والاعتبار" بتایا گیا ہے۔ حاجی خلیفہ[3] نے جاحظ کی ایک تصنیف "کتاب التعبیر" کا ذکر کیا ہے لیکن وہ اسے اُن تصانیف میں شامل کرتا ہے جو فن تعبیر رویا پر لکھی گئی ہیں۔ مگر چونکہ کسی دوسرے مورخ نے جاحظ کی اس تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے نام کی وجہ سے حاجی خلیفہ کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے اور غالبًا یہ وہی کتاب ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

یہ تصنیف کم و بیش ایک پندنامہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ابواب یا فصول سے عاری ہے۔ غالبًا اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہر چند جملوں کے بعد لفظ "فکر" کا استعمال کیا گیا ہے۔ مصنف نے ابتدا آسمان، سورج اور چاند سے کی ہے اور پھر یکے بعد دیگرے خالق کی معرفت اور قدرت کے ثبوت میں ارض و جبل، نباتات و جمادات اور بالآخر جسم انسانی کے عجائبات کو پیش کیا ہے۔ کتاب کے ابتدا میں وہ خود اس کی غرض و غایت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"قال ابو عثمان بحر ذاکر ودت اشیاء من شواهد اثار الصانع فی صنعته ومنبهون علی امر بدا وبرهانا ما شاهده من فطرته نقطا فی معرفته وتشهد بوحدانيته

---

[1] ضمیمہ فہرست مخطوطات ۲، ۱، صفحہ ۲۲۶۔
[2] شائع کردہ پروفیسر مارگولیتھ جلد ۶ صفحہ ۷۶۔
[3] کشف الظنون جلد ۲ صفحہ ۲۱۱۔

وتخبر عن جلالة عظمته وكمال قدرته " (ترجمہ) (ہم صنعتِ خداوندی کے بعض شواہد کا ذکر کرینگے اور بعض ان بھیدوں سے آگاہ کرینگے جن کا جاننے والا معرفت الٰہی کے اقرار پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی معدت کی گواہی دیتا ہے اور اسکی برتری ۔ بزرگی اور کمال قدرت کی خبر میں سُنا تا ہے) اس کتاب کی اہمیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں جاحظ نے اسی موضوع پر بعض قدیم تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے جو بیشتر سریانی زبان میں تھیں وہ لکھتا ہے کہ " وقد الف مثل كتابنا هذا جماعة من الحكماء المتقدمين فما اوضحوا معانيه ولا بينوا المشكل فيه، منهم جبرئيل بن نوح الانباری فانه صدر كتابه بغير خطبة ولا مقدمة ورتبه غير ترتيب الفلاسفة وصدره بكلام مغلق ونظمه نظما غير متسق فكان لم يألف - وقبله الف في معناه الودرايوس اسقف طرطوس كتابا وضعه في زمان يليانوس عظيم الروم الذي كان ينسب بالدهرية العصبية لدين الكفر وكان هذا الملك من اهل التلبيس والتدليس وسمى الودرايوس كتابه "كتاب التدبر" ونقله من اخذه عنه من السريانية الى العربية فلم يقع لعسا النقل حيث ينبغي ان يقع من الايضاح والشرح وافسد تداول الالسنة وسوء العبارة ومنها كتاب لطيمه تادريطوس اسقف قورس كتبه باليونانية ونقل بعده الى السريانية ثم الى العربية فجرى مجرى الاول تداول النقل والعبارات ۔ ومنها كتاب الف ايام سواميه لطيمه يسوع تحت سلطان فارس وكتبه بالفارسية فالبسه استغلاقا

(ترجمہ ۔ حکماء متقدمین کی ایک جماعت نے بھی ہماری اس تصنیف کے مثل کتابیں لکھیں لیکن انھوں نے معانی کو واضح نہیں کیا۔ اور نہ مشکلات کو حل کیا۔ ان میں سے ایک جبرئیل بن نوح انباری ہیں جنھوں نے اپنی کتاب بغیر خطبہ اور مقدمے کے لکھ ڈالی اور اس کی ترتیب فلسفیوں کی ترتیب کے مطابق رکھی پھر اس کی عبارتیں بھی گنجلک تھی تو گویا اسکا لکھنا اور نہ لکھنا دونوں برابر ہے اس سے قبل اسی موضوع پر الوودرایوس نے جو طرطوس کا اسقف تھا یلیانوس ملک روم کے عہد میں ایک کتاب لکھی یہ بادشاہ دہریہ تھا میلان طبع کفر کی طرف رکھتا تھا اور اہل تلبیس و تدلیس میں سے تھا ۔ الوودرایوس نے اپنی کتاب کا نام " کتاب التدبر " رکھا کسی نے اس کتاب کا ترجمہ

سریانی سے عربی میں کیا ہے۔ لیکن اس نے توضیح وتشریح کا حق ادا نہیں کیا بلکہ زبان کو توڑ مروڑ کر اور عبارت کو الجھا کر اور خرابی پیدا کر دی۔ اس سلسلے میں ایک اور کتاب ہے جس کا مصنف تاوریسطوس استعف قورس ہے اصل کتاب یونانی زبان میں لکھی گئی تھی لیکن بعد کو اس کا ترجمہ سریانی اور عربی میں ہوا۔ گریہاں بھی ترجمہ اور عبارت کی خرابی اسی طرح موجود ہے۔ اسی مضمون کی ایک اور کتاب بنی امیہ کے زمانہ میں لکھی گئی جسکا مصنف یسوع بخت مطرانِ فارسی تھا۔ اسکی کتاب فارسی زبان میں لکھی اور اسے بہت پیچیدہ بنا دیا ہے۔

غالبًا یہ کتابیں اب موجود نہیں ہیں ورنہ ہمیں جاحظ کی تصانیف سے انکا موازنہ کرنے کا موقع ملتا۔ بہرحال اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مصنف کو ان کتابوں کا علم تھا اور ممکن ہے کہ استوان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ بھی کیا ہو۔ زراعت اور نباتات پر جاحظ نے دو کتابیں تالیف کیں مگر بدقسمتی سے یہ دونوں ہم تک نہیں پہونچیں "کتاب الزرع، النخل والنبتون و الاعناب" کے متعلق یاقوت کا بیان ہے کہ جاحظ نے اسے ابراہیم بن عباس الصولی کے نام سے معنون کیا تھا۔ اور اس کے صلہ میں پانچ ہزار درہم بطور انعام کے بھی پائے تھے[۱]۔

دوسری تصنیف یعنی کتاب المتفاح" کا ذکر بھی بجز یاقوت کے اور کوئی نہیں کرتا اور اسے بھی صرف نام ہی بتلا سکتا ہے۔ یہی حال اس تصنیف کا بھی ہوا جو جمادات کے متعلق تھی لیکن خود جاحظ نے "کتاب الحیوان[۲]" کے مقدمہ میں خود اس کتاب کا ذکر کیا ہے اس سے کچھ کچھ پتہ چلتا ہے کہ اس کے مضامین کیا تھے۔ اس تصنیف میں اس نے زمین کے طبقوں سے دھات کی قسموں سے ان کے انجماد اور رقت سے اور انکو نکالنے اور صاف کرنے کے طریقوں سے بحث کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ کس طرح بعض دھاتوں میں بہ نسبت دوسروں کے جلد تبدیلیاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد رنگوں سے بحث کی گئی تھی اور یہ دکھایا گیا تھا کہ دوسری چیزوں کے رنگنے یا خود اپنے درجوں کے بدلنے میں ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور سب سے آخر میں مصنف نے "اکسیر"

---

[۱] ارشاد الاریب جلد ۶ صفحہ ۷۵۔

[۲] جلد ۱ صفحہ ۳۔

کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

حیوانات کے متعلق "کتاب الاسد والذئب" کے علاوہ "کتاب الحیوان" بھی ہے۔ جو جاحظ کی تصانیف میں سب سے زیادہ اہم ہے یاقوت[1] کا بیان ہے کہ مصنف نے اس کتاب کے ساتھ دو اور رسالے بھی شامل کئے تھے جن کے نام "کتاب النعل" اور "کتاب البغل" تھے۔ لیکن موجودہ نسخوں میں ان کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ کتاب صحت سے شائع نہیں ہوئی ہے بلکہ بدقسمتی سے غلطیاں اس میں بہت سی رہ گئی ہیں۔ اس تصنیف کے متعدد نسخے مشرق اور مغرب کے کتب خانوں میں موجود ہیں اگر ایک معقول نسخہ مع مکمل فہرست کے شائع کر دیا جائے تو یہ ایک گرانقدر علمی خدمت بھی ہوگی اور بہت سے ایسے اہل علم بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے جن کے پاس یا تو اتنا وقت نہیں کہ سات ضخیم جلدوں کا مطالعہ کر سکیں یا جو اس کی غیر ضروری طوالت کی تاب نہیں لا سکتے۔ یاقوت[2] کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "کتاب الحیوان" مشہور وزیر محمد بن عبدالملک الزیات کے نام نامی سے معنون کی گئی اور اس نے خوش ہو کر مصنف کو پانچ ہزار درہم بھی عطا کئے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کتاب ۲۳۳ھ سے قبل لکھی جا چکی تھی اس لئے کہ اسی سال علم و ادب کا یہ عظیم الشان مربی عہدہ وزارت سے معزول کر کے قتل بھی کر دیا گیا۔ اسکے علاوہ خود اس کتاب کے دیباچہ میں جاحظ نے تقریباً اپنی تمام تصانیف کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "کتاب الحیوان" اس کی کوششوں کا آخری پھل ہے۔

"کتاب الحیوان" کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ علاوہ ان معلومات کے جو حیوانات سے متعلق ہیں، اس میں دوسرے مضامین بھی بے شمار ہیں۔ یہ کتاب چند مخصوص اہل علم کے لئے نہیں لکھی گئی ہے۔ بلکہ مصنف نے اس امر کا خاص لحاظ رکھا ہے کہ عوام الناس اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں اور یہی وجہ ہے کہ بہت سی بے ترتیبیاں اس تصنیف میں نظر آتی ہیں

---

[1] ارشاد الاریب جلد ۶ صفحہ ۷۵۔

[2] جلد ۶ صفحہ ۷۵۔

سیاسی، معاشرتی اور دینی مسائل پر جاحظ کی جو تصانیف ہیں ان میں بہت سی مختلف فیہ مباحث بھی ہیں اور وہ خود اقرار کرتا ہے کہ اُن پر بہت شدت سے تنقید بھی ہوئی۔ لیکن یہ کتاب تو اس لئے لکھی گئی تھی کہ عام طور پر رائج ہو۔ چنانچہ مصنف نے ابتدا ہی میں یہ لکھا ہے کہ "یہ ایک ایسی کتاب ہے جسکے لئے ہر مذہب اور ملت کے لوگ یکساں خواہشمند ہونگے خواہ وہ عرب ہوں یا عجم، مسلم ہوں یا غیر مسلم اسلئے کہ اس میں فلسفہ بھی ہے۔ اور علم بھی، تجربات مشاہدات بھی ہیں اور دین بھی بس اسکے اُسی طرح طالب ہونگے جس طرح شن۔ زاہد اِس کو اُسی طرح تلاش کرینگے جس طرح رند، سنجیدہ اور متین لوگ اس کو اُسی طرح پسند کرینگے جس طرح مسخرے اور بے فکرے اور عقلمندوں کو اسکی ویسی ہی ضرورت ہوگی جیسی بے وقوفوں کو"۔ مصنف نے تمام مختلف فیہ مسائل سے بچنے اور کترانے کی کوشش کی ہے اور اپنے بیانات کو محدود رکھا ہے "صرف مختلف قسم کے حیوانات کے ذکر پر اس طرح کہ وہ عجائبات فطرت آشکارا ہو جائیں جنسے خالق کی بے نظیر صناعی پر روشنی پڑتی ہے اور جو بغیر غور و فکر یا بحث و تمحیص کے سمجھ میں نہیں آسکتے[۴]"
بعض وقت تو قبولیت عام حاصل کرنے کے لئے جاحظ موضوع سے بہت دور جا پڑتا ہے۔ اس کتاب میں کہیں کہیں ایسے خیالات بھی درج ہیں جن پر خود مصنف کا ایمان نہیں تھا اور انکی وقعت جہلا کے توہم سے زیادہ نہیں۔ توضیح کے لئے ایک مثال کافی ہوگی۔ پورے تیس صفحوں کا ایک باب لکھنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ تو محض تفریح طبع کے لئے تھا۔ اب آگے اسی مسئلہ پر سنجیدگی سے بحث شروع ہوتی ہے[۵]۔ اس کا خیال ہے کہ ضخیم جلدوں کا مطالعہ اسوقت بہت تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔ جبتک کہ موضوع کا تسلسل بعض دلچسپ فقروں یا تفریحی خیالات کے ذریعہ منقطع نہ ہوجایا کرے۔ اس تصنیف میں جو علم الحیوان سے متعلق ہے آیات قرآنی اور احادیث نبوی اشعار عرب اور عام کہاوتوں کے درج کرنے کا مقصد بھی ہے کہ خشک اور سنجیدہ

---

[۴] کتاب الحیوان جلد ا صفحہ ۳۔ ۵ ۔ جلد ۷ صفحہ ۳ و ۴ ۔

[۵] جلد ۲ صفحہ ۸۳ ۔

خیالات کی روانی میں فرق آجاتے[1]۔ اس رسالے کے پڑھنے والوں کو اگرچہ یہ کتاب اکثر غیر متعلق بیانات کی وجہ سے گراں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جاحظ اپنے زمانے اور اپنے ہم وطنوں میں بہت کامیاب رہا۔ کتاب الحیوان کا مطالعہ بہت عام ہوا اور اس سے فائدہ بھی بہت اٹھایا گیا۔ ساتویں صدی ہجری کے شروع تک مختلف علماء نے اس کی تلخیص اور پھر تلخیص در تلخیص[2] کی۔

جاحظ نے مضمون کی منطقی تقسیم کو قبولیت عوام پر سے قربان کر دیا ہے اس تصنیف کے مقدمہ[3] میں وہ تمام عالم کی طبعی اشیا کی دو تقسیمیں کرتا ہے۔ ایک نامی اور دوسرے غیر نامی (inorganic)۔ حیوانات اور نباتات کو پہلی قسم میں شامل کرکے وہ اول الذکر کے الگ الگ طبقے بتانا شروع کرتا ہے اور اس کے بعد ان کی مختلف انواع کا ذکر کرتا ہے یہ سب تقسیمیں بالکل بھونڈی اور غیر سائنٹفک ہیں، سپر طرہ یہ کہ بحث کرتے وقت ان تقسیموں کا بھی خیال نہیں رکھا ہے۔ اس کی کوشش صرف یہی رہی ہے کہ اپنا تمام علم بلا لحاظ ترتیب یا تعین موضوع کے پڑھنے والے تک پہونچا دے، اس لئے بلا ارادہ ابواب کی ترتیب سے احتراز کیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے[4]: "اذ کان ابوابا کثیرۃ باسماء مختلفۃ ان القاری میل بابا حتی یخرجہ الثانی الی خلافہ و کذالک یکون مقام الثالث من الرابع و الرابع من الخامس و الخامس من السادس (ترجمہ: جب بہت سے ابواب ہوتے ہیں اور ہر ایک کا ایک مختلف نام تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا جب ایک سے گھبراتا ہے تو دوسرا باب آجاتا ہے اور یہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے کے بعد تیسرا تیسرے کے بعد چوتھا، چوتھے کے بعد پانچواں اور پانچویں کے بعد چھٹا)" جاہلیۃ کے اشعار اور قصے یا مذہبی عقائد برابر اس کے ذہن کو منتقل کرتے رہتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بلند پرواز تخیل کا بے طرح غلام بنا ہوا ہے۔ جاحظ ابوالحسن اخفش کی ان تصانیف کا جو صرف و نحو پر ہیں سخت مخالف ہے۔

---

[1] جلد ۵ صفحہ ۱۰ و جلد ۴ صفحہ ۳-۴ و ۱۱ [2] حاجی خلیفہ جلد ۲ صفحہ ۲۰۱-۲۰۹، ۱۲ و ۲۸۴۔
[3] جلد ۱ صفحہ ۱۳-۱۵ ؛ [4] جلد ۶ صفحہ ۳ ؛

صرف اس وجہ کہ اس میں بعض ایسے مسائل ہیں جو عام سمجھ سے باہر ہیں اور وہ خود اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس تصنیف میں جو طریقہ کار اس نے پہلے سے متعین کر لیا تھا وہ اسی کے الفاظ میں یہ ہے۱؎: الی اتکل علی انک لا تمل باب القول فی البعیر حتی تخرج الی الفیل وفی الذرة حتی تخرج الی البعوضة وفی العقرب حتی تخرج الی الحیة وفی الرجل حتی تخرج الی المرأة وفی الذبان حتی تخرج الی الغربان والعقبان وفی الکلب حتی تخرج الی الدیک وفی الذئب حتی تخرج الی السبع وفی الظلم حتی تخرج الی الحمام وفی الجعافر حتی تخرج الی الحمام وفی الحمام حتی تخرج الی البرق وفی البرق حتی تخرج الی المطالب وکذلک القول فی الطیر وعامة الاصناف (ترجمہ میں یہ خیال رکھو نگا کہ تم اونٹ کے بیان سے ابھی تھکے نہ ہو کہ ہاتھی کا بیان آ جائے یا چیونٹی کے ذکر سے گھبرائے نہ ہو کہ مچھر کا ذکر چھڑ جائے، بچھو سے جی بھرا ہو کہ سانپ پر گفتگو شروع ہو جائے، مرد کے حالات سے سیری نہ ہوئی ہو کہ عورت کی کیفیت معلوم ہونے لگے اسی طرح مکھی کے بعد کوؤں اور چیلوں کا کتے کے بعد مرغوں کا بھیڑیے کے بعد شیروں کا۔ حشرات کے بعد سانپ کا بعد رم پانی کا اور اس کے بعد چیلوں کا اور چیلوں کے بعد بچوں کا اور پھر ایسی ہی گفتگو ہو چڑیوں کے متعلق اور تمام دوسری قسموں کے متعلق)۔ لیکن کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس ترتیب کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے مثلاً ایک جگہ اس نے ان اثرات کا ذکر کیا ہے جو انسانوں کے خصی کیے جانے سے ان کے مزاج اور صحت پر پڑتے ہیں پھر فوراً ہی وہ دوسرے جانوروں کا بیان شروع کر دیتا ہے اور ابھی اسی عمل کے اثرات بتانے لگتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد وہ اس رویہ پر گفتگو شروع کر دیتا ہے جو اسلام کا اس رسم کے متعلق ہے۔ اقوال و احادیث کو نقل کرتے کرتے غالباً بلا ارادہ وہ ایک پالو کتے اور گھریلو مرغ کا ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کر دیتا ہے۔ یہاں سے دو معتزلی علما میں جنکے نام معلوم ہیں مباحثہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بحث بالکل علمی ہوتی ہے اور پہلی جلد کا نصف آخری حصہ اور دوسری جلد پوری اسی میں ختم ہو جاتی ہے، اب پھر وہ جانوروں کو جس ترتیب سے جی چاہتا ہے ایک ایک کر کے لیتا ہے اور خود اپنے بنائے ہوئے خاکے کا بھی خیال نہیں کرتا۔ یوں چار جلدیں مکمل ہو جاتی ہیں اور باقی حصہ کیلئے

۱؎ جلد ۱ صفحہ ۴۶ ۔ ۲؎ جلد ۱ صفحہ ۹۳ اور ۱۰۱ ۔

ایک دوسرا خاکہ ظاہر کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے[1]:-

ونبدأ بما فی العصفور ثم ناخذ فی ذکر الفار والعقرب وما بینهما من العداوة سائر خصالهما ثم القول فی العقرب والخنفساء والصداقة بینهما مع سائر خصالهما ثم القول فی السنور والقول فی القنفذ ثم القول فی البعوض والبراغیث ثم القول فی القمل والصیبان ثم القول فی الورل والضب ثم القول فی الیربوع والقنفذ ثم القول فی السنور والرخم ثم القول فی العقاب ثم القول فی القوداد والضفادع ثم القول فی الجبارى وما

(ترجمہ: ہم چڑیا سے شروع کریں گے اور اس کے بعد ذکر کرینگے چوہے اور بچھو کا اور اس عداوت کا جو ان کو ایک دوسرے سے ہے اور ان کے تمام خصائل کا۔ پھر بچھو اور جھینگر کی دوستی کا اور ان کے تمام خصائل کا بھی پھر سانپ کا۔ بلی کا اور چوہے کا، پھر مچھروں اور پسوؤں کا۔ پھر کھٹمل اور جوں کا پھر چھپکلی اور گوہ کا پھر جنگلی اور جنگلی چوہے کا پھر بلی اور سفید گدھ کا پھر چیل اور خرگوش کا پھر بندر اور مینڈک کا اور پھر حباریکا اور ان کا جو اس کے شامل ہیں) لیکن جاحظ کا قلم حدود کا پابند تو ہو سکتا ہی نہیں چنانچہ آخری تین جلدوں میں بھی وہ ادھر ادھر جہاں جی میں آیا مارا مارا پھرتا رہا ہے۔ اس تصنیف میں جس اسلوب کو اختیار کرنے کا اس کا ارادہ تھا وہ یہ ہے[2]۔ متی خرج (القاری) من آی القرآن صار الی الاثر ومتی خرج من اثر صار الی الخبر۔ ثم یخرج من الخبر الی الشعر ومن الشعر الی النوادر ومن النوادر الی حکم عقلیہ ومقاییس شداد۔ (ترجمہ: پڑھنے والا جب آیات قرآنی سے گذر چکے گا تو اسکو احادیث ملیں گی اور جب یہ بھی ہو چکیں گی تو اقوال اس کے بعد شعر اور نادر باتیں اور آخر میں عقلی حکمتیں اور قیاسات)"

بالکل یہی اسلوب دمیری کا بھی ہے۔ جسنے جاحظ کے بہت دنوں بعد علم الحیوان پر ایک قابل قدر تصنیف چھوڑی ہے۔ اس کا بہت امکان ہے کہ جس طرح اور باتیں اسی جاحظ سے اخذ کی ہیں یہ اسلوب بھی وہیں سے لیا ہو۔ لیکن خود کتاب الحیوان میں کسی قسم کی ترتیب کا پتہ نہیں اور بحثیں بھی اسی قدر پراگندہ ہیں جسقدر ابواب وفصول حتی کہ ایک جانور کے متعلق دوسروں کے اقوال

---

[1] جلد اصفحہ ۶۴ ۔ [2] جلد اصفحہ ۴۶ وجلد ۵ صفحہ ۱ ۔

یا خود اس کے خیالات بہ تمام وکمال اس باب میں ہرگز نہیں ملیں گے جو اس جانور کے نام سے موسوم ہے۔ بلکہ مصنف بار بار دوسرے ابواب کا حوالہ دیتا ہے۔ جن میں سے کوئی تو پہلے گذر چکا ہے۔ اور کوئی ابھی لکھنے کو باقی ہے۔ خود جاحظ کو بھی اس کمی کا احساس ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت[1] سے معلوم ہوگا لیکن وہ اپنے طرز تحریر اور جولانی فکر سے مجبور ہے اور کوئی علاج اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ " إنّي أذمّ هذا

الكتاب في الجملة لأن شواهد على شيء وقعت متفرقة غير مجتمعة ولو قدرت على جمعها

لكان ذلك أبلغ في تزكية الشاهد وأنور للبرهان وأسلس للنفس وأمتع بحسن

الوصف واحمد؛ لأن جملة الكتاب على حال مشتملة على جميع الحجج ومحيطة بجميع تلك البرهان

وإن وقع بعضه في مكان بعض وتأخر متقدم وتقدم متأخر" (ترجمہ: "میں الجملہ اس کتاب کو پسند

نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ایک چیز کے شواہد ایک جگہ نہیں ہیں بلکہ کچھ ادھر ہیں اور کچھ ادھر اور اگر کاش میں ان کو یکجا کرنے پر قادر ہوتا تو یہ خود شواہد کی صفائی کے لئے زیادہ مفید ہوتا اور دلائل اس سے زیادہ روشن ہو جاتے اور قلوب کی تسلی کے لئے کافی ہوتی۔ پھر اس سے پورے بیان میں ایک حسن بھی پیدا ہو جاتا۔ لیکن میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ پوری کتاب میں یہ تمام دلائل موجود ہیں۔ اور کوئی شاہد چھوٹا نہیں ہے اگرچہ یہ ضروری ہے کہ ایک نے دوسرے کی جگہ لے لی ہے اور جسے پہلے آنا چاہئے تھا وہ پیچھے رہ گیا اور جسے پیچھے آنا تھا وہ پہلے)۔

کہا جاتا ہے کہ دمیری نے ۵۶۰ تصانیف اور ۱۹۹ دواوین سے مدد لے کر اپنی کتاب "حیات الحیوان"[2] تیار کی تھی لیکن جس زمانہ میں جاحظ نے کتاب لکھی اس وقت ایسے عظیم الشان ذخیرہ علمی کا کہیں وجود بھی نہیں تھا۔ بصرہ اور کوفہ کے اکثر نحویوں کی طرح اس کی معلومات کے ماخذ بھی بعض عام کہاوتیں اور شعرائے عرب کے دواوین ہیں۔ تقریباً تمام دلائل کی بنیاد یہی اشعار ہیں جنھیں وہ کثرت سے نقل کرتا ہے۔ اور اپنے زمانہ کی عام رفتار کے مطابق ان مسائل میں شعرائے جاہلیہ کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتا ہے۔ اسکی بہترین مثال وہ بحث ہے جو اس نے حشرات الارض کے متعلق کی ہے۔ ان کے بارے میں اس نے

---

[1] جلد ۶ صفحہ ۱۱ و ۱۲ ؛ [2] حاجی خلیفہ جلد ۳ صفحہ ۱۲۲ ؛

ساٹھ ساٹھ اور ستر ستر اشعار کے دو قصیدے[۵۱] پیش کرنے پر اکتفا کی ہے جو بشر بن معتمر کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ پھر خود ہی ان کی شرح بھی لکھی ہے۔ اور اس شاعر کے بیانات کی تصدیق بھی جا بجا دوسرے شعراء کے کلام سے کی ہے۔ جہاں تک ہو سکے آیات قرآنی کا حوالہ بھی آخر بہت ضروری ہی تھا۔ اور اگر کوئی آیت نہ مل سکی تو حدیث تو موجود ہی ہے۔ ایک پکے مسلمان کی حیثیت سے وہ آیات واحادیث کو ہر بحث کے متعلق فیصلہ کن سمجھتا ہے اور اپنی ساری کوشش ان کی صحت کے ثبوت میں صرف کر دیتا ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ سائنٹفک مباحث میں بھی اس کے نزدیک ان رایوں کی بہت اہمیت معلوم ہوتی ہے جو رسول اللہ کے کسی صحابی یا کسی خلیفہ نے کبھی ظاہر کی ہوں۔ اپنے ساتھی یعنی نحویوں سے بھی اس نے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ لیکن کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیتا غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب اس کے ہم عصر تھے۔ اور ان کی کتابیں اس وقت عام طور پر رائج نہ ہی ہونگی۔ وہ اصمعی کے حوالے بہ نسبت ابو عبیدہ یا کسی دوسرے کے زیادہ دیتا ہے۔ شاذ و نادر ہی ہمارا مصنف خود اپنے تجربات یا مشاہدات پیش کرتا ہے بلکہ ان کے لئے وہ اپنے دوست محمد بن الجہم[۵۲] اور اپنے استاد ابو اسحق ابراہیم النظام پر بھروسہ کرتا ہے۔

جاحظ کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے جوشِ علمی نے دوسرے ممالک کے ادبی خزانے کھولنے شروع کر دئے تھے۔ یونانی، سریانی اور سنسکرت کی تصانیف کا ترجمہ براہ راست یا بالواسطہ عربی زبان میں ہونے لگا تھا اور لوگ ان کا مطالعہ بڑے ذوق سے کرتے تھے، اس تحریک نے جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔ عربی ادب کا رنگ ہی بدل دیا۔ اس لئے اسکی ضرورت ہے کہ ہم بھی دیکھیں کہ ہمارے مصنف نے اپنی اس تصنیف میں جو علم الحیوان پر ہے کہاں تک ان جدید ذرائع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ کتاب التفکر والاعتبار کے سلسلہ میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جاحظ سریانی زبان کی سائنٹفک تصانیف سے واقف ہے۔ اور کتاب الحیوان[۵۳]،

---

۵۱ جلد ۶ صفحہ ۹۱ تا ۹۷ ۔

۵۲ ملاحظہ ہو ابن خلکان جلد ۱ صفحہ ۶۳ اور جلد ۲ صفحہ ۶۸ ۔ ۵۳ جلد ۱ صفحہ ۳۸ ۔

کی ایک عبارت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ یونانیوں کو اس معاملہ میں اپنی قوم سے برتر سمجھتا تھا۔ اسے اس کا بھی علم تھا کہ یونانی رسائل اکثر کتابت اور ترجمے کی خرابیوں کے شکار رہے ہیں لیکن جیسا کہ پروفیسر مارگولیتھ کا خیال ہے وہ یونانی فلسفیوں کا زیادہ رہین منت نہیں ہے۔

"کتاب الحیوان" میں جو سائنٹفک معلومات ہیں ان کا ایک معتد بہ حصہ ارسطو کی اس تصنیف سے ماخوذ ہے جو علم الحیوان پر ہے۔ جاحظ اس کتاب کے حوالے کثرت سے دیتا ہے اور اس کے مصنف کو "صاحب منطق" کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ ارسطو کے لئے جو مسلمانوں میں بہت مقبولیت حاصل کر چکا ہے یہ لقب عربی ادب میں بہت عام ہے۔ کہیں کہیں وہ اسے اس کے نام سے بھی یاد کرتا ہے لیکن یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان مواقع پر وہ صرف اپنی سنائی بات کا حوالہ دیتا ہے۔ اور اس کی کسی مخصوص تصنیف کا ذکر نہیں کرتا۔ یہی کیفیت ان حوالوں کی بھی ہے۔ جو جالینوس یا اقلیمون سے منقول ہیں۔

بہت سے مسلمانوں کی طرح جاحظ بھی یونانی یا سریانی زبان سے ناواقف تھا اور مجبوراً اسے صرف عربی ترجموں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ باوجودیکہ ترجمے کا کام تیسری صدی ہجری کے اوائل میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن پروفیسر مارگولیتھ کا خیال صحیح ہے کہ یونانی خیالات سے عام واقفیت پانچویں اور چھٹی صدی سے پہلے نہیں پیدا ہوئی تھی۔ ان دقتوں کی وجہ سے جو چھپی نہیں ہیں یہ تصانیف جاحظ کے زمانہ تک عام اشاعت نہیں حاصل کر سکی تھیں۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ جاحظ کے پاس بجز ارسطو کی کتاب کے جس کا ابھی ذکر ہو چکا ہے اور کسی دوسری تصنیف کا ترجمہ موجود نہیں تھا۔ بعض مشہور اطبا مثلاً جبریل بن بختیشوع۔ سلمویہ بن بنان اور یوحنا بن ماسویہ جو یونانی علوم کے مطالعہ میں بہت غور سے مصروف رہا کرتے اور مترجمین مثلاً ثابت بن قرۃ اور حنین بن

---

۵۱ Early Development of Mohammadanism صفحہ ۲۲۵۔

۵۲ ملاحظہ ہو ابن ابی اُصیبعہ جلد ا صفحہ ۷۵۔

۵۳ Early Development of Mohammadanism صفحہ ۲۰۵

اسحٰق اس کے ہم عصر تھے، ان میں سے ایک یعنی یوحنا بن ماسویہ کے متعلق تو یہ سُننے میں آیا ہے کہ خود یونانی علوم کے ایک بڑے ماہر ہونے کے علاوہ اس نے اپنے ذاتی مطالعہ کے لئے بہت سی غیر زبان کی تصانیف کا ترجمہ بھی کرایا تھا۔ اس کے حلقۂ احباب میں بہت سے مختلف المذاق علما داخل تھے۔ اور جاحظ بھی ان میں سے ایک تھا اس لئے یہ فرض کرنا غالباً بیرونِ از قیاس نہ ہوگا کہ اکثر بیرونی خیالات کا علم اُسی انھیں صحبتوں میں ہوا ہوگا۔ اور ان دوستوں ہی حوالوں کا ماخذ جو اس کی تصانیف میں کثرت سے ملتی ہیں بیشتر اس کے یہی دوست ہیں۔ جاحظ کے ایک بیان سے اس کے ذرایع معلومات کی کیفیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :۔ "قل معنی سمعنٰہ فی باب معرفۃ الحیوان من الفلاسفۃ وقرأناہ فی کتب الاطباء والمتکلمین الا ونحن قد وجدناقریباً منہ فی اشعار العرب والاعراب وفی معرفۃ اھل لغتنا وملتنا (ترجمہ: حیوانات کے متعلق بہت کم معلومات ایسی ہیں جو ہم نے فلاسفہ سے حاصل کی ہوں، یا اطباء اور متکلمین کی تصانیف میں پڑھی ہوں، اور قریب قریب وہی باتیں ہمیں اشعار عرب یا اپنے ہم زبان اور ہم قوم لوگوں سے نہ معلوم ہوئے ہوں)"۔

(باقی)

زوال مغرب

مغربی تہذیب ان مسائل کے حل کرنے میں ناکام رہی جنھیں نئی زندگی اپنے ساتھ لائی ہے۔ اس ناکامی کا احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، اور سوچنے والے دماغ اپنے اپنے طور پر اس کی توجیہ کر کے مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہیں جرمنی کا مشہور فلسفی مورخ اسپنگلر اس باب میں اپنا خاص نظریہ رکھتا ہے۔ حال میں اس کی ایک تصنیف "زوال مغرب" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں اس نے پہلے دنیا کی تاریخ سے استنباط کئے ہوئے نتائج کی بنا پر ایک نظریہ تمدن پیش کیا ہے، اور پھر اسی کی روشنی میں مغربی تہذیب کے حال اور استقبال پر روشنی ڈالی ہے۔

تصنیف کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جہاں اسپنگلر یورپ کے سیاسی تغیرات سے بحث کرتا ہے۔ اسپنگلر کے بعض خیالات سے خواہ ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو، مگر یہ غالباً ہر شخص کو نظر آئے گا کہ اسکی تحریر جمہوریت کی ناکامی کا ایک اعتراف ہے۔ اور یہ ثابت کرتی ہے کہ دنیا کو اطمینان نصیب نہیں ایک چیز کو چھوڑتی ہے، دوسری کو پکڑتی ہے، اور پھر اسے چھوڑ کر پہلی کی طرف پلٹتی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کی شخصی حکومتوں کے خاتمہ اور آئینی و جمہوری حکومتوں کے قیام نے دور جدید کا آغاز کیا۔

جمہوریت کا تخیل پہلے پہل بہت دلفریب ثابت ہوا، اور یہ سمجھا گیا کہ اس تخیل کو عملی جامہ پہنا کر دنیا سیاسی حیثیت سے اپنے معراج کمال کو پہونچ گئی۔ لیکن تجربہ نے بتا دیا کہ موجودہ جمہوری حکومت دنیا کا آخری طرز حکومت نہیں ہے۔ اور اگر ایک طرف اس سے پرانے مسائل حل ہوتے ہیں تو دوسری طرف بہت سے نئے مسائل پیدا بھی ہو جاتے ہیں، جن کا حل شاید اس طرز حکومت کے بدلنے ہی سے مل سکے۔ نیا طرز حکومت کیسا ہوگا، یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ اسپنگلر کے خیال میں یہ ایک شاہنشاہی حکومت ہوگی ذیل میں ناظرین جامعہ کے لئے اسپنگلر کے چند خیالات کا ایک مختصر خاکہ انگریزی سے ترجمہ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ امید ہے

کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔
(عبدالقادر)

اسپنگلر نے جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کی ہے وہ اپنے طرز اور مضمون کے لحاظ سے بہت نرالی ہے، انسانی زندگی کی بابت ہمارے جو خیالات ہیں ان سے اسپنگلر شروع ہی سے اصولی اختلاف رکھتا ہے۔ اور اپنی دلیل کی ابتدا اس دعوی سے کرتا ہے۔ کہ ہمارا تاریخ انسانی کو پستی سے بلندی کی طرف ایک ہی سلسلہ ترقی سمجھنا غلطی ہے جسکی اصلاح ابتک اس لئے نہیں ہوسکی کہ ہم واقعات عالم سے غلط استنباط کئے ہوئے نتائج پر اندھا دھند ایمان رکھتے ہیں۔ تہذیب کسی واحد شئے کا نہیں بلکہ ایک مجموعہ کا نام ہے چنانچہ بربریت سے تمدن کی طرف ایک ہی سلسلہ ترقی کے بجائے اسپنگلر ہمارے سامنے جُدا جُدا تہذیبوں کی تاریخ پیش کرتا ہے۔ جو مفروضہ راہ ترقی کی منازل نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی مستقل ہستی رکھتی ہے۔ اور ہر ایک کو بچپن، شباب اور انحطاط کی منزلوں سے ایک مقررہ مدت کے اندر اندر گزرنا پڑتا ہے۔ یہ مدت بھی ہر حال میں تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔

اس نظریہ سے اسپنگلر جو نتیجہ نکالنا چاہتا ہے۔ وہ صاف ظاہر ہے۔ بیسویں صدی اپنی لاسلکیوں اور دوربینوں کے باوجود وہ بلند ترین مقام نہیں ہے جہاں دنیا بحیثیت مجموعی ترقی کرکے پہونچی ہو، بلکہ صرف مغربی تہذیب کی راہ کی ایک منزل ہے۔ ایسی ہی جیسی اگلی تہذیبوں کی راہوں میں پیش آچکی ہیں۔ آزادی تو ہمیں کسی طرح میسر نہیں آسکتی۔ کیونکہ تمام اہم معاملات میں انسان "روح عصر" کے ہاتھ میں ہے۔ اور بیسویں صدی بھی مثل سابق سالہا صدیوں کے، جن کا ہمیں تاریخی علم ہے اسی طرح ایک تمدن کے نشو ونما کا دور متقدر ہے، جس طرح کسی درخت کی زندگی میں پت جھڑ کا زمانہ۔

اسپنگلر نے یہ عقیدہ دنیا کی تاریخ میں چند اہم خصوصیتوں کو دیکھکر قایم کیا، جنکا وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ تاریخ کے بظاہر غیر متعلق واقعات کی تہ میں ایک "قانون تمدن" ہے۔ جس کا عمل بلا تغیر ہر زمانہ میں یکساں رہا ہے۔ اسپنگلر کے نزدیک تمدن ایک نامی شئے ہو۔

اور زندگی اور موت کے الفاظ اس کے لئے اسی طرح مستعمل ہو سکتے ہیں جسطرح انسان کیلئے روح انسانی کی طرح تمدن بھی ایک "روح رواں" رکھتا ہے۔ یعنی وہ خاص خیال جو اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ صرف اس تمدن کے فنون و مذہب، بلکہ اس کے ارتقا سیاسی کی نوعیت کو بھی متعین کرتا ہے۔ اسپنگلر اس بار واقع ہونے والے عمل کی نوعیت تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ جب زندگی کی یہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو پھر نہ تو کوئی بڑا کارنامہ ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ نہ کوئی بار آور خیال۔ اور جو قومیں اس تمدن میں حصہ لیتی ہیں۔ وہ تمدنی حیثیت سے ایسی ہی مردہ ہو جاتی ہیں جیسے چینی یا فلاحین مصر آج نظر آ رہے ہیں۔

اس اسکیم کو پیش نظر رکھکر اسپنگلر ایک تمدن کے اپنی زندگی کے دور ہائے مقدر سے گزرنے کی آٹھ مثالیں دیتا ہے جنمیں سے ہر ایک کی روح رواں کوئی نیا خیال کوئی نیا احساس زندگی تھا، نویں مثال خود ہماری مغربی تہذیب کی ہے۔ جس کا اسپنگلر کے قانون کے بموجب آغاز انحطاط ہے۔ اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ آیندہ وہی کیفیات ہماری تہذیب میں بھی پیدا ہو جائیں گی۔ جیسے اگلی تہذیبیں بلا استثناء اپنے مدارج انحطاط میں متمیز تھیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً سنہء میں ہماری تہذیب نے یورپ کی بدنظمی اور انتشار میں جنم لیا۔ جسطرح قدیم تہذیب اگامنن (Agamemnon) کے زیر حکومت سواحل ایجین پر نقل وطن کی بے اطمینانیوں میں پیدا ہوئی۔ دونوں تہذیبیں بالکل متوازی راستہ ترقی کا اختیار کرکے اپنے اپنے شباب کو پہونچیں۔ مگر ہر ایک مرکزی خیال (اسپنگلر اس کا نام طغرائے امتیاز رکھتا ہے) اتنا مختلف رہا ہے کہ جب تک ہم ہر ایک کے مظاہر کی کیفیت جو ان کے اپنے اپنے زمانہ کے علوم و فنون اور خیالات میں تھی۔ تھوڑا بہت ذہن نشین نہ کرلیں اس وقت تک ان کے ارتقاء

سیاسی" اور پھر سماجی اپنے مسائل موجودہ پر روشنی نہ ڈال سکیں گے۔

ہم اپنی تہذیب کا سلسلہ قدیم تہذیب سے ملایا کرتے ہیں۔ اسپنگلر کے خیال میں دونوں تہذیبوں کو نہ صرف زمانہ کا بعد جدا کرتا ہے، بلکہ معنوی لحاظ سے بھی وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یونانی-رومی تمدن پیدا ہوا، اور اپنے مسائل کا اپنے طور پر سامنا کر کے ختم ہو گیا، اس کے بغیر کہ آنے والے تمدنوں پر کوئی قابل لحاظ اثر ڈال سکتا خود ہمارے تمدن پر بھی جو قرون اولیٰ کا ہمیشہ سے پرجوش پرستار رہا ہے۔ اسے ماضی کی خبر تھی نہ مستقبل کا خیال۔ پس جو کچھ تھا زمانہ حاضر تھا۔ اسکی ساری وابستگیاں حسّی، مادی اور جسمانی حیثیت سے موجود چیزوں پر ختم ہو گئی تھیں، اس کے بالکل برعکس مغربی تہذیب ہمیشہ تلاش میں سرگرداں اور ماحول کے قیود کو توڑ ڈالنے میں کوشاں رہی۔ ہمارا مخصوص فن لطیف موسیقی ہے جسمیں فضائے بسیط کے اندر پھیل جانے کی صلاحیت ہے۔ اور تمدن اولیٰ نے اپنے لئے سنگ تراشی پسند کی تھی، جو محدود اور صرف حواس ظاہری سے تعلق رکھنے والا فن ہے۔ اسی حصہ سے مغربی یورپ کی ریاضی لائبنز (Leibniz) کی لامحدود مکان والی ریاضی ہے، اور یونانی ریاضی اقلیدس کی ریاضی تھی جس کا تعلق اعداد متفرقہ سے ہے۔ ہمارے نزدیک بھی خدا کی ذات جیسے نیب لنگن (Nibelungen) کے قصہ میں سمجھا گیا ہے، لامحدود ہے۔ مگر یونانی اپنے دیوتاؤں کی ذات کو اپنی ذات سے کچھ ہی وسیع سمجھتے تھے۔ یہی خصوصیت ان کے معابد میں بھی نظر آتی ہے جو مربع شکل میں دنیا کی طرف رخ کئے ہوئے ہوتے تھے، بخلاف ہمارے گاتھک (Gothic) کلیساؤں کے جن کے کلس اور پشتے لامحدود بلندی کی طرف پرواز کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یونان ہی نہیں بلکہ رومی شاہنشاہی کی سیاسیات بھی حقیقتہً محدود اور شہری مملکت (City States) کی سیاسیات تھیں اور اس دائرہ میں نہیں داخل ہو سکتیں۔ جو لوئی چہاردہم یا فریڈرک اعظم کی وسیع سیاسیات کا ہے۔ قدیم و جدید دونوں تہذیبوں کا ہر عمل، ہر خیال اپنی اپنی تہذیبوں کے بنیادی نقطۂ نظر کو ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔

چونکہ آج کل ہماری تہذیب اس منزل پر پہونچ گئی ہے۔ جب وہ مافوق الطبیعات کے نقطۂ نظر سے بے مایہ معلوم ہوتی ہے اس لئے وجود لامحدود کی طلب جو ہمارے دل سے لگی ہے وہ "فضائے محدود" کو فتح کرنے والی سائنس کی ایجادوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ نظریہ جوہر فرد (atomic Theory) میں دورِ جدید کا جو بنیادی پیغام مضمر ہے قرونِ وسطیٰ کے عقائد مذہبی میں، باخ کی موسیقی میں یا بڑے بڑے گرجاؤں کی عمارات میں تھا۔

یہ غلط ہوگا اگر ہم اپنی اور یونانی۔ رومی تہذیب کا ورق جاننے کے لئے دیکھیں کہ اقلیدس کے علم ہندسہ اور وماکرٹس کی سائنس نے اس زمانہ سے اب تک کیا ترقی کی۔ دونوں میں فرق مدارج ارتقا کا نہیں ہے۔ بلکہ اشارہ ہے کہ ہماری تہذیب دنیا کی بابت ایک بالکل ہی مختلف زاویہ نگاہ رکھتی ہے۔ اور یہی وہ واحد زاویہ نگاہ ہے جس سے ہماری تہذیب کا خیال ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اسپنگلر ہمیں بتاتا ہے کہ عربی تمدن کا، جسنے قدیم تمدن کے سایہ میں جبکہ وہ دم توڑ رہا تھا، پرورش پائی اور بعض اوقات اس کے قالبوں میں اپنی روح ڈالنے کی کوشش کی، زاویہ نگاہ دنیا کی بابت کیا تھا۔ اور وہ کونسا **مخصوص خیال** (جسے اس تمدن کی روح رواں سمجھنا چاہئے) تھا جسکی بنا پر اس نے ریاضی میں جبر و مقابلہ سائنس میں علم کیمیا، اور فنون میں تعمیر وہ بھی گنبدوں والی مسجد اور پچیکاری کا کام اپنے لئے منتخب کیا۔ اسپنگلر تہذیب کے ان تمام دوروں میں سے ہر ایک کے **بنیادی خیال** کا مظہر اسکی زندگی کے مقررہ مدارج میں تلاش کرتا ہے اور دکھاتا ہے، کہ کس طرح ایک فن اپنی تہذیب کے ساتھ نشو و نما پاکر اپنی مخصوص شکل میں معراج کمال کو پہونچتا ہے پھر کس طرح پُرانا ہو کر اپنی تمام جدتیں کھو دیتا ہے۔ اور اس کے اندر لایعنی تکلفات اور پُرانے خیالات کی بھدی نمائش کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اب پھر اگر ہم سیاسیات کو لیں (اور ہمیں اسپنگلر ہمارے مخصوص مسائل سے اچھی طرح

بحث کرتا ہی، تو اس میں بھی وہی زمانے نشو و نما، شباب اور انحطاط کے پائیں گے (ہماری موجودہ حالت اور ہر تہذیب میں کوئی نہ کوئی زمانہ ایسی حالت کا گزر چکا ہے)۔ . . . . دو سو سال قبل مسیح کی یونانی = رومی تہذیب کی حالت سے بہت کچھ ملتی ہے، اور موجودہ منزل تک ہم نے بھی وہی راستہ اختیار کیا ہی جسپر تہذیب قدیم گامزن تھی۔ دونوں تہذیبوں میں وہ بادشاہیاں کمزور پڑ گئیں، جنھوں نے انکی ابتدا دیکھی تھی۔ (ایک میں شارلیمن کی بادشاہی اور دوسری میں اگممنن (Agamemnon) کی) اور ان کی جگہ کچھ عرصہ کے لئے نوابی راج (Feudalism) نے لے لی۔ ہمارے اندر عارضی طور سے اور تہذیب قدیم میں ہمیشہ کے لئے اور بادشاہ کی جگہ پر امرا کا طبقہ آ گیا۔ انگلستان میں نوابوں (Barons) کا طبقہ اور یونان میں وہ بڑے خاندان جن کے افراد سے تمام عہدے پر تھے، یہ نظام چند سری حکومت (Oligarchy) میں تبدیل ہو جاتا ہی۔ اور طبقۂ عوام کی اہمیت کے بڑھنے پر ایسے حکمرانوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اس طبقہ کے مفاد کی نمایندگی کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ یونانی = رومی تہذیب میں "خود سر حکمرانوں" (Tyrants) پر مشتمل ہوتا ہے، اور مغربی تہذیب میں رشلیو، کرامول اور والنسٹین جیسے لوگوں پر۔ دوسری صدی ارتقار سیاسی کا عروج دیکھتی ہی۔ یعنی وہ درجہ جہاں ملک کی شکل منظم کمال کو پہونچ جاتی ہی، جیسے پانچویں صدی ق-م میں یونان کی جمہوری حکومت کے زمانہ اور ہماری تہذیب میں لوئی چہاردہم کی شخصی حکومت کے زمانہ میں یہ کمال صرف پچیس سال کی مختصر مدت تک رہتا ہی۔ پھر نظام میں آہستہ آہستہ ڈھیل پڑنے لگتی ہے۔ بدنظمی، جیسی چوتھی صدی قبل مسیح کے یونان میں، اور اس پر آشوب زمانہ کے یورپ میں جسکا خاتمہ انقلاب فرانس سے ہوا، دیکھی جاتی ہے، اسکندر اور نیپولین جیسے لوگوں کے لئے راستہ صاف کر دیتی ہے، اس کے بعد ہمارا وکٹوریں عہد (Victorian Age) شروع ہوتا ہے جس میں یورپ نے اس قسم کی شاہی سے نجات حاصل کر لی جو پہلے تھی۔ اسی طرح قدیم تہذیب کا عہد ہلینی (Hellenic Age) شروع ہوا تھا جس میں یونان نے مملکت شہری

(City-states) کے پرانے نظام کو خیرباد کہا تھا۔ دونوں زمانے علمی و ادبی ترقی کے تھے۔ ہیروڈوٹس اور بطلیموس کے ناموں کے مقابل نیوٹن، ڈارون اور آئنسٹین کے نام ہیں۔ اور اسکندریہ کے لٹریچر میں وہی رومانی خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو شیلی سے لیکر ولیم موریس تک وکٹورین عہد کے شعرا میں۔ اخلاقیات کے اندر لارڈ شیفٹسبری اور جے۔ ایس۔ مل جیسے لوگوں کی "انسانی" تخئیلیت (humanitarian idealism) وہی حیثیت رکھتی جو رواقیوں (Stoics) اور کلبیوں (Cynics) کے فلسفیانہ نظام کی ہے۔

سیاسی حیثیت سے دو زمانہ بھی دونوں تہذیبوں نے دیکھے ہیں چوتھے طبقہ یعنی طبقۂ مزدور کو (Labour Party) ملکی معاملات میں پوری طرح دخل ہو گیا۔ منطقی حیثیت سے ان کی آزادی ان کے غلبۂ سیاسی کی مرادف ہو گی۔ روم میں چوتھی طبقہ کی آزادی سے اس قسم کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ سوشلسٹ عنصر کبھی غالب نہ آسکا۔ کیونکہ اپنی رہنمائی آپ کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے کے سبب عوام الناس مثلاً، میریس، پامپی جیسی مقتدر شخصیتوں کے زیر اثر آجاتے جو اپنی دانائی، دولت یا طاقت کے ذریعہ ان کی رہنمائی کرسکتیں۔ یہی شخصیتیں تمام ملک کا مرکز عمل بن جاتیں۔ باوجودیکہ آئینی حکومت کا نظام ہنوز قایم تھا، مگر ان کا اقتدار پیش خیمہ تھا، ایک مقتدر تر شخصیت .. قیصر کا۔ کیا ہم بھی قیصریت کی طرف جارہے ہیں؟ اس کا جواب اسپنگلر اثبات میں دیتا ہے۔ اور بلاشبہ موجودہ یورپ کے اندر بہت سی نشانیاں ایسی ہیں جو اس جواب کی تصدیق کرتی ہیں۔ سلطنت کا انتظام کرنے میں سوشلسٹ حکومت یہاں بھی ویسی ہی ناکام رہی جیسی روم میں تو کیا یہ صرف ایک وہم ہوگا۔ اگر جنوبی یورپ میں جمہوریت کی ناکامی کے وہی معنی لئے جائیں جو رومی جمہوریت کی ناکامی کے ہیں؟ اور کیا یہ محض ایک اتفاقی بات ہے کہ مسولینی، پینگلوس، اور ڈی ریورا جیسے لوگوں کے برسر اقتدار آنے، بلکہ زمانہ جنگ میں خود ہمارے لائڈ جارج کے طاقت پکڑ جانے میں ہم ان لوگوں کی اس قدر مشابہت دیکھتے ہیں جو قیصر کے پیش خیمہ تھے؟

اسپنگلر کی تعبیر سے مستقبل کا حال معلوم کرنا مشکل نہیں۔ قیصر کے بعد ایک آگسٹس

(Augustus) پیدا ہوگا، اور پھر ایک عظیم الشان شخصی سلطنت قایم کی جائے گی۔ چنانچہ یہ دیکھنے میں بھی آتا ہے کہ ہر ملک میں معاملات ملکی صرف چند افراد کے ہاتھوں میں جا رہے ہیں اور یہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کو اپنی فلاح کے لئے تمام منتشر ہونیوالی قوتوں کو کسی نہ کسی طرح ایک مرکز پر لاکر اپنی قابو میں رکھنا ہوگا۔ اسپنگلر کے خیال میں آئینی حکومت اور آزادی مطلق ہی نہیں بلکہ قومیت کے تخیلات بھی، جو پرانے ہو چکے ہیں۔ اب قایم رہنے کی تاب نہیں رکھتے، جس طرح رومی جمہوریت کے تخیلات کو آگسٹس اور شاہی حکومت کے مقابلہ میں زک اٹھانی پڑی تھی۔ محض اس لئے کہ ان جبلوں سے امن و آزادی کا حصول صحیح معنوں میں نہ ہوا اور ایک آدمی کی حکومت اس لایعنی آزادی سے بدرجہا بہتر ثابت ہوئی جو انھیں حاصل تھی۔ اسپنگلر کا دعویٰ ہے کہ ہماری تہذیب کا آخری کام یہ ہوگا کہ وہ اپنی تمام منتشر دنیا کو ایک شاہنشاہی حکومت میں متحد کردے۔ یہ اسی قسم کی شاہنشاہی حکومت ہوگی جس کا نقشہ سیسل۔ رہوڈس (Cecil Rhodes) نے اتنے عرصہ قبل ہی پیش کردیا ہے۔ رومۃ الکبریٰ کی طرح یورپ (اور امریکہ) کی متحدہ شاہنشاہی حکومت معاشی و معاشرتی فارغ البالی کے ایک ایسے دور کا آغاز کریگی جس میں مادی اور صرف مادی ترقی ہوگی۔

یہ ہی وہ مستقبل جسکے لئے اسپنگلر ہمیں تیار ہو جانے کو کہتا ہے۔ اور نہ صرف تیار ہو جانے بلکہ اپنے کو بالکل اس کے مطابق بنا لینے کو اس علم کے ساتھ کہ ہمارے لئے کوئی اور مستقبل ممکن نہیں ہے۔ فنون لطیفہ کا کوئی سوال مغربی تمدن کے لئے اب بیکار ہے۔ اس صیغہ میں لایعنی تکلفات کے سوا اب کوئی بڑا کمال پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب میں ہمیں جو کچھ موہوم امیدیں ہیں انکو اپنے پرانے سیاسی تخیلات کی امیدوں کی طرح چھوڑ کر اپنی توجہ ان امور کی جانب منعطف کرنی چاہئے جو آجکل کی دنیا میں روز بروز اہمیت پکڑتے جا رہے ہیں۔ تاکہ ہم میں تنظیم، اور موجودہ زندگی کے سیاسی، اقتصادی اور اعلیٰ واقعات کو پیش نظر رکھکر سچے طریقہ سے غور و فکر کرنیکی صلاحیت پیدا ہو۔

دراصل اسپنگلر یہ بتانا چاہتا ہے کہ کونسی باتیں ہمارے لئے ضروری اور اس وجہ سے ممکن ہیں۔ اور کونسی باتیں ہمارے زمانہ کے امکانات سے خارج ہیں تاکہ ہم ان چیزوں کے پیچھے اپنی قوی دماغی کو ... نہ کریں جو انجام کار لاحاصل ہونگی ؛ ... سنت رکھتے ہو!

عاشقی اور نان نفقہ

(نگارش قلم آگسٹ اسٹرنرگ)

جسوقت نائب ممبر کونسل نوجوان گستاف نے بڑے آداب و قواعد کے ساتھ لوئی کو اپنے زوجیت میں لانے کی تجویز اوس کے باپ کے سامنے پیش کی تو اس بڈھے آدمی کا پہلا سوال یہ تھا۔

"تمہاری معاش کیا ہے؟"

"کوئی سو کرونر ماہوار، لیکن لوئی۔۔"

"بس آگے رہنے دو" فاق کے مجوزہ خسر نے قطع کلام کر کے کہا، "میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ تمہاری آمدنی کچھ زیادہ نہیں ہے"

"اوہ! آپ دیکھئے کہ لوئی میں اور مجھ میں کیسی قلبی محبت ہے! ہم کو ایک دوسرے کے خلوص محبت پر کیسا اعتماد ہے! ایسی صورت حالات میں ہم اس قسم کی ضمانت طلبیوں سے بالاتر ہونگے!

"بالکل ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے! لیکن مجھکو ایک مرتبہ پھر پوچھنے دو کہ کیا واقعی بارہ سو کرونر سالانہ ہی تمہارے وسائل معاش کی کل کائنات ہے؟"

"ہاں تو ہماری ایک دوسرے سے پہلی شناسائی لڈنگو میں ہوئی اور" بالکل تجاہل عارفانہ کے انداز میں۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ اپنی سرکاری تنخواہ کے علاوہ بھی تم کچھ کمالیا کرتے ہو کہ نہیں؟" بڈھے نے اپنے اوسی موضوع سخن کو جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں، میرا خیال ہے کہ ہم کو اپنی بسر اوقات کے لئے کافی مل جایا کرے گا۔ اس سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہماری محبت جانبین۔۔۔۔"

"بالکل بجا ہے، لیکن اس وقت ہم کو "عشق و محبت" کی بجائے کچھ اعداد و شمار کے متعلق تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے!"

"ابھی اس کے متعلق آپ کیوں کاوش میں پڑے ہوئے ہیں؟!" لوئی کے پرجوش اُمیدوار نے کہا۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی زائد کام کرکے میں اتنا ضرور کما لونگا کہ ہمارے اخراجات کے لئے کافی و وافی ہوگا"

"لیکن مجھے بھی تو معلوم ہو کہ یہ زائد کام آخر کیا ہوگا اور اُس سے کیا بنک آمدنی کی توقعات ہیں؟"

"سُنئے، میں فرانسیسی زبان پڑھا سکتا ہوں۔ اور اوس کے علاوہ ترجمے کا کام بھی کر سکتا ہوں، اور ہاں چھاپے میں پروف پڑھنے کے کام میں بھی مہارت رکھتا ہوں"

"اچھا ترجمہ کتنا؟ اور اوس کی اجرت کتنی؟" سُراغ رساں بڈھے نے پوچھا اور اور ہاتھ میں پنسل لے لی!

"میں ٹھیک نہیں کہسکتا۔ لیکن آجکل میں ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ کر رہا ہوں، اور اوس میں میرا معاوضہ دس کرونر فی جزو کے حساب سے طے پایا ہے"

"اس کتاب میں کل کتنے جزو ہونگے؟ محاسبہ کو ختم کرنے والے بڈھے نے پھر پوچھا"

"کوئی پچیس چھبیس، بس ایسے ہی ہونگے"

"بہت خوب، اچھا اس طرح ساری کتاب کی اُجرت ترجمہ اڑھائی سو کرونر رکھلو۔ ہاں اب اور؟"

"جناب اب اور میں نہیں جانتا، اس لئے کہ دوسری آمدنیاں کچھ یقینی نہیں ہیں"

"ایں؟! غیر یقینی آمدنیاں اور اُسپر شادی کا یقینی عزم بالجزم؟! مرد آدمی معلوم ہوتا ہے، کہ مسئلہ ازدواج کے متعلق تم کچھ عجیب قسم کے تخیلات اور توہمات رکھتے ہو!

تم کو اسبات کا احساس ہو کہ بچے بھی آخر عالم وجود میں آئیں گے۔ اور تم کو انہیں کھلانا۔ اور پہنانا پڑے گا، پھر اون کی تعلیم و تربیت بھی کرنی ہو گی ؟

"لیکن آپ ذرا اسبات کو تو دیکھئے" فاک نے معترضانہ کہا "کہ بچوں کی تشریف آوری اب اتنی جلدی تو ہو گی، اور پھر ہماری باہم محبت اتنی ہے کہ ———"

"کہ مستقبل قریب میں بچوں کے قدم رنجہ فرمانے کی پیشنگوئی بلا خوف تردید کی جا سکتی ہو!"

نوجوان کو اتنا سنا کر اب لوئی کے باپ کو ترس آ گیا اور وہ اپنے سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے یوں گویا ہوا

" میں سمجھتا ہوں کہ تم دونوں نے شادی کی ٹھان لی ہو۔ اور مجھے اسبات کا بھی اعتراف ہے کہ تمہاری محبت اب اوس نوبت تک پہونچ چکی ہے کہ " ہر کہ شک آرد کافر گردد " کا معاملہ ہو گیا ہے۔ پس ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اب میرے لئے بھی یہی زیبا ہو کہ اپنی منظوری دیدوں۔ اچھا اب تم کو میری نصیحت ہو کہ اپنے وقت کی قدر کرو، اور لوئی سے منسوب ہو جانے کے بعد جو یہ نیا عہد شروع ہو رہا ہو اُس کا ایک ایک لمحہ کو اپنے اضافہ آمدنی کی فکروں میں صرف کرو"

نوجوان فاک بڈھے کی منظوری پر پھڑک اُٹھا! وہ خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اور اپنی ارادت و احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے اوس نے لوئی کے باپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا! خدا ہی خوب جانتا ہو کہ وہ کتنا خوش تھا ——— اور دوسری طرف لوئی بھی کتنی شاد کام تھی! کتنے فخرآمیز اور فاتحانہ انداز میں وہ پہلی مرتبہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے نکلے ہیں! اور لوگوں کے لئے اس منسوب شدہ جوڑے کی خوشیاں اور اون کے چہروں کی سرخیاں کتنی قابل دید تھیں!

ہر روز شام کو فاک لوئی کے دیدار کے لئے آتا۔ اور اُس کے ہاتھ میں وہ پروف کے تختے ہوتے جن کی تصحیح کا کام اوس نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ حضرت قبلہ" پر اس سعادتمندی کا بہت اچھا اثر ہوتا اور اس کارگذاری کے صلہ میں محنت پسند نوجوان کو لوئی کے عذار رنگین کا ایک بوسہ ملجایا کرتا! لیکن ایک رات وہ تفریحاً تھیٹر دیکھنے گئے اور ادھر سے بجائے پیدل آنے کے گاڑی میں

لے، چنانچہ اوس روز کی ضیافت طبع کا سامان خرچہ دس کروز بیٹھا! اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً بجائے فرانسیسی کا سبق دینے جانے کے وہ اپنی نوجوان منگیتر کے ہاں آتا اور اوس کو شام کی سیر و گشت کے لئے لیجاتا۔

اب چونکہ شادی کی تاریخ قریب آ رہی تھی اس لئے اون کو محفل نکاح اور اپنے حجلہ عروسی کی زینت و آرایش کے لئے ضروری سامان کی خریداری کی فکر شروع ہوئی۔ اونہوں نے دو خوبصورت پلنگ خریدے، یہ اسپرنگدار تھے اور خالص اخروٹ کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور اون کے ساتھ بہت ملایم قسم کے گدے تھے۔ بقول خاک کے توی کا گدیلا آسمانی ہونا چاہئے کیونکہ اوس کے بال ریشمی ہیں وہ مکان کی آراستگی کا سامان بیچنے والے دوکانداروں کے ہاں بھی گئے، جہاں اونہوں نے ایک لیمپ سرخ رنگ کے قالبوس کا پسند کیا، زہرہ دیوی کا ایک خوشنما چینی کا بنا ہوا ننھا سا مجسمہ خریدا، ٹیبل کے استعمال کا مکمل سیٹ معہ چھری کانٹے اور کانچ کی چیزوں کے لیا، باورچیخانے کے ظروف کے انتخاب میں اونہوں نے ایک ماما کی ماہرانہ رائے سے فائدہ اوٹھایا، الغرض ہمارا نائب ممبر کاونسل آجکل بہت سرگرم کار نظر آتا ہے، کبھی دوڑا ہوا جاتا ہے کہ کسی مکان کی تلاش کرے، کبھی کاریگروں کی جستجو میں مصروف دوا دوش ہوتا ہے، کبھی اسباب کے دیکھنے میں مشغول پایا جاتا ہے کہ آیا سب ضروری فرنیچر آ گیا ہے یا نہیں، اور پھر کبھی چیک لکھتا ہوتا ہے، اور کبھی کچھہ اور کرتا ہوا!

اس اثنار میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ گستاف کوئی غیر معمولی زائد آمدنی نہ حاصل کر سکا اور اوس کی یہ معذوری بالکل قدرتی اسباب پر مبنی تھی، لیکن جوں ہی اون کی شادی ہو جائے گی وہ کچھہ نہ کچھہ کر کے ان تقریبات کے مصارف کی تلافی کرے گا۔ اُنہوں نے شادی کے بعد بہت ہی کفایت شعار بننے کا ارادہ کیا ہے۔ اور یہ طے پایا ہے کہ صرف دو کمروں سے اپنی ازدواجی زندگی کی رہایش کا آغاز کرنا چاہئے۔ ایک بڑے ہال کے مقابلہ میں ایک چھوٹے سے کمرے کے لئے فرنیچر بہم پہونچانا نسبتاً آسان ہوگا۔ چنانچہ اونہوں نے چھہ سو کرونر کے کرایہ پر ایک پہلی منزل کا

کمرہ لے لیا جس کا طول و عرض اچھا خاصا تھا اور وہ دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں منقسم تھا۔ ان کمروں میں سے ایک باورچیخانہ کے لئے تھا اور ایک جنس رکھنے کے لئے۔ شروع میں نوئی سے بالائی منزل پہ تین کمروں کی فرمایش کی تھی لیکن وہاں پہ اپنے اپنے مطالبات کو واپس لینے میں کسکو مضائقہ تھا۔ جبتک کہ اون کی محبت صادقانہ و مخلصانہ تھی اور "حساب دوستاں در دل" پر وہ عامل تھے؟

آخر کار کمرے بالکل آراستہ و پیراستہ ہو گئے۔ خوابگاہ کا کمرہ مثل ایک "حرمِ آمنا" کے تھا! اور اوس کے اندر دولہا دلہن کے بستر پہلو بہ پہلو ایسے نظر آتے تھے جیسے کہ گویا وہ دو رتھیں ہوں جو مشترکہ زندگی کے سفر پر روانہ ہونے کے لئے تیار کھڑی ہیں! آسمانی رنگ کے گدیلے اور اُبر برف کے مثال سفید چادریں، پُر تکلف تکئے جنکی سوزنکار جھالروں پر رنگیلی اور نوخیز لڑکیوں نے مرموز دستخط کاڑھے تھے یہ سب چیزیں ایک نظر فریب اور دلکش منظر پیش کر رہی تھیں! نوئی کے پرائیویٹ عقبی کمرے پر ایک لمبا اور خوبصورت پردہ چلمن کے طور پر پڑا ہوا تھا۔ نوئی کا پیانو جو بارہ سو کرونر میں خریدا گیا تھا۔ اوس دوسرے کمرے کی زینت بڑھا رہا تھا جو بیک وقت نشستگاہ۔ کھانے کے کمرے، اور مطالعہ کے کمرے کا کام دیتا تھا۔ یہاں علاوہ دیگر سامان کے اخروٹ کی لکڑی کا ایک لکھنے کا ڈیسک اور ایک خوشنما وضع کی کھانے کی میز بھی تھی جس کے گرداگرد قرینے سے موزوں قد و قامت کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، ایک بڑا آئینہ بھی تھا جسکے چوکھٹے پر نقری پانی چڑھا ہوا تھا، اور اسپر مستزاد ایک سوفا تھا اور ایک چھوٹی سی کتابوں کی الماری، ان مختلف اسباب و لوازمات نے کمرے کے اندر ایک خاص آرایش اور آسایش کی فضا قایم کر دی تھی!

عقد نکاح کی تقریب سنیچر کی شام کو پڑی، اور دوسرے دن اتوار کی صبح کو نوجوان جوڑا دیر تک خواب استراحت میں رہا! آخر کار گستاف پہلے جاگا، اگرچہ دن کی روشنی کواڑوں کی درازوں میں سے ہو کر اندر آ رہی تھی۔ لیکن پھر بھی اوس نے دروازے کو نہ کھولا، بجائے اِس کے

اوس نے وہ سرخ رنگ فانوس والا لیمپ روشن کیا اور اس "شب قدر" کی مدت میں ایک مصنوعی طوالت پیدا کر دی! لیمپ کی روشنی سے کمرے کے اندر رکھے ہوئے زہرہ کے مجسمہ پر ایک پراسرار و معنی خیز گلابی رنگ ڈالا! خوبصورت سی نوجوان بیوی اپنی بستر پر ایک مخملی بالطبع انداز سے مست خواب تھی اور حالتِ خواب میں بھی اوس کے چہرے پر طمانیت و قناعت کے آثار ہویدا تھے! آج کی رات نیند بھی اوسی کی تھی اور دماغ بھی اوسی کا! طلوع صبح امید کے بعد بھی اوس کے خواب ناز میں کوئی شے مخل انداز نہوئی تھی، اس لئے کہ آج اتوار کا دن تھا، اور کاروبار کی تعطیل کی وجہ سے سویرے سویرے ہی وہ گاڑیوں اور سواریوں کی کھڑکھڑاہٹ سامعہ خراش نہوئی تھی! سکون و راحت کا یہی عالم خموش تھا کہ یکبارگی گرجوں کے گھنٹے بجنا شروع ہوئے اور ایسا معلوم ہوا کہ خوشی و خرمی کے یہ کلیسائی نغمے ہمارے دولہا دولہن کی "معقد محبت" کی حسین تقریب کی یادگار منا رہے ہیں!

لوئی نے کروٹ لی، اور گسٹاف پردے کے پیچھے گیا تاکہ شب باشی کا لباس بدل لے بعد ازاں وہ باورچیخانہ میں گیا تاکہ لنچ کا انتظام کرے۔ اس جگہ نئے خریدے ہوئے قلعی دار ظروف کیسے "جگ مگ جگ مگ" ہو رہے تھے! اور یہ امر کس درجہ غرور و مسرت پیدا کر رہا تھا کہ یہ سب زینت افزا سامان اون کا اپنا تھا! گسٹاف کا اور لوئی کا!! اوس نے باورچی کو حکم دیا کہ قریب کے ریسٹران میں جائے اور وہاں اطلاع کرے کہ کھانا بھیجا جائے۔ ہوٹل کا مالک سارے پروگرام سے پہلے ہی واقف تھا اور ایک دن پہلے ہی اوسکو مکمل ہدایات اس بارے میں دی جاچکی تھیں، چنانچہ اب صرف یاددہانی کی ضرورت تھی تاکہ اوس کو معلوم ہو جائے کہ وہ مخصوص لمحہ آگیا۔

اب دولہا خوابگاہ کے کمرے پر واپس آتا ہے اور آہستہ سے دستک دیکر نیازکیشانہ انداز میں اجازت مانگتا ہے: "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

خواب جوانی میں غرقاب دُلہن چونکتی ہے، اور پھر ایک گھبرائی ہوئی آواز آتی ہے "نہیں،

"نہیں، پیارے! ذرا ٹھیرو! ایک منٹ کی مہلت دو!"

گستاف پلٹتا ہے اور کھانے کے کمرے میں آکر ٹیبل کو خود درست کرتا ہے، اُدھر ریسٹورا سے لنچ آیا اور اِدھر ہمارے سرگرم عمل نوجوان گستاف نے قابیں اور پلیٹیں، چھری اور کانٹے، کانچ کے سارے ظروف میز کے صاف اور براق دسترخوان پر قرینے سے چن دئے عروسی گلدان لوئی کی نشست کے سامنے رکھا گیا۔ رات کی دُلہن اپنی گلکار پوشش حسن افزا آخر کار کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اور سورج کی زرتار کرنیں اوس کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ وہ کسی قدر تھکی معلوم ہوتی ہے جس کو محسوس کرکے گستاف اوس کو ایک آرام کرسی پیش کرتا ہے۔ اور اوسپر اوس کو بٹھا کر خود کرسی کو پہیوں پر چلا کر لوئی کو ٹیبل کے قریب کر دیتا ہے! آتش سیال کے چند قطرے ماندگی زدہ عروس اپنے لب لعلیں سے لگاتی ہے اور ایک برقی رو اوسکے سارے نوخیز جسم میں دوڑ جاتی ہے، ان قطرات شراب نے اوسکی بھوک کو بھی متحرک کر دیا۔ غور کیجئے اگر لوئی کی ماں اس وقت اوس کو اس طرح "شغل شراب" میں دیکھتی تو کیا انگشت بدنداں ہوتی!

مگر اوہ! کچھ مضائقہ نہیں یہی تو وہ "مراعات خصوصی" ہیں۔ جن کا قرطاس آزادی، شادی کے بعد ملجاتا ہے!

در موسم گل زتوبہ یارب توبہ!

نوجوان شوہر اپنی حسین دلہن کے آئینۂ جمال کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ سبحان اللہ کیا جنت نظارہ ہے!! اس سے پہلے نہ معلوم کتنے لنچ اوس نے کھائے ہونگے، اپنی ناکتخدائی کے زمانے میں بیشمار ضیافتوں کے موقعے پیش آئے ہونگے، مگر طعام معدہ نواز کے ساتھ یہ غذاء روح یہ دعوت نظر، اور جام دل سے چھلکتی ہوئی شراب محبت کی یہ نوشا نوش" زندگی کا پہلا بیخود کرنے والا منظر تھا!

مدہوش و سرشار گستاف اس وقت اسی "خوابستان محبت" کی سیر کر رہا ہے اسقدر

مردہ دل اور بد مذاق ہیں۔ یہ لوگ، یہ کنواری نوجوان جنہوں نے شادی کے خلاف عہد کیا ہے! پھر ساتھ ہی ان کی مجرد زندگیوں میں کیسی خود غرضی وخود پرستی پنہاں ہے! میں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ ان بدبختوں پر ٹیکس لگایا جائے، بلعینہ جس طرح سڑک کے آوارہ پھرنے والے کتوں پر لگایا جاتا ہے!"

تاہم لوئی کے فلسفہ ازدواج میں اتنی متعصبانہ شدت اور سخت گیری نہیں ہے، وہ بڑی ملاطفت اور شیرینی سے ایسے لوگوں کی طرف سے یہ معذرت پیش کر رہی ہے۔ کہ "لطف حیات کے یہ حرماں نصیب لوگ جو غیر شادی شدہ زندگی کو قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، در اصل ہماری ہمدردی وترحم کے مستحق ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ اگر ان کو کافی مالی وسائل میسر ہوتے تو وہ ضرور شادی کرتے"۔ گسٹاف لوئی کے ان خیالات سے کسی قدر بے لطف ہو جاتا ہے۔ ایک خاص خیال اس کے دل میں چٹکی لے لیتا ہے۔ جو اس تمام عرصہ میں اس کے لئے سوہان روح بنا رہا ہے! پھر وہ اپنے دل ہی سے کہتا ہے کہ "یقیناً قلب وروح کی مسرت کا پیمانہ کیسہ زر نہیں ہے! ہرگز نہیں ہے! لیکن، لیکن۔ خیر پروا نہیں، دیکھا جائیگا۔ اگر خدا نے چاہا تو بہت جلد بہ کثرت کام ملے گا۔ اور کافی روپیہ ہاتھ آئے گا۔ اور زندگی بافراغت گذرا کریگی! سردست ہمارے دسترخوان پر یہ بھنا ہوا انیز کا گوشت جس کے ساتھ یہ مزیدار چٹنی ہے اور بعد کے ذائقہ کے لئے جام شراب ہے، کچھ کم غنیمت نہیں ہے"۔

لیکن یہی مرغوبات وتکلفات نوجوان بیوی کو ایک لمحہ کے لئے انتشار خاطر میں مبتلا کر دیتے ہیں، اور وہ دبی زبان سے ایک معذرت طلب انداز میں پوچھ بیٹھتی ہے کہ "گسٹاف! کیا اس پیمانہ پر ہم اپنی مصارف زندگی کو تادیر برداشت کر سکتے؟ لیکن گسٹاف اپنی ننھی لوئی کے ساغر میں تھوڑی سی اور "گلابی" ڈالکر "خاک برسر کن غم ایام را" کی دعوت بےفکری دیتا ہے۔ اور اوس کے خدشات وتوہمات کو رفع کرتا ہے۔ "ہر دن عید کا دن نہیں ہوتا پیاری! عیش حیات کے چند لمحے بھی بہت نادر ونایاب ہوتے ہیں۔ اور وہ جب میسر آجائیں،

اون سے بیش از بیش لطف اندوز ہونا چاہیئے!"

خیر ۶ بجے شام کو ایک خوبصورت اور آراستہ گاڑی جسمیں گھوڑوں کی جوڑی جڑی ہوئی تھی دولہا دولہن کے درِ دولت پر حاضر ہوئی، اور اس میں بیٹھکر یہ نیا ہم رشتۂ زوجیت جوڑا سیر کو نکلا۔ یہ موکب عروسی جس وقت پارک کے باروں میں سے ہوکر گذرا تو لوگ اس جاہ وجلال سے مبہوت رہ گئے: وہ بڑی اطمینان وآرام سے گاڑی میں ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، اور اس حالت میں دوست آشنا ملتے ہیں جو پا پیادہ سڑک پر جا رہے ہیں۔ اور نئے دولہا دولہن کو دیکھکر اون کی فاتحانہ کامرانی پر "خراج سلام" پیش کرتی ہیں! ساتھ ہی حیرت اور رشک سے اون کو دیکھتے ہیں۔!

"نائب ممبر کونسل کو خوب جوڑا ملا! بیوی بھی ملی اور دولت بھی! ایک ہم ہیں آت نہ کا مابن محبت اور تہیدستان مال وزر! جو پیدل گھسٹتے چلے جا رہے ہیں! کتنی پُر لطف ہے ان کی یہ سیر جسمیں اپنے ہاتھ پاؤں کو اونھیں ذرا بھی جنبش نہیں دینا پڑتی اور تکیہ دار نرم نشستوں پر فسان سے بیٹھے چلے جا رہے ہیں! یہ ہی خاطر خواہ شادی کی معراج!

"ماہِ عسل" کا ہر روز و شب "روزِ عید" اور "شب برات" کی طرح گذرا! بال پارٹیاں، ڈنر، تھیٹر وغیرہ بھی اپنی ہنگامہ آرائیوں سے اون کا شغل تھا۔ لیکن خود اپنے ہی گھر کی دلچسپیاں بھی اون کے لئے کسی بال اور تھیٹر سے کم نہ تھیں! کیا ہی لذت کی چیز تھی گسٹاف کے لئے یہ بات کہ وہ رات کے وقت لوئی کو اوسکے والدین کے پہلو سے محبت سے اوٹھا کر لے آتا اور اون کو اپنی لختِ جگر کی صحبتِ شب سے جو اس شادی کے قبل اون کو ایک ہی چھت کے نیچے نصیب تھی محروم چھوڑ آتا! پھر آکر محبت کے لذت چشیدہ میاں بیوی تھوڑا کھانا تناول کرتے اور اوس کے بعد آرام واطمینان کے ساتھ ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ جاتے اور پھر عشق و محبت کی حرف وحکایات میں ساری ساری رات اڑ جاتی! گسٹاف یوں تو علم الاقتصاد کا ایک مجسم خطبہ تھا۔ لیکن، زبانی جمع وخرچ کے سوا برائے نام ہی کچھ واقعی قطع وبرید اخراجات میں کی گئی! ایک دن نوجوان دولہن نے جس کے ساتھ اس تجویز میں گھر کی مالکہ بھی شریک ہوگئی تھی،

سن مچھلی پکائی اور اُبالے ہوئے آلوؤں کے بدرقہ کے ساتھ اوس کو کھایا، لوئی کو یہ کھانا بہت ہی مرغوب معلوم ہوا، لیکن گسٹاف اس غذا کی پسند کرنے میں اوس کا ہم مذاق بننے کے لئے تیار نہ تھا، اس لئے جب سامن کے پکنے کا دن پھر آیا تو اوس نے بجائے اوس کے تیتروں کی ایک جوڑی خریدی، یہ پرند اوسکو صرف ایک کرور میں مل گئے، چنانچہ وہ اپنی اس باکفایت خریداری پر بہت نازاں ہوا، لیکن یہاں لوئی گسٹاف کے اس تاجرانہ کارنامہ کو قابل داد سمجھنے پر راضی نہ ہوئی۔ اس لئے کہ اوس نے ایک دفعہ اس سے کم داموں میں دو تیتر خریدے تھے، علاوہ اس کے شکار کا گوشت کھانا ایک رئیسانہ تکلف تھا۔ اور بقول لوئی کے اون کی بے بضاعتی ان شوقوں کی اجازت نہ دیتی تھی، تاہم وہ اتنی سی رکیک بات کے لئے زیادہ حرف گیری نہ کرنا چاہتی تھی اور اس روش کو شوہر کے احترام کے منافی سمجھتی تھی!

دو مہینے کے بعد لوئی فاک کو ایک عجیب پراسرار قسم کا عارضہ لاحق ہو گیا! کیا بات تھی؟! کیا اوس کو رکام ہو کر بگڑ گیا ہے؟ یا باورچی خانہ کے کسی برتن کے فلزاتی زہر سے نادانستہ طور سے وہ مسموم ہو گئی ہے؟ خیر ڈاکٹر بلایا گیا، مگر وہ اون کے ان توہمات پر خوب ہنسا! لیکن خود یہ تشخیص مرض بھی مضحکہ خیز تھی، جبکہ یہ نوجوان عورت بظاہر کسی نہ کسی سنگین بیماری میں ضرور مبتلا ہے تو اُس وقت ڈاکٹر کا یہ کہنا کتنا بے معنیٰ سمجھا جانا چاہئے کہ کوئی بات نہیں ہے، اور طبعی حالت صحت موجود ہے! فاک نے خیال کیا کہ ممکن ہے کہ دیواروں پر چسپاں کرنے والے کاغذ میں سنکھیا کا کوئی جزو ہو چنانچہ اس شبہ پر اوس نے تھوڑا سا کاغذ لیا اور علم الکیمیا کے ایک ماہر کے پاس لے گیا اور اوس سے کہا کہ اوس کا بغور امتحان و تجزیہ کرے، لیکن زہریات کے اس مبصر کی رپورٹ نے دیوارگیر کاغذ کو ہر قسم کے مضر عناصر سے پاک بتایا۔

لوئی کی بیماری کسی طرح کمی پر نہ آتی تھی اور کسی علاج معالجہ سے اوس کی روزافزوں ترقی روکی نہ جا سکتی تھی۔ ناچار گسٹاف نے اپنی محبوب بیوی کے مرض کے عقدۂ لاینحل پر اپنے ہی طور پر کچھ تحقیقات شروع کی، آخر ایک طبی کتاب کے مطالعہ اور استشارہ سے اوس کو مریضہ کے

عارضہ کی نوعیت کے بارے میں یکسو کردیا۔ اوس نے لوئی کو نیم گرم پانی کا پاشویہ کرانا شروع کیا۔ اور اس علاج کے مسلسل ایک مہینے کے دورے سے مرض میں نمایاں افاقہ نظر آنے لگا۔ اور مریض کی حالت بالکل اُمید افزا قرار دی گئی، یہ تغیر حال بہت تیز رفتاری سے عمل میں آیا، کم از کم اون کی تمام توقعات سے بڑھکر۔ واقعی مرض بڑے ہی رازدارانہ قسم کا تھا! لیکن یہ راز اب زیادہ دنوں تک راز رہنے والا نہ تھا۔ ہزاروں صحتیں اس بیماری پر نثار کرنے کے قابل تھیں! اُوہ! "اَبّا اور امّاں" بننا کتنی خوش آیندبات تھی، ! یقیناً بچہ لڑکا ہی ہوگا! اور ابتو اوس کے لئے ایک نام کی تجویز ہونی چاہئے! ایک دن لوئی نے اپنے شوہر کو پاس بٹھاکر کہا: "دیکھو فاک، شادی کے وقت سے آجتک تمنے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی، اگرچہ تم جانتے ہو کہ یہ تنخواہ بالکل ناکافی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس اثنا میں ہمنے اپنی زندگی بھی کچھ "اجلی" ہی رکھی لیکن اب یہ ہونا چاہئے کہ اُن شاہ خرچیوں کو ختم کریں اور اپنا ہاتھ روکیں، انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائیگا!

دوسرے دن ہمارا نائب ممبر کونسل اپنے ایک بیرسٹر دوست کے ہاں گیا اور اوس سے درخواست کی کہ از راہِ کرم وہ ایک پرامیسری نوٹ لکھدے، اس کے ذریعہ سے وہ کچھ روپیہ قرض لے گا، جو بعض آنے والے ناگزیر اخراجات میں صرف کیا جائے گا۔ فاک نے اس "مد مخصوص" کا پوست کندہ حال اپنے دوست کو بتایا!

"ٹھیک ہی! کیوں نہ ہو!" قانون داں دوست نے کہا "شادی کرنا اور ایک خانداں کو پیدا کرنا اس کے لئے تو جب ایسے ہی خرچوں کی ضرورت ہوگی! لیکن مجھکو تو کبھی ان عزائم کی مالی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی ہمت نہوئی!"

فاک شرم وخجالت سے پانی پانی ہوگیا۔ اب اوس کو اتنی جسارت نہ تھی کہ اپنی قرضہ کی تحریک پر اصرار کرتا، چنانچہ وہ بے نیل ومرام گھر لوٹا۔ یہاں اوس کے خیر مقدم کے لئے مژدۂ جانفزا منتظر تھا کہ "آپ کی غیر حاضری میں دو اجنبی شخص آئے تھے اور آپ کو پوچھتے تھے!"

"غالباً یہ فوج کے وہ دو لفٹننٹ ہونگے جو میرے دوست ہیں اور فورٹ وکیسہوم کی قلعہ نشین سپاہ سے تعلق رکھتے ہیں" فاک نے اپنے کو مخاطب کرکے کہا "نہیں صاحب! وہ فوجی لفٹننٹ کیسے ہوسکتے ہیں؟ وہ اچھے خاصے بڈھے لوگ تھے!" فاک کو جتایا گیا" ارے ٹھیک! یہ میرے وہ لنگوٹیا یار ہونگے جنسے اپسالا میں میری شناسائی ہی انہوں نے میری شادی کا اور میری نئی زندگی کو دیکھنے کے اشتیاق میں آئے ہونگے، لیکن نوکر نے کہا کہ "کم از کم اتنا تو میں آپ کو بتلا سکتا ہوں کہ وہ اپسالا سے نہ آئے تھے، وہ وطنیت کے اعتبار سے اسٹاک ہومی تھے، اور ان کے ہاتھوں میں لکڑیاں تھیں!"

"عجیب! — قطعاً عجیب!! — لیکن ایسا ہے تو یقیناً وہ پھر لوٹ کر آئینگے!"

خیر، ان تفکرات کو بالائے طاق رکھکر یہ نوجوان شوہر بازار کو جاتا ہے تاکہ کچھ ضروری سودا سُلف کرے۔ اوس نے اسٹرابیری (ایک پھل) خریدے، اور یقیناً بہت ارزاں!

"ذرا دیکھنا" اوس نے فاتحانہ انداز میں گھر کی خادمہ سے کہا، یہ بڑے بڑے اسٹرابیری وزن میں پورے ایک پنٹ ہیں اور مجھکو صرف ڈیڑھ کرونر میں مل گئے ہیں! اور پھر لطف یہ کہ سال کے اس موسم میں!"

"افسوس، پھر وہی! اُسٹاف پیارے، میں کہتی ہوں کہ ہماری استطاعت ان چیزوں کے کھانے کی نہیں ہے!"

"کچھ پروا مت کرو میری پیاری! میں نے کچھ زائد کام کا بندوبست کیا ہے"

"لیکن اس قرضے کی بلا کا تمنے کیا بندوبست سوچا ہے؟"

"قرضہ؟ دیکھو اب میں ایک بڑا قرضہ لینے والا ہوں، اور اوس کے ذریعہ سے ان سارے چھوٹے چھوٹے مطالبات کا قصہ پاک کئے دیتا ہوں!"

"ہائے افسوس! میں پوچھتی ہوں کہ کیا اس کے معنی خود ایک نیا قرضہ نہیں ہیں؟!"

"خیر تو کیا پرواہ ہے؟ کم از کم اس دوسرے قرضہ سے تھوڑی مہلت تو ملجائے گی! لیکن میں کہتا ہوں کہ ان غیر خوشگوار باتوں کا آخر اس قدر چرچا کیوں کیا جائے؟ بھلا سوچو تو پیاری کہ چند اسٹرابیری کے پھل کیا مال ہیں؟! اچھا اب بتاؤ تو کہ ان پھلوں کے بعد انگوری شراب کا ایک جام کیسا رہے گا؟"

تجویز تو پہلے ہی طے شدہ تھی، چنانچہ اس گفتگو پر لوکر فوراً بازار دوڑایا گیا تاکہ بادۂ ناب کی ایک (بلاشبہ "قسم اعلیٰ") بوتل لے آئے!

اب تیسرے پہر کا وقت تھا اور لوئی کو ایک جھپکی آ گئی تھی، آج وہ سونے ہی پر بیٹھے بیٹھے ذرا اونگھ گئی تھی۔ بیدار ہونے پر اوس نے ذرا معذرت آمیز لہجہ میں اوس موضوع کو پھر چھیڑا۔ اوس نے کہا کہ "اگر میرے منھ سے کوئی نامناسب کلمہ نکلا ہو تو معاف کر دیجئے گا۔ اور خفا نہ ہوجیے گا!"

"خفا" فاک نے کہا، یقیناً خفا ہونے کی کوئی بات نہ تھی! تم نے کہا ہی کیا تھا؟! کیا تم نے اپنے خرچ کے لئے کوئی روپیہ مانگا تھا؟!"

لوئی نے اپنی فکرمندیوں اور احتیاط آموزیوں کی توجیہہ اس طرح کی:

"پنساری کے دام ابھی تک ادا نہیں کئے گئے ہیں" قصاب کا تقاضائے زرشت" بھی سختی سے ہو رہا ہے، اور کرایہ کے گھوڑوں کے اصطبل کا مالک بھی اپنے بل کے چکا دئے جانے پر مصر ہے۔"

"بس اتنی بات؟!" نائب ممبر کونسل نے پوچھا، اچھا ان سب کا یافتنی بلا تاخیر فوراً ادا کر دیا جائے گا — بس کل — بائی بائی! لیکن سنو سنو، ہم کو کچھ اور فکر بھی کرنا ہے، اچھا اگر آج شام کو گاڑی میں بیٹھ کر پارک کو چلیں، تو تمہاری کیا رائے ہے؟ — ہاں شاید تم گاڑی کو پسند نہیں کرتیں؟ بہتر تو پھر ٹرام ہوسے؛ آج ٹرام ہی میں پارک کی زیارت سہی!"

خیر پارک میں پہونچے اور الحمرا ریسٹران کے ایک پرائیویٹ کمرے میں اونہوں نے کھانا کھایا، ہوٹل کے مرکزی دارالطعام کے لوگوں نے ان خلوتیاں رازکی تنہا خوری سے خاص لطف اوٹھایا، اور اُن کو نوخیز ولولہ انگیز شرمیلے عاشق و معشوق کا ایک جوڑا سمجھا! لوگوں کی اس خیال آرائی سے گسٹاف کو بھی بہت مزہ آیا۔ مگر لوئی نے اس دلپسند خوش فہمی سے زیادہ لطف اندوزی نہ کی۔ برعکس اسکے وہ کسی قدر دل شکستہ نظر آتی تھی اور اوس کے اس غم پنہانی کے بیرونی آثار اوس وقت اور بھی نمایاں ہوگئے جب اوس نے "بل" کو دیکھا! اتنی رقم میں تو وہ گھر پر کہیں اچھا کھانا کھا سکتی تھی!

مہینوں پر مہینے گذرتے گئے اور پھر آخرکار وہ وقت آیا جبکہ ضروری سازوسامان کی عملی تیاری و فراہمی بلا تاخیر مزید شروع کردینی چاہیئے تھی ـــ یعنی ایک جھولا، اور امروز فردا میں آنیوالے نئے مولود کی پوشاک، وغیرہ وغیرہ!

فاک کے لئے اس وقت روپیہ کی دستیابی کوئی معمولی مہم نہ تھی! دارو غہ اصطبل اب آئندہ اوس کی ساکھ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور بنیا بھی اب قرض پر چیزیں دینا نہیں چاہتا! اس لئے کہ آخر ان لوگوں کے بھی بال بچے ہیں۔ اور ان کو بھی اپنا نجی خرچ چلانے کے لئے کچھ نہ کچھ زرنقد کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ روح کے لئے کس قدر تکلیف وہ یہ "مادہ پرستی" کا منظر ہے!"

آخرکار وہ مُشارفی ساعت آپہونچی! گسٹاف کے لئے ایک نرس کی خدمات کی بہم رسانی ایک ناگزیر ضرورت ہوگئی ہے۔ لیکن اس وقت منظر کتنا ہوش رُبا ہے!

حرمان نصیب گسٹاف اپنی نوزائیدہ بچی کو اپنی ہی مردانہ آغوش میں لئے ہوئے ہے!! اور یہ ٹریجڈی ("داستان المیہ") اوس وقت مکمل ہوجاتی ہے۔ جب اس عالم بے سروسامانی میں دروازے پر قرض خواہوں کا ہجوم نظر آتا ہے!!

نئی ذمہ داریوں کا بار فاک کی کمر کو توڑے دیتا ہے، اور اوس کا دل و دماغ اب

بالکل یاری نہیں دیتا!

یہ پرسچ ہے کہ اوس کو اب بھی تھوڑا بہت ترجمہ کا کام ملجاتا ہے لیکن مشکلات کے اس طوفان وتلاطم میں بھلا اپنے دماغ کو یکسو کر کے وہ کونسا کام کرسکتا ہے؟! اس حالت بیچارگی وبے بالی پرمیں وہ اپنے خسر کو "صدائے المدد" دیتا ہے، لیکن وہ "صدا بصحرا" ثابت ہوتی ہے۔ مگر آخر کار مرد مہربلسے کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

"خیر اس مرتبہ میں تم کو یہ رقم پیش کرتا ہوں لیکن تمھارے گوش گذار ہے کہ یہ پہلی اور آخری مدد ہے! میں خود ایک غریب پونجی کا آدمی ہوں اور تم اس سے بےخبر نہیں ہو کہ میری تنہا یہی اولاد نہیں ہے"!

اس بینوائی میں بھی زچہ کے لئے مخصوص لوازم دوا وغذا کے بغیر چارہ نہیں: لطیف اور سریع الہضم غذائیں مثل چوزہ مرغ وغیرہ اور بس ضروری ہیں، مزید براں بعض مقوی شرابیں بھی! اور پھر نرس کا نذرانہ ادا کرنا!

خوش قسمتی سے فاک کی بیوی ایام زچگی سے فراغت پاکے صحیح سلامت جلدی کھڑی ہو جاتی ہے۔ اب وہ پھر ایک کوری اور کنواری لڑکی معلوم ہوتی ہے! قد وقامت میں قدرے کشادگی اور چھریرا پن آگیا ہے، اوس کا انداز و سراپا پورا باوقار وشاہانہ ہے۔

اب لڑکی کا باپ اپنے داماد کو کچھ کھری کھری باتیں سُناتا ہے:

"سنتے ہو! اب آگے بچوں کی جھول جھال نہو! بس خدا کے لئے اتنی مہربانی رکھیئا اور اگر اپنا بیڑا غرق کرنا ہو تو اختیار ہے!" یہ خواری اور برخورداری" مبارک رہے!"

تھوڑے دنوں تک فاک اپنے اہل وعیال کے ساتھ افتاں وخیزاں اپنی زندگی کو ڈھکیلتا رہا۔ ان ایام میں اوس کی بسر اوقات یا "قرض" پر تھی یا پھر "عشق" پر! لیکن ایکدن دیوالیہ پن نے آخر اوس کے دروازے پر دستک دیدی۔ تمام اثاث البیت کی قرقی تعلیقہ کا وقت آگیا! اس وقت بڈھا بھی آگیا اور لڑکی اور اوس کے بچہ کو لیجانے کا حکم سنادیا! سب سی

زیادہ شاق و جگر خراش بات یہ تھی کہ روانہ ہوتے ہوئے بڈھے کی زبان پر یہ شکوہ سنجی تھی، "میں بھی یاد رکھوں گا کہ میں نے اپنی لڑکی کو ایک ایسے نوجوان کے سپرد کیا تھا جس نے ایک سال کے بعد اوس کو اوس کے وقار و عزت کو مجروح کر کے مجھے پھر واپس کر دیا!" لوئی اب بھی خاک کے ساتھ خوشی سے رہنے کے لئے تیار تھی اور اوس کی رفاقت میں ہر رنج و راحت میں شریک رہنے پر آمادہ، لیکن اب خالی "عشق" کی "غذائی روح" پر کہاں تک بسر ہو لی؟! اب گسٹاف بے یار و مددگار بنا ہوا کھڑا ہے۔ اور قرض خواہوں اور سرکاری پیادوں کے نرغہ اور یورش کو دیکھ رہا ہے، جو فرنیچر و اسباب، بستر و پلنگ، چھری و کانٹا، اور باورچیخانے کے تمام ظروف پر ایک ایک کر کے قبضہ کر رہے ہیں، اور وہ ساکت و صامت اس خانہ ویرانی کا تماشہ دیکھ رہا ہے! آخر سارا مکان کھنڈر ہو گیا!

اب گسٹاف کی حقیقی زندگی شروع ہوئی ہے۔ اوس نے کچھ جتن کر کے ایک اخبار کے عملۂ ادارت میں پروف خوانی کی جگہ حاصل کر لی۔ یہ اخبار چونکہ صبح کو شائع ہوا کرتا تھا۔ اس لئے اوس کی سرکاری آسامی بھی باقی رہی۔ اگرچہ اپنے صیغۂ ملازمت میں اوس کے لئے ترقی و اضافہ تنخواہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ خسر صاحب نے بھی اتنا رحم کیا کہ ہفتہ میں ایک دفعہ اتوار کے دن اوس کو اپنی بیوی اور بچی کو دیکھنے اجازت دیدی، لیکن اوس کو اون سے تنہائی میں ملنے کی سخت ممانعت تھی! جب شام کو ملاقات کرنے کے بعد وہ رخصت ہوتا تاکہ اخبار کے دفتر میں جا کر اپنی شبینہ ڈیوٹی کو انجام دے، تو سسرال والے گھر کے دروازے تک اوس کو پہونچانے کے لئے آتے اور اس "اول منزل" کے بعد وہ اکیلا ایک سخت روحانی ذلت کے ساتھ روانہ کر دیا جاتا! اپنے سارے قرضہ جات و مطالبات کو ادا کرنے میں تو شاید اوس کو بیس برس لگیں گے، اور پھر — ہاں، پھر کیا؟ سوال یہ ہے کہ اس بیباقی کے بعد بھی وہ اس قابل ہوگا یا نہیں کہ تنہا اپنی قوت بازو کی بدولت اپنے عیال و اطفال کا متکفل ہو سکے؟ نہیں، غالباً نہیں! اور اگر اس اثنا میں کہیں خسر کا انتقال ہو گیا تو گھر سے بھی بے در ہونا

پڑے گا!۔ اس نظر سے وہ دیکھتا تھا تو اوس کو یہی فیصلہ کرنا پڑتا کہ اس سنگدل بڑھے کا اتنا احسان بھی کچھ کم نہیں ہے۔ کہ اوس کی چھت کا سایہ ہی اوس کو نصیب ہے! اگرچہ اس ظالم نے دو عاشق روحوں کے اجسام میں تفریق کر دی ہے؟

ہاں ہوشیار ہو جائیے کہ انسانی زندگی بہت سخت اور بیدرد ہے! جنگل کے جانوروں کو آسانی سے اپنا "آذوقہ" ملجاتا ہی، لیکن خدا کی ساری مخلوق میں "انسان" ہی کو اپنے قوت لایموت کے لئے صبح سے شام تک اپنی جان کھپانا پڑتی ہی۔ فرزند آدم "محفل قدرت" میں اپنے معزز مقام کے لحاظ سے جس دلداری و نازبرداری کا مستحق ہے، اوس کو دیکھتے ہوئے زمین پر اوس کی یکس مپرسی سچ مچ مقام انسانیت کی بڑی توہین ہے! آہ کہ انسان کو "تیتروں اور اسٹرابیری" کے پھلوں کا "رزق" "غیر ممنوع" نصیب نہیں ہے!!

تنقید و تبصرہ

عبرت - خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی استاد تفسیر و ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ جو سلسلہ تعلیم الفرقان کا لکھ رہے ہیں اسی سلسلہ میں یہ حصہ شائع ہوا ہے جو سورۂ یوسف کی مکمل تفسیر ہے۔

خواجہ صاحب کے انداز بیان اور طرز تفسیر سے لوگ واقف ہو چکے ہیں۔ وہ نفسِ مضمون قرآنی نہایت سلاست اور خوبی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں اور جو عبرت اور بصیرت کی باتیں ہوتی ہیں ان کو آنکھوں کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ یہ حصہ بھی ان خوبیوں سے پر ہے۔ اور میرے خیال میں سورۂ یوسف کی اس سے آسان اور بہتر کوئی تفسیر اردو زبان میں نہیں ہے۔

چھپائی لکھائی نہایت عمدہ اور کاغذ اعلیٰ قسم کا ہے۔ قیمت فی نسخہ (عہ)

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ۔ دہلی۔

سفرنامہ حکیم ناصر خسرو علوی - حکیم ذکی احمد خاں صاحب مالک جید برقی پریس دہلی نے یہ مشہور سفرنامہ اپنے مطبع میں نہایت عمدگی کے ساتھ چھاپا ہے۔ لکھائی چھپائی کے لئے خود اس مطبع کا نام کافی ضمانت ہے۔ کاغذ بھی نہایت عمدہ ہے۔ اور جلد بھی خوبصورت بندھی ہے۔

حکیم ناصر خسرو پانچویں صدی کا مشہور سیاح ہے۔ اس نے شام۔ مصر۔ عرب اور ایران میں ۲۲۲۰ فرسنگ کا سفر کیا اور اس زمانہ کے عالم اسلامی کے چشم دید حالات نہایت سلیس فارسی میں لکھ دئے۔ چونکہ یہ سفرنامہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے بعض یونیورسٹیوں میں نصاب تعلیم میں بھی داخل ہے۔ اسلئے اسکے آخر میں طابع نے فرہنگ و تعلیقات بھی لگا دئے ہیں۔ تاکہ طلباء کو سہولت ہو۔ کسی زمانہ میں مولانا حالی مرحوم نے اس سفرنامہ پر ایک مقدمہ لکھا تھا۔ کاش وہ مقدمہ یا اس کا خلاصہ بھی دیدیا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔

مجلد کی قیمت عہ ہے۔ اور جید برقی پریس بلیماران دہلی کے پتہ سے ملسکتا ہے۔

خلفاء راشدین:۔ ہم پہلے اس رسالہ میں لکھ چکے ہیں کہ ملے بار میں ہماری کتاب تاریخ تاریخ الامت کا ترجمہ ملیالم زبان میں ہو رہا ہے جس کی پہلی جلد رسولِ کریم کے نام سے سیرۃ الرسول کا ترجمہ سال گذشتہ میں موصول ہو چکی ہے۔ اب چند مہینے ہوئے دوسری جلد خلافت راشدہ کا ترجمہ خلفائے راشدین کے نام سے شائع ہو کر آ گیا ہے نفسِ ترجمہ کے متعلق ملیالم نہ جاننے کی وجہ ہم کچھ نہیں لکھ سکتے۔ تاہم ہم کو اس قدر معلوم ہوا ہے کہ ملیبار کے اخبارات نے اس کی تعریفیں لکھی ہیں۔ باقی چھپائی وغیرہ حسب سابق نہایت اچھی ہے۔ اب اُمید ہے کہ تیسری جلد کا ترجمہ بھی چھپکر عنقریب آ جائے گا:۔

ترجمہ قانون قبضۂ اراضی:۔ سن رواں کے ماہ اگست میں جو جدید قانون قبضۂ اراضی کے متعلق صوبہ متحدہ کی کونسل نے پاس کیا ہے اس کا ترجمہ مع شرح و نظائر و نقشہ جات کے مولوی جمیل الدین حسن صاحب وکیل لکھنؤ بازار جھاؤلال و مولوی ابرار حسین صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل ہردوئی نے شائع کیا ہے۔

گو زمینداران صوبہ کی فوری ضرورت کی وجہ سے صاحبان موصوف نے یہ کتاب نہایت عجلت میں شائع کی ہے۔ لیکن پھر بھی ترجمہ عمدہ صاف اور قریب الفہم ہے۔ اور شرح ایسی ہے کہ عامی سے عامی بھی اچھی طرح اس کو سمجھ سکتا ہے۔ قیمت فی نسخہ عہ ہے۔ مذکورہ بالا دونوں حضرات کے پتہ سے مل سکتا ہے:۔

انیس:۔ یہ ہفتہ وار اخبار زیر ادارت مولوی محمد عاصم خاں صاحب بی۔ اے (علیگ) ضلع بستی سے نکلا ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ تقطیع $\frac{20 \times 26}{4}$ تعداد صفحات ۸ قیمت سالانہ پانچ روپیہ (صہ)

بستی علمی اور ادبی لحاظ سے نہایت پستی میں ہے۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ چند پر جوش جدید تعلیم یافتوں اور چریا کوٹی علماء کی حمایت اور سرپرستی میں یہ اخبار وہاں سے شائع ہونے لگا:۔

اس اخبار کے مضمون نویس اور قلمی معاونین کی فہرست ممتاز اہل علم کے ناموں سے مزین ہے۔ اور اتحاد اقوام ہند کا خصوصیت کے ساتھ حامی ہے۔ مضامین اور آرا کے لحاظ سے نہایت متین۔ سنجیدہ اور پرمغز معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف ترقی کرے گا۔ بلکہ اس نواح میں شمع ہدایت کا کام دے گا۔

ہم جس طرح اس ضلع اور اطراف کے باشندوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کی قدر کرینگے اسی طرح اس کے سرپرستوں سے بھی امید رکھتے ہیں کہ اپنے عزم وارادہ میں مستقل رہیں گے اور ابتدائی خسارہ سے جو ہر اخبار میں لازمی ہے گھبرا کر اس کو بند نہ کر دیں گے۔

الحافظ۔ یہ رسالہ شیعہ مدرسۃ الحفاظ لاہور کا ماہوار "علمی" رسالہ ہے جو زیر سرپرستی علامہ حائری صاحب مجتہد پنجاب کوچہ قاضی خانہ موچی دروازہ لاہور سے شائع ہوتا ہے ضخامت دو جزو لکھائی چھپائی معمولی اور کاغذ اوسط۔ قیمت سالانہ ۱۲ؔ

یہ رسالہ چونکہ ایک مدرسہ کا ترجمان ہے، اور ایک مذہبی مجتہد کی زیر حمایت نکلتا ہے۔ اس وجہ سے بجائے علمی ہونے کے مذہبی ہے۔ زیادہ مضامین مذہبی مناقشوں اور شیعہ عقائد کی حمایت میں لکھے گئے ہیں۔

ہمارے ملک میں جس قدر مذہبی رسائل یا جرائد نکلتے ہیں۔ خواہ وہ کسی فرقہ کے ہوں تعمیر کی بہ نسبت تخریب کی زیادہ کوشش کرتے ہیں جس سے بجائے فائدہ کے قوم کا نقصان ہوتا ہے۔ کاش وہ اس بات کو سمجھیں۔ ہم کو مولانا سید علی حائری صاحب جیسے مجتہد کی زیر حمایت اس سے بلند رسالہ کی توقع تھی:۔

غزل

(مصورِ جذبات مرزا ثاقب، لکھنوی)

دیکھتا حسن کا عالم جو نہ حیراں ہوتا
خیر یوں بھی سہی دل تو پریشاں ہوتا

راحتوں میں بھی جنوں کا وہی ساماں ہوتا
پھیلتا بھی دلِ عاشق تو بیاباں ہوتا

بیٹھتے جی سایۂ دیوارِ چمن تک نہ گیا
مر کے کیا پھول کا شرمندۂ احساں ہوتا

آفتِ جاں تھے شبِ غم کے ڈرانے انداز
دل تو دل ہی تھا کہاں تک پریشاں ہوتا

ھن ہوا ، ڈوب گئے بحر میں رو رو تو
اور کیا چاہتے ہو نوح کا طوفاں ہوتا

ہے بڑے کام کی گم گشتگیٔ ہوش و حواس
آئینہ سنگ سے کم تھا جو نہ حیراں ہوتا

پھر بھڑک اُٹھتے ذرا دیر کے خاموش چراغ
ان کے ہاتھوں جو مزاروں پہ چراغاں ہوتا

ل ایسے کر لئے جمعیتِ دل ہے لیکن
کوئی ہوتا جو مری طرح پریشاں ہوتا

جھگڑے آپس کے ہیں دل کہتا ہے بس وحشت بس
ہاتھ کہتے ہیں گریباں پہ گریباں ہوتا

خونِ دل رنگ بدلتا نہ اگر اشکوں کا
یہ سمندر مرے زخموں کا نمکداں ہوتا

کشتۂ آفتِ تقدیر ہے ہر شمع و چراغ
آگ لگتی نہ تو پھر کیوں کوئی عریاں ہوتا

میں نہ جی اٹھتا مگر قبر پہ آتے تو کبھی
کچھ نہ ہوتا تو یہ کیا کم تھا کہ احساں ہوتا

رو رہا ہوں کہ مرا خاک شدہ دلِ ثاقب
جل نہ جاتا تو چراغِ شبِ ہجراں ہوتا

غزل

خواجہ امین الدین امینؔ عظیم آبادی

(سال وفات ۱۱۹۵ھ)

عاشق بدیدہ ناوک جاناں نگاہ داشت   یعنی بچشم خاطر مہماں نگاہ داشت
ہرکس کہ آشنا شدہ با چو منو کافرے   ایماں نداشت ست گر ایماں نگاہ داشت
روشندلاں بروئے کسے در نہ بستہ اند   آئینہ کس ندید کہ درباں نگاہ داشت
در گلشن زمانہ کہ غیر از ملال نیست   باید چو غنچہ سر بہ گریباں نگاہ داشت

(۲)

نیست غمی ز مرگ خویش تلخی غم چشیدہ را   دل بہ سفر قوی بود رنج سفر کشیدہ را
اے کہ بہ سینہ تخم غم کاشتہ بیاد گل   یاد بمی کنی چرا ایں دل داغ دیدہ را
خواہ ملطف پیش آ، خواہ بکینہ رو نما   ہر دو زلست خوشنما عاشق پاک دیدہ را

(۳)

روئے شگفتۂ تو گلستان آتش ست   زلفِ تو نخل سرکش بستان آتش ست
بیتاب کرد روئے تو ہرچند شعلہ را   داغ دگر ز خون تو در جان آتش ست
مغز سرم ز سوز محبت ہمہ پراست   ایں پنبہ را ببیں کہ نگہبان آتش ست

(۴)

چشم خوباں ہمیشہ بیمار است   خوئے بدرا بہا نہ بسیار است
خط بگرد رخش نمودار است   ماہ در جلوہ و شب تار است
دل صد چاک ما سلامت باد   شانہ زلف ترا چہ در کار است
بسکہ تیر تو دوخت سرتا پا   در برم جامۂ قلم کار است

وله

چہ شد ازیں کہ زمحفل مرا بروں کردی ــــ ز دل برآبر توانی اگر تمنا را
بگوید قاصد انظر من آں یار جانی را ــــ کہ ہجران تو بر من تلخ دارد زندگانی را
میدرد بیتابی دل پردہٴ ناموس را ــــ شمع سوزد در ہوا پیراہن فانوس را
پیچیدہ ام بنامہ تن زار خویش را ــــ بینم بدیں بہانہ مگر یار خویش را
نکردے چشم من گر ضبط گریہ ــــ ندیدے ہیچکس روئے زمیں را
چوب گل ست در نظر مردمان تنم ــــ گل کرد بسکہ داغ تو سر تا قدم مرا
افشاندہ ایم بس عوض دانہ اشک گرم ــــ جائے شگوفہ شعلہ برآید ز کشت ما
آن دل کہ شدے آب ز اظہار تمنا ــــ رسوا ست بہر کوچہ و بازار تمنا
گاہ بدیر میکنم گہ بحرم ترا طلب ــــ جائے تو در حریم دل ہست کجا کجا طلب
داغ عشق تو بس نمایان است ــــ سینہ یک تختہ چراغان است
آن دل کہ ز آتش غم عشق تو داغ نیست ــــ مانند خانہ ایست کہ در وے چراغ نیست
مرا وے زغم و درد تو رہائی نیست ــــ ترا کہ می نگرم بوئے آشنائی نیست
ز رخسار تو رنگے وام کردند ــــ بفصل گل بہارش نام کردند
بوالہوس در صفِ عشاق برابر نشود ــــ قاصد از نامہ و پیغام پیمبر نشود
دردِ دل از دوائے کسیکم نمی شود ــــ ایں زخم ہر رہینہ و مرہم نمی شود
برائے ہستیٴ یکدم کہ می رود بر باد ــــ بجانِ خود چقدر ایں شرارمی لرزد
دلِ دیوانہ بکوئے تو چہ الفت دارد ــــ گر رہے رود از راہ دگر باز آید
سبزہٴ خط شدہ بر عارض آنماہ نمود ــــ چمنے تازہ بروئے چمنے پیدا شد
ہمچو آن شخصے کہ باشد تکیہٴ او را در کلام ــــ ذکر او آید مرا در ہر سخن بے اختیار

شذرات

سنہ ۱۹۲۶ء کا آخری پرچہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ رسم ہے کہ دسمبر کے پرچہ میں رسائل کے مدیر موجودہ سال کی کارگذاری پر نظر ڈالتے ہیں اور آیندہ سال کے کام کا دستور العمل بناتے ہیں۔ ہم اس رسم کو صرف اس حد تک ادا کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی خامیوں کا اعتراف کریں اور آیندہ کے لئے انھیں دور کرنے کی تدابیر سوچیں۔ جتنے خطوط ہمارے قدر دانوں اور سرپرستوں کے آئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مضامین، طباعت و کتابت اور وقت کی پابندی کے لحاظ سے ہمارا رسالہ کامیاب سمجھا جاتا ہے، دو باتوں کے متعلق فی الجملہ شکایت ہے۔

(۱) نظمیں کم ہوتی ہیں۔

(۲) مضامین اکثر مغربی زبانوں سے ترجمہ ہوتے ہیں۔ اور پچھلے رسالے صرف دو شائع ہوئے۔ ہم انشاء اللہ آیندہ ماہ سے دونوں شکایتوں کو رفع کرنے کی انتہائی کوشش کریں گے مگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے قدر شناس ہماری امکانی مدد کریں۔ خریداری کے مطبوعہ فارم اس رسالہ کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں۔ جن حضرات سے ممکن ہو اپنے احباب سے ان کی خانہ پری کرا کے واپس فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

اس پرچے کے تیار ہونے کے بعد ہمیں اپنے عزیز دوست اور رفیق کار قاضی محمد سعد صاحب کے توسط سے راسخ عظیم آبادی کی چند غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جو انشاء اللہ آیندہ مہینہ شائع ہوں گی۔ قاضی صاحب راسخ مرحوم کا کلام جمع کر رہے ہیں اور انشاء اللہ عنقریب جامعہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی طرف سے شائع کریں گے۔

یونان بھی عجب خوش نصیب ملک ہے انقلاب حکومت جو دوسری قوموں کو سالہا سال کی

کوشش کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ یہاں آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے انقلاب کے بعد سے پورے سال بھر کے بعد ۱۶ر نومبر کو یونانی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ہوا۔ جنرل کنڈائلس نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جس میں اپنی حکومت کا دستورالعمل (تا انقلاب ثانی) بیان کیا۔

مسٹر نیلاس صاحب سابق وزیر اعظم یونان آج کل لندن میں مقیم ہیں اور علمی مشاغل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ گویا اکبر مرحوم کی اس نصیحت پر عمل کر رہے ہیں۔

غنیمت ہے شب فرقت کی فرصت
رسالہ لکھئے تحقیق کریں

خود یونان میں بھی علوم و فنون کی باسی کڑھی میں اُبال آتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ شہر ایتھنس (اثینہ) کی انجمن ادبی نے ہمارے مایۂ ناز اور "عزلت پسند" شاعر ٹگور کی دعوت کی اور صدر جمہوریہ نے اونھیں "حلقۂ نجات دہندہ" کا اول درجہ کا تمغہ عطا فرمایا۔

ہماری حکومت برطانیہ جس نے اپنا واحد مقصد تہذیب و تمدن کی اشاعت کو قرار دے رکھا ہے یونان کی طرف سے کیسے غافل رہ سکتی تھی۔ معاصر "سیر ایسٹ" بحوالہ ڈیلی ٹیلیگراف بیان کرتا ہے کہ برطانیہ کا نیا بحری مشن جو یونان کی بحری طاقت کو سنبھالنے کے لئے جا رہا ہے۔ حسب ذیل ارکان پر مشتمل ہوگا۔

ایک اعلیٰ افسر جو یونانی امیر البحر کا مشیر ہوگا۔

ایک اور افسر جو بحری جنگی اکادمی میں بحری جنگ کے فن پر لکچر دیگا۔ اور ادن لوگوں کو تعلیم دیگا۔ جن کا خاص مضمون توپ کا کام، تارپیڈو کا کام، سگنل کا کام یا تحت البحر کا کام ہے۔

تین بحری طیاروں کے چلانے والے جن میں سے ایک مستریوں کو تعلیم دے گا۔

اس سے بڑھ کر علم و تعلیم کی قدر دانی اور کیا ہو سکتی ہے یقین ہے کہ اگر یونانیوں کو بحریات

میں علمی تحقیق کا چسکا پڑ گیا لوگوں سے اور اون سے تبادلۂ خیالات اور مناظرہ ضرور ہوا کرے گا۔

ماڈرن ریویو میں ایک صاحب شکایت کرتے ہیں کہ انجمن اقوام کے مجموعی مصارف (۹۱۷۲۲۵ پاؤنڈ) میں سے ہندوستان سترھویں حصہ کے قریب ادا کرتا ہے لیکن وہاں کے ملازموں میں صرف ۳ ہندوستانی ہیں۔ انگلستان دسواں حصہ ادا کرتا ہے اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کی نسبت سے ۵ بار زیادہ سے زیادہ ۹ عہدے ملنا چاہئے تھے لیکن انھیں ۱۲۲ عہدے ملے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہندوستانی اور انگریز سب برطانوی رعایا ہیں۔ اور ہمارے لبرل مدبروں کے خیال میں متحد مقاصد رکھتے ہیں تو یہ شکایت اور تفریق کیا معنی رکھتی ہے۔ انجمن اقوام کے عہدہ داروں میں ہندوستانی کم سہی انگریز تو زیادہ ہیں۔

ہمعصر ریڈ۔ ٹی۔ ایم۔ جی کے نئے نمبر میں انجمن مستشرقین المانیہ کے سالانہ جلسہ کی رپورٹ چھپی ہے جس کے صدر ڈاکٹر روزن سابق سفیر ایران و مترجم رباعیات عمر خیام تھے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کی علمی جد و جہد جو جنگ کے بعد اقتصادی مشکلات کے سبب قریب قریب رک گئی تھی اب پھر شروع ہو گئی ہے اور جوں جوں مالی حالت سنبھلتی جاتی ہے تالیف و اشاعت کا کام ترقی کرتا جاتا ہے۔ ورزتعلیم پروشیہ بعض مطابع اور اشاعت گاہوں کے مالک خصوصاً لائپزک کے ہارووٹسر اور دوسرے علم دوست انجمن کی مالی اور اخلاقی مدد کر رہے ہیں۔

ہم ہندوستان کے تمام علم دوست حضرات اور علوم مشرقی کی حامی انجمنوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ جرمنی کی اس مقتدر انجمن کی ممبری حاصل کریں۔ اور علوم مشرقی کے احیا میں اس کی مدد کریں۔

تمام ہندوستان میں جو ہنگامہ کونسلوں اور اسمبلی کے انتخابات کی وجہ سے برپا تھا۔ وہ ختم ہو گیا ہے۔ نتائج شائع ہو گئے۔ اور امید ہے کہ کامیاب اور ناکامیاب اُمیدوار سب اپنی اپنی حالت پر صابر و شاکر ہوں گے۔ گو بعض کو صبر کی ضرورت ہوگی اور بعض کو شکر کی! ان انتخابات پر دو پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے ہمیں ان کی سیاسی اہمیت یا نتیجہ سے یہاں بحث نہیں۔ لیکن ان کے ضمن میں جو تمدنی اور اخلاقی بلکہ غیر تمدنی اور غیر اخلاقی مظاہر پیش آتے ہیں۔ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہم لوگوں کی سیاسی زندگی ابھی تک بالکل ہی ابتدائی حالت میں ہے۔ ملکی معاملات میں فرقہ بندیاں کسی خاص اصولی اختلافات کی بنا پر نہیں۔ بلکہ محض ذاتی مخالفتوں اور خواہش اقتدار کا نتیجہ ہیں ہر شخص لیڈر بننا چاہتا ہے۔ اور اس جنون میں ایسی ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں جو معمولی عقل اور کیرکٹر کا شخص ہرگز بہ صحت حواس خمسہ نہیں کر سکتا۔ مخالفین کو بدنام کرنے اور ان کو نیچا دکھانے کے لئے ہر قسم کے ناجائز ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں اور یا ہمی طعن و تشنیع اور بدزبانی جو تحریراً اور تقریراً بر پریس اور پلیٹ فارم پر کی جاتی ہے اس کا اثر ملک کے اخلاق پر نہایت ہی مضر پڑتا ہے نہ صرف یہ بلکہ امیدوار منصب و جاہ کی خواہش میں ووٹ خریدنے کے لئے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ ایسی مثالیں لوگوں کو معلوم ہیں جن میں ممبروں نے ایک ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ صرف کیا فی نفسہ تو شاید اس بات میں کوئی بُرائی نہیں کہ بعض مالدار بیوقوف اپنی خواہش شہرت کی قیمت ادا کریں لیکن اس کا جو ردعمل رائے دہندگی کے اخلاق پر ہوتا ہے اس کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ آزادی رائے کا گرانمایہ حق جو انسان کے نہایت بیش بہا حقوق میں سے ہے ضائع ہو جاتا ہے۔ صحیح انتخاب عمل میں آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص روپیہ خرچ نہ کر سکے یا نہ کرنا چاہے اس کے لئے کامیابی کا بہت ہی کم موقع ہوتا ہے۔

یہ شرمناک صورت حال صرف کونسلوں کے انتخابات ہی تک محدود نہیں۔ بلکہ عام طور پر ہماری ساری زندگی میں جڑ پکڑ گئی ہے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ پھینکنے کی کوشش میں نہ صرف فریقین کی بدنامی ہو بلکہ تمام قوم کی اخلاقی معیار اور اخلاقی قدروں کی ہتک ہوتی ہے لوگ عام طور پر یہی سمجھنے لگے ہیں

کو اپنی شہرت کو قائم کرنے اور بڑھانے کا یہی طریقہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی شہرت کو خاک میں ملایا جائے۔ اور جب اس قسم کی ذاتی جنگ شروع ہو جاتی ہے تو ایک اٹل قانون نقل کے ماتحت اسی کا رجحان پستی کی جانب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر قسم کی ناگفتنی اور ناکردنی باتیں اور حرکتیں ظہور میں آتی ہیں۔

ہمارے خیال میں ان تمام خرابیوں کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہمارے قومی لیڈروں اور کارکنوں کے پاس کوئی کام کرنے کے لئے نہیں ہے۔ جس طرح ایک بیکار آدمی ضدی اور زود رنج ہو جاتا ہے اور اس کی تمام قوتیں اس کی زبان (زبان گویا یا زبان قلم) میں سمٹ کر آ جاتی ہیں اسی طرح ان کی عملی قوتیں بھی ضائع یا غلط طریقے سے استعمال ہو رہی ہیں۔ اگر وہ واقعتاً سنجیدگی اور خاموشی سے قومی خدمت میں مصروف ہوتے (اور قومی خدمت کرنے کی بے شمار صورتیں ہو سکتی ہیں) تو اختلاف رائے اس حالت میں بھی ہوتا۔ لیکن وہ اصولی اور غیر ذاتی ہوتا۔ اس کا نتیجہ باہمی بحث و مباحثہ ہوتا جو فریقین کے خیالات پر اثر ڈالتا۔ اور ان کی ترمیم کرتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک مشترک لائحہ عمل قائم ہو لیکن اگر معقولیت کے ساتھ تقسیم عمل کی جائے تو کم از کم مختلف الرائے فرقے ایماندارانہ اختلاف رائے کی قدر کرتے اور بجائے ایک دوسرے سے جھگڑنے کے جس میں شخصی اور قومی قوتیں منتشر اور ضائع ہوتی ہیں اپنی مختلف قابلیتوں اور خیالات کے ذریعے ملک کی زندگی کو مالا مال کرتے مگر یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک لوگ نفسانی اغراض کی بندگی کو چھوڑ کر خود کو ایک برتر مقصد میں گم کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔

اس ماہ کا آخری ہفتہ دہلی میں "قومیات" کے نقطۂ نظر سے خاصی دلچسپی اور چہل پہل کے ساتھ گزرا۔ مسلمانوں میں سے اکثر ممتاز حضرات جو تعلیمی اور معاشرتی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے جمع ہوئے تھے کہ تعلیمی کانفرنس، سودمند کانفرنس، اور انجمن تبلیغ وغیرہ کے سالانہ

جلسوں میں شریک ہوں اور بعض اکابر جو سیاسی مسائل کو ایک مخصوص رنگ کی بے ضرر عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے آئے تھے کہ مسلم لیگ کی رسم انعقاد کو پورا کریں۔

اس میں سے ہمیں صرف تعلیمی کانفرنس کی کاسہ لیسی کے مشاہدہ کا موقعہ ملا کیونکہ تمام جلسوں میں شریک ہونے کے لئے غیر معمولی قوائے جسمانی اور غیر ضروری قوائے دماغی کی ضرورت تھی۔

تعلیمی کانفرنس کے جلسے کسی زمانہ میں مسلمانوں کے لئے اس قدر اہمیت رکھتے تھے کہ ہر مسلمان ان میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ ایک چھوٹا سا پنڈال بھی پورا نہیں بھرتا۔ تاہم کانفرنس کا یہ جلسہ اس لحاظ سے یادگار ہے کہ عرصہ کے بعد اس جماعت نے اپنی زندگی اور اپنے اعمال کا احتساب کیا۔ اور یہ بات جو ساری دنیا جانتی تھی پہلی بار محسوس کی کہ بہ حالت موجودہ اوس کا وجود قریب قریب بیکار ہے۔ صدر کانفرنس اور صدر مجلس استقبالیہ دونوں نے اپنے اپنے خطبوں میں اس بات پر زور دیا کہ کانفرنس کا تبلیغی دور گذر چکا ہے۔ اب اصلی کام کی باری ہے۔ تعلیم کی ضرورت کا احساس ملک میں پیدا ہو گیا۔ اب صحیح تعلیم کے رواج دینے کا وقت

جس زمانہ میں کانفرنس قایم ہوئی تھی۔ اوس کے لحاظ سے سب سے بڑا تعلیمی مقصد یہ تھا کہ انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم پر لوگوں کو راغب کیا جائے۔ کانفرنس کو اپنے مقاصد میں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ انگریزی تعلیم کا شوق مسلمانوں میں پیدا ہو گیا۔ اور کچھ لوگ ایسے نظر آنے لگے جو انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کے مبادیات سے واقف ہیں۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے جو چیز پہلے ہمارا منتہائے نظر تھی وہ اب ہمیں بہت چھوٹی نظر آتی ہے جس طرح کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہم اپنے بچوں کو تعلیم دینا چاہتے تھے، اوس پر ہم قانع نہیں بلکہ اوسے

... اور پست سمجھتے ہیں۔ اب ضرورت تھی کہ کانفرنس قوم کے سامنے ایسا تعلیمی نصب العین جو اس نئے احساس خودداری سے آشنا اور اس وسیع تر اور بلند تر مطمح نظر سے ہم ... ہوتا۔

بجائے اس کے کانفرنس ہر سال پرانے قصے دہرانی اور سنی ہوئی باتیں سناتی رہی ہر سال تجاویز پاس کرکے گورنمنٹ میں بھیجتی یعنی نیکی کرکے دریا میں ڈالتی رہی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ قوم کی توجہ کانفرنس کی طرف سے کم ہوتی رہی اور اب آسی رہ گئی ہے کہ اگر کانفرنس کا اجلاس دوسری ...وں کے اجلاسوں کے ساتھ نہ ہو تو شائد اس میں سوائے چند مرکزی کمیٹی کے ممبروں کے ... آئے۔

بہت خوشی کی بات ہے صدر کانفرنس اور صدر مجلس استقبالیہ دونوں نے اپنے خطبات صدارت میں کانفرنس کو ہدایت کی کہ وہ اپنے ماتحت ایک مرکزی تعلیمی ادارہ قایم کرے جس میں تمام مسلم ماہرین فن تعلیم کے اتحاد عمل سے تمام اہم تعلیمی مسائل پر غور و فکر ہوا۔ اور ...کے نتائج کانفرنس کے سامنے جلسے کے موقعہ پر پیش ہوا کریں۔ چنانچہ کانفرنس نے ایک تجویز کے ذریعہ سے ایسی ایک جماعت ماہرین فن تعلیم کی منتخب کی ہے۔ اور اوس کے حسب ذیل فرایض قرار دئے ہیں۔

(۱) نظری اور عملی تعلیمی مسائل پر علمی تحقیقات۔

(۲) اس تحقیقات کے نتائج کو عام فہم زبان میں شائع کرنا۔

(۳) اسلامی مدارس کے لئے ہر قسم کی ضروری معلومات بہم پہونچانا اور مفید مشوروں سے اون کی مدد کرنا۔

یہ جماعت عنقریب اپنا اجلاس منعقد کرے گی۔ اور اپنا ایک مفصل لائحہ عمل بنا کر کانفرنس کی

مرکزی کمیٹی کے سامنے پیش کرے گی۔

ہمیں امید ہے کہ اگر اس تجویز پر عمل کیا گیا تو کانفرنس کے تن مردہ میں سے سرے سے جان پڑ جائے گی اور اس کے اجلاس پھر ارباب علم اور حامیان تعلیم کا مرجع بن جائیں گے۔

[illegible] کے سلسلہ میں صرف ایک علمی مقالہ پڑھا گیا جو ارباب نظر کے نزدیک قابل [illegible] تھا خواجہ غلام السیدین صاحب پروفیسر مدرستہ العلمین مسلم یونیورسٹی نے یونیورسٹی اور [illegible] [illegible] کے بارے میں اپنے قابل قدر خیالات سے حضار کانفرنس کو مستفید فرمایا [illegible] [illegible] رسالہ کے آیندہ نمبر میں شائع ہوگا۔

اسی مہینہ دہلی میں وہ افسوسناک واقعہ پیش آیا جس نے مذہبی منافرت کے مہلک نتائج سے تمام ملک کو آگاہ کر دیا۔ سوامی شردھانند کا قتل ہم مسلمانوں کے لئے انتہائی شرم و عبرت کا باعث ہے۔ ہم سوامی جی کے [illegible] اندر چند پروفیسر اندر سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔
